مالیاتی فقہ کے اہم ارکان کے اصول و ضوابط اور مباحث کی تحقیق و تدوین پر مبنی مسائل
اور مختلف رسائل و جرائد میں مالی معاملات پر شائع شدہ تحقیقی مقالات و مضامین کا مجموعہ

مالی مُعاملات

اُصولی مباحث اور جدید تحقیقات

2

مفتی شاد محمد شاد
فاضل و متخصص جامعہ دارالعلوم کراچی

اکادمیۃ الحسان

مالی مُعاملات

اصولی مباحث اور جدید تحقیقات

جلد دوم

مالیاتی فقہ کے اہم ابواب کے اُصول وضوابط اور مباحث کی تلخیص، قدیم وجدید مسائل
اور مختلف رسائل وجرائد میں مالی معاملات پر شائع شدہ تحقیقی مقالات ومضامین کا دلچسپ مجموعہ

مفتی شاد محمد شاد
فاضل و متخصص جامعہ دارالعلوم کراچی

أكاديمية الحسان
للطباعة والنشر والتعليم

جملہ حقوق بحق مؤلف محفوظ ہیں

یہ کتاب یا اس کا کوئی بھی حصہ مصنف کی تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جاسکتا اور اس کی پی ڈی ایف/سافٹ کاپی بنانے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ بصورتِ دیگر قانونی کاروائی کا حق محفوظ ہے۔

نام کتاب:---------مالی معاملات: اُصولی مباحث اور جدید تحقیقات

مؤلف:-------------------------------مفتی شاد محمد شاد

(978-969-23664-0-3)------------------ISBN

اشاعتِ اول:-------------------------اکتوبر، ۲۰۲۲ء

ناشر:----------------------------اکادیمیۃ الحسان

ای میل: ------------shadkhan654@gmail.com

فون نمبر:-------------------------+923443884654

ملنے کے پتے:

الحسان اکیڈمی، اسلام آباد-----------------03443884654

مکتبہ الایمان، کراچی------------------03212466024

مکتبہ عزیزیہ، بنوری ٹاؤن، کراچی-----------03002343814

مکتبہ حسنین، محلہ جنگی، پشاور---------------03155252835

مکتبہ سید احمد شہید، لاہور-----------------03013668272

مکتبہ عثمانیہ، کمیٹی چوک راولپنڈی------------03335141413

فہرست

عنوان | صفحہ

تیسرا باب
تبرعات کے معاملات
(Gratuitous Contracts)

۱۔ تبرعات کا تعارف ۴۴۹

۱۔ عقودِ تبرع کا تعارف ۴۴۹

۲۔ عقودِ تبرع کی مشروعیت ۴۵۰

۳۔ عقودِ تبرع کی خصوصیت ۴۵۱

۴۔ عقودِ تبرع کی اقسام ۴۵۲

۲۔ ہبہ کے اصول واحکام (Gift) ۴۵۵

۱۔ ہبہ کا تعارف ۴۵۵

۲۔ ہبہ کا حکم ۴۵۶

۳۔ ہبہ کی شرائط ۴۵۷

۱۔ الفاظِ ہبہ کی شرائط ۴۵۸

۲۔ واہب (ہبہ کرنے والے) کی شرائط ۴۵۸

۳۔ موہوب لہ (جس کو ہبہ کیا جائے اس) کی شرائط ۴۵۸

۳۔ موہوب (جو چیز ہبہ کی جائے اس) کی شرائط	۴۵۹
۴۔ ہبہ کی اہم اقسام	۴۶۰
۱۔ ہبۃ العین	۴۶۰
۲۔ ہبۃ المنافع	۴۶۱
۳۔ ہبہ معنوی	۴۶۱
۴۔ دین کا ہبہ	۴۶۱
۱۔ ھبة الدین لمن علیه الدین	۴۶۱
۲۔ ھبة الدین لغیر من علیه الدین	۴۶۲
۵۔ ہبۃ المشاع	۴۶۲
۶۔ ہبۃ المجہول	۴۶۴
۷۔ مریض کا ہبہ	۴۶۵
۸۔ ہبہ معوضہ	۴۶۶
۱۔ مشروط فی العقد	۴۶۷
۲۔ غیر مشروط فی العقد	۴۶۷
۵۔ رجوع اور موانع رجوع	۴۶۸
۱۔ ہبہ میں رجوع	۴۶۸
۱۔ پہلی صورت: رجوع قبل القبض	۴۶۹
۲۔ دوسری صورت: رجوع بعد القبض	۴۶۹
۲۔ موانع رجوع	۴۷۰
۶۔ ہبہ کے عمومی ضوابط	۴۷۱
۷۔ ہبہ کی جدید صورتیں	۴۷۳
۱۔ زندگی میں جائیداد کی تقسیم	۴۷۳

۲۔ شادی بیاہ کے تحفے	۴۷۴
۳۔ بچوں کو ملنے والے تحائف	۴۷۵
۴۔ دوا ساز کمپنیوں سے تحائف لینا	۴۷۵
۵۔ مشکوک آمدنی والے سے تحفہ لینا	۴۷۶
۶۔ خون عطیہ کرنا	۴۷۶
۷۔ پنشن کا حکم	۴۷۶
۳۔ عاریت کے اصول واحکام (Commodate Loan)	**۴۷۸**
۱۔ عاریت کی تعریف	۴۷۸
۲۔ عاریت کا حکم	۴۸۰
۱۔ عاریت کا ثبوت	۴۸۰
۲۔ عاریت کا لزوم	۴۸۰
۳۔ عاریت کی شرائط	۴۸۱
۴۔ عاریت کی اقسام	۴۸۳
۱۔ عاریت مطلقہ	۴۸۳
۲۔ عاریت مقیدہ	۴۸۳
۵۔ عاریت کے عمومی ضوابط	۴۸۴
۶۔ عاریت کی جدید صورتیں	۴۸۶
۱۔ دلہن کا زیور	۴۸۷
۲۔ مکتبہ/لائبریری کی کتابیں	۴۸۷
۴۔ قرض کے اصول واحکام (Loan)	**۴۸۹**
۱۔ قرض کا تعارف	۴۸۹

۲۔ قرض کا حکم ۴۹۰
۱۔ عقدِ قرض کا لزوم ۴۹۱
۲۔ قرض کا اصل حکم ۴۹۱
۳۔ مختلف احوال کا حکم ۴۹۲
۳۔ قرض کی شرائط ۴۹۳
۱۔ مقرِض کی شرائط ۴۹۳
۲۔ مستقرض کی شرائط ۴۹۳
۳۔ مال کی شرائط ۴۹۴
۴۔ نفسِ قرض کی شرط ۴۹۴
۴۔ قرض کی اقسام ۴۹۴
۱۔ قرضِ حسن ۴۹۵
۲۔ قرضِ ربوی ۴۹۵
۳۔ قرضِ حقیقی ۴۹۵
۴۔ قرضِ حکمی ۴۹۶
۵۔ قرضِ نقدی و عینی ۴۹۶
۶۔ قرضِ استہلاکی ۴۹۶
۷۔ قرضِ انتاجی ۴۹۶
۸۔ قوی، متوسط، ضعیف ۴۹۶
۹۔ قروض متبادلہ ۴۹۷
۵۔ قرض کی ادائیگی اور وصولی ۴۹۷
۱۔ قرض کی ادائیگی کی صورتیں ۴۹۸
۲۔ قرض کی وصولی کے اصول ۵۰۰

۶۔قرض پر نفع	۵۰۲
۱۔ نفع کی اقسام	۵۰۳
۱۔مشروط نفع	۵۰۳
۲۔معروف نفع	۵۰۳
۳۔غیر مشروط وغیر معروف نفع	۵۰۴
۲۔ نفع کی صورتیں	۵۰۴
۱۔قرض میں اضافہ	۵۰۴
۲۔مادی نفع	۵۰۴
۳۔منفعت	۵۰۴
۴۔معنوی نفع	۵۰۴
۵۔اجل/مدت	۵۰۵
۶۔سفتجہ	۵۰۵
۳۔قرض پر نفع کے لیے حیلے	۵۰۶
۱۔بیع الوفاء	۵۰۶
۲۔بیع عینہ	۵۰۶
۳۔قرض میں بیع کی شرط	۵۰۶
۴۔خیار شرط بطور حیلہ	۵۰۷
۵۔رہن سے انتفاع	۵۰۷
۷۔قرض کے عمومی ضوابط	۵۰۸
۸۔قرض کی جدید صورتیں	۵۱۰
۱۔سیکورٹی ڈپازٹ (Security Deposit)	۵۱۰
۲۔بیعانہ	۵۱۰

۳۔ کسان/زمیندار کو قرض دینا ۵۱۱
۴۔ بیسی/کمیٹی ۵۱۲
۵۔ بینک اکاؤنٹس(Accounts) ۵۱۲
۶۔ مائیکروفائنانس بینکنگ کے قرضے(MFB) ۵۱۳
۷۔ موبائل سم لون(Advance Balance) ۵۱۴
۸۔ بانڈز(Bonds) ۵۱۴
۹۔ بل آف ایکسچینج(Bill of Cxchange) ۵۱۴

چوتھا باب

جدید و معاصر تحقیقات

Contemporary Studies on Financial Contracts

انسانی دودھ کا کاروبار: تعارفی و فقہی جائزہ(Human Milk Bank) ۵۱۶
◆۔ تعارف ۵۱۶
◆۔ ملک بینک کے قیام کی وجوہات ۵۱۸
◆۔ دودھ کے جمع کرنے اور حفاظت کا طریقہ کار ۵۱۸
◆۔ طبعی رضاعت کے فوائد ۵۲۰
◆۔ ملک بینک کے نقصانات ۵۲۱
◆۔ شرعی احکام ۵۲۲
۱۔ رضاعت کے ثبوت کی کیفیت ۵۲۲
۲۔ مخلوط دودھ سے رضاعت کا ثبوت ۵۲۶
الف۔ جس دودھ میں پانی یا دوا ملائی گئی ہو، اس کا حکم ۵۲۶

ب۔ مختلف عورتوں کے مخلوط دودھ کا حکم ۵۲۷
۳۔ انسانی دودھ کی خرید وفروخت ۵۲۸
۴۔ ملک بینک کے قیام کا شرعی حکم ۵۲۹
ا۔ پہلی رائے ۵۳۰
نقد وتبصرہ ۵۳۱
۲۔ دوسری رائے ۵۳۳
نقد وتبصرہ ۵۳۷
۳۔ تیسری رائے ۵۳۷
ترجیح ۵۳۸
مالِ خبیث: صورتیں اور احکام (Ill-gotten Gains) ۵۴۰
تمہید ۵۴۰
خبث کی اقسام واحکام ۵۴۱
- پہلی قسم: عدمِ ملک کی وجہ سے واقع ہونے والا خبث ۵۴۱
الف۔ بلا اجازت حاصل شدہ مال ۵۴۲
ب۔ اجازت کے ساتھ لیا گیا مال ۵۴۲
شرعی حکم ۵۴۲
ا۔ اصل حکم ۵۴۲
۲۔ انتفاع ۵۴۳
الف۔ مالِ حرام سے خود انتفاع حاصل کرنا ۵۴۳
ب۔ حرام مال اپنی اولاد یا بیوی کو دینا ۵۴۴
۳۔ مالِ حرام کے ذریعے معاملہ کرنا ۵۴۶

الف۔ سارا مال حرام ہو یا حرام و حلال الگ الگ ہو	۵۴۶
ب۔ حلال و حرام مال مخلوط ہو	۵۴۷
◆۔ دوسری قسم: ناجائز عقد کی وجہ سے مال میں واقع ہونے والا خبث	۵۴۷
ا۔ عقد باطل کے ذریعے حاصل شدہ مال	۵۴۷
الف۔ معقود علیہ ''عین'' ہو	۵۴۸
ب۔ معقود علیہ ''منفعت'' ہو	۵۴۹
۲۔ عقدِ فاسد کے ذریعے حاصل شدہ مال	۵۵۱
• خریدار کا حکم	۵۵۲
• فروخت کنندہ کا حکم	۵۵۳
◆۔ حرام مال میراث	۵۵۴
قمار کا تعارف و احکام (Gambling)	**۵۵۸**
◆۔ قمار کا تعارف	۵۵۸
◆۔ قمار کے عناصر	۵۵۹
◆۔ قمار کا شرعی حکم	۵۶۰
◆۔ قمار کے نقصانات	۵۶۱
ا۔ قمار کے شخصی نقصانات	۵۶۱
۲۔ قمار کے معاشرتی نقصانات	۵۶۲
◆۔ قمار کی قسمیں	۵۶۳
◆۔ قمار کی مروجہ صورتیں	۵۶۳
ا۔ کھیلوں میں قمار	۵۶۳
۲۔ لاٹری (Lottery)	۵۶۳
۳۔ اخباری کوپن (Coupon)	۵۶۳

۴۔ بیمہ (Insurance)	۵۶۳
۵۔ مصنوعات (Products) پر انعام	۵۶۳
معاصر اسلامی بینکاری کی شرعی بنیادیں (Islamic Banking)	**۵۶۶**
تمہید	۵۶۶
● - مبحث اول: اسلامی بینکاری کی شرعی بنیادیں	۵۶۹
• پہلا حصہ: ذمہ داری (Liability Side)	۵۶۹
• دوسرا حصہ: اثاثہ جاتی حصہ (Asset Side)	۵۷۰
۱۔ مشارکہ	۵۷۰
۲۔ مضاربہ	۵۷۱
مشارکہ و مضاربہ کے اصول	۵۷۱
شرکت متناقصہ (Diminishing Musharakah)	۵۷۲
۳۔ مرابحہ	۵۷۳
۴۔ اجارہ	۵۷۴
۵۔ سلم	۵۷۵
۶۔ استصناع	۵۷۶
۷۔ حوالہ / سفتجہ	۵۷۷
● - مبحث دوم: مسلمہ اصول اور ان کا انطباق	۵۷۷
• پہلی بحث: بنیادی مسلمہ اصول	۵۷۷
پہلا اصول	۵۷۷
دوسرا اصول	۵۷۹
تیسرا اصول	۵۸۰
چوتھا اصول	۵۸۱

پانچواں اصول	۵۸۲
چھٹا اصول	۵۸۲
٭دوسری بحث: اصولوں کا انطباق و تجزیہ	۵۸۳
ا۔ مشارکہ	۵۸۳
مشارکہ متناقصہ	۵۸۵
۲۔ مضاربہ	۵۸۶
۳۔ مرابحہ	۵۸۷
۴۔ اجارہ	۵۸۸
۵۔ سلم	۵۹۰
۶۔ استصناع	۵۹۱
۷۔ حوالہ	۵۹۱
٭۔ خاتمہ: نتائج و سفارشات	۵۹۲
بینک اکاؤنٹس: تعارف و شرعی حیثیت(Bank Accounts)	**۵۹۵**
تمہید	۵۹۵
٭۔ اکاؤنٹس کی اقتصادی اہمیت	۵۹۵
٭۔ اکاؤنٹس کی اقسام	۵۹۶
ا۔ کرنٹ اکاؤنٹ(Current account)	۵۹۶
۲۔ فکسڈ ڈپازٹ(Fixed Deposit)	۵۹۶
۳۔ سیونگ اکاؤنٹ(Saving account)	۵۹۶
۴۔ لاکرز(Lockers)	۵۹۷
٭۔ فقہی حیثیت	۵۹۷

۱۔ کنونشنل بینکوں کے اکاؤنٹس	۵۹۷
شرعی حکم	۵۹۸
پہلی بات	۵۹۸
دوسری بات	۵۹۹
تیسری بات	۶۰۱
۲۔ غیر سودی بینکوں کے اکاؤنٹس	۶۰۱
چیک کا تعارفی و فقہی جائزہ(Cheque)	**۶۰۲**
● - چیک کا تعارف	۶۰۲
● - چیک کے فریق	۶۰۳
● - چیک کی اقسام	۶۰۳
۱۔ بیئرر چیک(Bearer Cheque)	۶۰۳
۲۔ اوپن چیک(Open Cheque)	۶۰۴
۳۔ آرڈر چیک(Order Cheque)	۶۰۴
۴۔ کراس چیک(Cross Cheque)	۶۰۵
۵۔ مدتی چیک(Posidated Cheque)	۶۰۵
۶۔ رقم کی منتقلی کا چیک(Account Payee Cheque)	۶۰۵
۷۔ سیاحتی چیک(Traveler Cheque)	۶۰۵
۸۔ حوالتی چیک(Cheque for bank Transfer)	۶۰۶
● - چیک اور بل آف ایکسچینج میں فرق	۶۰۶
● - چیک کی شکل	۶۰۶
● - چیک کی فقہی حیثیت	۶۰۷
پہلا حصہ	۶۰۷

دوسرا حصہ ۶۰۷
ا۔پہلی رائے ۶۰۷
۲۔دوسری رائے ۶۰۸
- چیک پر قبضہ کی تحقیق ۶۱۱
ا۔پہلی رائے ۶۱۱
۲۔دوسری رائے ۶۱۲
۳۔تیسری رائے ۶۱۳
پہلی رائے کے دلائل کے جوابات ۶۱۶
وضاحت ۶۱۷
ثمرہ اختلاف ۶۱۷
بینک کارڈز: تعارفی وفقہی جائزہ (Bank Cards) ۶۱۹
- تعارف واہمیت ۶۱۹
- کارڈز کی اقسام ۶۲۰
ا۔ڈیبٹ کارڈ (Debit Card) ۶۲۱
۲۔چارج کارڈ (Charge Card) ۶۲۱
۳۔کریڈٹ کارڈ (Credit Card) ۶۲۱
۴۔اے ٹی ایم کارڈ (ATM Card) ۶۲۲
- کارڈز کے شرکاء ۶۲۲
ا۔عالمی ادارے ۶۲۲
۲۔جاری کنندہ ۶۲۲
۳۔حامل کارڈ ۶۲۲

۴۔ تاجر	۱۲۳
۵۔ تاجر کا بینک	۱۲۳
◆- فقہی حیثیت	۱۲۳
۱۔ وکالہ	۱۲۳
۲۔ کفالہ	۱۲۳
۳۔ حوالہ	۱۲۴
دو باتیں	۱۲۴
◆- کارڈ ہولڈر اور تاجر سے فیس لینا	۱۲۵
۱۔ حامل کارڈ سے فیس لینا	۱۲۵
۱۔ پہلی رائے	۱۲۶
۲۔ دوسری رائے	۱۲۶
۲۔ تاجر سے فیس وصول کرنا	۱۲۶
۱۔ پہلی رائے	۱۲۷
۲۔ دوسری رائے	۱۲۷
۳۔ تیسری رائے	۱۲۷
◆- کارڈز کے استعمال کا شرعی حکم	۱۲۸
نکتہ: سودی معاہدہ	۱۳۰
◆- کارڈز پر ملنے والے ڈسکاؤنٹس کا حکم	۱۳۱
الف- کریڈٹ کارڈ پر ملنے والا ڈسکاؤنٹ	۱۳۱
ب- ڈیبٹ کارڈ پر ملنے والا ڈسکاؤنٹ	۱۳۲
ایل سی: تجارتی و فقہی جائزہ (Letter of Credit)	**۱۳۳**
◆- تعارف و طریقہ کار	۱۳۳

♦-ایل سی کے مراحل	۱۳۶
۱۔ مرحلہ عقد	۱۳۶
۲۔ مرحلہ طلب	۱۳۶
۳۔ مرحلہ اصدار	۱۳۷
۴۔ مرحلہ تنفیذ	۱۳۷
♦-اطراف وفریق	۱۳۷
۱۔ درآمد کنندہ	۱۳۷
۲۔ مصدِر	۱۳۷
۳۔ برآمد کنندہ	۱۳۷
۴۔ برآمد کنندہ کا بینک	۱۳۷
۵۔ مراسل بینک	۱۳۸
♦-ایل سی کی خصوصیات	۱۳۸
♦-ایل سی کی اقسام	۱۳۹
• پہلی تقسیم: امپورٹر کے لحاظ سے	۱۳۹
• دوسری تقسیم: ایکسپورٹر کے لحاظ سے	۱۳۹
• تیسری تقسیم: قوت وضعف کے لحاظ سے	۱۴۰
♦-فقہی حیثیت	۱۴۰
۱۔ ایل سی کے عقد کی فقہی حیثیت	۱۴۰
۲۔ امپورٹر سے لی جانے والی رقم (مارجن) کی حیثیت	۱۴۳
۳۔ مراسل بینک کی حیثیت	۱۴۳
♦-ایل سی پر فیس	۱۴۴
• پہلا حصہ: کفالہ پر فیس لینا	۱۴۴

۱۔ پہلی رائے	۱۴۴
۲۔ دوسری رائے	۱۴۴
جوابات	۱۴۵
۳۔ تیسری رائے	۱۴۶
• دوسرا حصہ: وکالت پر فیس لینا	۱۴۷
• تیسرا حصہ: مراسل بینک کی فیس	۱۴۸
◆ -بذریعہ ایل سی بیع کا حکم	۱۴۸
◆ -شرعی متبادل	۱۴۹
۱۔ درآمد کنندہ کے لیے شرعی متبادل	۱۴۹
الف-شرکت	۱۴۹
ب-مضاربت	۱۵۰
ج-مرابحہ	۱۵۰
د-اجارہ	۱۵۱
۲۔ برآمد کنندہ کے لیے شرعی متبادل	۱۵۱
الف-شپمنٹ سے پہلے	۱۵۱
ب-شپمنٹ کے بعد	۱۵۲
رسک مینجمنٹ: تعارف، شرعی حیثیت، اصول (Risk Management)	**۱۵۳**
◆ -رسک اور رسک مینجمنٹ کا تعارف	۱۵۳
۱۔ رسک	۱۵۳
۲۔ رسک مینجمنٹ	۱۵۳
◆ -رسک مینجمنٹ کے مقاصد	۱۵۵

● ۔رسک مینجمنٹ کی شرعی حیثیت	۶۵۶
۱۔ضمان خطر الطریق	۶۵۷
۲۔ضمان الدرک	۶۵۷
۳۔عاقلہ	۶۵۷
۴۔عقدِ موالات	۶۵۸
۵۔حوالہ وکفالہ	۶۵۸
۶۔رہن	۶۵۸
● ۔رسک مینجمنٹ کے شرعی اصول	۶۵۹
۱۔شرعی حدود کی رعایت	۶۵۹
۲۔نفع، ذمہ داری کے ساتھ	۶۵۹
۳۔تین ناگزیر چیزیں	۶۶۰
۴۔غرر (Uncertainty) سے اجتناب	۶۶۰
قرضوں کی خرید وفروخت (Trading of Debt)	**۶۶۲**
● ۔دین کا تعارف	۶۶۲
۱۔دین کی تعریف	۶۶۲
۲۔دین اور قرض میں فرق	۶۶۳
۳۔دین کے اسباب	۶۶۴
۴۔دین کی خصوصیات	۶۶۵
۵۔دین کی اقسام	۶۶۶
۱۔دین اللہ	۶۶۶
۲۔دین العبد	۶۶۶
۳۔دین حال	۶۶۶

۴۔دین مؤجل	۲۶۶
۵۔دین قوی	۲۶۶
۶۔دین متوسط	۲۶۶
۷۔دین ضعیف	۲۶۷
♦-دیون کی خرید وفروخت کی صورتیں	۲۶۷
♦-فقہاء کی آراء	۲۶۸
پہلی صورت: بیع الدین بالدین ممن علیه الدین	۲۶۸
دوسری صورت: بیع الدین بالدین من غیر من علیه الدین	۲۶۸
دونوں صورتوں کا حکم	۲۶۸
تیسری صورت: بیع الدین بالنقد ممن علیه الدین	۲۶۹
الف- بیع الدین بالعین	۲۶۹
ب- بیع الدین بالنقد	۲۷۰
تیسری صورت کا حکم	۲۷۰
چوتھی صورت: بیع الدین بالنقد من غیر من علیه الدین	۲۷۱
الف- بیع الدین بالعین	۲۷۱
ب- بیع الدین بالنقد	۲۷۱
چوتھی صورت کا حکم	۲۷۱
♦-حوالہ اور بیع میں فرق	۲۷۳
♦-خلاصہ	۲۷۴
♦-جدید صورتیں	۲۷۴
۱۔بانڈز (Bonds)	۲۷۴
۲۔بل آف ایکسچینج (Bill of Exchange)	۲۷۵

۳۔ چیک(Cheque)	۲۷۵
۴۔ پرامیسری نوٹ(Promissory Note)	۲۷۵
۵۔ کریڈٹ کارڈز(Credit Cards)	۲۷۵
۶۔ انوائسز(Invoices)	۲۷۵
۷۔ مستقبل کے سودے(Future Contracts)	۲۷۶
بانڈز: تعارف اور شرعی جائزہ(Bonds)	**۲۷۷**
◆- بانڈز کا تعارف	۲۷۷
◆- بانڈز کی اقسام	۲۷۹
۱۔ کوپن بانڈز(Coupon Bonds)	۲۷۹
۲۔ زیرو کوپن بانڈز(Zero Coupon Bonds)	۲۷۹
۳۔ قابل تحویل بانڈز(Convertible Bonds)	۲۷۹
۴۔ ناقابل تحویل بانڈز(Non-Convertible Bonds)	۲۷۹
۵۔ انعامی بانڈز(Prize Bonds)	۲۷۹
◆- بانڈز اور شیئرز میں فرق	۲۸۰
◆- بانڈز کا شرعی حکم	۲۸۰
◆- حامل بانڈز کے لیے شرعی راہنمائی	۲۸۳
◆- شرعی متبادل	۲۸۳
۱۔ شیئرز کا اجراء	۲۸۳
۲۔ مشارکہ سرٹیفکیٹ	۲۸۳
۳۔ صکوک کا اجراء	۲۸۵
بل آف ایکسچینج: تعارف وشرعی حیثیت(Bill of Exchange)	**۲۸۶**
◆- بل آف ایکسچینج کا تعارف	۲۸۶

۱۔ تعارف	۶۸۶
۲۔ بل آف ایکسچینج کی شرائط	۶۸۸
۳۔ بل آف ایکسچینج کے فوائد	۶۸۹
۴۔ بل آف ایکسچینج کی اقسام	۶۸۹
◆ - بل آف ایکسچینج کی فقہی حیثیت	۶۹۰
۱۔ پہلی رائے	۶۹۰
۲۔ دوسری رائے	۶۹۱
۳۔ تیسری رائے	۶۹۱
◆ - بل آف ایکسچینج کے تبادلہ کا شرعی حکم	۶۹۳
۱۔ برابری کے ساتھ تبادلہ	۶۹۳
۲۔ کٹوتی کے ساتھ تبادلہ	۶۹۳
◆ - تبادلہ کا متبادل	۶۹۴
توثیق الدیون(Debt Guaranteeing)	**۶۹۷**
◆ - تعارف	۶۹۷
◆ - توثیق کی حکمتیں	۶۹۸
◆ - توثیق کا شرعی حکم	۶۹۸
◆ - دین کی وصولی میں موانع / رکاوٹیں	۶۹۹
۱۔ انکار	۶۹۹
۲۔ موت	۷۰۰
۳۔ تنگدستی	۷۰۰
۴۔ ٹال مٹول	۷۰۱
◆ - شرعی حل اور وسائل	۷۰۱

۱۔ وسائلِ اثباتیہ	۷۰۱
الف۔ دستاویز لکھنا	۷۰۲
۱۔ تعارف	۷۰۲
۲۔ دستاویز کی صفات	۷۰۲
۳۔ کیا دستاویز حجت ہے؟	۷۰۳
ب۔ گواہ بنانا	۷۰۴
۲۔ وسائلِ استیثاقیہ	۷۰۴
الف۔ رہن	۷۰۴
۱۔ تعارف	۷۰۵
۲۔ رہن کے بنیادی احکام	۷۰۵
۳۔ رہن کی جدید صورتیں	۷۰۶
ب۔ کفالہ	۷۰۷
۱۔ تعارف	۷۰۷
۲۔ کفالہ کے بنیادی احکام	۷۰۸
ج۔ حوالہ	۷۰۸
◆۔ مسئلہ انظار	۷۰۹
فرنچائز: تعارف، شرعی حیثیت، احکام (Franchise)	۷۱۱
◆۔ فرنچائز کا تعارف	۷۱۱
◆۔ فرنچائز کی ابتداء	۷۱۳
◆۔ فرنچائز معاہدے کی دفعات	۷۱۳
◆۔ فرنچائز کے فوائد	۷۱۵
۱۔ کمپنی کے فوائد	۷۱۵

۲۔ فرنچائز لینے والے کے فوائد ۷۱۵
۳۔ ملک کے فوائد ۷۱۶
◆ ۔ فرنچائز کی اقسام ۷۱۶
۱۔ صنعتی فرنچائز (Manufacturing Franchise) ۷۱۷
۲۔ تقسیم کاری فرنچائز (Distributing Franchise) ۷۱۷
۳۔ بزنس فارمیٹ فرنچائز (Business Format Franchise) ۷۱۷
۴۔ ایجنسی (Agency) ۷۱۸
◆ ۔ فرنچائز کی شرعی حیثیت واحکام ۷۱۸
پہلی صورت کا حکم ۷۱۸
۱۔ دائمی فرنچائز (Perpetual Franchise) ۷۱۹
۲۔ وقتی فرنچائز (Timed Franchise) ۷۱۹
دوسری اور تیسری صورت کا حکم ۷۲۰
چوتھی صورت کا حکم ۷۲۰
آخری بات: مصنوعات کے تناسب سے کمیشن لینا ۷۲۰
تشہیر: تعارف، شرعی حیثیت، حدود (Advertisement) ۷۲۲
◆ ۔ تشہیر کا تعارف ۷۲۲
◆ ۔ تشہیر کی اقسام اور وسائل ۷۲۳
۱۔ تشہیر کی قسام ۷۲۳
الف۔ تعمیم ۷۲۳
ب۔ اسکیم ۷۲۳
۲۔ تشہیر کے وسائل ۷۲۴
◆ ۔ تشہیر کی خصوصیات ۷۲۴

♦- تشہیر کے اقتصادی اثرات	۴۲۵
♦- تشہیر کی شرعی حیثیت	۴۲۶
♦- تشہیر کی حدود شرعیہ	۴۲۸
۱- پروڈکٹس حلال ہوں	۴۲۸
۲- پروڈکٹ کی صفات اور عیوب	۴۲۸
۳- تصاویر اور انسانی اعضاء کی نمائش	۴۲۹
۴- قانون کی پابندی	۴۳۰
۵- منکرات سے احتراز	۴۳۰
۶- مبالغہ آرائی اور فرضی کہانی	۴۳۰
عقود المشتقات کی شرعی حیثیت(Derivatives)	**۴۳۱**
♦- تعارف	۴۳۱
♦- خصوصیات	۴۳۲
♦- بنیادی اقسام	۴۳۲
۱- مستقبل کی بیع(Future Sales)	۴۳۳
۲- خیارات(Option)	۴۳۳
۱- خریدنے کا حق(Call Option)	۴۳۳
۲- بیچنے کا حق(Put Option)	۴۳۴
۳- خریدنے اور بیچنے کا حق(Straddle Option)	۴۳۴
۳- سویپ (Swap)	۴۳۴
♦- شرعی حکم	۴۳۵
♦- شرعی متبادل	۴۳۶

بذریعہ نمونہ خرید وفروخت(Sale by Sample) ۷۳۷
◆۔تعارف ۷۳۷
◆۔شرعی حکم ۷۳۸
◆۔ناجائز صورت کے شرعی متبادل ۷۳۹
۱۔وعدہ ۷۳۹
۲۔بیع سلم ۷۳۹
۳۔استصناع ۷۴۰
◆۔خریدار کا اختیار (خیارِ رؤیت) ۷۴۱
◆۔خریدار اور فروخت کنندہ کا اختلاف ۷۴۳
◆۔ملکی کوالٹی کا مال فراہم کرنا ۷۴۴
◆۔امپورٹڈ نمونہ دکھا کر لوکل مال فراہم کرنا ۷۴۴
پگڑی اور زرِ ضمانت(Key-Money and Security Deposit) ۷۴۶
◆۔پگڑی اور زرِ ضمانت کا تعارف ۷۴۶
◆۔پگڑی کی صورتیں ۷۴۷
◆۔پگڑی اور زرِ ضمانت میں فرق ۷۴۸
◆۔شرعی احکام ۷۴۸
نفع کی تحدید اور مصنوعی طلب(Demand Profit Margin and Artificial) ۷۵۳
◆۔نفع کی تحدید(Profit Margin) ۷۵۳
◆۔تسعیر/نرخ مقرر کرنا(Pricing) ۷۵۶
◆۔مصنوعی طلب(Artificial Demand) ۷۵۷
۱۔نجش(False Bidding) ۷۵۷
۲۔تلقی رکبان یا تلقی جلب ۷۵۹

۳۔ بیع حاضر للبادی ۷۵۹
۴۔ احتکار (Monopoly) ۷۶۰
۵۔ ٹیمن دو حوکہ ۷۶۱
بین الاقوامی تجارت کے احکام (Export and Import) ۷۶۳
-تعارف ۷۶۳
-چھ بنیادی مسائل ۷۶۵
• پہلا مسئلہ: معاملہ کب مکمل ہوگا؟ ۷۶۵
• دوسرا مسئلہ: ڈلیوری والا کس کا وکیل ہے؟ ۷۶۵
• تیسرا مسئلہ: چیز خریدار کے رسک میں کب داخل ہوگی؟ ۷۶۶
• چوتھا مسئلہ: ٹرانسپورٹر سے نقصان لینا ۷۶۷
• پانچواں مسئلہ: ڈلیوری والے کے ہاتھ میں قیمت کی حیثیت ۷۶۷
• چھٹا مسئلہ: ڈلیوری کا طریقہ کار ۷۶۸
نیٹ ورک مارکیٹنگ کی شرعی حیثیت (Network Marketing/MLM) ۷۷۱
-تعارف ۷۷۱
۱۔ پونزی اسکیم (Ponzi Scheme) ۷۷۲
۲۔ پرامڈ اسکیم (Pyramid Scheme) ۷۷۲
۳۔ بائنری سسٹم (Binary System) ۷۷۳
۴۔ میٹرکس سسٹم (Matrix System) ۷۷۳
۵۔ مرحلہ وار نظام (System Stair-step Break-away) ۷۷۳
-خصوصیات ۷۷۳
-اصولی باتیں ۷۷۵
-نیٹ ورک مارکیٹنگ کی شرعی حیثیت ۷۷۶

آن لائن تجارت کی شرعی حیثیت(Drop shipping)	۴۷۹
◆-تعارف	۴۷۹
◆-آن لائن تجارت کی شرعی حیثیت	۴۸۱
ا۔ایجاب وقبول	۴۸۱
۲۔آن لائن تجارت کی بنیادی شرائط	۴۸۲
۳۔متبادل صورتیں	۴۸۳
ا۔پہلی صورت: وعدہ	۴۸۳
۲۔دوسری صورت: بیع سلم	۴۸۴
۳۔تیسری صورت: بروکری	۴۸۵
۴۔ایمازون(Amazone)پر کاروبار	۴۸۵
ا-ہول سیل(Whole Sale)	۴۸۶
۲-پرائیویٹ لیبل(Private Label)	۴۸۶
۳-افیلیٹ مارکیٹنگ(Affiliate Marketing)	۴۸۷
پی ٹی سی کی شرعی حیثیت(Paid to Click)	۴۸۸
◆-تعارف	۴۸۸
◆-شرعی حکم	۴۹۰
مال ودولت اور خرچ: اسلامی تعلیمات	۴۹۲
ا۔مال ودولت کی محبت	۴۹۲
۲۔مال ودولت کی آزادی وخودمختاری	۴۹۳
۳۔مال کمانے کے درجات	۴۹۵
ا۔فرض	۴۹۵

۲۔ مستحب	۷۹۵
۳۔ جائز ومباح	۷۹۵
۴۔ حرام یا مکروہ	۷۹۵
۴۔ دولت سے متعلق چند ہدایات	۷۹۶
پہلی ہدایت	۷۹۶
دوسری ہدایت	۷۹۶
تیسری ہدایت	۷۹۶
چوتھی ہدایت	۷۹۷
۵-مال: کہاں اور کیسے خرچ کیا جائے؟	۷۹۷
الف۔ خرچ کا مقصد کیا ہو؟	۷۹۸
ب۔ خرچ کی جانے والی اشیاء کی اقسام	۷۹۹
ا۔ ضروریات	۷۹۹
۲۔ حاجیات	۷۹۹
۳۔ منفعت کی اشیاء	۸۰۰
۴۔ زینت کی اشیاء	۸۰۰
۵۔ فضول اشیاء	۸۰۰
ج- خرچ میں میانہ روی	۸۰۰
د- عزیز واقارب پر خرچ	۸۰۱
ھ- ضرورت مند افراد پر خرچ	۸۰۲
و- خرچ کے ذریعے آخرت سوارنا	۸۰۲
معاشی منصوبہ بندی اور اسلام (Economic Planning)	**۸۰۳**
● - تعارف	۸۰۳

معاشی منصوبہ بندی	۸۰۴
معاشی منصوبہ بندی کے مقاصد	۸۰۵
معاشی منصوبہ بندی کے فوائد	۸۰۵
◆ - اسلامی تعلیمات	۸۰۶
پیدائش دولت کی منصوبہ بندی	۸۰۶
تبادلہ دولت کی منصوبہ بندی	۸۰۷
تقسیم دولت کی منصوبہ بندی	۸۰۷
خرچ کی منصوبہ بندی	۸۰۸
بے روزگاری اور اسلام	**۸۰۹**
◆ - بے روزگاری کے اسباب	۸۰۹
◆ - نقصانات	۸۱۰
◆ - بے روزگاری کا اسلامی حل	۸۱۱
۱۔ اقدامی حل	۸۱۱
۲۔ دفاعی حل	۸۱۲
مصادر و مراجع	**۸۱۴**

تیسرا باب

تبرعات کے معاملات

(Gratuitous Contracts)

بابِ سوم میں تبرعات یعنی ''عقود التبرع'' کا تعارف اور اصولی مباحث بیان کیے جائیں گے۔ اگرچہ تبرعات کا تعلق معاوضات مالیہ کے ساتھ نہیں ہے، لیکن ان میں سے چند عقود محض اسقاطات یا کسی حق کو معاف کرنے کی قبیل سے نہیں ہیں، بلکہ وہ عقود بھی درحقیقت ''تملیکات'' (کسی کو کسی چیز یا منفعت کا مالک بنانے) میں ہی آتے ہیں، اس لیے تبرعات کے اہم عقود کے بنیادی اور اصولی مباحث اور چند اہم جدید صورتوں کو بیان کرنا ضروری ہے۔ عقودِ تبرع کے اصول واحکام سے قبل بطورِ تمہید تبرعات کا تعارف پیش کیا جائے گا، اس کے بعد ہبہ، عاریت اور قرض کے اصول واحکام کو بیان کیا جائے گا۔

اس باب کا خاکہ مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ تبرعات کا تعارف

۲۔ ہبہ کے اصولی مباحث واحکام

۳۔ عاریت کے اصولی مباحث واحکام

۴۔ قرض کے اصولی مباحث واحکام

ا۔ تبرعات کا تعارف

(Gratuitous Contracts)

تبرعات کے تعارف کے لیے مندرجہ ذیل نکات سمجھنا ضروری ہیں:

ا۔ عقودِ تبرع کا تعارف ۲۔ عقودِ تبرع کی مشروعیت

۳۔ عقودِ تبرع کی خصوصیات ۴۔ عقودِ تبرع کی اقسام

ا۔ عقودِ تبرع کا تعارف

تبرع کا لفظ ''برع'' سے بنا ہے، جس کا معنی لائق وفائق ہونے اور ماہر ہونے کے آتے ہیں۔ اسی طرح اس کے معنی نفل اور کسی چیز کا بدل وعوض طلب کیے بغیر خرچ کرنے کے بھی آتے ہیں۔

علامہ ابن فارس لکھتے ہیں:

(برع) الباء والراء والعين أصلان: أحدهما التطوع بالشيء من غير وجوب. والآخر التبريز والفضل.[۱]

با، راء، عین کے دو اصول ہیں: ایک یہ کہ غیر واجب چیز کو نفلی طور پر دینا، دوسرا مہارت اور فضل۔

جہاں تک تبرع کا فقہی واصطلاحی مفہوم ہے تو وہ بھی لغوی معنی کے قریب ہی ہے۔ فقہاء اس لفظ کو عموماً ان عقود کے لیے استعمال کرتے ہیں جن میں ایک فریق دوسرے کو کوئی چیز یا منفعت بلاعوض دیتا ہے اور یہ دینے والے پر واجب بھی نہیں ہوتا، بلکہ وہ ثواب واحسان کے طور پر دیتا ہے۔ چنانچہ تبرع کی سب سے جامع اور مختصر تعریف یوں کی گئی ہے:

التبرع : العطاء بغير مقابل.[۲]

بلاعوض کوئی چیز دینا۔

شیخ مصطفی الزرقاء نے عقدِ تبرع کی تعریف اس طرح کی ہے:

عقود التبرعات: وهي التي تقوم على أساس المنحة أو المعونة من أحد الطرفين

[۱] معجم مقاييس اللغة ١/ ٢٢١

[۲] معجم لغة الفقهاء ١/ ١٤٢

للآخر، كالهبة والإعارة.[1]

عقود تبرع وہ معاملات ہیں جو ایک فریق کے دوسرے کے ساتھ معاونت اور عطیہ کی بنیاد پر قائم ہیں۔ جیسے گفٹ اور عاریت۔

موسوعہ فقہیہ کویتیہ میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

بذل المكلف مالا أو منفعة لغيره في الحال أو المآل بلا عوض بقصد البر والمعروف غالبا.[2]

مکلف کا کسی دوسرے شخص کو بلا عوض کوئی مال یا منفعت دینا، فی الفور ہو یا مستقبل کی طرف منسوب کر کے دیا جائے، اور عموماً اس کا مقصد نیکی اور کسی کے ساتھ بھلائی کرنا ہوتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ عقدِ تبرع، خواہ کسی شخص کا انفرادی عمل ہو یا دو فریقین کریں، اس میں دو بنیادی عنصر ہوتے ہیں:

۱۔مادی عنصر: اس کا مطلب یہ ہے کہ عقدِ تبرع میں چیز یا منفعت دینے والا کسی مادی عوض اور بدلہ کو طلب اور وصول نہیں کرتا۔

۲۔ معنوی عنصر: اس سے مراد دینے والے کی نیت ہے، کہ دینے والا نیکی اور احسان کے طور پر کسی کو بلا عوض چیز دیتا ہے۔ اسی میں شفقتِ پدری یا دنیوی تعلقات کو استوار کرنا بھی آتا ہے۔ اور اگر تبرع و بلا عوض چیز دینے سے کسی کا مقصد شکریہ اور تعریف وغیرہ کا حصول ہو تو بھی یہ تبرع ہی ہے، کیونکہ تبرع میں جو عوض نہیں لیا جاتا، اس سے مادی عوض مراد ہے، کسی معنوی عوض (شکر اور تعریف وغیرہ) سے ''عقدِ تبرع'' کی تکییف میں کوئی فرق نہیں آتا، بلکہ اس پر تبرع ہی کے احکام لاگو ہوتے ہیں۔

۲۔ عقودِ تبرع کی مشروعیت

قرآن وسنت میں کئی مقامات پر نیکی کی ترغیب، خیر کے کاموں میں معاونت اور لوگوں کے ساتھ احسان واچھائی کرنے کا حکم ملا ہے۔ انہی آیات واحادیث سے عقودِ تبرع کی تمام اقسام کا مجموعی طور پر ثبوت بھی ملتا ہے، کیونکہ عقودِ تبرع بھی درحقیقت نیکی واحسان کی بنیاد پر قائم ہونے والے معاملات ہیں۔ اس کے علاوہ ہر عقدِ تبرع (مثلاً ہبہ، عاریت وغیرہ)

---

[1] المدخل الفقهي العام ١/ ٦٤٠

[2] الموسوعة الفقهية الكويتية ١٠/ ٦٥

کے ثبوت پر فقہاء نے الگ اور مستقل طور پر بھی دلائل ذکر کیے ہیں۔ یہاں صرف ایک مشہور حدیث ذکر کرلینا کافی ہے۔ سرورِ دوعالم ﷺ کا ارشاد ہے:

تَهَادَوْا تَحَابُّوا.[1]

ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو، اس سے تمہارے درمیان محبت پیدا ہوگی۔

۳۔ عقودِ تبرع کی خصوصیات

تبرعات کے معاملات میں چند خصوصیات مشترک طور پر پائی جاتی ہیں، یہاں ان کا مختصر تذکرہ کیا جائے گا، تاکہ تبرعات اور دیگر معاملات کے درمیان بنیادی واصولی فرق ہوجائے۔ یہ خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ تبرعات کی بنیاد ''تسامح'' اور چشم پوشی پر ہے، اسی لیے فقہاء نے تبرعات میں غرر کثیر اور جہالت کی گنجائش دی ہے، کیونکہ اس میں باہمی نزاع کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ اسی لیے کسی مجہول ونامعلوم شخص کے لیے وصیت کو جائز قرار دیا گیا ہے۔[2]

بعض معاصر علماء نے یہ قاعدہ لکھا ہے:

يغتفر في التبرعات ما لايغتفر في المعاوضات.[3]

اگرچہ کئی تبرعات میں اس ضابطہ (جہالت کی گنجائش) کو اختیار کیا گیا ہے، لیکن یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے، بلکہ جہاں جہالت کی وجہ سے باہمی نزاع کا اندیشہ ہو، وہاں جہالت اور غرر کی اجازت نہیں دی گئی۔

۲۔ معاوضات مالیہ اور لین دین کے معاملات میں اگر فاسد شرط لگادی جائے تو اس کی وجہ سے عقد فاسد ہوجاتا ہے، لیکن تبرعات کی خاصیت یہ ہے کہ شرطِ فاسد لگانے کی وجہ سے تبرع کا عقد فاسد نہیں ہوتا، بلکہ عقد اپنی جگہ درست رہتا ہے، جبکہ شرطِ فاسد لغو قرار دیا جاتا ہے۔ علامہ شامی نے اس سلسلے میں یہ ضابطہ لکھا ہے کہ:

وَالْأَصْلُ فِيهِ أَنَّ كُلَّ مَا كَانَ مُبَادَلَةَ مَالٍ بِمَالٍ يَبْطُلُ بِالشُّرُوطِ الْفَاسِدَةِ لَا مَا كَانَ مُبَادَلَةَ مَالٍ بِغَيْرِ مَالٍ أَوْ كَانَ مِنَ التَّبَرُّعَاتِ.[4]

---

[1] الأدب المفرد ص:٥٩٤، حديث نمبر:٥٧

[2] الدر المختار وحاشية ابن عابدين ٦/ ٦٤٩

[3] أوفوا بالعقود، ص:٥٩

[4] حاشية ابن عابدين ٥/ ١٦٩

اصول یہ ہے کہ ہر وہ معاملہ جس میں مال کا تبادلہ مال کے ساتھ ہو رہا ہو وہ شروطِ فاسدہ کی وجہ سے فاسد ہو جاتا ہے، نہ کہ وہ معاملہ جس میں مال کا تبادلہ کسی غیر مال کے ساتھ ہو یا وہ عقد تبرعات میں سے ہو۔

۳۔ تبرعات کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ ایسے معاملات فقط زبانی ایجاب و قبول سے تام و مکمل نہیں ہوتے، بلکہ ان کے مکمل ہونے کے لیے باقاعدہ قبضہ بھی ضروری ہوتا ہے۔ اگر کسی نے صرف زبانی طور پر کسی چیز کو گفٹ کے طور پر دینے کا عقدِ تبرع کر لیا تو وہ قبضہ سے پہلے اس سے رجوع کر سکتا ہے، جبکہ دیگر معاملات صرف ایجاب و قبول سے ہی مکمل ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تبرعات کے معاملات کوئی لازم اور واجب نہیں ہوتے، بلکہ انسان احسان اور نیکی کے طور پر ایسا معاملہ کرتا ہے، لہذا اگر صرف زبانی ایجاب سے ہی اس طرح کے معاملات کو مکمل و لازم قرار دیا گیا تو اس سے تبرع کرنے والے کے لیے ایک قسم کی تکلیف و ضرر ہے۔ اس کو فقہاء نے ایک قاعدہ کی شکل میں یوں بیان کیا ہے:

لَا يَتِمُّ التَّبَرُّعُ إِلَّا بِقَبْضٍ۔ [1]

۴۔ تبرعات کے لیے اہلیتِ کاملہ (یعنی عقلمند و بالغ ہونا) ضروری ہے، جس انسان میں کامل اہلیت نہ ہو، وہ عقدِ تبرع نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس دیگر معاملات کے لیے ناقص اہلیت بھی کافی ہوتی ہے، جیسے اگر کوئی نابالغ بچہ سمجھ دار ہے تو وہ اپنے ولی کی اجازت سے تجارت وغیرہ کر سکتا ہے، لیکن وہ عقدِ تبرع (کسی کو قرض یا کوئی چیز گفٹ) نہیں کر سکتا۔ بلکہ کسی بچے کا ولی بھی بچے کے مال سے کوئی چیز کسی کو تبرع و احسان کے طور پر نہیں دے سکتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بچے کے مال سے کوئی چیز تبرع کے طور پر دینا بچے کے لیے مضر ہے۔ [2]

۵۔ تبرعات کی ترغیب پر شریعت میں کئی نصوص موجود ہیں، اس لیے یہ شریعت کی نظر میں معروف، نیکی اور اچھے عقود ہیں، کیونکہ اس سے ثواب کے ساتھ ساتھ دنیوی محبت و بھائی چارہ بھی پیدا ہوتا ہے۔

۴۔ عقودِ تبرع کی اقسام

فقہاء نے تبرعات کے تحت کئی عقود کا تذکرہ کیا ہے، تاہم ان میں سے پانچ عقود زیادہ مشہور ہیں، وہ پانچ عقود مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ وہ عقد جس میں انسان باقاعدہ اپنی کوئی چیز/عین کسی کو بلا عوض گفٹ کرتا ہے۔ اس کو "ہبہ" کہتے ہیں۔

---

[1] مجلة الأحكام العدلية، ص: ٢٢ (المَادَّةُ ٥٧)

[2] كشف الأسرار عن أصول فخر الإسلام البزدوي ٤/ ٣٦١

۲۔ وہ عقد جس میں ایک انسان دوسرے کو اپنی چیز کا مالک نہیں بناتا، بلکہ عارضی طور پر صرف چند دن کے استعمال کے لیے بلاعوض دیتا ہے، یعنی اپنی مملوکہ چیز کی منفعت کسی کو دینا۔ اس کو فقہ میں "عاریت" کہتے ہیں۔

۳۔ وہ عقد جس میں ایک انسان دوسرے کو نقود/کرنسی یا مثلیات (جیسے گندم وغیرہ) کچھ عرصہ کے لیے مفت دے کر بعد میں واپس لے لیتا ہے۔ اس کو "قرض" کہتے ہیں۔

۴۔ وہ عقد جس میں ایک انسان اپنی مملوکہ چیز کسی کو بلاعوض دیتا ہے، لیکن اس کی نسبت اپنی موت کے بعد کے وقت کی طرف کر دیتا ہے۔ اس کو "وصیت" کہتے ہیں۔

۵۔ وہ عقد جس میں ایک انسان اپنی کوئی چیز خیر کے کام اور عوام الناس کی بھلائی کے لیے دیتا ہے۔ اس کو "وقف" کہتے ہیں۔

ان اقسام کو یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ عقودِ تبرع کی دو بنیادی تقسیمات ہیں، ہر تقسیم کے تحت چند اقسام ہیں:

۱۔ وہ عقود جو ابتداء اور انتہاء دونوں حالتوں میں مفت اور تبرع ہی ہیں۔ اس میں ہبہ، وقف اور وصیت آتے ہیں۔

۲۔ وہ عقود جو ابتداء میں تو تبرع ہوتے ہیں، لیکن انتہاء میں وہ عقدِ معاوضہ ہے، کیونکہ ان میں چیز واپس لی جاتی ہے۔ اس میں قرض اور عاریت کا عقد آتا ہے۔

عقودِ تبرع کی اقسام

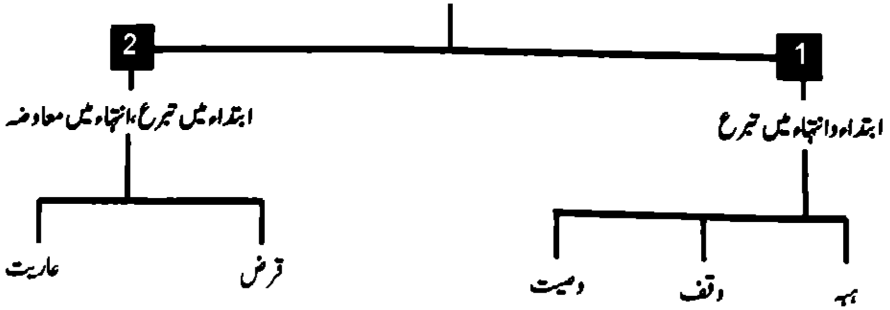

یہاں عقود تبرع کی تین اقسام (ہبہ، عاریت، قرض) کے اصولی مباحث اور احکام پر مختصر گفتگو کی جائے گی، کیونکہ ان کا معاملات کے ساتھ خاص اور گہرا تعلق ہے، جہاں تک بقیہ دو اقسام (وصیت، وقف) کی بات ہے تو ان کا موضوع اور احکام کچھ مختلف ہیں اور تفصیل طلب بھی ہیں، اسی لیے علماء نے ان پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، لہٰذا ان کے لیے مندرجہ ذیل کتب کا مطالعہ مفید رہے گا:

۱۔ وصیت کے احکام کے لیے عمومی طور پر فقہی کتب اور خاص کر شیخ علی الخفیف کی کتاب ''أحكام الوصية
بحوث مقارنة'' اہم ہے۔ اس کتاب میں وصیت کے اصول واحکام کی ہر جہت کو تفصیل اور عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔

۲۔ وقف کے اصول واحکام کے لیے اردو میں ڈاکٹر خلیل احمد اعظمی کی کتاب ''اسلام کا نظام اوقاف'' ایک بہتر اور جامع کتاب ہے۔ عربی میں شیخ مصطفی الزرقاء کی کتاب ''أحكام الأوقاف''، ڈاکٹر محمد عبید عبد اللہ الکبیسی کی کتاب ''أحكام الوقف في الشريعة الإسلامية'' اور شیخ محمد بن احمد کی کتاب ''الوقف في الشريعة الإسلامية ودوره في تنمية المجتمع'' اہم ہے۔

۲۔ ہبہ کے اصولی مباحث واحکام

(Gift)

ہبہ کے اصولی مباحث واحکام کو مندرجہ ذیل سات نکات میں بیان کیا جائے گا:

۱۔ ہبہ کا تعارف ۲۔ ہبہ کا حکم

۳۔ ہبہ کی شرائط ۴۔ ہبہ کی اہم اقسام

۵۔ رجوع اور موانعِ رجوع ۶۔ ہبہ کے عمومی ضوابط

۷۔ ہبہ کی جدید صورتیں

۱۔ ہبہ کا تعارف

ہبہ کے لغوی معنی گفٹ اور ایسا عطیہ کے ہیں جو ہر قسم کے عوض اور غرض سے خالی ہو، خواہ کسی بھی شکل میں ہو۔[۱] فقہی اصطلاح میں ہبہ کی تعریف یوں کی گئی ہے:

تَمْلِيكُ الْعَيْنِ مَجَّانًا.[۲]

کسی کو کسی چیز کا مفت مالک بنادینا۔

مجلہ الاحکام العدلیہ میں ہبہ کی تعریف کی مزید وضاحت کی گئی ہے:

الْهِبَةُ هِيَ تَمْلِيكُ مَالٍ لِآخَرَ بِلَا عِوَضٍ، وَيُقَالُ لِفَاعِلِهِ: وَاهِبٌ، وَلِذَلِكَ الْمَالُ مَوْهُوبٌ وَلِمَنْ قَبِلَهُ مَوْهُوبٌ لَهُ.[۳]

ہبہ کسی دوسرے کو بلاعوض مال کے مالک بنانے کا نام ہے۔ ہبہ کرنے والے کو "واہب"، اس مال کو "موہوب" اور جس کو مال ہبہ کیا جائے اس کو "موہوب لہ" کہتے ہیں۔

---

[۱] لسان العرب ص: ۸۰۳/۱

[۲] الدر المختار ۶۸۷/۵

[۳] مجلة الأحكام العدلية، ص: ۱۶۱ (المادة ۸۳۳)

جب کوئی شخص کسی دوسرے کو ثواب کی نیت سے بلا عوض کوئی چیز/مال دیتا ہے تو اس کو "**صدقہ**" کہتے ہیں۔ اور اگر کسی کی عزت، احترام اور اکرام مقصود ہو اور اس نیت سے کسی کو کوئی چیز مفت/گفٹ دی جائے تو اس کو "**ہدیہ**" کہتے ہیں۔ فقہ میں ایک اور لفظ "**اباحت**" بھی استعمال ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو اپنے مال کے بلاعوض استعمال کی اجازت دی جائے، یعنی اس میں تملیک ضروری نہیں ہے، جبکہ ہبہ میں باقاعدہ تملیک ہوتی ہے اور کسی کو مالک بنایا جاتا ہے۔[1]

۲۔ ہبہ کا حکم

ہبہ عام احوال میں مستحب ہے، تاہم ہبہ کا حکم حالات واحوال کے مختلف ہونے سے مختلف ہو سکتا ہے، جس کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:

۱۔ اگر ہبہ کا مقصد باہمی محبت، اکرام اور بھائی چارہ ہو تو ایسا ہبہ نہ صرف جائز، بلکہ مستحب اور بہتر بھی ہے۔

۲۔ اگر ہبہ میں کوئی حرام عنصر شامل ہو جائے تو ایسا ہبہ دینے والے اور لینے والے دونوں کے لیے حرام ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص کسی افسر کو اس لیے ہبہ/گفٹ دیتا ہے تاکہ وہ کسی دوسرے پر ظلم کرے۔ یا ایک شخص دوسرے کو اسلحہ گفٹ کرتا ہے تاکہ وہ کسی کو قتل کر دے۔ یا کوئی شخص کسی کو شراب یا دیگر نشہ آور چیزیں استعمال کے لیے گفٹ کرتا ہے تو یہ سب صورتیں حرام ہیں۔

۳۔ اگر ہبہ/گفٹ بطورِ رشوت دیا جائے تو یہ بھی جائز نہیں ہے، لیکن رشوت کا حکم بھی مختلف احوال میں مختلف ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص کسی کے ظلم سے بچنے کے لیے رشوت دیتا ہے یا اپنے ایسے جائز حق کی وصولی کے لیے رشوت دیتا ہے جو رشوت کے بغیر حاصل نہ ہو سکتا ہو تو ایسی رشوت دینے والے کے لیے جائز ہے، اس کو کوئی گناہ نہیں ہوگا، لیکن لینے والے کے لیے حرام ہے۔ اس کے علاوہ رشوت کی کوئی صورت جائز نہیں ہے۔[2]

علامہ شربینی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

> وانعقد الإجماع على استحباب الهبة بجميع أنواعها. قال الله تعالى: { وتعاونوا على البر والتقوى } والهبة بر، ولأنها سبب التواد والتحاب. قال -صلى الله عليه وسلم-: تهادوا تحابوا. وقبل ﷺ هدية المقوقس الكافر، وقبل هدية النجاشي

---

[1] مجلة الأحكام العدلية (المادّة ٨٣٤) و (المادّة ٨٣٥) و (المادّة ٨٣٦)

[2] الدر المختار وحاشية ابن عابدين ٥/٣٦٢

المسلم وتصرف فيها وهاداه أيضا.

وقد يعرض لها أسباب تخرجها عن ذلك، منها الهبة لأرباب الولايات والعمال فإنه يحرم عليهم قبول الهدية من أهل ولاياتهم ممن ليست له عادة بذلك قبل الولاية كما هو محرر في محله، ومنها ما لو كان المتهب يستعين بذلك على معصية.[1]

ہبہ کی تمام انواع کے مستحب ہونے پر علماء کا اجماع ہے۔اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ: (نیکی اور تقوی کے کاموں میں ایک دوسرے کی معاونت کرو)اور ہبہ بھی نیکی ہے۔اور ہبہ اس لیے بھی مستحب ہے، کیونکہ یہ باہمی انس ومحبت کا سبب ہے۔ سرورِ دوعالم ﷺ کا ارشاد ہے کہ: (ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو،اس سے تمہارے درمیان محبت پیدا ہوگی)اور سرورِ دوعالم ﷺ نے مقوقس کافر کا ہدیہ قبول کیا تھا،اسی طرح نجاشی مسلم کا ہدیہ قبول کر کے اس میں تصرف کیا تھااور اسے بھی ہدیہ دیا تھا۔

البتہ کبھی ہبہ میں ایسے اسباب پیش آسکتے ہیں، جن کی وجہ سے ہبہ، جواز کے دائرے سے نکل جاتا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اربابِ اختیار اور عمال کو ہبہ کیا جائے تو ایسے ہبہ کی عادت اگر ان کے عہدہ سے قبل نہ تھی تو ان کے لیے ہبہ لینا حرام ہے۔اسی طرح اگر ہبہ کرنے والا ہبہ کے ذریعے کسی گناہ کے کام میں معاونت طلب کرے تو ایسا ہبہ بھی حرام ہے۔

۳۔ہبہ کی شرائط

ہبہ کے صحیح ہونے کے لیے فقہاء نے کئی قسم کی شرائط ذکر کی ہیں، مثلاً فقہاء حنابلہ کی کتابوں میں ہبہ کی تقریبا گیارہ شرائط کا تذکرہ ملتا ہے۔فقہاء حنفیہ نے جو شرائط لکھی ہیں،ان کا خلاصہ چار اقسام کی شرائط میں بیان کیا جاسکتا ہے:

۱۔الفاظِ ہبہ کی شرائط

۲۔واہب(ہبہ کرنے والے)کی شرائط

۳۔موہوب لہ(جس کو ہبہ کیا جائے اس)کی شرائط

۴۔موہوب(جو چیز ہبہ کی جائے اس)کی شرائط

---

[1] مغني المحتاج ۲/ ۳۹٦

ہبہ کی شرائط

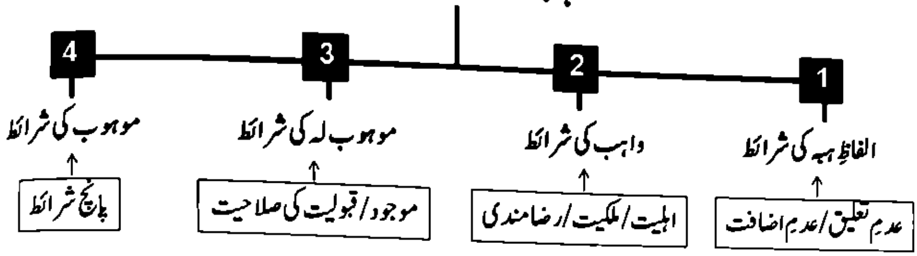

ا۔الفاظِ ہبہ کی شرائط:

چونکہ کسی کو کوئی چیز ہبہ/گفٹ کرنا درحقیقت تملیک ہے، اس لیے تملیک کی وہ دو بنیادی شرائط جن کا تعلق الفاظ کے ساتھ ہیں، یہاں بھی ضروری ہیں:

ا۔ہبہ کو کسی ایسی شرط/واقعہ پر معلق نہ کیا جائے جس کا وجود میں آنا اور نہ آنا دونوں ممکن ہو۔ جیسے کوئی شخص کسی کو یوں کہہ دے کہ: اگر تم امتحان میں کامیاب ہوگئے تو میری یہ گھڑی بطورِ گفٹ تمہاری ہے۔ ایسا ہبہ منعقد نہیں ہوتا۔

۲۔ہبہ کے الفاظ کی دوسری بنیادی شرط یہ ہے کہ ہبہ کو مستقبل کی کسی تاریخ کی طرف منسوب نہ کیا جائے۔ مثلاً کوئی شخص کسی کو یوں کہہ دے کہ: یہ چیز میں نے آپ کو اگلے ماہ کی یکم تاریخ کو گفٹ کر دی۔ ایسا ہبہ بھی منعقد نہیں ہوتا۔

۲۔واہب (ہبہ کرنے والے) کی شرائط:

ہبہ کرنے والے کے لیے مندرجہ ذیل شرائط ضروری ہیں:

ا۔ہبہ کرنے والا تبرع کی اہلیت رکھتا ہو۔ بالفاظِ دیگر وہ عقلمند ہو، بالغ ہو، اور آزاد ہو۔ لہذا پاگل کا ہبہ، بچے کا ہبہ اور غلام کا ہبہ درست نہیں ہے۔

۲۔ہبہ کرنے والا جس چیز کو ہبہ کر رہا ہے، وہ اس چیز کا مالک بھی ہو۔ کسی ایسی چیز کو انسان ہبہ نہیں کر سکتا، جس کا وہ مالک ہی نہ ہو۔

۳۔ہبہ کرنے والا اپنی خوشی، رضا اور اختیار سے ہبہ کرے۔ اگر کسی پر جبر و زبردستی کے ذریعے کوئی چیز ہبہ کرادی گئی تو ایسا ہبہ بھی درست نہیں ہے۔

۳۔موہوب لہ (جس کو ہبہ کیا جائے اس) کی شرائط:

جس شخص کو کوئی چیز ہبہ اور گفٹ کی جارہی ہے، اس کے لیے مندرجہ ذیل شرائط ہیں:

ا۔ہبہ کرتے وقت وہ شخص موجود ہو اور ہبہ کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ لہذا جنین (پیٹ میں موجود

بچے) کو ولادت سے قبل کوئی چیز گفٹ کرنا ہبہ نہیں ہے۔ اسی طرح کسی مرحوم شخص کو کوئی چیز ہبہ نہیں کی جاسکتی۔

۲۔ جس کو کوئی چیز ہبہ کی جارہی ہے، اس کا عقلمند ہونا یا بالغ ہونا یا آزاد ہونا ضروری نہیں ہے، لہٰذا اگر کسی نے کسی مجنون یا بچے کو یا غلام کو کوئی چیز بطورِ ہبہ دے دی تو یہ جائز ہے، ان کی طرف سے ان کا ولی اور آقا قبضہ کرے گا۔

۴۔ موہوب (جو چیز ہبہ کی جائے اس) کی شرائط:

جو چیز کسی کو بطورِ ہبہ / گفٹ دی جارہی ہے، اس کے لیے مندرجہ ذیل شرائط ہیں:

۱۔ یہ ضروری ہے کہ جو چیز ہبہ میں دی جارہی ہے، وہ ہبہ کرتے وقت موجود بھی ہو۔ اگر ہبہ کرتے وقت وہ چیز موجود نہ ہو تو ایسا ہبہ درست نہیں ہے۔ مثلاً کوئی شخص کسی کو یوں کہہ دے کہ: اس موسم میں میرے باغ کے فلاں درخت پر جو پھل لگیں گے، وہ میں نے آپ کو ہبہ کردیے۔ یہ ہبہ درست نہیں ہے۔ البتہ جب پھل نکل آئے اور پھر پھل توڑ کر اسے دے دیے تو اس وقت ہبہ ہو جائے گا۔

۲۔ جو چیز ہبہ میں دی جارہی ہے وہ مال اور متقوم ہو۔ ایسی چیز نہ ہو جو عرف یا شریعت میں مال ہی نہ ہو، جیسے شراب وغیرہ۔

۳۔ جو چیز ہبہ میں دی جارہی ہے وہ مباح عام اشیاء میں سے بھی نہ ہو اور ہبہ کرنے والے کی ملکیت میں ہو۔ مثلاً اگر کسی نے دوسرے کو دریا کا پانی یا کوئی شکار (شکار کرنے سے قبل) ہبہ کردیا تو یہ ہبہ اس وقت منعقد نہ ہوگا، البتہ جب پانی کو کسی برتن میں جمع کرکے یا جانور شکار کرکے ہبہ کردے تو یہ درست ہے۔

۴۔ جو چیز ہبہ میں دی جارہی ہے وہ مشاع و مشترک نہ ہو، بلکہ جدا، الگ اور تقسیم شدہ ہو۔ حنفیہ کے ہاں جو چیز قابلِ تقسیم ہے، اس کا کوئی غیر متعین حصہ کسی کو بطورِ ہبہ دینا درست نہیں ہے، بلکہ اس کو تقسیم کرکے باقاعدہ الگ کرکے ہبہ کرنے سے ہی ہبہ منعقد ہوگا۔ لہٰذا اگر کسی نے اپنی دس کنال زمین میں سے کوئی ایک غیر متعین کنال زمین اپنے کسی بیٹے کو ہبہ / گفٹ کردی تو یہ ہبہ منعقد نہیں ہوگا، لیکن جب اس کو تقسیم کرکے اس ایک کنال کو الگ کرکے بیٹے کے حوالے کردیا جائے گا تو اس وقت ہبہ مکمل ہو جائے گا۔ البتہ اگر کوئی ایسی چیز ہے جو قابلِ تقسیم ہی نہیں ہے تو اس کا کوئی مشترک اور غیر متعین حصہ بطورِ ہبہ دینا درست ہے، مثلاً کسی نے اپنی گاڑی کا آدھا حصہ کسی کو گفٹ کردیا تو یہ ہبہ منعقد ہو جائے گا۔

۵۔ جو چیز بطورِ ہبہ دی جارہی ہے وہ بالکل الگ اور جدا ہو اور ہبہ کرنے والے کی دیگر مملوکہ چیزوں سے الگ ہو۔ بالفاظِ دیگر ہبہ کے مکمل ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ جس شخص کو چیز بطورِ ہبہ دی جارہی ہے، وہ اس چیز پر قبضہ کرلے، قبضہ سے پہلے ہبہ منعقد تو ہوتا ہے، لیکن تام و مکمل نہیں ہوتا، اور قبضہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ چیز بالکل الگ

ہو، تاکہ اس پر قبضہ ہو سکے۔ مثلاً اگر کسی نے دوسرے کو اپنی زمین بطورِ ہبہ دے دی، لیکن اس زمین میں ہبہ کرنے والے کی فصل/کھیتی لگی ہوئی ہے تو یہ ہبہ تام و مکمل نہیں ہوگا، بلکہ یا تو اس فصل کو بھی ہبہ کیا جائے یا فصل کو الگ کرکے زمین اس شخص کے مالکانہ تصرف اور قبضہ میں دے دے تو ہبہ مکمل ہو جائے گا۔[1]

۴۔ ہبہ کی اہم اقسام

اس عنوان کے تحت ہبہ کی ان اہم اقسام اور صورتوں کا مختصر تعارف اور احکام بیان کرنا مقصود ہے جو فقہی کتابوں میں ہبہ کی بحث میں مختلف مقامات پر ذکر کی گئی ہیں۔ یہ کل آٹھ (۸) اقسام ہیں:

۱۔ ہبۃ العین	۲۔ ہبۃ المنافع	۳۔ ہبہ معنوی	۴۔ دین کا ہبہ
۵۔ ہبۃ المشاع	۶۔ ہبۃ المجہول	۷۔ مریض کا ہبہ	۸۔ ہبۃ معوضہ

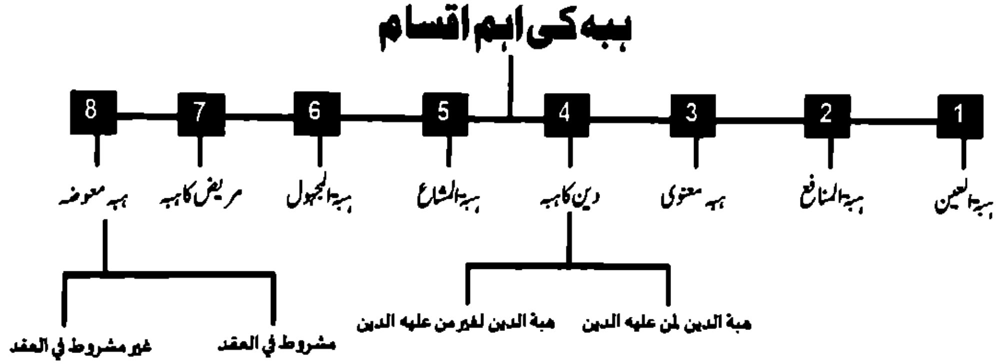

۱۔ ہبۃ العین:

اس سے مراد ان مادی اور حسی اشیاء کا ہبہ ہے جن کی باقاعدہ حقیقی قیمت ہوتی ہے۔ اس میں ہر چیز داخل ہے جس کا حسی وجود ہو اور اس کی خرید و فروخت کی جاسکتی ہو۔ اس کی مثالوں میں غیر منقولی اشیاء بھی داخل ہیں، جیسے زمین اور منقولی اشیاء بھی، جیسے گاڑی اور دیگر ہبہ/گفٹ کی چیزیں۔ اس کے لیے فقہاء نے ایک ضابطہ بھی لکھا ہے کہ:

ما جاز بيعه جازت هبته، وما لا فلا.[2]

ہر وہ چیز جس کی خرید و فروخت جائز ہے، اس کا ہبہ اور گفٹ کرنا بھی جائز ہے، ورنہ نہیں۔

ہبہ کی اس قسم کی وہی شرائط ہیں جو پہلے بیان ہو چکی ہیں اور اس کے احکام بھی ہبہ کے عمومی احکام ہیں، اس کے

---

[1] درر الحكام في شرح مجلة الأحكام ٢/ ٣٨٧، بدائع الصنائع ٦/ ١١٨

[2] المنثور في القواعد ٣/ ١٣٨

کوئی الگ یا خاص احکام نہیں ہیں۔

۲۔ہبۃ المنافع:

اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی انسان اپنی خدمات یا اپنی کسی مملوکہ چیز کے منافع (services) کسی کو گفٹ کردے۔ مثلاً کوئی شخص کسی کی مفت میں خدمت کردے یا اپنا گھر کسی کو کچھ دنوں کے لیے بلاعوض استعمال کے لیے دے دے۔ فقہاء اس قسم کے احکام عمومی طور پر ''عاریت'' کے تحت ذکر کرتے ہیں، اس لیے اس کی مزید تفصیل ''عاریت'' کے عنوان کے تحت بیان کی جائے گی۔

۳۔ہبہ معنوی:

اس قسم کے ہبہ سے مراد یہ ہے کہ کسی کو ایسی چیز سے نوازا جائے جس چیز کا نہ مادی وحسی یا قیمتی وجود ہے اور نہ ہی اس کا تعلق منافع یا خدمات کے ساتھ ہے، لیکن اس کا ایک معنوی وجود ضرور ہوتا ہے، جس کی وجہ سے دوسرا شخص خوش ہوسکتا ہے اور اسے فائدہ بھی ہوسکتا ہے۔ جیسے کسی شخص کو بڑے القابات سے نوازنا یا کسی کی تعریف کرنا وغیرہ۔

ہبہ کی اس قسم کا اصل اور بنیادی حکم یہی ہے کہ ذاتی غرض، لالچ نہ ہو اور جھوٹ سے بچا جائے تو اس قسم کے ہبہ میں کوئی قباحت نہیں، بلکہ یہ شرعی طور پر مستحب ہے۔

۴۔دین کا ہبہ:

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرض خواہ اپنا قرض/دین کسی کو ہبہ/گفٹ کردے۔ فقہاء حنفیہ کے ہاں اس کی بنیادی طور پر دو صورتیں ہیں:

ا۔هبة الدين لمن عليه الدين:

جس شخص پر قرض/دین لازم ہے، اسی کو وہ قرض ہبہ کیا جائے۔ یہ شرعاً جائز ہے۔ فقہاء حنفیہ کے ہاں اگرچہ ہبہ کے لیے ''عین'' ضروری ہے، لیکن اس صورت کو انہوں نے مجازاً ''ابراء'' قرار دے کر درست لکھا ہے، کیونکہ الفاظ اگرچہ ہبہ کے استعمال کیے جائیں، لیکن یہاں حقیقت ابراء کی پائی جاتی ہے، لہٰذا یہ درحقیقت کسی شخص کا دوسرے کو اپنے حق سے بری کرنا ہے جو کہ درست ہے۔

اس قسم کے بارے میں علامہ سرخسی رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ مقروض کو اپنی موت سے قبل اس ہبہ سے انکار کرنے اور اسے رد کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے، اگر اس نے رد کردیا تو یہ ہبہ ختم ہوجائے گا اور دوبارہ اس پر قرض/دین لازم ہوجائے گا۔ اگر اس نے ہبہ کو قبول کرلیا یا موت سے قبل اس کا انکار نہ کیا اور خاموش رہا تو ایسا ہبہ مکمل ہوجائے گا،

اب اس کے بعد ہبہ کرنے والا (قرض خواہ) اپنے حق کا دوبارہ مطالبہ نہیں کر سکتا۔[1] لیکن علامہ شامی اور دیگر فقہاء
ہاں مقروض ایسے ہبہ کا انکار نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ ابراء ہے، لہذا قرض خواہ نے جیسے ہی مقروض کو قرض ہبہ کر دیا اسی
وقت مقروض اس قرض سے بری ہو جائے گا اور قرض خواہ دوبارہ اپنے قرض کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔[2]

۴۔هبة الدين لغير من عليه الدين:

دوسری صورت یہ ہے کہ قرض خواہ اپنا قرض/دین کسی تیسرے شخص کو ہبہ/گفٹ کر دے۔ مثلاً زید کے ذمہ عمر کے ایک لاکھ روپے قرض ہیں۔ عمر نے اپنا یہ قرضہ خالد کو ہبہ کر دیا۔ اس صورت کے بارے میں فقہاء حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ اگر ہبہ کرنے والے نے تیسرے شخص کو اس رقم کے قبضہ کرنے کی اجازت دے دی ہے تو یہ ہبہ درست ہے، کیونکہ وہ پہلے قرض خواہ کا نائب بن کر قرض پر قبضہ کر لے گا اور پھر بطورِ ہبہ اس رقم کو خود اپنی ملکیت میں داخل کر دے گا۔

علامہ شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وَلَوْ وَهَبَ دَيْنًا لَهُ عَلَى رَجُلٍ وَأَمَرَهُ أَنْ يَقْبِضَهُ فَقَبَضَهُ جَازَتْ الْهِبَةُ.[3]

دیگر ائمہ کی آراء کا خلاصہ یہ ہے کہ دین کی پہلی قسم کا ہبہ تقریباً تمام ائمہ کے ہاں جائز ہے، جبکہ دین کے ہبہ کی دوسری قسم میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں۔ فقہاء حنفیہ، مالکیہ اور شافعیہ کی ایک رائے کے مطابق یہ درست ہے، جبکہ فقہاء حنابلہ اور شافعیہ کی دوسری رائے کے مطابق یہ درست نہیں ہے۔[4]

۵۔ہبۃ المشاع:

مشاع کسی غیر تقسیم شدہ اور غیر متعین حصہ کو کہا جاتا ہے۔ ہبۃ المشاع کی بنیادی طور پر دو صورتیں ہیں:

۱۔ایک صورت یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی مملوکہ چیزوں میں سے یا اپنی مملوکہ زمین میں سے کوئی معلوم مقدار اور حصہ کسی کو گفٹ کر دے، لیکن باقاعدہ تقسیم اور الگ کر کے نہ دے۔ مثلاً والد نے اپنی زمین میں سے ایک غیر متعین کنال زمین اپنے بیٹے کو گفٹ کر دی، لیکن باقاعدہ تقسیم اور الگ کر کے نہ دی۔ اس صورت میں گویا والد اور بیٹا زمین میں شریک ہو گئے۔

---

[1] المبسوط للسرخسي ١٢/ ٨٣

[2] حاشية ابن عابدين ٥/ ٦٨٧

[3] حواله بالا ٥/ ٦٨٧

[4] الفقه على المذاهب الأربعة ٣/ ١٢٩

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی مملوکہ چیزوں کا بعض حصہ یا اپنی مملوکہ زمین کا ایک حصہ ایک سے زیادہ افراد کو گفٹ کردے اور ہر ایک کو اس کا حصہ الگ و تقسیم کر کے نہ دے۔ مثلاً والد نے اپنی زمین اپنے تین بیٹوں کو گفٹ کردی، لیکن ہر ایک کا حصہ باقاعدہ تقسیم اور الگ الگ کر کے نہ دیا، بلکہ سب کو مشترکہ طور پر زمین دے دی۔ اس صورت میں گویا تینوں بیٹے اس مشترکہ زمین میں شریک ہوگئے۔

ہبۃ المشاع درست ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ ائمہ ثلاثہ کے ہاں ہبۃ المشاع درست ہے اور منعقد ہو جاتا ہے اور اس سے ملکیت بھی ثابت ہو جاتی ہے، جبکہ فقہاء حنفیہ کے ہاں اس میں درج ذیل تفصیل ہے:

ا۔ وہ اشیاء جو قابل تقسیم ہی نہیں ہیں، جیسے گاڑی، دیوار، حمام وغیرہ۔ ان اشیاء کا کوئی معلوم حصہ (مثلاً نصف وغیرہ) کسی کو ہبہ کرنا درست ہے۔ اسی طرح ان اشیاء کو ایک سے زیادہ افراد کو ہبہ کرنا بھی درست ہے اور باقاعدہ تقسیم کر کے دینا کوئی ضروری نہیں ہے۔

۲۔ وہ اشیاء جو قابل تقسیم ہیں، جیسے زمین وغیرہ۔ ان کے بارے میں فقہاء حنفیہ کی عمومی رائے یہ ہے کہ ان میں ہبۃ المشاع درست نہیں ہے، بلکہ باقاعدہ تقسیم کر کے دینا ضروری ہے، ورنہ ہبہ مکمل نہیں ہوگا، کیونکہ تقسیم کے بغیر قبضہ کامل حاصل نہیں ہو سکتا۔[1]

یہ تو فقہاء کی آراء کا خلاصہ تھا، لیکن یہاں اصولی طور پر تین باتیں ذہن میں رکھنا ضروری ہیں:

ا۔ فقہاء حنفیہ نے جو اشیاء کی دو اقسام (قابل تقسیم و غیر قابل تقسیم) ذکر کر کے ہر ایک کا حکم الگ لکھا ہے، یہ کسی نص سے ثابت نہیں، بلکہ یہ اجتہادی معاملہ ہے۔

۲۔ خود بعض فقہاء حنفیہ کی یہ رائے ہے کہ ہبۃ المشاع کے بعد اگر اس چیز پر قبضہ ہو جائے تو اس سے دوسرے شخص کی ملکیت ثابت ہو جائے گی۔[2]

۳۔ ہبۃ المشاع کی دو بنیادی صورتوں میں سے جو دوسری صورت ہم نے ذکر کی ہے، یعنی اگر ہبہ کرنے والا ایک ہی شخص ہو اور موہوب لہ (جس کو ہبہ کیا جائے) وہ کئی افراد ہوں اور ان کو مشاع و مشترک طور پر کوئی چیز گفٹ کردی جائے تو امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کے ہاں یہ درست ہے، البتہ امام ابو حنیفہ کی رائے میں یہ درست نہیں ہے۔[3]

---

[1] الفقه على المذاهب الأربعة ٣/ ١٢٦

[2] فتاوى قاضي خان ١٤٦/١

[3] الفتاوى الهندية ٣٤٨/٢

موجودہ زمانے میں یہ قول زیادہ راجح ہے کہ اگر کسی نے کئی افراد کو مشترک طور پر کوئی چیز/زمین گفٹ کردی، اور انہوں نے اس چیز/زمین پر قبضہ بھی کر لیا تو یہ ہبہ درست ہے اور وہ اس زمین کے مالک بھی ہو جائیں گے، اگرچہ ہر ایک کو اس کا حصہ الگ الگ تقسیم کر کے نہ دیا ہو، لیکن صرف زبانی طور پر یا تحریری طور پر کسی کو زمین وغیرہ ہبہ کرنا کافی نہیں ہے، قبضہ بہر صورت ضروری ہے۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ لکھتے ہیں:

ثُم اعلم أنَّ هِبة المُشاع لا تَتِم في أصل المذهب، وإن تحقق القبضُ أيضًا: وأفتى المتأخرون بجوازها، وبه أفتي.[1]

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے ایک فیصلے میں لکھا ہے:

۱۔ ہبہ کرنے والے کو چاہیے کہ جو شئ ہبہ کرنی ہو، اگر وہ قابل تقسیم ہو تو اسے تقسیم کر کے ہبہ کرے۔

۲۔ اگر مشاع یعنی مشترکہ چیز کو ہبہ کیا جائے تو اگرچہ قیمت واہمیت کے لحاظ سے اس کے مختلف حصوں کی حیثیت میں فرق ہو، لیکن اس کی تقسیم اور قبضہ کے سلسلے میں ان لوگوں کے درمیان کوئی باہمی نزاع نہ ہو جن کو ہبہ کی گئی ہے، تو یہ ہبہ درست ہے۔[2]

۲۔ ہبۃ المجہول:

اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی مملوکہ اشیاء میں سے کوئی مجہول و نامعلوم حصہ دوسرے کو ہبہ/گفٹ کردے۔ مثلاً کوئی شخص دوسرے کو کہہ دے کہ: میری ان تین گاڑیوں میں سے ایک گاڑی میں آپ کو گفٹ کرتا ہوں۔ یا والد اپنے بیٹے کو کہہ دے کہ: میری زمین میں سے کچھ حصہ میں تمہیں گفٹ کرتا ہوں۔

اس قسم کا ہبہ درست ہوگا یا نہیں؟ اس سلسلے میں فقہاء حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ یہ ہبہ درست نہیں ہے، کیونکہ ہبہ کے درست ہونے کے لیے ضروری ہے کہ جو چیز ہبہ کی جارہی ہے وہ معلوم و متعین ہو، جبکہ فقہاء مالکیہ کے ہاں مجہول و نامعلوم چیز کا ہبہ کرنا درست ہے، کیونکہ ان کی رائے میں اس میں کسی قسم کے نزاع اور جھگڑے کا اندیشہ نہیں ہوتا۔[3]

---

[1] فيض الباري شرح صحيح البخاري ٢/ ٧٦

[2] نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے ص:۲۹۸

[3] الفقه الإسلامي وأدلته ٥/ ٦٢٩

راجح یہی ہے کہ نامعلوم چیز یا نامعلوم مقدار کا حصہ ہبہ کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ ہبہ کے مکمل ہونے کے لیے قبضہ ضروری ہے اور قبضہ کسی نامعلوم چیز پر نہیں ہو سکتا۔

۷۔ مریض کا ہبہ:

یہاں مریض سے مراد ایسا مریض ہے جو مرض الموت (mortal sickness) میں مبتلا ہو اور اس حالت میں وہ اپنی کسی مملوکہ چیز کسی کو گفٹ کردے۔ مرض الموت اس بیماری کو کہتے ہیں جس میں عموماً موت واقع ہوتی ہے۔ مجلہ الاحکام العدلیہ میں اس کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

مَرَضُ الْمَوْتِ هُوَ الْمَرَضُ الَّذِي يَعْجَزُ الْمَرِيضُ فِيهِ عَنْ رُؤْيَةِ مَصَالِحِهِ الْخَارِجَةِ عَنْ دَارِهِ إِنْ كَانَ مِنَ الذُّكُورِ، وَيَعْجَزُ عَنْ رُؤْيَةِ الْمَصَالِحِ الدَّاخِلَةِ فِي دَارِهِ إِنْ كَانَ مِنَ الْإِنَاثِ ، وَالَّذِي يَكُونُ فِيهِ خَوْفُ الْمَوْتِ فِي الْأَكْثَرِ وَيَمُوتُ. وَهُوَ عَلَى ذَلِكَ الْحَالِ قَبْلَ مُرُورِ سَنَةٍ سَوَاءٌ كَانَ مُلَازِمًا لِلْفِرَاشِ ، أَوْ لَمْ يَكُنْ ، وَإِذَا امْتَدَّ مَرَضُهُ ، وَكَانَ دَائِمًا عَلَى حَالٍ وَاحِدٍ وَمَضَى عَلَيْهِ سَنَةٌ يَكُونُ فِي حُكْمِ الصَّحِيحِ ، وَتَكُونُ تَصَرُّفَاتُهُ كَتَصَرُّفَاتِ الصَّحِيحِ مَا لَمْ يَمْتَدَّ مَرَضُهُ وَيَتَغَيَّرْ حَالُهُ، أَمَّا إِذَا اشْتَدَّ مَرَضُهُ وَتَغَيَّرَ حَالُهُ، وَتُوُفِّيَ قَبْلَ مُضِيِّ سَنَةٍ فَيُعَدُّ مَرَضُهُ اعْتِبَارًا مِنْ وَقْتِ التَّغْيِيرِ إِلَى الْوَفَاةِ مَرَضَ مَوْتٍ.[1]

مرض الموت ایسا مرض ہے جس میں اکثر طور پر اسی مرض سے موت کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اگر مریض مرد ہے تو وہ گھر سے باہر کے معاملات سے اور اگر عورت ہے تو گھریلو معاملات کی نگہداشت سے عاجز آجائے اور اسی حالت میں ایک سال کے اندر اندر اس کا انتقال ہو جائے، خواہ صاحبِ فراش ہو یا نہ ہو۔ اگر اس کا مرض طویل ہو جائے اور پورا سال گزر جائے تو وہ تندرست کے حکم میں ہوگا اور اس کے تمام معاملات تندرست آدمی والے ہوں گے، جب تک وہ مرض بہت شدید نہ ہو جائے اور اس کی حالت متغیر نہ ہو جائے۔ اگر اس کا مرض شدید ہو گیا اور حالت متغیر ہو گئی اور اسی حالت میں اس کی موت واقع ہو گئی تو اس کا مرض الموت حالت تغیر سے لے کر وفات تک کے درمیان والا حصہ شمار کیا جائے گا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرض الموت ایسا مرض ہے جس میں مندرجہ ذیل تین نکات موجود ہوں:

[1] مجلة الأحكام العدلية، ص: ۳۱۴ (المادّة:۱۵۹۵)

۱۔انسان اپنے عام معمول اور عادت کے کاموں سے عاجز آجائے۔

۲۔مرض ایسا ہو کہ عموماً اس مرض میں مریض کا انتقال ہو جاتا ہو۔

۳۔اس مرض کی ایک مخصوص مدت (یعنی ایک سال) کے اندر مریض کا انتقال بھی ہو جائے۔

ایسا مریض جب کسی کو کوئی چیز ہبہ /گفٹ کرتا ہے تو اس پر جمہور فقہاء کا اتفاق ہے کہ یہ ہبہ، وصیت کے حکم میں ہے، لہذا اگر مریض نے اپنے کسی وارث کو کوئی چیز گفٹ کر دی ہے تو یہ بالکل درست ہی نہیں ہے اور اگر کسی اجنبی شخص کو کوئی چیز گفٹ کر دی ہے تو ایسے مریض کا ہبہ اس کے مجموعی مال میں سے صرف ایک تہائی (ثلث) کی حد تک ہی درست ہوگا، اس سے زیادہ مال کا اگر وہ ہبہ کرتا ہے تو وہ ورثاء کی اجازت پر موقوف رہے گا، اگر ورثاء اس کی اجازت دے دے تو ٹھیک، ورنہ تہائی مال سے زیادہ کا ہبہ منعقد نہیں ہوگا۔

علامہ ابن قدامہ لکھتے ہیں:

أن عطيته في مرض موته لبعض ورثته لا تنفذ؛ لأن العطايا في مرض الموت بمنزلة الوصية في أنها تعتبر من الثلث إذا كانت لأجنبي إجماعا، فكذلك لا تنفذ في حق الوارث، قال ابن المنذر أجمع كل من أحفظ عنه من أهل العلم أن حكم الهبات في المرض الذي يموت فيه الواهب حكم الوصايا.[1]

کسی شخص کا مرض الموت میں اپنے کسی وارث کو کوئی چیز عطیہ کرنا نافذ نہیں ہوگا، کیونکہ مرض الموت میں عطیہ کا حکم وصیت والا ہے کہ یہ جب اجنبی کے لیے ہو تو صرف ایک تہائی کی حد تک نافذ ہوتا ہے اور جب وارث کے لیے ہو تو نافذ ہی نہیں ہوتا۔ علامہ ابن منذر فرماتے ہیں کہ: میرے علم کے مطابق تمام اہل علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جس مرض میں ہبہ کرنے والے کا انتقال ہو جائے، اس ہبہ کا حکم وصیت والا ہے۔

۸۔ہبۂ معوضہ:

اس کو بعض فقہی کتابوں میں ''هبة بشرط العوض'' اور ''هبة الثواب'' کا نام بھی دیا گیا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی عوض کی غرض سے دوسرے کو کوئی چیز گفٹ کر دے۔ کسی کو عوض کی غرض سے ہبہ کی بنیادی طور پر دو صورتیں ہیں:

[1] المغني ٦/ ٣١٧

۱۔مشروط فی العقد:

کسی کو ہبہ کرتے وقت باقاعدہ عوض کی شرط لگادی جائے۔ مثلاً کسی نے دوسرے کو اپنی گھڑی اس شرط پہ گفٹ کردی کہ وہ اسے متعین رقم یا اپنا موبائل وغیرہ دے گا۔

۲۔غیر مشروط فی العقد:

کوئی شخص دوسرے کو کوئی چیز بلا کسی شرط کے گفٹ کردے اور دوسرا شخص بھی بغیر کسی سابقہ شرط یا معاہدہ کے پہلے شخص کو اس وضاحت کے ساتھ کوئی چیز گفٹ کردے کہ یہ تمہارے گفٹ کے بدلے میں ہے، یا وضاحت نہ کرے، لیکن قرائن سے ایسا معلوم ہو رہا ہو کہ دوسرا شخص سابقہ گفٹ کے بدلے ہی گفٹ دے رہا ہے۔

ان اقسام کے حوالے سے فقہاء کی آراء کا خلاصہ یہ ہے کہ:

• پہلی قسم (مشروط فی العقد) میں جس عوض کی شرط لگائی گئی ہے، اگر وہ معلوم و متعین ہے تو تقریباً تمام فقہاء کے ہاں یہ ہبہ درست ہے، تاہم اکثر فقہاء حنفیہ کے ہاں اس قسم کے عقد کی فقہی تکییف یہ ہے کہ یہ ابتداء ہبہ ہے اور انتہاء بیع ہے، لہذا اس کے لیے ہبہ اور بیع دونوں کی شرائط ضروری ہوں گی اور دونوں کے احکام لاگو ہوں گے، جبکہ امام زفرؒ کی رائے میں یہ صرف بیع ہی ہے، لہذا اس کے لیے ہبہ کی شرائط ضروری نہیں ہیں۔ یہی رائے دیگر ائمہ کی بھی ہے۔

اگر پہلی قسم میں عوض مجہول اور نامعلوم ہے تو اس سلسلے میں فقہاء حنفیہ اور مالکیہ کے ہاں اور حنابلہ کے ایک قول کے مطابق یہ ہبہ درست ہے اور شرط باطل ہو جائے گی، کیونکہ یہ شرط فاسد ہے اور شرط فاسد سے ہبہ فاسد نہیں ہوتا، جبکہ شافعیہ اور ایک قول کے مطابق حنابلہ کے ہاں یہ ہبہ باطل ہے۔

• جہاں تک دوسری قسم (غیر مشروط فی العقد) کی بات ہے تو دوسرے شخص پر شرعاً یہ لازم نہیں ہے کہ وہ پہلے شخص کے ہبہ/گفٹ کے بدلے میں کوئی چیز دے، کیونکہ اس نے ایسی کوئی شرط نہیں لگائی تھی، البتہ اگر اس نے بغیر کسی شرط کے اس کے گفٹ کے بدلے میں کوئی چیز گفٹ میں دے دی تو یہ جائز ہے۔

اس کے لیے ایک بنیادی نکتہ سمجھنا ضروری ہے، وہ یہ کہ جب کسی شخص کو اپنے ہبہ/گفٹ کے بدلے میں گفٹ مل جائے تو پہلے ہبہ کرنے والے کو، اسی طرح گفٹ کے بدلے گفٹ دینے والے کو اپنے ہبہ میں رجوع کرنے اور اسے واپس لینے کا حق ختم ہو جاتا ہے، لیکن اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ یا تو عقد کے اندر ہی عوض کی شرط لگائی گئی ہو (مشروط فی العقد) یا دوسرے شخص نے باقاعدہ اس وضاحت کے ساتھ گفٹ دیا ہو کہ میں آپ کے گفٹ کے بدلے آپ کو گفٹ دے رہا ہوں یا اس بات پر قرائن موجود ہوں۔ اگر نہ شرط لگائی ہو، نہ ایسی کوئی وضاحت کی ہو اور نہ اس بات پر کوئی قرینہ

موجود ہو تو دوسرے شخص کی طرف سے ملنے والا گفٹ "هبة مبتدءة" یعنی نیا ہبہ/گفٹ ہو گا اور ہر ایک کو اپنی ہبہ کی ہوئی چیز میں رجوع کر کے اُسے واپس طلب کرنے کا حق حاصل ہو گا۔[1]

۵۔ رجوع اور موانعِ رجوع

یہاں دو نکات بیان کرنا مقصود ہے:

۱۔ ہبہ میں رجوع

۲۔ موانعِ رجوع

ہبہ میں رجوع کی دو صورتیں ہیں اور موانعِ رجوع سات (۷) ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل سے پہلے مندرجہ ذیل خاکہ ذہن میں رکھیں:

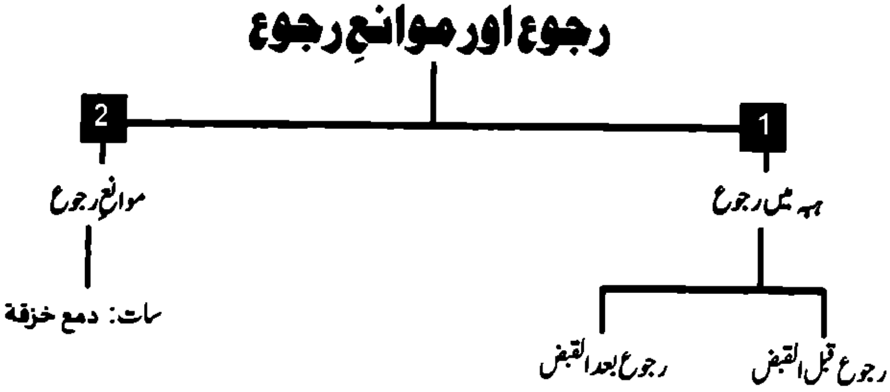

۱۔ ہبہ میں رجوع:

جب کوئی شخص کسی کو اپنی کوئی چیز ہبہ/گفٹ کر دیتا ہے تو کیا اس کے بعد ہبہ کرنے والے کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہبہ سے رجوع کرے اور دوسرے شخص کو وہ چیز نہ دے یا اگر دی ہے تو اس سے واپس وصول کرے؟ اس مسئلہ کی بنیادی طور پر دو صورتیں ہیں اور ہر صورت میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں، یہاں ان کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ پہلی صورت: رجوع قبل القبض

۲۔ دوسری صورت: رجوع بعد القبض

---

[1] بدائع الصنائع ٦/١٣٢، الفقه على المذاهب الأربعة ٣/١٣٣

۱۔ پہلی صورت: رجوع قبل القبض

جس شخص کو کوئی چیز ہبہ کی گئی ہے، اس نے ابھی تک اس چیز پر قبضہ نہیں کیا تو جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ ہبہ کرنے والا اپنے ہبہ سے رجوع کر سکتا ہے، اسے اختیار ہے، چاہے تو اس شخص کو ہبہ کی گئی چیز دے دے اور اگر چاہے تو انکار کر دے۔ فقہاء مالکیہ کے ہاں جب کسی شخص نے زبانی طور پر ہبہ کر دیا ہے تو اب وہ اس سے رجوع نہیں کر سکتا، اگرچہ اس چیز پر قبضہ نہ ہوا ہو۔

اس سلسلے میں راجح قول جمہور کا ہے، کیونکہ ہبہ ایک عقدِ تبرع ہے اور عقدِ تبرع کا بنیادی اصول یہی ہے کہ وہ قبضہ سے تام و مکمل ہوتا ہے۔ قبضہ سے پہلے کسی عقدِ تبرع کو تبرع کرنے والے پر لازم کرنے سے لوگوں کو حرج لاحق ہو سکتا ہے اور دوسرا اس سے تبرع کے باب میں تنگی پیدا ہو سکتی ہے۔

۲۔ دوسری صورت: رجوع بعد القبض

اگر کسی شخص نے اپنی کوئی چیز یا زمین وغیرہ کسی دوسرے کو ہبہ / گفٹ کر دی اور اس کے قبضہ میں بھی دے دی تو کیا اس کے بعد ہبہ کرنے والا اپنے ہبہ سے رجوع کر کے اپنی چیز واپس لے سکتا ہے یا نہیں؟ اس میں فقہاء کی دو آراء ہیں:

۱۔ جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ قبضہ کرنے کے بعد رجوع کرنا حرام ہے، تاہم فقہاء شافعیہ اور حنابلہ کے ہاں اصول (مثلاً والد، دادا، ماں، دادی، نانی وغیرہ) نے اگر فروع (مثلاً بیٹے، بیٹی، پوتے، پوتی وغیرہ) کو کوئی چیز گفٹ میں دی ہے تو ان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ رجوع کر کے اپنی چیز واپس لے لیں۔

۲۔ فقہاء حنفیہ کے ہاں اصول یہ ہے کہ ہبہ کرنے والا ہر حالت میں اپنی چیز واپس وصول کر سکتا ہے، البتہ دو صورتیں اس سے خارج ہیں:

الف۔ اگر کسی شخص نے اپنے کسی محرم رشتہ دار کو کوئی چیز گفٹ کر دی اور اس نے اس پر قبضہ بھی کر لیا تو اب ایسے شخص کو رجوع کر کے اپنی چیز واپس وصول کرنے کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ جیسے والد نے اپنے بیٹے کو کوئی چیز گفٹ کر کے قبضہ میں دے دی تو اب رجوع کرنا جائز نہیں ہے۔

ب۔ دوسری صورت یہ ہے کہ موانعِ رجوع میں سے کوئی مانع پایا جائے تو اس کے بعد بھی ہبہ کرنے والے کو رجوع کا حق حاصل نہیں ہوتا۔ موانعِ رجوع کی تفصیل آگے آرہی ہے۔[1]

فقہاء کے اختلاف کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اس سلسلے میں احادیث و آثار مختلف ہیں، کچھ فقہاء نے خاص وجوہات کی

---

[1] الفقه على المذاهب الأربعة ۳/ ۱۳۱. بدائع الصنائع ۶/ ۱۲۸

بنیاد پر ایک قسم کی احادیث اختیار کرلی، کچھ فقہاء نے دوسری قسم کی روایات کو اختیار کرلیا۔ تفصیل کے لیے حدیث اور شروحاتِ حدیث کی کتب ملاحظہ فرمائیں۔

۲۔ موانعِ رجوع:

فقہاءِ حنفیہ کے ہاں کچھ موانع اور رکاوٹیں ایسی ہیں، جن کی وجہ سے ہبہ کرنے والا ہبہ سے رجوع کرکے اپنی چیز واپس وصول نہیں کرسکتا۔ ایسے موانع کل سات ہیں، جن کو ایک جملہ ''دمع خزقة'' میں جمع کیا گیا ہے، جس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

د-اس سے مراد ''زیادۃ متصلہ'' ہے۔ یعنی جس شخص کو چیز گفٹ میں ملی ہے، اگر اس نے چیز پر قبضہ کرکے اس میں اپنی طرف سے ایسا اضافہ کردیا جو اس کے ساتھ متصل اور ملا ہوا ہو، جیسے دودھ لے کر اس کی چائے بنالی یا زمین میں مکان بنادیا یا درخت لگادیے وغیرہ تو اب ہبہ کرنے والے کو رجوع کا حق حاصل نہیں ہوگا۔

م-اس سے مراد ''موت'' ہے۔ یعنی اگر ہبہ کرنے والا یا جس کو چیز ہبہ کی گئی ہے وہ مرگیا تو اب رجوع کا حق ختم ہوگیا۔

ع-اس سے مراد ''عوض'' ہے۔ اگر ہبہ کرنے والے نے اپنے ہبہ کا عوض لے لیا تو پھر اسے رجوع کا حق حاصل نہیں ہوگا، جس کی تفصیل پہلے گزرچکی ہے۔

خ-اس سے مراد ''خروج من الملک'' ہے۔ یعنی اگر وہ چیز کسی بھی طرح اس شخص کی ملکیت سے نکل گئی، جس کو چیز ہبہ کی گئی تھی، مثلاً اس نے بیچ دی تو اب ہبہ کرنے والا رجوع نہیں کرسکتا۔

ز-اس سے مراد ''زوجیت'' ہے۔ اگر ہبہ کرنے والے اور جس کو گفٹ دیا گیا ہے، دونوں کے درمیان زوجیت اور نکاح کا رشتہ ہو تو بھی ہبہ کرنے والا رجوع نہیں کرسکتا۔

ق-اس سے مراد ''قرابت'' ہے۔ اگر ہبہ کرنے والے نے اپنے کسی ذی رحم محرم رشتہ دار کو کوئی چیز گفٹ کردی ہے تو بھی وہ رجوع نہیں کرسکتا۔

ہ-اس سے مراد ''ہلاک الموہوب'' ہے۔ جو چیز بطورِ ہبہ دی تھی، اگر وہ کسی طرح ضائع ہوگئی تو بھی ہبہ کرنے والے کا حق رجوع ختم ہوجائے گا۔[1]

---

[1] مجمع الأنہر ۲/۳۶۰

۶۔ہبہ کے عمومی ضوابط

اس عنوان کے تحت ہبہ کے احکام کو ضوابط کی شکل میں بیان کیا جائے گا۔ ممکن ہے کچھ ضوابط ایسے ہوں جن کی تفصیل سابقہ مباحث میں آچکی ہو، لیکن اس ضابطہ کو مختصراً یہاں اس لیے ذکر کیا جائے گا، تاکہ اس کو ذہن میں رکھ کر تفصیلی مباحث کا خلاصہ ذہن میں رہے۔

۱۔پہلا ضابطہ: ہبہ ایجاب و قبول سے منعقد ہو جاتا ہے، خواہ زبانی ہو یا تحریری، لیکن ہبہ مکمل اور تام اس وقت سمجھا جائے گا جب اس پر باقاعدہ قبضہ کیا جائے۔ بالفاظِ دیگر ہبہ بغیر قبضہ کے لازم نہیں ہوتا۔ اس کی تفصیل ''رجوع'' کی بحث میں گزر چکی ہے۔ اس ضابطہ کو فقہاء نے یوں لکھا ہے:

- تنعقد الهبة بالإيجاب والقبول وتتم بالقبض
- الهِبَةُ لا تَلْزَمُ إلا بِالقَبْضِ

۲۔دوسرا ضابطہ: ہبہ تعاطی کے ذریعے بھی منعقد ہو جاتا ہے۔ تعاطی کا مطلب یہ ہے کہ زبانی یا تحریری الفاظ کے بغیر ہی، کوئی شخص اپنی کوئی چیز کسی کو عملی طور پر گفٹ میں دے دے۔ یہاں ایک نکتہ یہ ذہن میں رہے کہ ایسی صورت میں ہبہ تام و مکمل بھی ہو جاتا ہے، کیونکہ قبضہ ہو گیا۔ دوسرا یہ کہ یہاں ہبہ کے لیے ضروری ہے کہ کوئی ایسا قرینہ یا نشانی ہو جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ دینے والا بطورِ ہبہ /گفٹ دے رہا ہے، قرض نہیں دے رہا۔ اس ضابطہ کو فقہاء نے اس طرح لکھا ہے:

- تنعقد الهبة بالتعاطي

۳۔تیسرا ضابطہ: ہبہ اس وقت مکمل ہوتا ہے جب اس پر قبضہ ہو جائے، لیکن قبضہ کے لیے اصل مالک (واہب) کی باقاعدہ اجازت سے قبضہ کرنا ضروری ہے، اگرچہ اس نے زبانی یا تحریری ہبہ کیا ہو۔ اگر مالک کی صریح یا دلالۃً اجازت کے بغیر اس چیز پر قبضہ کیا گیا تو اس سے ہبہ مکمل نہیں ہوگا۔ اس ضابطہ کے الفاظ یوں ہیں:

- يلزم إذن الواهب صراحة أو دلالة في القبض

۴۔چوتھا ضابطہ: ہبہ کو کسی خاص وقت تک محدود رکھنا، یا ہبہ کو کسی شرط پر معلق کرنا یا مستقبل کی کسی تاریخ کی طرف نسبت کر کے ہبہ کرنا درست نہیں ہے۔ اس کی تفصیل ہبہ کی شرائط میں گزر چکی ہے۔ اس ضابطہ کے الفاظ یہ ہیں:

- لا تصح الهبة مؤقتة، ولا معلقة، ولامضافة

۵۔پانچواں ضابطہ: جس چیز کی بیع (خرید و فروخت) جائز ہے، اس کو ہبہ کرنا بھی جائز ہے اور جس چیز کی بیع جائز نہیں ہے، اس کا ہبہ بھی جائز نہیں ہے۔ بالفاظِ دیگر جس چیز کو ہبہ کیا جا رہا ہے، ضروری ہے کہ وہ حلال چیز ہو اور عرف

وشریعت میں مال ہو۔اس ضابطہ کو یوں بیان کیا گیا ہے:

- ما جازَ بَیْعُه جازتْ هِبَتُه، وما لاَ فلا

۶۔چھٹا ضابطہ: دین/قرض کو ہبہ کرنا جائز ہے، خواہ مقروض کو ہبہ کیا جائے یا کسی تیسرے شخص کو۔ مقروض کو قرض ہبہ کرنا ابراء ہے۔اس ضابطہ کے الفاظ یہ ہیں:

- هِبَةُ الدَّین تَصِحُّ، کما یَصِحُّ رَهْنُه

۷۔ساتواں ضابطہ: اگر ہبہ میں کوئی شرط فاسد لگائی جائے تو اس سے ہبہ فاسد نہیں ہوتا، بلکہ ہبہ درست ہوتا ہے اور شرط لغو ہو جاتی ہے۔ مثلاً کوئی شخص دوسرے کو اپنی گھڑی گفٹ کر کے شرط لگا دیتا ہے کہ تم بھی مجھے اپنی کوئی چیز گفٹ کرو گے۔ چونکہ یہاں عوض نامعلوم و مجہول ہے، اس لیے یہ شرط فاسد ہے، اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔اس ضابطہ کے الفاظ یہ ہیں:

- الهبة لا تبطل بالشروط الفاسدة

۸۔آٹھواں ضابطہ: کسی کو کوئی چیز ہبہ/گفٹ کرتے وقت اگر عوض لینے کی شرط لگا دی جائے تو ایسا ہبہ، بیع کے حکم میں ہے، بشرطیکہ عوض معلوم ہو۔اس کی تفصیل بھی پہلے گزر چکی ہے۔اس ضابطہ کے الفاظ یہ ہیں:

- الهبةُ بشرط العِوَضِ بمنزلة البیع

۹۔نواں ضابطہ: کسی کو ثواب کی نیت سے کوئی چیز بلا عوض دینا صدقہ ہے۔ صدقہ کے فقہی احکام وہی ہیں جو ہبہ کے ہیں، مثلاً صدقہ بھی قبضہ کے بعد ہی مکمل سمجھا جائے گا وغیرہ۔اس ضابطہ کے الفاظ یہ ہیں:

- حُکْمُ الصَّدَقةِ کَالهِبَةِ

۱۰۔دسواں ضابطہ: کسی نامعلوم و مجہول چیز کو ہبہ/گفٹ کرنا یا کسی معدوم چیز کو گفٹ کرنا درست نہیں ہے، بلکہ ایسا ہبہ باطل ہوتا ہے۔اس ضابطہ کے الفاظ اس طرح ہیں:

- هِبَةُ المَجهُولِ والمَعدُومِ باطلةٌ

۱۱۔گیارہواں ضابطہ: کسی قابل تقسیم چیز کے غیر متعین حصہ کو ہبہ کرنا یا اس کو ایک سے زیادہ افراد کو مشترک طور پر ہبہ کرنا درست نہیں ہے۔اس کی مزید تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔اس ضابطہ کے الفاظ یوں ہیں:

- لا تصحُّ هبةُ المشاعِ

۱۲۔بارہواں ضابطہ: ہبہ میں ملنے والی چیز پر قبضہ، امانت کا قبضہ ہے۔اس کی وضاحت یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس کوئی چیز امانت رکھی ہے اور مالک نے وہی چیز اس کو ہبہ کر دی تو دوبارہ قبضہ کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ سابقہ قبضہ

بھی امانت کا تھا اور ہبہ کا قبضہ بھی اسی جیسا ہے۔ اسی طرح اگر کسی نے دوسرے کو چیز ہبہ کردی اور پھر اس میں رجوع کر لیا، لیکن ابھی تک چیز واپس نہیں لی تو یہ چیز دوسرے شخص کے پاس امانت رہے گی، اگر اس سے بغیر غفلت وکوتاہی کے ضائع ہوگئی تو اس پر ضمان ونقصان لازم نہ ہوگا۔ اس ضابطہ کے الفاظ یہ ہیں:

- قَبْضُ الهِبَةِ قَبْضُ أَمَانَةٍ

۱۳۔ تیرھواں ضابطہ: اگر کسی نے دوسرے کو مرض الموت میں کوئی چیز ہبہ / گفٹ کردی تو اس پر وصیت کا حکم لاگو ہوگا، لہذا ورثاء میں سے کسی کو مرض الموت میں ہبہ کرنا درست نہیں اور اجنبی کے لیے صرف تہائی مال کی حد تک ہبہ درست ہے۔ اس ضابطہ کے الفاظ یوں ہیں:

- الهِبَةُ فِي مِرَضِ المَوْتِ وَصِيَّةٌ

۱۴۔ چودھواں ضابطہ: سات موانع ایسے ہیں، جن کی وجہ سے اصل مالک اپنی ہبہ کردہ چیز میں رجوع کرکے اسے واپس نہیں لے سکتا۔ اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

- يمنع الرجوعَ فيها دمعُ خزقه

۷۔ ہبہ کی جدید صورتیں

اس عنوان کے تحت ہبہ کی چند اہم اور جدید صورتوں کو مختصراً ذکر کیا جائے گا۔

۱۔ زندگی میں جائیداد کی تقسیم:

ہر انسان اپنی صحت والی زندگی میں اپنی تمام جائیداد واملاک کا تنہا مالک ہوتا ہے۔ اُسے اپنی ملکیت میں ہر جائز تصرف کرنے کا مکمل اختیار حاصل ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص خوشی اور اپنی رضامندی سے اپنی جائیداد اپنے ورثاء کے درمیان تقسیم کرنا چاہے تو کرسکتا ہے، اور یہ شرعاً ہبہ (گفٹ) کہلائے گا اور اس پر ہبہ کے احکام لاگو ہوں گے۔

زندگی میں جائیداد کی تقسیم کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنی متوقع زندگی کے لیے جو کچھ مناسب سمجھیں اپنے لیے نکال لیں تاکہ بعد میں اُن کو کسی کا محتاج نہ ہونا پڑے۔ اس کے بعد بقیہ مال کا کم از کم آٹھواں حصہ اپنی بیوی کو دے دیں، اور اپنے غیر شادی شدہ بیٹوں اور بیٹیوں کے لیے مناسب خرچہ الگ کرکے اُن کو دے دیں۔ اس کے بعد بقیہ مال اپنے بیٹوں اور بیٹیوں میں برابر تقسیم کردیں۔ یہی افضل ہے۔ اور اگر میراث کے اصول کو سامنے رکھتے ہوئے بیٹیوں کو بیٹوں کے مقابلے میں آدھا دینا چاہیں تو یہ بھی جائز ہے، لیکن بیٹیوں کو بالکل محروم کرنا یا اُن کا حصہ بیٹوں کے مقابلے میں آدھے سے کم کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، اس کا گناہ ہوگا۔

چونکہ زندگی میں اپنی جائیداد اپنی اولاد کے درمیان تقسیم کرنا ہبہ (گفٹ) کے حکم میں ہے، اور شرعاً ہبہ (گفٹ) کے مکمل ہونے کے لیے قابلِ تقسیم چیز کو مشترک طور پر دینا کافی نہیں، بلکہ ہر ایک کو اس کے حصے پر باقاعدہ قابض اور مالک بنانا ضروری ہے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ جائیداد کو باقاعدہ تقسیم کرکے ہر ایک کو اس کے حصے پر قابض ومالک بنادیا جائے۔ اگر مشترک طور پر جائیداد اپنے ورثاء کو دے دی، ہر ایک کا حصہ الگ نہیں کیا، لیکن سب نے اصل مالک کی زندگی ہی میں جائیداد پر قبضہ کرلیا تو بھی یہ ہبہ درست ہو جائے گا۔

اگر کسی نے اپنی جائیداد اپنے ورثاء میں صرف زبانی طور پر یا تحریری طور پر تقسیم کردی، لیکن اصل مالک (مثلاً والد) نے اپنی زندگی میں ان کو قبضہ نہیں دیا، بلکہ مکمل جائیداد کو اپنے ہی قبضہ وتصرف میں رکھا اور اسی حالت میں ان کا انتقال ہوگیا تو یہ ہبہ مکمل نہیں سمجھا جائے گا، بلکہ ایسی جائیداد تمام ورثاء کے درمیان میراث کے اصولوں کے مطابق تقسیم ہوگی۔ صرف زبانی یا تحریری ہبہ/گفٹ یا حکومتی کاغذات میں انتقال وغیرہ کا کوئی اعتبار نہیں ہے، ہبہ کے مکمل ہونے کے لیے باقاعدہ مالکانہ قبضہ دینا ضروری ہے۔

اگر والد اپنی نابالغ اولاد کو کوئی جائیداد وغیرہ مشترکہ طور پر ہبہ کردے، باقاعدہ تقسیم کرکے اس کے قبضہ میں نہ دے، بلکہ اپنے قبضہ میں رکھے تو بھی ہبہ مکمل سمجھا جائے گا اور والد کا قبضہ، نابالغ کی طرف سے سمجھا جائے گا، کیونکہ ایسی صورت میں موہوبہ اراضی کا مقبوض اور غیر مشاع ہونا شرط نہیں ہے۔[1]

۲۔ شادی بیاہ کے گفٹس:

شادی بیاہ کے موقع پر تحفہ اور ہبہ وغیرہ دینے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر کوئی شخص شادی بیاہ کے موقع پر اپنے عزیز، دوست کو اپنی دلی خوشی سے لوجہ اللہ، صلہ رحمی کا حق ادا کرنے کے لیے بغیر کسی طمع ولالچ کے کوئی ہدیہ/تحفہ دے جس میں ریا، نام ونمود اور واپس لینے کی نیت نہ ہو تو شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں، یہ جائز بلکہ باعثِ اجر وثواب ہے۔ لیکن اگر اس کا باقاعدہ حساب رکھا جاتا ہو، اور دینے والے کے ہاں تقریب ہونے کی صورت میں دی ہوئی رقم کے برابر، بلکہ اس سے زیادہ دینے کا اہتمام کیا جاتا ہو تو اس رقم کو تحفہ یا ہدیہ/ہبہ کہنا مشکل ہے، بلکہ یہ قرض ہے اور اگر اس قرض میں یہ بات طے شدہ ہو کہ جب واپس کیا جاتا ہو تو لی گئی رقم سے زائد ہی واپس کیا جاتا ہو، اور اگر کم یا برابر واپس کیا جائے تو اس کو بُرا سمجھا جاتا ہو تو ایسی صورت میں دی گئی رقم سے زائد رقم "کل قرض جر نفعا فھو ربا" کے تحت داخل ہو کر سود کی

[1] رد المحتار ٥/٦٩٧

ایک صورت ہوگی، اور سود کا لینا اور دینا ناجائز اور حرام ہے۔ [۱]

۳۔ بچے کو ملنے والے تحائف:

آج کل نومولود بچوں کو رشتہ دار وغیرہ مختلف تحائف دیتے ہیں، وہ بھی درحقیقت ہبہ میں آتے ہیں۔ ان میں یہ تفصیل ہے کہ:

اگر وہ تحائف ورقوم وغیرہ رشتہ دار یا جاننے والوں کی طرف سے خاص بچے کو ہی مالک بنا کر اس کے ولی کے حوالہ کی گئی ہوں تو اس صورت میں بچہ ہی ان اشیاء کا مالک ہوگا اور اس میں کسی دوسرے کو تصرف کا اختیار نہیں ہوگا۔

اگر خاص بچہ کو مالک بنا کر نہیں دی گئیں تو اب اس میں یہ دیکھا جائے گا کہ جو چیز بچہ کی استعمال کی ہے وہ بچہ کی ملکیت ہوگی اور اسی کے لیے استعمال کی جائے گی اور وہ چیز کسی اور کو دینا شرعاً جائز نہیں۔ اور جو چیز بچہ کے استعمال کی نہیں ہے اس کے بارے میں عام عرف یہ ہے کہ اگر وہ باپ کے رشتہ داروں اور جاننے والوں نے دی ہے تو وہ باپ کی ملکیت سمجھی جائے گی اور اس میں باپ کو تصرف کا اختیار حاصل ہوگا، اور اگر ماں کے رشتہ داروں اور جاننے والوں نے دی ہے تو وہ ماں کی ملکیت سمجھی جائے گی، تاہم ان دونوں صورتوں میں بھی احتیاط اس میں ہے کہ بچہ کو ہبہ کی گئی اشیاء اسی بچہ کے لیے استعمال کی جائیں۔ [۲]

۴۔ دواساز کمپنیوں سے تحائف لینا:

آج کل ادویات بنانے والی کمپنیاں، ڈاکٹروں کو مختلف قسم کی اشیاء بطورِ تحفہ دیتی ہیں، ان کے حکم میں یہ تفصیل ہے کہ:

دواساز کمپنی یا فرم ڈاکٹروں کو جو تحفے دیتی ہے اس کا مقصد اگر یہ ہو کہ ڈاکٹر زیادہ سے زیادہ مریضوں کے لیے اس کمپنی کی دوائی لکھے اور ان تحائف کی وجہ سے ڈاکٹر دباؤ میں آکر اسی کمپنی کی دوائی لکھنے پر مجبور ہو جاتا ہو تو ایسی صورت میں کمپنی یا فرم کا تحفہ دینا اور ڈاکٹر کے لیے لینا جائز نہیں ہے، کیونکہ مریض کے لیے دوائی لکھنا ڈاکٹر کے فرائض میں سے ہے، جس پر کمیشن یا تحفہ لینا رشوت کے زمرے میں آئے گا۔

اگر ان تحائف کی وجہ سے ڈاکٹر اس کمپنی کی دوائیاں لکھنے پر مجبور تو نہ ہو، لیکن کمپنی کے تحفہ دینے کا مقصد یہی ہو کہ ڈاکٹر زیادہ سے زیادہ اس کمپنی کی دوائی لکھے تو ایسی صورت میں اگرچہ ڈاکٹر کے لیے تحفے لینا ناجائز تو نہیں ہے، لیکن

---

[۱] معارف القرآن ۶/۷۵۰

[۲] الدرالمختار ۵/۶۹۶

اس میں رشوت کا شبہ ہے، اس لیے اس سے بھی بچنا چاہیے۔ اور اگر ان تحائف سے کمپنی کا مقصد اپنی ہی دوائی لکھوانا نہ ہو اور ڈاکٹر بھی ان تحائف کی وجہ سے اس کمپنی کی دوائی لکھنے پر مجبور نہ ہو تو ایسی صورت میں کمپنی کے لیے تحفے دینا اور ڈاکٹر کے لیے لینا جائز ہے۔[۱]

۵۔ مشکوک آمدنی والے سے تحفہ لینا:

اگر کسی شخص کے بارے میں یقینی طور پر معلوم ہی نہ ہو کہ اس کی آمدنی حلال ہے یا حرام تو ایسے شخص کی ظاہری حالت اور مسلمان ہونے کو دیکھ کر اس کا ہدیہ اور تحفہ لینا جائز ہے۔ اگر کسی کے بارے میں یقینی طور پر یہ معلوم ہے کہ اس کی مکمل آمدنی حرام ہے یا اس کی اکثر آمدنی حرام ہے اور کم حلال ہے تو ایسے شخص نے اگر ہدیہ یا تحفہ دیتے وقت یہ وضاحت کر دی کہ یہ تحفہ میں حلال رقم سے دے رہا ہوں تو اس کی بات پر اعتبار کر کے تحفہ لینا جائز ہے، البتہ اگر اس نے ایسی کوئی وضاحت نہ کی ہو تو اس کا تحفہ لینا جائز نہیں ہے۔ اگر کسی کی مکمل آمدنی یا اکثر آمدنی حلال ہے تو بھی اس کا تحفہ لینا جائز ہے۔ اور جس شخص کے بارے میں یہ تو معلوم ہے کہ اس کی کچھ آمدنی حرام ہے، لیکن یہ معلوم نہ ہو کہ اکثر آمدنی حلال ہے یا حرام تو اس صورت میں غالب گمان پر عمل کیا جا سکتا ہے، تاہم احتیاط بہتر ہے۔[۲]

۶۔ خون عطیہ کرنا:

کسی مریض کو خون عطیہ کرنا جائز ہے، بشرطیکہ خون دینے کی ضرورت ہو یعنی کسی مریض کی ہلاکت کا خطرہ ہو اور ماہر ڈاکٹر کی نظر میں اُس کی جان بچانے کا اس کے سوا کوئی راستہ نہ ہو۔ یا جب ماہر ڈاکٹر کی نظر میں خون دینے کی حاجت ہو یعنی مریض کی ہلاکت کا خطرہ تو نہ ہو، البتہ خون دیے بغیر اُس کے صحت مند ہونے کا امکان نہ ہو تو ایسی صورت میں بھی خون دینا جائز ہے۔ اس کے علاوہ کسی صورت میں خون عطیہ کرنا درست نہیں ہے۔[۳]

۷۔ پنشن کا حکم:

پنشن کی فقہی حیثیت عطیہ وہبہ کی ہے یا یہ اجرت ہی کا حصہ ہے؟ شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے لکھا ہے کہ اس کے متعلق مختلف اداروں کے قواعد مختلف ہوتے ہیں، لہٰذا اسکا اصول یہ ہے کہ اگر ادارہ کے قواعد وضوابط کے مطابق ملازم اپنی زندگی ہی میں جس رقم کا حقدار ہو گیا ہو وہ رقم اس ملازم کی ملکیت ہے اور اس کے

---

[۱] حاشیة ابن عابدین ۵/ ۳۷۳

[۲] الدر المختار ۲۳۵/۵

[۳] جواہر الفقہ ۷ ۴۳

ترکہ میں شامل ہوگی اور اس کے تمام ورثاء میں شرعی حصوں کے مطابق تقسیم ہوگی۔ اور ملازم جس رقم کا اپنی زندگی میں حقدار نہ بنا ہو، بلکہ اس کی موت کے بعد وہ رقم ادارہ کی طرف سے اس کے ورثاء کو دی جاتی ہو تو وہ رقم ادارہ کی طرف سے ہبہ اور عطیہ ہے اور اس کا حکم یہ ہے کہ ادارہ جس کو متعین کر کے دے گا وہی اس کا مالک ہوتا ہے، اور گرادارہ یہ رقم لواحقین کو متعین کئے بغیر دے گا، تو وہ تمام افراد جو اس ملازم کے زیرِ کفالت ہوں، وہ اس رقم کے مساوی طور پر حق دار ہوں گے۔[1]

لیکن اس پر اجارہ کے آخر میں عرض کر دیا گیا تھا کہ پنشن کو اجرت اور تنخواہ ہی کا حصہ قرار دینا زیادہ درست معلوم ہوتا ہے، بشرطیکہ ملازم کو پنشن کے مطالبہ کا قانونی حق بھی حاصل ہو۔ اس کی مزید وضاحت اجارہ کے آخر میں دیکھ لی جائے۔

۳۔ عاریت کے اصولی مباحث واحکام

(Commodate Loan)

عاریت کے اصولی مباحث کو مندرجہ ذیل چھ نکات میں بیان کیا جائے گا:

۱۔ عاریت کی تعریف ۲۔ عاریت کا حکم

۳۔ عاریت کی شرائط ۴۔ عاریت کی اقسام

۵۔ عاریت کے عمومی ضوابط ۶۔ عاریت کی جدید صورتیں

۱۔ عاریت کی تعریف

عاریت لفظ ''عور'' سے بنا ہے اور عربی زبان میں اسم ہے، اس کا فعل ''إعارة'' آتا ہے جس کے معنی کسی چیز کو باری باری استعمال کرنے اور واپس کرنے کے آتے ہیں۔ علامہ ابن فارس لکھتے ہیں:

(عور) العين والواو والراء أصلان: أحدهما يدل على تداول الشيء، والآخر يدل على مرض في إحدى عيني الإنسان.[۱]

عین، واو، راء کے دو اصول ہیں: ایک کسی چیز کو باری باری لینا، دوسرا یہ الفاظ کسی انسان کی ایک آنکھ میں مرض کی نشاندہی کرتے ہیں۔

جہاں تک فقہی اصطلاح کی بات ہے تو اس سلسلے میں فقہاء کے دو نقطہ ہائے نظر ہیں:

۱۔ فقہاء حنفیہ ومالکیہ نے اس کی تعریف یہ کہ ہے کہ کسی انسان کو کسی چیز کے منافع (Services) کا بلاعوض عارضی طور پر مالک بنانا عاریت ہے۔[۲]

علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں:

الْعَارِيَةُ: تَمْلِيكُ الْمَنْفَعَةِ بِغَيْرِ عِوَضٍ، سُمِّيَتْ عَارِيَةً لِتَعَرِّيهَا عَنْ الْعِوَضِ.[۳]

---

[۱] معجم مقاييس اللغة ٤/ ١٨٤

[۲] إرشاد السالك ص: ١٦٧

[۳] المبسوط للسرخسي ١١/ ١٣٣

کسی کو بلاعوض منفعت کا مالک بنانا، چونکہ یہ عوض سے خالی ہوتا ہے، اس لیے اس کو عاریہ کہتے ہیں۔

۴۔ فقہاء شافعیہ اور حنابلہ کے ہاں اس کی تعریف یہ ہے کہ کسی چیز کی عین کو باقی رکھتے ہوئے، دوسرے شخص کے لیے اس کے منافع کو مباح کرنا عاریت ہے۔[1]

علامہ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں:

العارية: إباحة الإنتفاع بعين من أعيان المال.[2]

ان دونوں قسم کی تعریفات میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پہلی رائے میں عاریت میں باقاعدہ کسی شخص کو کسی چیز کے منافع کا مالک بنایا جاتا ہے، جبکہ دوسری رائے کے مطابق عاریت میں تملیک ضروری نہیں ہے، بلکہ اباحت کافی ہے، لہذا اگر کسی نے دوسرے کو صرف اتنا کہہ دیا کہ مثلاً میرا فلاں گھر آپ کے لیے مباح ہے، آپ جس وقت چاہے، اس میں رہائش اختیار کر سکتے ہیں، اور گھر اس کے حوالے نہیں کیا تو دوسری رائے کے مطابق یہ بھی عاریت ہے، دوسری رائے کے مطابق یہ عاریت نہیں ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ پہلی رائے کے مطابق جس شخص کو کوئی چیز بطورِ عاریت مل جائے، وہ شخص یہ چیز کسی دوسرے کو بھی عاریت پر دے سکتا ہے، کیونکہ وہ اس چیز کے منافع کا مالک ہے، جبکہ دوسری رائے کے مطابق ایسے شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ وہ کسی دوسرے کو یہ چیز عاریت پر دے دے، کیونکہ یہ شخص منافع کا مالک نہیں ہے، بلکہ اس کو صرف استعمال کرنے کی اجازت ملی ہے۔

مجلہ الاحکام العدلیہ میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

الْعَارِيَةُ: هِيَ الْمَالُ الَّذِي تُمَلَّكُ مَنْفَعَتُهُ لِآخَرَ مَجَّانًا أَيْ بِلَا بَدَلٍ، وَيُسَمَّى مُعَارًا أَوْ مُسْتَعَارًا أَيْضًا. الْإِعَارَةُ: هِيَ الْإِعْطَاءُ عَارِيَةً، وَيُقَالُ لِلشَّخْصِ الَّذِي أَعْطَى مُعِيرًا. الِاسْتِعَارَةُ: هِيَ الْأَخْذُ عَارِيَةً، وَيُقَالُ لِلَّذِي أَخَذَ مُسْتَعِيرًا.[3]

''عاریت'' اس مال کو کہتے ہیں جس کے منافع کا دوسرے کو بلاعوض/مفت میں مالک بنایا جاتا ہے۔ ایسے مال کو ''معار'' یا ''مستعار'' بھی کہتے ہیں۔ ''اعارۃ'' کا مطلب ہے کسی کو بطورِ عاریت کوئی چیز دینا، جو شخص دینے والا ہوتا ہے، اس کو ''معیر'' کہتے ہیں۔ ''استعارۃ'' کا مطلب ہوتا ہے کسی سے

---

[1] الفقه على المذاهب الأربعة ٣/ ١١٥

[2] المغني ٥/ ٣٥٤

[3] مجلة الأحكام العدلية ص: ١٤٥، (المادّة ٧٦٥) و(المادّة ٧٦٦) و (المادّة ٧٦٧)

کوئی چیز بطورِ عاریت لینا،اور جو عاریت لینے والا ہوتا ہے اس کو ''مستعیر'' کہتے ہیں۔

۲۔عاریت کا حکم

یہاں دو نکات بیان کرنا ضروری ہیں:

۱۔عاریت کا ثبوت

۲۔عاریت کالزوم

۱۔عاریت کا ثبوت:

جہاں تک عاریت کے ثبوت کی بات ہے تو اس پر تقریبا تمام ائمہ کا اتفاق ہے اور اس کے ثبوت پر ایک تو ان نصوص کو پیش کیا جاتا ہے جن میں خیر اور بھلائی کے کاموں کی ترغیب آئی ہے۔دوسرا عاریت کے ثبوت پر واضح احادیث اور آثار بھی موجود ہیں، مثلا:

الف-ایک حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں: "والعارية مؤداة" کہ عاریت کی چیز واپس کرنا ضروری ہے۔[۱]

ب-ایک روایت میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے غزوہ حنین کے موقع پر صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ سے ذرع عاریت پر لی تھی۔[۲]

ج-اسی طرح ایک روایت میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے ابو طلحہ رضی اللہ عنہ سے گھوڑا عاریت پر لیا تھا۔[۳]

حاصل یہ ہے کہ کسی دوسرے کو اپنی چیز عارضی طور پر استعمال کرنے کے لیے دینا جائز ہی نہیں، بلکہ مستحب بھی ہے، لیکن یہاں یہ ذہن میں رہنا ضروری ہے کہ اس عمل میں کسی گناہ اور معصیت کا عنصر شامل نہ ہو، مثلا کسی پر ظلم کرنے کے لیے یا رشوت کے طور پر کسی کو چیز عاریت پر دینا درست نہیں ہے۔

۲۔عاریت کالزوم:

جب کوئی شخص اپنی کوئی چیز دوسرے کو استعمال کے لیے /بطورِ عاریت دے دے تو کیا یہ عقد لازم ہو جاتا ہے یا نہیں؟ بالفاظِ دیگر کیا ایسی چیز کو کسی بھی وقت واپس لیا جا سکتا ہے؟اس سلسلے میں فقہاء کی دو آراء ہیں:

۱۔فقہاء مالکیہ کی رائے یہ ہے کہ اگر عاریت پر چیز دیتے وقت باقاعدہ وقت طے کیا تھا، مثلا ایک ماہ یا دو ماہ کے لیے

---

[۱] سنن أبی داود ۳/ ۳۲۱،حدیث نمبر: ۳۵٦۷

[۲] حواله بالا ۳/ ۳۲۱، حدیث نمبر: ۳۵٦٤

[۳] صحیح البخاري ص: ٦۲، حدیث نمبر: ۲۸٦۲

کسی کو اپنی چیز دے دی تو ایسی صورت میں اس وقت کے مکمل ہونے سے پہلے مالک اپنی چیز واپس نہیں لے سکتا۔ اور اگر کوئی وقت طے نہیں کیا تھا تو ایسی صورت میں اس مقصد کو دیکھا جائے گا جس مقصد کے لیے مالک نے کسی کو اپنی چیز دی ہے، اگر وہ مقصد حاصل ہو گیا یا عرف میں لوگ اس قسم کی عاریت کے لیے جو مناسب وقت طے کرتے ہوں وہ مکمل ہو گیا ہے تو مالک اپنی چیز واپس لے سکتا ہے، اس سے پہلے نہیں لے سکتا۔

۲۔ دیگر تمام فقہاء کی رائے یہ ہے کہ جس طرح مستعیر (عاریت پر چیز لینے والے) کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی بھی وقت عاریت کی چیز واپس کر سکتا ہے، بالکل اسی طرح مالک کو بھی ہر وقت یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی چیز واپس لے لے، خواہ عاریت پر چیز دیتے وقت کوئی وقت مقرر کیا گیا ہو یا کوئی وقت طے نہ کیا ہو، دونوں صورتوں کا یہی حکم ہے۔

جمہور علماء کی اس رائے کے ساتھ یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ بعض حالات ایسے ہیں جن میں اصل مالک کو اپنی عاریت پر دی ہوئی چیز واپس لینے کا حق حاصل نہیں ہوتا، مثلاً:

الف۔ اگر عاریت پر دی ہوئی چیز کو واپس لینے سے کسی گناہ کا ارتکاب ہو رہا ہے تو مالک اپنی چیز فی الفور واپس نہیں لے سکتا۔ مثلاً اگر کسی شخص نے اپنی زمین کسی میت کو دفن کرنے کے لیے دے دی اور وہاں میت کو دفن کر دیا گیا تو اس کے بعد مالک کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی زمین واپس لے کر میت کی لاش کو وہاں سے نکال دے۔ اسی میں علماء نے ایک مثال یہ بھی لکھی ہے کہ شوہر نے عدت گزارنے کے لیے عورت کو گھر دے دیا تو عدت مکمل ہونے سے قبل اسے وہاں سے نہیں نکالا جائے گا۔

ب۔ اسی طرح اگر عاریت کی چیز کی وجہ سے دوسرے شخص کو ضرر لاحق ہونے کا اندیشہ ہو تو بھی مالک اپنی چیز فوراً واپس نہیں لے سکتا۔ مثلاً مالک نے اپنی زمین کسی کو فصل کاشت کرنے کے لیے عاریت پر دے دی اور مستعیر نے اس زمین پر فصل کاشت کر لی تو ایسی صورت میں مالک کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کھیتی پکنے سے قبل اپنی زمین واپس لے کر مستعیر کی کھیتی کو اکھاڑ پھینک دے، کیونکہ اس میں مستعیر کے لیے ضرر ہے۔ فقہاء حنفیہ کے ہاں ایسی صورت میں مستعیر پر بقیہ مدت کی اجرت مثل لازم ہو گی۔[1]

۳۔ عاریت کی شرائط

عاریت کے لیے فقہاء نے کئی شرائط طے کی ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ معیر (اپنی چیز عاریت پر دینے والے) کے لیے ضروری ہے کہ وہ عقلمند ہو، مجنون یا ناسمجھ بچے کی عاریت

---

(۱) الفقه على المذاهب الأربعة ۳/ ۱۱۹

درست نہیں ہے۔ فقہاء حنفیہ کے ہاں معیر کے لیے بالغ ہونا ضروری نہیں ہے، جبکہ دیگر فقہاء کے ہاں بالغ ہونے کی شرط ضروری ہے۔

۲۔ مستعیر (جس کو چیز عاریت پر دی جارہی ہے) وہ باقاعدہ چیز پر قبضہ بھی کرلے، کیونکہ عاریت ایک تبرع ہے اور تبرع کے مکمل ہونے کے لیے قبضہ ضروری ہے۔

۳۔ جس چیز کو عاریت پر دیا جارہا ہے اس کی عین کو باقی رکھتے ہوئے، اس سے نفع حاصل کرنا ممکن و جائز ہو۔ لہذا اگر کسی نے دوسرے کو ایسی چیز عاریت پر دے دی جو استعمال کرنے سے ختم ہو جاتی ہے تو یہ عاریت نہیں ہے، بلکہ یہ قرض کے حکم میں ہوگا۔ اور اگر کسی نے دوسرے کو ایسی چیز بطورِ عاریت دے دی جس سے جائز نفع حاصل کرنا ممکن ہی نہ ہو تو یہ جائز نہیں، بلکہ گناہ ہے۔

۴۔ جس چیز کو عاریت پر دیا جارہا ہے، اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ معلوم و متعین ہو۔ اگر کسی نے دوسرے کو غیر متعین و نامعلوم چیز عاریت پر دے دی تو یہ درست نہیں ہے۔ مثلاً کسی نے دوسرے کو کہہ دیا کہ میں اپنی تین گاڑیوں میں سے ایک آپ کو استعمال کے لیے دیتا ہوں، تو یہ درست نہیں، البتہ اگر اسے کوئی بھی ایک لینے کا اختیار دے دیا تو درست ہے۔

۵۔ عاریت کو کسی شرط یا مستقبل کے واقعہ پر معلق کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ عاریت درحقیقت منافع کی تملیک ہے اور تملیک کو معلق کرنا درست نہیں ہے۔ مثلاً کوئی شخص یہ کہہ دے کہ اگر زید آیا تو میں نے آپ کو یہ گاڑی عاریت پر دے دی، تو یہ درست نہیں ہے۔

۶۔ جہاں تک عاریت کو مستقبل کی طرف منسوب و مضاف کرنے کی بات ہے تو اس سلسلے میں حنفیہ کی دو روایات ہیں، ایک میں ہے کہ مستقبل کی طرف عاریت کی اضافت درست ہے، جبکہ دوسری روایت میں ہے کہ درست نہیں ہے۔ مثلاً کوئی شخص دوسرے کو کہہ دے کہ: میں نے آپ کو کل سے اپنا مکان بطورِ عاریت رہائش کے لیے دے دیا۔ چونکہ اس میں کسی قسم کے نزاع و جھگڑے کا اندیشہ نہیں ہوتا، اس لیے بظاہر یہ درست ہونا چاہیے۔

۷۔ جو چیز عاریت پر دی جارہی ہے، اگر اس کے دینے کا مقصد متعین نہ کیا جائے اور اس کے منافع بھی معلوم نہ ہوں تو اس میں بھی شرعاً کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح اگر یہ بھی طے نہ کیا جائے کہ کتنے وقت کے لیے چیز دی جارہی ہے تو بھی کوئی حرج نہیں ہے۔[1]

---

(1) بدائع الصنائع ٦/ ٢١٤، الدر المختار وحاشية ابن عابدين ٥/ ٢٥٧

۴۔ عاریت کی اقسام

فقہاء کے ہاں عاریت کی کئی اقسام ہیں، علامہ علی حیدرؒ نے عاریت کی سولہ (۱۶) قسمیں لکھی ہیں، ان تمام اقسام کی تفصیلات واحکام کو مندرجہ ذیل دو اقسام کے تحت جمع کیا جاسکتا ہے:

۱۔ عاریت مطلقہ

۲۔ عاریت مقیدہ

۱۔ عاریتِ مطلقہ:

''عاریت مطلقہ'' کا مطلب یہ ہے کہ مالک نے کسی کو اپنی چیز بطورِ عاریت استعمال کے لیے دیتے ہوئے کسی بھی قسم کی شرط یا قید نہیں لگائی۔ نہ کوئی وقت طے کیا، نہ کسی مقام اور جگہ کا تعین کیا، نہ مقصد وانتفاع کو متعین کیا، اور نہ ہی یہ شرط لگائی کہ اس چیز کو کون کون استعمال کر سکتا ہے۔

اس قسم کی عاریت کا حکم یہ ہے کہ جس شخص کو چیز عاریت میں ملی ہے وہ اس چیز کو مالک کی طرح استعمال کر سکتا ہے، خواہ کسی بھی وقت، کسی بھی جگہ اور کسی بھی قسم کے مقصد کے لیے استعمال کیا جائے۔ لیکن اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس چیز کو عام عرف وعادت کے مطابق ہی استعمال کیا جائے گا، لہذا اگر کسی نے دوسرے کو عارضی طور پر اپنا گھوڑا دے دیا تو لینے والے پر لازم ہے کہ عام عادت وعرف کے مطابق ہی اس گھوڑے پر سواری کرے یا سامان لادے۔ ایسا کرنا جائز نہیں ہے کہ گھوڑے پر ناقابل برداشت بوجھ ڈال دے، ورنہ یہ شخص ذمہ دار اور ضامن ہوگا۔[1]

عاریتِ مطلقہ میں ملنے والی چیز انسان کسی اور کو بھی استعمال کے لیے دے سکتا ہے، بشرطیکہ وہ ایسی چیز نہ ہو جس میں مختلف لوگوں کے استعمال کی وجہ سے فرق آتا ہو اور نقصان کا اندیشہ ہو۔ اگر ایسی چیز ہے تو اسے کسی اور کو عاریت پر دینا جائز نہیں ہے۔

۲۔ عاریتِ مقیدہ:

عاریتِ مقیدہ کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کو اپنی چیز دیتے وقت کوئی شرط یا قید لگادے۔ مثلاً دینے والا وقت کی شرط لگادے کہ صرف دن کو ہی استعمال کرنا۔ یا مکان ومقام کی شرط لگادے کہ مثلاً اس سواری کو صرف پختہ روڈ پر ہی چلانا۔ یا یہ شرط عائد کردی کہ یہ چیز کسی اور کو استعمال کے لیے نہ دینا۔ یا اس کے علاوہ کوئی اور شرط لگادی تو ایسی صورت میں مستعیر یعنی چیز لینے والے پر اس شرط کی پابندی کرنا لازم وضروری ہے۔ اگر اس نے مالک کی عائد کردہ شرائط کی خلاف

---

(1) مجلة الأحكام العدلية ص: ١٥٦، المادّة ٨١٦

ورزی کردی تو وہ ذمہ دار وضامن ہوگا۔[1]

۵۔عاریت کے عمومی ضوابط

• **پہلا ضابطہ:** لا تنعقد العارية بالوعد: محض وعدہ کرنے سے عاریت کا عقد منعقد نہیں ہوتا، بلکہ باقاعدہ جزم کے ساتھ کسی کو چیز دینے سے ہی عاریت کا عقد منعقد ہوتا ہے۔

• **دوسرا ضابطہ:** سکوت المعیر لا یعد قبولا: معیر کی خاموشی کو قبول نہیں سمجھا جائے گا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی سے کوئی چیز بطورِ عاریت مانگ لے اور مالک خاموش ہو جائے تو اس کی خاموشی کو رضامندی نہیں سمجھا جائے گا، کیونکہ فقہی اصول ہے کہ: " لاينسب إلى ساكت قول"۔خاموش شخص کی طرف کسی قول کی نسبت نہیں کی جائے گی۔

• **تیسرا ضابطہ:** القبض شرط في العارية: عاریت میں قبضہ ضروری ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ عاریت عقدِ تبرع ہے اور عقدِ تبرع، قبضہ کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔

• **چوتھا ضابطہ:** يلزم تعيين المستعار: جو چیز کسی کو بطورِ عاریت دی جارہی ہے، اس کا معلوم ومتعین ہونا ضروری ہے۔اس کی تفصیل شرائط میں گزر چکی ہے۔

• **پانچواں ضابطہ:** الإِعَارَةُ مَبْنِيَّةٌ عَلَى الْمُسَامَحَةِ: عاریت کی بنیاد مسامحت اور چشم پوشی پر رکھی گئی ہے۔چونکہ عاریت ایک غیر لازم اور اپنی خوشی کا معاملہ ہوتا ہے جس میں مالک اپنی چیز مفت میں کسی کو استعمال کے لیے دیتا ہے اور کسی بھی وقت واپس وصول کر سکتا ہے، اس لیے اس عقد میں کچھ نہ کچھ جہالت کی گنجائش دے دی گئی ہے، چنانچہ اگر چیز دیتے ہوئے کوئی وقت، جگہ یا مقصد وغیرہ کی تعیین نہیں کی گئی تو بھی یہ جائز ہے، جیسا کہ ایک اور ضابطہ ہے کہ: "جهالة المنافع المملكة لا تفسد الإعارة" جن منافع کا کسی کو مالک بنایا جاتا ہے، اگر وہ نامعلوم اور مجہول ہیں تو اس سے عاریت کا عقد فاسد نہیں ہوتا۔

• **چھٹا ضابطہ:** كُلُّ مَا جَازَتْ إِجَارَتُهُ جَازَتْ إِعَارَتُهُ، وَمَا لا فَلا: ہر وہ چیز جس کو کرایہ پر دینا شرعا جائز ہے، اس کو عاریت پر بھی دیا جاسکتا ہے۔اسی ضابطہ کو مختلف تعبیرات میں بیان کیا گیا ہے، مثلا: "إِعَارَةُ مَا لَا يُمْكِنُ الانْتِفَاعُ بِهِ إِلَّا بِالاسْتِهْلَاكِ يَكُونُ قَرْضًا" یعنی جس چیز سے نفع کا حصول صرف اسی وقت ممکن ہو جب اس کو خرچ کیا جائے، تو

[1] درر الحكام في شرح مجلة الأحكام ۲/ ۳۵۸

اس کو عاریت پر دینا در حقیقت عاریت نہیں، بلکہ قرض ہے۔ اسی جیسا ایک اور ضابطہ ہے کہ: "كُلُّ مَا أَمْكَنَ الانْتِفَاعُ بِهِ مَعَ بَقَاءِ عَيْنِهِ جَازَتْ إِعَارَتُهُ" ہر وہ چیز جس کی عین کو برقرار رکھتے ہوئے اس سے نفع حاصل کرنا ممکن ہو تو اس کو عاریت پر دینا بھی جائز ہے۔

• **ساتواں ضابطہ:** ما ينتفع به انتفاعًا محرمًا لا تصح إعارته: جس چیز سے حرام نفع حاصل کیا جاتا ہو، اس کو عاریت پر دینا صحیح نہیں ہے، بلکہ گناہ ہے، کیونکہ یہ گناہ کے کام میں تعاون کے زمرے میں آتا ہے جو کہ حرام ہے۔

• **آٹھواں ضابطہ:** كُلُّ شَرْطٍ يُنَافِي عَقْدَ الإِعَارَةِ فَهُوَ لَاغٍ: ہر وہ شرط جو عاریت کے عقد کے منافی اور خلاف ہو، وہ لغو ہے۔ عاریت پر چیز دینے کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ لینے والا اس چیز کی عین کو باقی رکھ کر اس سے نفع حاصل کرے اور پھر چیز مالک کو واپس کردے۔ اگر فریقین نے باہمی طور پر ایسی کوئی شرط عائد کردی جو عاریت کے مقصد کے خلاف ہو تو ایسی صورت میں فقہاء اس شرط کے مطابق اس کو عاریت کے بجائے کوئی دوسرا مناسب عقد قرار دیتے ہیں۔ مثلاً مالک نے یہ شرط لگادی کہ چیز لینے والا اسے استعمال نہیں کرے گا تو یہ در حقیقت "امانت" ہے۔ اگر یہ شرط عائد کی جائے کہ لینے والا چیز واپس نہیں کرے گا تو یہ در حقیقت "ہبہ" ہے۔[1]

• **نواں ضابطہ:** نفقة المستعار على المستعير: جس چیز کو عاریت پر دیا جائے، اس کا نان ونفقہ مستعیر یعنی چیز لینے والے کے ذمہ ہوگا، کیونکہ اس چیز سے نفع وہ حاصل کررہا ہے، اس لیے اس کا یومیہ اور معمول کا خرچہ بھی وہی برداشت کرے گا۔ مثلاً اگر جانور ہے تو اس کو چارہ دینا ضروری ہے، ورنہ اگر جانور چارہ نہ ملنے کی وجہ سے مرے گا تو مستعیر ضامن ہوگا۔

• **دسواں ضابطہ:** المستعير كمالك في الإعارة المطلقة: عاریتِ مطلقہ میں چیز لینے والا مالک کی طرح ہوتا ہے۔ لہٰذا اسے چیز کو ہر وقت اور ہر طرح استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

• **گیارہواں ضابطہ:** المستعير ملزم بالقيد في الإعارة المقيدة: عاریتِ مقیدہ میں چیز لینے والے پر قید وشرط کی پابندی لازم ہے، ورنہ وہ ضامن ہوگا۔ اس کی تفصیل بھی گزر چکی ہے۔

• **بارہواں ضابطہ:** العارية مؤداة: عاریت کی چیز واپس کرنا ضروری ہے۔ یہ حدیث کے الفاظ ہیں، بعض فقہاء نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ عاریت کی چیز کا ضمان چیز لینے والے پر بہر صورت لازم ہوگا۔ اس کی تفصیل اگلے

---

[1] بدائع الصنائع ۳۹/۳

ضابطے میں آرہی ہے۔

• **تیرہواں ضابطہ:** العارية أمانة في يد المستعير: عاریت کی چیز مستعیر کے ہاتھ میں امانت کے حکم میں ہے۔ جب کسی کو کوئی چیز بطورِ عاریت استعمال کے لیے دے دی جائے تو ایسی چیز کی حیثیت لینے والے کے قبضہ میں کیا ہے؟ کیا یہ قبضہ ضمان ہے یا قبضہ امانت؟ اس سلسلے میں فقہاء کا اختلاف ہے:

۱۔ فقہاء شافعیہ اور حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ یہ قبضہ ضمان ہے، لہذا اگر یہ چیز مستعیر کے قبضہ میں ضائع ہوگی تو اس پر ضمان ونقصان کی ادائیگی لازم ہوگی، خواہ اس کی تعدی، کوتاہی وغفلت سے چیز ضائع ہوئی ہو یا بغیر تعدی وکوتاہی کے ضائع ہوئی ہو۔

۲۔ فقہاء حنفیہ اور مالکیہ کی ایک رائے کے مطابق یہ قبضہ امانت ہے۔ لہذا اگر مستعیر کے ہاتھ میں چیز خود ہی، بغیر کسی غفلت وکوتاہی کے ضائع ہوگئی تو اس پر کوئی نقصان یا ضمان لازم نہ ہوگا، لیکن اگر اس نے کوئی کوتاہی یا غفلت کرلی جس کی وجہ سے چیز ضائع ہوگئی تو اس صورت میں اس پر ضمان لازم ہوگا۔ بلکہ حنفیہ کے ہاں اگر ضمان کی باقاعدہ شرط بھی لگادی تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔[۱]

۳۔ فقہاء مالکیہ کی مشہور رائے یہ ہے کہ اگر عاریت کی چیز ایسی ہے جسے چھپایا جاسکتا ہے، جیسے زیور، کپڑے وغیرہ تو اس کا ضمان لازم ہوگا اور اگر وہ ایسی چیز ہے جس کو چھپایا نہیں جاسکتا، جیسے زمین تو اس کا ضمان لازم نہیں ہوگا۔[۲]

• **چودہواں ضابطہ:** تنفسخ الإعارة بوفاة أحد العاقدين: فریقین میں سے کسی کا بھی انتقال ہوجائے تو عقدِ عاریت فسخ اور ختم ہوجائے گا۔ عاریت کے اختتام کے اسباب میں سے ایک سبب موت ہے، دوسرا جنون ہے کہ اگر کوئی ایک فریق بھی پاگل ہوگیا تو عقد ختم ہوجائے گا۔ تیسرا سبب رجوع یا رد ہے کہ اگر مالک نے اپنی چیز واپس طلب کرلی یا مستعیر نے ہی چیز واپس لوٹادی تو عقد ختم ہوجائے گا۔

۲۔ عاریت کی جدید صورتیں

آج کل کے معاشرے میں عاریت کی چھوٹی چھوٹی بہت سی صورتیں رائج ہیں۔ جو لوگ اور دوست آپس میں بے تکلف ہوتے ہیں وہ ایک دوسرے کی اجازت سے ایک دوسرے کی چیزیں استعمال کرتے رہتے ہیں، جیسے کسی دوست کا موٹر سائیکل کچھ دیر کے لیے لے لیا یا کوئی اور چیز لے لی۔ اسی طرح پڑوسی بھی ایک دوسرے سے کچھ دیر کے استعمال کے

---

[۱] درر الحكام في شرح مجلة الأحكام ٣٤٨/٢

[۲] الفقه على المذاهب الأربعة ١٢١/٣

لیے چیزیں لے لیتے ہیں، جیسے شادی بیاہ کے موقع پر پڑوسیوں سے بستر، کمبل اور برتن وغیرہ لینا۔اسی طرح عورتیں ایک دوسرے سے عارضی طور پر استعمال کے لیے کچھ زیور لے لیتی ہیں۔ یہ ساری صورتیں عاریت کے حکم میں ہیں۔

ان کے علاوہ خاص طور پر عاریت کی دو صورتوں کی تفصیل ذکر کی جاتی ہیں:

۱۔دلہن کا زیور:

آج کل شادی بیاہ کے موقع پر دلہن کو سسرال یا شوہر کی طرف سے کچھ زیورات وغیرہ دیے جاتے ہیں اور جب کبھی طلاق یا جدائی کی نوبت آتی ہے تو ایسے زیورات کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے کہ یہ زیور کس کی ملکیت ہے۔ایسے زیور کے حکم میں مندرجہ ذیل تفصیل ہے:

۱۔اگر شادی کے موقع پر دلہن کو دیے جانے والے زیورات اُس کو بطور ہبہ (گفٹ) مالک بنا کر دیے جائے اور اس بات کی وضاحت بھی کر دی گئی تو ایسا زیور ہبہ ہے اور دلہن ہی کی ملکیت ہے۔یہی حکم اس صورت کا بھی ہے کہ دلہن کو زیوارت مہر میں دے دیے جائیں۔

۲۔اگر دلہن کو ایسے زیورات بطور عاریت (محض استعمال کے لیے) دیے جائیں اور باقاعدہ اس بات کی وضاحت بھی ہو جائے کہ یہ زیور صرف عارضی طور پر استعمال کے لیے ہیں تو ایسی صورت میں یہ "عاریت" ہے اور سسرال/شوہر کی ملکیت ہوں گے جو واپس لے سکتے ہیں۔

۳۔اور اگر زیورات دیتے وقت کوئی وضاحت نہیں کی گئی کہ یہ زیورات بطور ہبہ دیے جا رہے ہیں یا بطور عاریت (عارضی طور پر استعمال کے لیے) دیے جا رہے ہیں تو ایسی صورت میں معاشرے کے عام عرف اور رواج کے مطابق عمل کیا جائے گا۔اگر اس علاقے اور معاشرے یا خاندان کا عام عرف یہ ہو کہ شادی کے موقع پر سسرال/شوہر کی طرف سے دیے جانے والی اشیاء بطور ہبہ (گفٹ) دی جاتی ہوں تو وہ زیورات دلہن کی ملکیت ہوں گی، اور اگر وہاں بطور عاریت (محض استعمال کے لیے) دیے جانے کا رواج ہو تو پھر یہ زیورات "عاریت" ہوں گے اور دینے والے واپس وصول کر سکتے ہیں۔[1]

۲۔مکتبہ/لائبریری کی کتابیں:

آج کل مختلف مکتبہ اور لائبریریوں والے لوگوں کو مطالعہ کے لیے مختلف کتابیں، ناول، رسائل و جرائد وغیرہ دیتے ہیں، اس کی بھی بعض صورتیں عاریت میں آتی ہیں۔اس کی ممکنہ صورتیں اور ان کا حکم حسبِ ذیل ہیں:

---

[1] الفتاوی الهندية ۱ / ۳۲۷

۱۔اس کی ایک صورت یہ ہے کہ لائبریری والے کسی کو مطالعہ کے لیے متعین دنوں کے لیے کوئی کتاب/ کتابیں دیتے ہیں اور اس پر باقاعدہ فی کتاب یا فی یوم کے حساب سے فیس وصول کرتے ہیں۔اس کے ساتھ بسا اوقات کتاب کی قیمت کے برابر رقم بطورِ سیکورٹی بھی رکھتے ہیں، تاکہ اگر کسی سے کتاب ضائع ہو جائے تو اس نقصان کی تلافی کی جاسکے، ورنہ کتاب کی واپسی پر سیکورٹی کی رقم واپس کردی جاتی ہے۔یہ صورت در حقیقت اجارہ/کرایہ داری کی ہے جس میں ایک متعین اجرت کے بدلے کتب کو کرایہ پر دیا جاتا ہے۔اگر وقت اور اجرت دونوں معلوم و متعین ہو اور کوئی اور شرعی خرابی نہ ہو تو یہ جائز ہے، بلکہ سیکورٹی میں رقم رکھنے کی بھی اجازت ہے۔

۲۔دوسری صورت یہ ہے کہ مکتبہ /لائبریری والے لوگوں کو بلا عوض اور مفت میں مطالعہ کے لیے کتابیں دیتے ہیں۔یہ صورت در حقیقت ''عاریت'' کی ہے۔اس میں اگر کتاب لے جانے والے سے کتاب کسی کوتاہی و غفلت کے بغیر ضائع ہو جائے تو اس پر کوئی ضمان لازم نہیں ہو گا، البتہ اگر اس نے کسی قسم کی کوتاہی کی ہو تو اس پر ضمان لازم ہو گا۔

۳۔بسا اوقات لوگ کسی مکتبہ /مدرسہ میں کتابیں وقف کر کے دیتے ہیں اور وہ مکتبہ /مدرسہ والے خاص اپنے ہی طلبہ واساتذہ کو ایسی کتابیں عاریت پر دیتے ہیں۔یہ صورت بھی جائز ہے، لیکن مکتبہ /مدرسہ کے لیے وقف کتابیں باہر کے لوگوں کو عاریت پر دینا درست نہیں ہو گا، کیونکہ عموماً وقف کرنے والوں کی طرف سے اس کی اجازت نہیں ہوتی، البتہ اگر وقف کرنے والوں کی طرف سے اس کی اجازت ہو تو پھر جائز ہے۔[1]

---

[1] الدر المختار ٤ / ٣٦٥

۴۔ قرض کے اصولی مباحث واحکام

(Loan/Qard)

قرض کے اصولی مباحث واحکام کو مندرجہ ذیل آٹھ نکات میں بیان کیا جائے گا:

۱۔ قرض کا تعارف	۲۔ قرض کا حکم
۳۔ قرض کی شرائط	۴۔ قرض کی اقسام
۵۔ قرض کی ادائیگی اور وصولی	۶۔ قرض پر نفع
۷۔ قرض کے عمومی ضوابط	۸۔ قرض کی جدید صورتیں

۱۔ قرض کا تعارف

عربی میں ''قرض'' کے لغوی معنی کاٹنے اور قطع کرنے کے آتے ہیں اور ہر وہ چیز یا عمل جس پر جزاء اور بدلہ ملے، اسے بھی قرض کہتے ہیں۔ اسی طرح کسی کو مال اس نیت سے دینا کہ واپس لیا جائے گا، اسے بھی قرض کہا جاتا ہے۔

علامہ ابن فارس لکھتے ہیں:

(قرض) القاف والراء والضاد أصل صحيح، وهو يدل على القطع. يقال: قرضت الشيء بالمقراض. والقرض: ما تعطيه الإنسان من مالك لتقضاه.[1]

قاف، راء، ضاد کا ایک صحیح اصول ہے کہ یہ الفاظ، کاٹنے پر دلالت کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ: میں نے مقراض سے کوئی چیز کاٹی۔ قرض وہ چیز ہے جو مالک کسی انسان کو واپس مطالبہ کی بنیاد پر دیتا ہے۔

جہاں تک فقہی اصطلاح کی بات ہے تو اس سلسلے میں فقہاء حنفیہ نے قرض کی تعریف میں مثلی اشیاء کی تخصیص کی ہے، جبکہ دیگر ائمہ نے ایسی کوئی تخصیص نہیں کی، اس کی مزید تفصیل قرض کی شرائط کے تحت آجائے گی، یہاں صرف فقہاء حنفیہ کی تعریف پر اکتفاء کیا جاتا ہے:

علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں:

مَا تُعْطِيهِ مِنْ مِثْلِيٍّ لِتَتَقَاضَاهُ، عَقْدٌ مَخْصُوصٌ يَرِدُ عَلَى دَفْعِ مَالٍ مِثْلِيٍّ لِآخَرَ لِيَرُدَّ

[1] معجم مقاييس اللغة ٥/ ٧١

مِثْلَهُ.[1]

قرض ایسی مثلی چیز کو کہتے ہیں جو آپ کسی کو اس لیے دیتے ہیں تاکہ اس سے واپس وصول کریں۔ بالفاظِ دیگر قرض ایسا خاص قسم کا عقد یا معاملہ ہے جس میں کسی دوسرے شخص کو کوئی مثلی چیز دی جاتی ہے، تاکہ وہ اس چیز کی مثل واپس کرے۔

مرشد الحیران میں قرض کی تعریف یوں کی گئی ہے:

القرض: هو أن يدفع شخص لآخر عينا معلومة من الأعيان المثلية التي تستهلك بالانتفاع بها ليرد مثلها.[2]

قرض یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کو مثلی اشیاء میں سے کوئی معلوم چیز دے دے تاکہ وہ شخص اس چیز کو باقاعدہ خرچ کر کے استعمال کرے اور پھر اس کی مثل واپس کر دے۔

"مثلی" سے مراد ایسی چیز ہے جس کی طرح اور ہو بہو، بغیر کسی فرق دوسری چیز مہیا کی جا سکتی ہو، مثلاً گندم، مکئی یا کرنسی وغیرہ۔ ایسی چیز جب کسی کو بلا عوض، عارضی طور پر صرف استعمال کے لیے دی جائے تو اسے **"قرض"** کہتے ہیں۔

"قرض" اور **"عاریت"** میں یہ فرق ہے کہ عاریت میں کسی چیز کی عین اور ذات کو باقی رکھ کر اس سے نفع حاصل کیا جاتا ہے، جبکہ قرض میں چیز کو باقی نہیں رکھا جاتا، بلکہ اس چیز کو خرچ کر کے بعد میں اس جیسی چیز واپس کی جاتی ہے۔

جہاں تک **"دین"** کی بات ہے تو یہ قرض سے عام ہے، کیونکہ فقہ میں ہر اس مالی حق کو دین کہتے ہیں جو ایک انسان کے لیے دوسرے کے ذمہ لازم ہو جائے، جبکہ قرض، دین کی ایک خاص صورت کو کہتے ہیں۔ دین کی تفصیل اور دین و قرض میں فرق وغیرہ کے لیے کتاب کے آخری باب میں موجود مقالہ "قرضوں کی خرید و فروخت" ملاحظہ فرمائیں۔

اسی طرح ایک اور لفظ **"سلف"** بھی ہے جو قرض سے عام ہے، کیونکہ سلف کا لفظ کبھی قرض کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی بیع سلم اور اُدھار معاملہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

۲۔ قرض کا حکم

اس عنوان کے تحت تین نکات کی وضاحت مقصود ہے:

---

[1] الدر المختار ٥/ ١٦١

[2] مرشد الحيران إلى معرفة أحوال الإنسان ص: ١١٢، (مادة ٦٨٦)

۱۔ عقدِ قرض کا لزوم
۲۔ قرض کا اصل حکم
۳۔ مختلف احوال کا حکم

۱۔ عقدِ قرض کا لزوم:

اس بات پر تو تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ قرض ایک عقدِ تبرع ہے اور یہ بھی متفقہ بات ہے کہ جو شخص کسی سے قرض لیتا ہے اس کے حق میں عقدِ قرض کوئی لازم عقد نہیں ہے، بلکہ وہ جب چاہے قرض واپس کر کے عقدِ قرض کو ختم کر سکتا ہے۔

جہاں تک قرض دینے والے کی بات ہے تو اس کے بارے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں:

۱۔ فقہاء حنابلہ کے ہاں اور ایک قول کے مطابق فقہاء شافعیہ کی رائے یہ ہے کہ جب تک قرض پر قبضہ نہ ہو جائے تو یہ عقد لازم نہیں ہے، لیکن جب قرض لینے والے نے قرض پر قبضہ کر لیا تو اب قرض دینے والے کے لیے وہی چیز/مال واپس لینا جائز نہیں ہے، بلکہ اس کے حق میں یہ قرض کا عقد لازم ہو گیا ہے۔ اس پر لازم ہے کہ قرض لینے والے کو قرض استعمال کرنے کی مہلت دے دے اور بعد میں اس سے اس کی مثل واپس وصول کرے۔

۲۔ فقہاء مالکیہ کی رائے یہ ہے کہ قرض دینے والے نے اگر صرف زبانی طور پر قرض دے دیا، ابھی تک دوسرے کو قبضہ میں نہیں دیا تو بھی اس کے حق میں عقد لازم ہو جائے گا اور اس پر لازم ہو گا کہ قرض دے دے۔

۳۔ فقہاء حنفیہ اور راجح قول کے مطابق فقہاء شافعیہ کی رائے یہ ہے کہ عقدِ قرض کسی بھی صورت میں کوئی لازم عقد نہیں ہے، بلکہ قرض دینے والا کسی بھی وقت اپنے قرض کا مطالبہ کر سکتا ہے۔[۱]

۲۔ قرض کا اصل حکم:

قرض کا اصل حکم جواز کا ہے، لہذا اگر قرض میں کسی قسم کی شرعی خرابی نہ ہو تو قرض لینا یا دینا جائز ہے، بلکہ ضرورت کے موقع پر کسی کی مدد کے لیے قرض دینا باعثِ اجر و ثواب بھی ہے۔ کئی احادیث سے قرض کا جواز ثابت ہے، مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

ما من مسلم يقرض مسلما قرضا مرتين إلا كان كصدقتها مرة.[۲]

---

[۱] فقه المعاملات ۱/ ۷۰۱

[۲] سنن ابن ماجه ۲/ ۸۱۲، حديث نمبر: ۲۴۳۰

کوئی بھی مسلمان جب دوسرے کو دو بار قرض دیتا ہے تو یہ ایسا ہے جیسے ایک بار صدقہ کرنا۔

اسی وجہ سے قرض لینے اور دینے کے جواز پر فقہاء کا اجماع ہے۔ علامہ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں:

أجمع المسلمون على جواز القرض.[1]

۳۔ مختلف احوال:

قرض کا اصل حکم تو یہ ہے کہ یہ جائز ہے، لیکن چونکہ قرض ایک قسم کا وسیلہ یا معاملہ ہے، اس لیے اس پر مختلف احوال پیش آسکتے ہیں، جن کا حکم بھی الگ الگ ہوگا، مثلاً:

۱۔ اگر کوئی شخص کسی مجبور کی مدد کی خاطر اس کو قرض دیتا ہے اور اس میں کسی قسم کے اضافہ وغیرہ کی شرط بھی عائد نہیں کرتا تو یہ نہ صرف جائز، بلکہ مستحب و باعثِ اجر و ثواب ہے، کیونکہ کئی احادیث سے یہ ثابت ہے کہ ایک مسلمان سے کوئی مصیبت و تنگی دور کرنا دنیا و آخرت کی سعادت اور اللہ کی رحمت کا سبب ہے۔

۲۔ اگر کوئی شخص کسی کو قرض دیتا ہے اور اس میں کسی قسم کے اضافہ یا اس قرض پر قرض دینے والا کسی بھی قسم کا نفع حاصل کر رہا ہے تو یہ سود کے زمرے میں آتا ہے اور ناجائز ہے۔ اسی طرح اگر کسی کا قرض لیتے وقت واپس ادائیگی کی نیت ہی نہ ہو تو اس کے لیے قرض لینا حرام ہے۔

۳۔ اگر قرض لینے والے شخص کو یہ اطمینان ہے کہ وہ قرض باآسانی واپس کر لے گا، ادائیگی کے اسباب بھی متوقع ہوں اور قرض پر کسی قسم کا سود و نفع بھی نہیں دینا پڑ رہا ہے تو ایسی صورت میں قرض لینے والے کے لیے قرض لینا جائز ہے۔

۴۔ اگر قرض لینے والے کو قرض پر کسی قسم کا سود یا نفع نہیں دینا پڑ رہا ہے، لیکن اسے یہ اطمینان و یقین نہیں ہے کہ وہ قرض واپس کر سکے گا، قرض کی ادائیگی کے اسباب بظاہر متوقع نہ ہوں، بلکہ قرض کی ادائیگی مشکل ہو تو ایسے شخص کے لیے کسی سے قرض لینا ناپسندیدہ و مکروہ ہے، الا یہ کہ سخت ضرورت و مجبوری کی حالت ہو۔

۵۔ جہاں تک کسی عبادت، مثلاً حج یا عمرہ یا تبلیغ پر جانے کے لیے قرض لینے کی بات ہے تو علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی عبادت واجب ہو چکی ہو (جیسے حج) اور قرض کو واپس کرنے کے اسباب بھی موجود ہوں اور اطمینان ہو تو پھر اس عبادت کے لیے قرض لیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی عبادت واجب ہی نہیں ہے، جیسے عمرہ یا تبلیغ یا کوئی عبادت واجب تو ہو گئی ہے، لیکن قرض کی واپس ادائیگی مشکل ہو تو ان دونوں صورتوں میں قرض نہ لیا جائے، قرض لینا ناپسندیدہ ہے۔[2]

[1] المغني ٤/ ٣٨٢

۳۔ قرض کی شرائط

قرض کے لیے فقہاء نے کئی شرائط مقرر کی ہیں، جن کو چار اقسام میں جمع کیا جاسکتا ہے:

۱۔ مقرِض (قرض دینے والے) کی شرائط

۲۔ مستقرض (قرض لینے والے) کی شرائط

۳۔ مال کی شرائط

۴۔ نفسِ قرض کی شرط

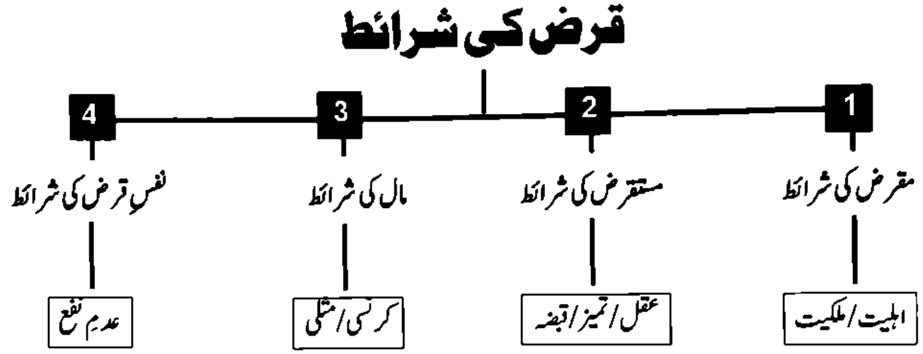

۱۔ مقرض (قرض دینے والے) کی شرائط:

الف۔ قرض دینے والے کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ تبرع کی اہلیت رکھتا ہو، ورنہ وہ قرض نہیں دے سکتا۔ تبرع کی اہلیت کا مطلب یہ ہے کہ قرض دینے والا عقلمند، بالغ اور آزاد ہو، لہذا مجنون، یا نابالغ بچہ یا غلام کسی کو بھی اپنا مال قرض نہیں دے سکتا۔ اسی طرح بچے کا والد بھی بچے کا مال کسی کو قرض نہیں دے سکتا۔

ب۔ قرض دینے والے کے لیے دوسری شرط یہ ہے کہ وہ اس مال کا مالک ہو، جس مال کو وہ قرض دے رہا ہے، کیونکہ انسان کسی دوسرے کا مال کسی کو قرض نہیں دے سکتا، البتہ اگر کسی کو اصل مالک نے اس بات کا وکیل مقرر کر دیا کہ یہ مال فلاں شخص کو قرض دے دو تو ایسی صورت میں وکیل کے لیے وہ مال اس شخص کو دینا جائز ہے۔

۲۔ مستقرض (قرض لینے والے) کی شرائط:

الف۔ قرض لینے والے کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ عقلمند ہو اور اچھے برے میں تمیز کر سکتا ہو۔ بالغ ہونا تو شرط نہیں ہے، لیکن یہ ضروری ہے کہ اگر کوئی شخص کسی نابالغ بچے کو قرض دے رہا ہے تو وہ بچہ سمجھ دار بھی ہو اور اس کو

اس کے ولی نے معاملات کرنے سے منع بھی نہ کیا ہو۔ ورنہ اگر کوئی شخص کسی نا سمجھ بچے کو قرض دیتا ہے یا کسی ایسے بچے کو قرض دیتا ہے جس کو ولی نے معاملات سے منع کیا ہے تو ایسے بچے کے پاس اگر وہ قرض ضائع ہو گیا تو بچہ ذمہ دار نہیں ہو گا۔

ب۔ قرض لینے والے کے لیے دوسری شرط یہ ہے کہ وہ قرض پر قبضہ بھی کرلے، کیونکہ قرض ایک عقدِ تبرع ہے اور عقدِ تبرع قبضہ کے بغیر مکمل نہیں ہوتا، اس لیے قرض کے مکمل ہونے یا قرض لینے والے کی ملکیت میں قرض اس وقت داخل ہو گا جب وہ قرض پر قبضہ کرلے گا۔

۳۔ مال کی شرط:

جس چیز/مال کو بطورِ قرض دیا جارہا ہے، اس کے لیے فقہاء حنفیہ کے ہاں ایک بنیادی شرط ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ چیز نقود/کرنسی میں سے ہو، یا مثلی چیز ہو، جیسے وزنی چیزیں (گندم، مکئی وغیرہ) یا عددیات متقاربہ میں سے ہو، یعنی ایسی چیز ہو جس کی خرید و فروخت لوگ عدد اور گنتی کے لحاظ سے کرتے ہوں اور اس کی ہر اکائی دوسرے سے زیادہ مختلف نہ ہو، بلکہ تقریباً ایک جیسے ہو، جیسے انڈے وغیرہ۔

جہاں تک دیگر ائمہ کی رائے ہے تو ان کے ہاں ہر ایسی چیز کو قرض میں دیا جا سکتا ہے جس چیز کی خرید و فروخت جائز ہے، خواہ وہ چیز مثلی ہو یا قیمی ہو، اسی لیے ان کے ہاں کسی جانور وغیرہ کو قرض میں دیا جا سکتا ہے۔[1]

۴۔ نفسِ قرض کی شرط:

عقدِ قرض کی بنیادی شرط یہ ہے کہ قرض پر کسی بھی قسم کے نفع کی شرط نہ لگائی جائے۔ اگر کوئی شخص قرض دے کر اس پر نفع کی شرط لگاتا ہے تو یہ سود اور حرام ہے، البتہ ایسی صورت میں فقہاء حنفیہ کے ہاں قرض کا عقد فاسد نہیں ہو گا، لیکن اس شرط پر عمل کرنا جائز نہیں ہو گا۔[2]

۴۔ قرض کی اقسام

قدیم و معاصر فقہاء نے قرض کی کیفیت، طریقہ کار اور مقصد کو دیکھتے ہوئے قرض کی مختلف اقسام لکھی ہیں، ان میں سے چند اہم اقسام کی مختصر وضاحت یہاں کی جاتی ہے۔ یہ کل نو (۹) اقسام ہیں:

۱۔ قرضِ حسن ۲۔ قرضِ ربوی ۳۔ قرضِ حقیقی

---

[1] الفقه الإسلامي وأدلته ٥/ ٤٤٣

[2] بدائع الصنائع ٧/ ٣٩٥

۴۔قرضِ حکمی　　۵۔قرضِ نقدی وعینی　　۶۔قرضِ استہلاکی

۷۔قرضِ انتاجی　　۸۔قوی، متوسط، ضعیف　　۹۔قروض متبادلہ

ا۔قرضِ حسن:

عمومی طور پر فقہاء نے قرض کی عام تعریف کو ہی ''قرضِ حسن'' کی تعریف قرار دیا ہے، تاہم اس سلسلے میں فقہاء حنابلہ کی مندرجہ ذیل تعریف زیادہ مناسب ہے:

دَفعُ مَالٍ إرْفَاقًا لِمَنْ يَنْتَفِعُ بِهِ وَيَرُدُّ بَدَلهُ.[1]

کسی کی سہولت وآسانی کے لیے اسے مال دینا تاکہ وہ اس سے نفع حاصل کر کے بعد میں اس کا بدل واپس کرے۔

قرضِ حسن کی تفصیلات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بنیادی طور پر دو نکات کا پایا جانا ضروری ہیں:

ا۔اس میں قرض دینے والے کو کسی قسم کا دنیوی فائدہ نہ ہو، بلکہ قرض لینے والے کا فائدہ ہو۔

۲۔دوسرا یہ کہ قرض دینے والے کی نیت میں اخلاص ہو اور وہ کسی کے ساتھ نیکی کر کے اس کی تنگی کو دور کرنا چاہتا ہو اور اخروی ثواب کی امید پر قرض دیا جائے۔

۲۔قرضِ ربوی:

اس کا مطلب ''سودی قرض'' ہے۔ایسا قرض جس میں قرض دینے والا کسی قسم کے فائدے کی شرط لگا دیتا ہے، خواہ وہ فائدہ کسی حسی اور جامد چیز (جیسے کرنسی یا سامان وغیرہ) کی شکل میں ہو یا کسی منفعت (services) وغیرہ کی شکل میں ہو۔

۳۔قرضِ حقیقی:

''قرض حقیقی'' اور ''قرض حکمی'' کی اصطلاح فقہاء شافعیہ کے ہاں ملتی ہے۔قرض حقیقی در حقیقت عام قرض کو کہتے ہیں جس میں کوئی شخص کسی دوسرے کو عارضی طور پر استعمال کرنے کے لیے کوئی چیز یا مال دیتا ہے اور پھر اسی جیسا مال اس سے واپس وصول کرتا ہے۔

---

[1] كشاف القناع عن متن الاقناع، ۲/۱

۴۔ قرضِ حکمی:

قرض حکمی کا مفہوم یہ ہے کہ کسی کو بطورِ قرض مال نہ دیا جائے، بلکہ کسی کی حاجت وضرورت پوری کرنے کے لیے اس پر قرض کی نیت سے مال خرچ کیا جائے، جیسے بھوکے کو کھانا کھلانا، یا کسی کو کپڑے پہنانا یا کسی یتیم پر کچھ مال خرچ کرنا وغیرہ۔[1]

یہ قسم دیگر فقہاء کے ہاں ''دین'' کے زمرے میں آتا ہے، تاہم اس کی مختلف صورتوں کا حکم مختلف ہے۔

۵۔ قرضِ نقدی وعینی:

''قرضِ نقدی'' کا مفہوم یہ ہے کہ نقود/کرنسی کسی کو قرض پر دینا، جبکہ ''قرض عینی'' کا مفہوم ہے کسی عین/چیز یاسامان کسی کو قرض پر دینا، مثلاً گندم، یا چاول وغیرہ۔

۶۔ قرضِ استہلاکی:

یہ ایسے قرض کو کہتے ہیں جس میں قرض لینے والے کا مقصد شخصی ضروریات کو پورا کرنا ہوتا ہے، یہ قرض کسی کاروباری مقصد کے لیے نہیں ہوتا، جیسے گھر بنانے کے لیے قرض لینا، یا گھر کے ضروری اخراجات کے لیے قرض لینا وغیرہ۔ اس کو انگریزی میں (consumer debt) کہتے ہیں۔

۷۔ قرضِ انتاجی:

یہ ایسے قرض کو کہتے ہیں جس میں قرض لینے والے کا مقصد کوئی کاروبار کرنا یا اپنے کاروبار کو جاری رکھنا اور اس قرض پر مزید پیسہ کمانا ہوتا ہے، جیسے کوئی کمپنی اپنے خام مال کے لیے کسی بینک وغیرہ سے قرض لیتی ہے یا ایکسپورٹ، ایمپورٹ کے لیے جو قرض لیا جاتا ہے۔ ایسے قرض کو انگریزی میں (investment loans) کہتے ہیں۔

۸۔ قوی، متوسط، ضعیف:

قرض کی یہ تقسیم عمومی طور پر فقہاء ''کتاب الزکوۃ'' میں ذکر کرتے ہیں، کیونکہ اس کا تعلق زکوۃ کے وجوب اور عدمِ وجوب اور ادائیگی سے ہے۔ اس کے لیے قرض کے بجائے، ''دین'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

''دین قوی'' اس قرض کو کہتے ہیں جس میں کسی کو نقدی یا سونا یا چاندی قرض پر دیا جائے، یا کسی کو تجارت کا مال بیچا جائے، جس کے بدلے اس پر قیمت (دین/قرض) کی ادائیگی واجب ہو۔ اس پر بہر صورت زکوۃ واجب ہوتی ہے، اگرچہ

---

[1] تحفة المحتاج ٥/ ٤٠

وصول نہ ہوا ہو۔

"دین متوسط" اس دین یا قرض کو کہتے ہیں جو کسی کو مال تجارت کے علاوہ کوئی اور چیز بیچنے کی وجہ سے لازم ہو گیا ہو، جیسے کسی نے اپنی ضرورت یا استعمال کی چیز کسی پر بیچ دی۔ اس پر بھی زکوۃ واجب ہے، البتہ ادائیگی وصولی کے بعد واجب ہوتی ہے۔

"دین ضعیف" وہ دین یا قرض ہے جو کسی پر ایسی چیز کے بدلے واجب ہوا ہو جو حقیقت میں مال ہی نہ ہو، جیسے بیوی کا مہر، قتل کے صلح کا مال وغیرہ۔ اس پر وصولی سے پہلے زکوۃ واجب ہی نہیں ہوتی اور جب وصول ہو جائے اور مالک، نصاب کا مالک ہو تو اس کے بعد کے سالوں میں دیگر اموال کے ساتھ اس مال کی بھی زکوۃ نکالے گا۔[۱]

۹۔ قروض متبادلہ:

یہ قرض کی ایک جدید صورت ہے، اس میں ایک شخص یا ادارہ کسی دوسرے شخص یا ادارے سے اس شرط پر قرض لیتا ہے کہ قرض لینے والا بھی اس کو قرض دے گا، مثلاً ایک بینک دوسرے بینک سے کچھ مدت کے لیے ڈالرز قرض لے کر اسی بینک کو ریال میں قرض دیتا ہے۔ اس میں رقم اور ڈیڈ لائن میں توازن کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔ اس کو انگریزی میں (reciprocal loans) کہتے ہیں۔ اس صورت کو بعض علماءِ عصر نے ممنوع لکھا ہے، کیونکہ اس میں قرض کے ایک معاملہ میں، قرض کے دوسرے معاملہ کی شرط لگائی جاتی ہے اور یہ (صفقة فی صفقة) کی خرابی ہے۔ تاہم اکثر علماءِ عصر اس کی اجازت دیتے ہیں، بشرطیکہ سود سے بچا جائے اور قرض پر کسی کو بھی نفع نہ دیا جائے۔[۲]

۵۔ قرض کی ادائیگی اور وصولی

اس عنوان کے تحت بنیادی طور پر دو باتوں کی تفصیل عرض کی جائے گی:

۱۔ قرض کی ادائیگی کی صورتیں

۲۔ قرض کی وصولی کے اصول

قرض کی ادائیگی کی تقریباً سات صورتیں ہیں، جبکہ قرض کی وصولی کے کچھ اہم اصولوں کا بھی تذکرہ کیا جائے گا۔

ان دونوں نکات کی تفصیل سے پہلے ذیل کا خاکہ ذہن میں رکھیں:

---

[۱] بدائع الصنائع ۲/ ۱۰

[۲] فقه المعاملات ۲/ ۱۷۷

قرض کی ادائیگی اور وصولی

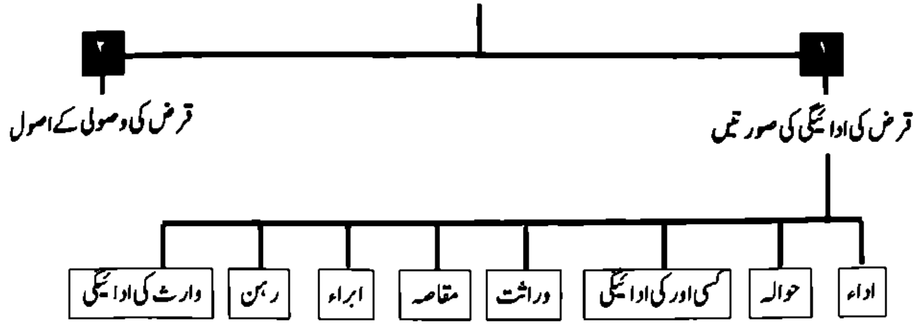

۱۔قرض کی ادائیگی کی صورتیں:

قرض/دین کی ادائیگی اور اس کے ساقط ہونے کی کئی صورتیں ہیں، جن کو مختصراً ذیل میں بیان کیا جاتا ہے:

۱۔اداء: اگر مقروض/مدیون اپنے اوپر لازم قرض کو اداء کر دیتا ہے تو وہ بری ہو جاتا ہے۔ اگر قرض خواہ/دائن زندہ ہو تو اس کو اس کا قرض دینا یا اگر اس کا انتقال ہو چکا ہے تو اس کے ورثاء کو اس کا قرض دینا ضروری ہے۔

۲۔حوالہ: عقدِ حوالہ سے بھی مقروض/مدیون اپنے اوپر قرض سے بری ہو جاتا ہے۔ مثلاً زید کے ذمہ عمر کا قرض ہے اور خالد نے اس کی ادائیگی کی ضمانت لیتے ہوئے کہہ دیا کہ آئندہ زید سے مطالبہ نہیں کیا جائے گا تو یہ ''عقدِ حوالہ'' ہے اور اس کی وجہ سے زید فی الحال قرض سے بری ہو جائے گا۔

۳۔کسی اور کی ادائیگی: اگر مقروض کی طرف سے کسی اجنبی شخص نے اس کا قرض ادا کر دیا تو اس سے بھی مقروض شخص کے ذمہ سے قرض ساقط ہو جاتا ہے اور وہ بری ہو جاتا ہے۔ اگر مقروض نے خود اجنبی شخص سے درخواست کی تھی یا حکم دیا تھا کہ میرا قرض ادا کر دو تو ایسی صورت میں جس اجنبی شخص نے قرض ادا کیا ہے وہ مقروض (جس کی طرف سے اس نے قرض ادا کیا ہے اس) سے ادا کردہ رقم کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ لیکن اگر مقروض نے اجنبی شخص کو کوئی حکم یا درخواست نہیں کی تھی، بلکہ اس نے احسان کے طور پر خود ہی کسی دوسرے کا قرض ادا کر دیا تو اب وہ شخص مقروض سے اس رقم کا مطالبہ نہیں کرے گا جو اس نے ادا کی ہے۔

۴۔وراثت: اگر قرض خواہ/دائن کا انتقال ہو جائے اور اس کے ورثاء میں سے صرف وہی ایک شخص ہو جو مرحوم کا مقروض ہے تو ایسی صورت میں بھی مقروض کے ذمہ سے قرض ساقط ہو جائے گا، کیونکہ قرض خواہ کے انتقال کے بعد مقروض ہی اس کے مال و ترکہ کا وارث و مالک ہے تو یہ شخص اس قرض کا بھی مالک ہو جائے گا جو اس کے ذمہ تھا۔ جیسے والد نے اپنے بیٹے کو کچھ مال بطورِ قرض دیا تھا اور والد کے انتقال کے بعد اس کا اس ایک بیٹے کے علاوہ کوئی بھی وارث نہیں ہے

تو بیٹا اس قرض سے بری ہو جائے گا۔

۵۔مقاصہ: اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کا دوسرے کے ذمہ قرض/دین لازم ہو جائے اور پھر کسی وجہ سے قرض خواہ کے ذمہ مقروض کا بھی اتنا ہی قرض/دین لازم ہو جائے تو دونوں قرضوں کا آپس میں مقاصہ / برابری ہو جاتی ہے اور دونوں کی ادائیگی بھی ہو جاتی ہے۔ لہذا اس کے بعد کوئی بھی دوسرے سے اپنے قرض/دین کا مطالبہ نہیں کرے گا۔ مثلاً زید کے ذمہ عمر کے ایک لاکھ روپے قرض/دین ہیں اور پھر کسی معاملہ کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے عمر کے ذمہ بھی زید کے ایک لاکھ روپے لازم ہو گئے۔ ایسی صورت میں دونوں قرضوں میں مقاصہ ہو جائے گا اور ہر فریق ایک، ایک لاکھ سے بری ہو جائے گا۔ مقاصہ کے لیے دونوں فریقین کی باہمی رضامندی ضروری نہیں ہے، تاہم فقہاء نے بغیر رضامندی کے مقاصہ کے لیے چند شرائط کا تذکرہ کیا ہے: [1]

الف۔ پہلی شرط یہ ہے کہ دونوں طرف قرض/دین ہو۔ اگر ایک طرف قرض ہو اور دوسری طرف امانت ہو تو ایسی صورت میں مقاصہ نہیں ہو گا۔ مثلاً زید پر عمر کے ایک لاکھ روپے قرض لازم ہیں، جبکہ زید نے عمر کو ایک لاکھ بطورِ امانت دے دیے تو بغیر رضامندی کے مقاصہ نہیں ہو گا۔

ب۔ دونوں طرف کے قرضوں/دیون نقد و حال ہوں، لہذا اگر دونوں کی ادائیگی مؤجل و مؤخر یعنی ادھار ہو یا ایک کی ادائیگی فوری ضروری ہو، جبکہ دوسرے کی ادائیگی فوری ضروری نہ ہو تو بھی بغیر رضامندی کے مقاصہ نہیں ہو گا۔

ج۔ دونوں قرض/دیون قوت میں برابر ہو، ورنہ بغیر رضامندی مقاصہ نہیں ہو گا۔ مثلاً بیوی کے ذمہ شوہر کا قرض ہو اور بیوی اپنے شوہر سے نفقہ کا مطالبہ کرے، جو درحقیقت قرض/دین ہی کے حکم میں ہے تو اس قرض اور نفقہ کا آپس میں مقاصہ نہیں ہو گا، کیونکہ نفقہ کی قوت کم ہے۔

د۔ دونوں قرضوں/دیون کی جنس ایک ہو۔ لیکن متاخرین علماء نے ٹال مٹول کی صورت میں قرض خواہ کو مختلف جنس کی چیز سے بھی اپنا قرض وصول کرنے کی اجازت دی ہے، اگرچہ دوسرا فریق راضی نہ ہو۔

۶۔ابراء: اگر قرض خواہ نے مقروض شخص کو قرض سے بری کر کے قرض معاف کر دیا تو اس سے بھی قرض ساقط ہو جاتا ہے اور مقروض بری ہو جاتا ہے۔ ابراء یا براءت کی دراصل دو صورتیں ہیں:

الف۔ قرض خواہ کو یہ معلوم ہے کہ مقروض پر میرا حق/قرض لازم ہے، اس کے باوجود اس نے اپنا حق/قرض معاف کر کے مقروض کو بری کر دیا تو ایسی صورت میں اتفاقی طور پر مقروض بری ہو جاتا ہے اور قرض خواہ کو دوبارہ مطالبہ

---

[1] الدر المختار وحاشية ابن عابدين ٥/ ٢٦٦

کرنے کا حق حاصل نہیں ہو گا۔

ب۔قرض خواہ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ مقروض کے ذمہ میرا حق/قرض لازم ہے،اس نے بغیر علم کے مقروض کو اپنے حق سے بری کر دیا تو ایسی صورت میں قضاء تو مقروض بری ہو جاتا ہے، لیکن دیانۃ مقروض بری ہو جائے گا یا نہیں؟اس سلسلے میں علماء کی دو آراء ہیں: بعض علماء کے ہاں مقروض دیانۃ بری نہیں ہو گا، جبکہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ ایسی صورت میں بھی مقروض دیانۃ بری ہو جائے گا۔اسی قول پر فقہاء نے فتویٰ دیا ہے، کیونکہ ابراء یا براءت در حقیقت اپنے حق کو ساقط کرنے کا نام ہے اور فقہی اصول ہے کہ "الجهالة لا تمنع صحة الإسقاط" کہ جہالت، اسقاط کے صحیح ہونے کے لیے مانع نہیں ہے۔[1]

۷۔رہن: اگر مقروض نے قرض کے بدلے قرض خواہ کے پاس اپنی کوئی چیز بطورِ رہن رکھی تھی اور وہ چیز قرض خواہ کے پاس ضائع ہو گئی تو ایسی صورت میں اصول یہ ہے کہ قرض خواہ پر قرض اور رہن میں رکھی ہوئی چیز میں سے جس کی قیمت کم ہو گی، اس کا ضمان لازم ہو جائے گا۔ مثلاً اگر رہن کی چیز کی قیمت زیادہ تھی اور قرض کم تھا تو قرض ساقط ہو جائے گا اور قرض خواہ سے اضافی قیمت کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اضافی قیمت امانت کے حکم میں ہے۔اگر چیز کی قیمت کم تھی اور قرض زیادہ تھا تو ایسی صورت میں مقروض کے ذمہ سے رہن کی قیمت کے برابر قرض ساقط ہو جائے گا اور بقیہ قرض واپس کرنا ہو گا۔

۸۔وارث کی ادائیگی: اگر مقروض نے اپنی زندگی میں قرض ادا نہیں کیا اور اس کا انتقال ہو گیا تو ایسی صورت میں اگر مرحوم نے ترکہ میں مال چھوڑا ہے تو ورثاء کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ مرحوم کا قرض پہلے ادا کریں،اس کے بعد میراث تقسیم کریں۔ جب ورثاء اپنے مورث مرحوم کا قرض ادا کر لیتے ہیں تو اس سے بھی قرض ادا ہو جاتا ہے اور مرحوم کے ذمہ سے حق ساقط ہو جاتا ہے،اس کے بعد اس سے کسی قسم کا مطالبہ نہیں کیا جاتا۔[2]

۲۔قرض کی وصولی کے اصول:

قرض کی وصولی کے بنیادی اصول مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔قرض کا اصول ہے کہ مقروض شخص نے جو چیز بطورِ قرض لی ہے،اس کی مثل قرض خواہ کو واپس کی جائے گی۔ قرض میں لی ہوئی چیز کی جنس کے بجائے کوئی اور جنس کی چیز دینا یا اس سے کم کوالٹی کی چیز واپس کرنا یا اس سے

[1] بدائع الصنائع ۵/ ۱۷۳

[2] درر الحكام في شرح مجلة الأحكام ۳/ ۸۹

اعلیٰ کو الٹی کی چیز واپس کرنا درست نہیں ہے۔ البتہ اگر قرض خواہ راضی ہو اور باقاعدہ شرط نہ لگائی جائے تو پھر جائز ہے۔

۲۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ قرض کی وصولی قرض خواہ کا حق ہے، لہذا وہ خود ہی قرض وصول کرے گا یا اس کا کوئی نائب قرض وصول کرے گا۔ نائب میں ایک تو اس کا وکیل شامل ہے، دوسرا اگر قرض خواہ کا انتقال ہو چکا ہو تو اس کے ورثاء بھی اس کے نائبین ہیں۔ اسی طرح اگر اس نے اپنا کوئی وصی و نگران مقرر کیا ہے تو وہ بھی اس کا نائب ہے۔ یہ سب مرحوم کا قرض وصول کر سکتے ہیں۔

۳۔ اگر قرض خواہ کے ہاتھ مقروض کی کوئی چیز آجائے تو اصول یہ ہے کہ مقروض کی اجازت کے بغیر اس چیز سے اپنا حق/قرض وصول نہ کرے، لیکن اگر مقروض ٹال مٹول کرتا ہے تو اس کی چیز سے قرض خواہ اپنا حق وصول کر سکتا ہے۔

۴۔ اگر قرض کو مؤجل کر دیا گیا اور یہ طے ہو گیا کہ قرض خواہ اپنا قرض ایک خاص مدت کے بعد ہی وصول کرے گا، اس سے پہلے وصول نہیں کرے گا تو کیا اس مدت سے قبل قرض خواہ اپنے قرض کا مطالبہ کر سکتا ہے؟

اس سوال کے جواب سے پہلے یہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ یہاں قرض کی بات ہو رہی ہے، جس میں ایک انسان دوسرے کو احسان کے طور پر کوئی مثلی چیز/کرنسی وغیرہ عارضی طور پر دیتا ہے، اس میں فقہاء کا اختلاف ہے، جو آگے آرہا ہے۔ جہاں تک "دین" کی بات ہے، جیسے کسی چیز کو خریدنے کی وجہ سے انسان پر قیمت لازم ہو جائے وغیرہ تو اس کو ادھار کیا جا سکتا ہے اور وقت آنے سے پہلے "دین" کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔

قرض کی تاجیل میں فقہاء کے دو اقوال ہیں:

۱۔ فقہاء مالکیہ، ظاہریہ، علامہ ابن تیمیہ، علامہ ابن قیم اور علامہ شوکانی رحمہم اللہ کی رائے یہ ہے کہ اگر قرض کی وصولی کے لیے کوئی وقت مقرر کیا گیا تو یہ تاجیل و ادھار لازم ہے اور قرض خواہ کو اس وقت سے پہلے اپنے قرض کے مطالبہ کا حق حاصل نہیں ہوگا۔[1]

۲۔ دیگر علماء کی رائے یہ ہے کہ قرض کی وصولی کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں کیا جا سکتا، اگر وقت مقرر کر دیا گیا تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے، بلکہ قرض خواہ کو ہر وقت اپنے قرض کے مطالبہ کا حق حاصل ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرض ابتداء ایک تبرع و احسان ہوتا ہے اور تبرع و احسان میں اجل/وقت کو لازم نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ قرض کا معاملہ انتہاء ایک قسم کی بیع ہے کہ جو چیز قرض میں لی تھی، اسی جیسی چیز واپس کی جائے گی اور ہم جنس اشیاء کی بیع میں ادھار

(۱) ارشاد السالک ص: ۱۴۹

ناجائز ہوتا ہے۔[1]

دو صورتیں ایسی ہیں جن میں قرض کے لیے مقرر کیا گیا وقت فقہاء حنفیہ کے ہاں لازم ہو جاتا ہے اور قرض خواہ کو وقت سے پہلے مطالبہ کا حق حاصل نہیں ہوتا:

۱۔ قرض بطورِ وصیت: اگر کسی شخص نے یہ وصیت کرلی کہ میرے مال سے فلاں شخص کو مثلاً ایک سال تک کے لیے اتنی رقم بطورِ قرض دے دی جائے تو یہ مدت لازم ہو جاتی ہے اور جس کو قرض ملا ہے، اس سے ایک سال سے پہلے قرض کی واپسی کا مطالبہ درست نہیں ہوگا۔

۲۔ حوالہ / کفالہ: اگر مقروض کے قرض کی ادائیگی کی ضمانت کوئی تیسرا شخص اپنے ذمہ لیتا ہے اور قرض خواہ کے ساتھ یہ معاہدہ ہو جاتا ہے کہ وہ ضمانت لینے والے شخص سے ایک خاص مدت کے بعد ہی قرض کا مطالبہ کرے گا تو یہ وقت بھی لازم ہو جاتا ہے اور قرض خواہ کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ ضمانت لینے والے سے وقتِ مقررہ سے پہلے قرض کا مطالبہ کرے۔[2]

عصرِ حاضر کے اکثر علماء نے زمانے کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے قرض کی واپسی کے لیے مدت مقرر کرنے کی اجازت دی ہے اور اس قسم کے معاہدہ کو لازم قرار دیا ہے، چنانچہ معاییر شرعیہ میں ہے:

> يجوز اشتراط الأجل في القرض، فلايلزم المقترض الوفاء قبل حلول الأجل، وليس للمقرض مطالبته به قبله. أما إذا لم يشترط الأجل، فيجب على المقترض الوفاء عند الطلب.[3]
>
> قرض میں کسی خاص مدت کی شرط لگانا جائز ہے، چنانچہ مقروض پر اس مدت سے پہلے قرض واپس کرنا لازم نہ ہوگا، اور نہ ہی قرض خواہ کو اس مدت سے پہلے قرض کے مطالبہ کا حق حاصل ہوگا۔ البتہ اگر مدت کی شرط نہ لگائی گئی تو مقروض پر مطالبہ کے وقت قرض واپس کرنا واجب ہوگا۔

۲۔ قرض پر نفع

قرض خواہ کے لیے قرض پر کسی بھی قسم کا مشروط یا معروف نفع لینا جائز نہیں ہے، بلکہ یہ سود کے زمرے میں آتا ہے۔ قرض پر نفع لینے کی کئی صورتیں واقسام ہیں اور اس کے لیے کچھ حیلے بھی اختیار کیے جاتے ہیں، جن کو مختصراً یہاں ذکر

[1] فقه المعاملات ١/ ٦٦٤

[2] درر الحكام في شرح مجلة الأحكام ٣/ ٩٤

[3] المعايير الشرعية، ص:٥٢٢، رقم المعيار:١٩

کیا جاتا ہے۔اس بحث کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

۱۔ نفع کی صورتیں

۲۔ نفع کی اقسام

۳۔قرض پر نفع کے لیے حیلے

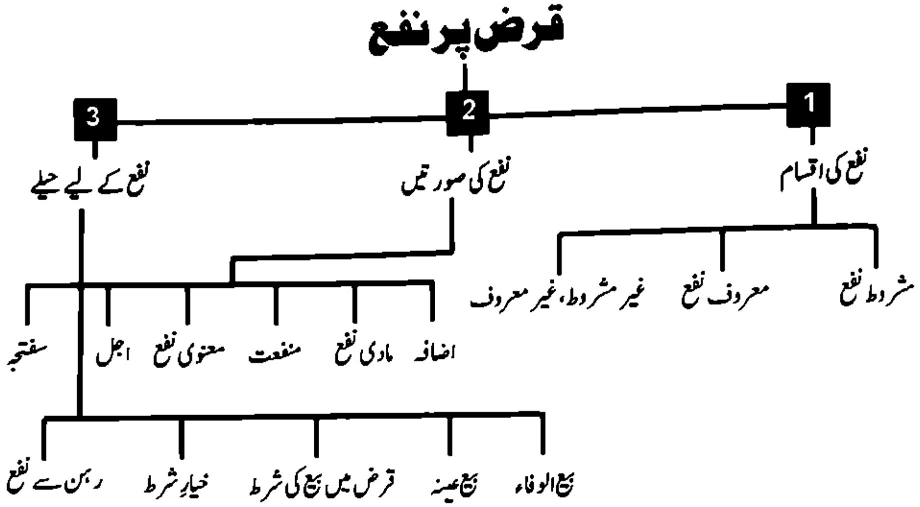

۱۔ نفع کی اقسام:

قرض پر نفع کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ مشروط نفع:

ایک قسم تو یہ ہے کہ قرض خواہ نے باقاعدہ نفع کی شرط لگا کر قرض دیا اور مقروض نے اس شرط کو قبول کر کے قرض لے لیا۔

۲۔ معروف نفع:

دوسری قسم یہ ہے کہ قرض خواہ نے قرض دیتے وقت کسی قسم کے نفع کی شرط تو نہیں لگائی، لیکن وہاں یہ بات معروف و مشہور ہو کہ اس قسم کے قرض پر قرض خواہ کو نفع دینا پڑتا ہے، جیسے کسی بینک وغیرہ کا عام معمول ہی یہ ہو کہ وہ سود پر قرض دیتا ہے تو قرض لینے والا اگر بغیر کسی شرط کے قرض لیتا ہے اور عام معمول کے مطابق بینک کو اضافہ بھی دے دیتا ہے تو یہ ''معروف نفع'' کے تحت آتا ہے۔

درج بالا دونوں قسم کا نفع زمانہ جاہلیت میں رائج سود کی صورتیں ہیں اور قرآن و حدیث کی رو سے حرام ہیں۔

۳۔ غیر مشروط و غیر معروف نفع:

اگر قرض خواہ نے قرض دیتے وقت نفع کی کوئی شرط نہیں لگائی اور نہ ہی وہاں قرض پر نفع لینے کا کوئی معمول ہو، بلکہ مقروض اپنی خوشی سے قرض خواہ کو کسی قسم کا اضافہ یا نفع دے دے تو یہ جائز ہے، بشرطیکہ یہ مقروض کے اپنے اختیار سے ہو، اس پر قضاء نفع لازم نہ کیا جاسکتا ہو، نہ اس سے مطالبہ کیا جاسکتا ہو۔[1]

۴۔ نفع کی صورتیں:

قرض خواہ کو اپنے قرض پر ملنے والا نفع مختلف شکل و صورت کا ہو سکتا ہے، مثلاً:

۱۔ قرض میں اضافہ:

قرض خواہ اپنے قرض کی مقدار سے زیادہ قرض وصول کرے۔ یہ قرض پر وصول ہونے والے نفع کی مشہور صورت ہے۔

۲۔ مادی نفع:

اس کی صورت یہ ہے کہ قرض خواہ، مقروض سے قرض میں اضافہ وصول نہیں کرتا، لیکن قرض کی وجہ سے مقروض سے کوئی اور مادی چیز وصول کرتا ہے۔ جیسے کسی دکاندار کو قرض دے کر، اس کی وجہ سے اس سے کوئی چیز سستی قیمت میں خرید لینا یا اس سے کوئی اور چیز مفت میں وصول کر لینا۔

۳۔ منفعت:

نفع کی اس صورت کا مطلب یہ ہے کہ قرض خواہ اپنے قرض کی وجہ سے مقروض کی کسی چیز سے منفعت (services) حاصل کرتا ہے۔ جیسے کسی کو قرض دے کر اس سے کوئی مکان یا زمین بطورِ رہن لے کر اس کو استعمال کرتے رہنا۔ یہ بھی اگر معروف یا مشروط ہو تو ناجائز ہے، بلکہ نفع کی تمام صورتوں کا یہی حکم ہے۔

۴۔ معنوی نفع:

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرض خواہ کسی قسم کا مادی نفع یا منفعت وصول نہیں کرتا، بلکہ کوئی معنوی اور غیر حسی نفع وصول کر لیتا ہے۔ جیسے قرض خواہ کا شکریہ ادا کرنا، یہ جائز ہے، بلکہ مستحب ہے۔ یا قرض خواہ سے قرض لے کر اس کی کوئی سفارش کرنا۔ سفارش میں بنیادی اصول مد نظر رکھنا ضروری ہے کہ صرف قرض کی وجہ سے ایسا کرنا رشوت کے زمرے

---

[1] الدر المختار وحاشية ابن عابدين ٥/ ١٦٧

میں آئے گا، البتہ اگر سفارش قرض کی وجہ سے نہ ہو، بلکہ قرض خواہ کے حقدار ہونے کی وجہ سے ہو تو جائز ہے۔

۵۔اجل:

قرض کی وصولی کے لیے کوئی مدت مقرر کرنا۔ یہ درحقیقت مقروض کو ملنے والا نفع ہے، جبکہ قرض پر جو نفع حرام ہے وہ قرض خواہ کو ملنے والا نفع ہے۔ قرض کی وصولی کے لیے وقت مقرر کرنے کی تفصیل اور فقہاء کی آراء کو پہلے بیان کیا جاچکا ہے، اس کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔

۶۔سفتجہ:

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرض خواہ کسی کو قرض دے کر یہ شرط لگاتا ہے کہ مقروض اس قرض کو دوسرے شہر میں قرض خواہ یا اس کے گھر والوں یا کسی نائب کو دے گا۔ اس کو بھی کئی فقہاء نے اسی بنیاد پر ممنوع لکھا ہے کہ اس میں قرض خواہ کو ایک قسم کا نفع مل رہا ہے کہ دوسرے شہر تک رقم پہنچانے کا رسک ختم ہوجاتا ہے، یہ بھی ایک قسم کا نفع ہے، تاہم فقہاء حنابلہ کے ہاں اس کی گنجائش ہے۔ موجودہ دور کے ایزی پیسہ اور ہنڈی وغیرہ پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا، کیونکہ ان میں بنیادی مقصد رقوم کی ترسیل ہے، راستے کا رسک ختم کرنا نہیں ہے۔ اس کی مزید تفصیل پہلے باب میں ''بیع صرف'' کے عنوان کے تحت بیان کردی گئی ہے۔

معاییر شرعیہ میں قرض پر مشروط وغیر مشروط نفع کے بارے میں تین اہم اصول وضوابط بیان کیے گئے ہیں:

پہلا ضابطہ: قرض خواہ کے لیے قرض میں اضافہ کی شرط لگانا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ سود ہے، خواہ قرض میں یہ اضافہ قرض کی صفت (کوالٹی) میں ہو یا مقدار میں ہو، یا یہ اضافہ کسی اثاثہ کی شکل میں ہو یا کسی منفعت کی شکل میں ہو، خواہ یہ اضافہ کی شرط عقد میں لگائی جائے یا عقد کے بعد قرض کے لیے مدت طے کرتے وقت لگائی جائے، خواہ اس شرط کی صراحت کی جائے یا ایسی شرط کا عرف ہونے کی وجہ سے لحاظ رکھا جائے۔

دوسرا ضابطہ: قرض کی مدت کے دوران مقروض کے لیے یہ بھی جائز نہیں ہے کہ وہ قرض خواہ کو قرض کی وجہ سے ایسا ہدیہ پیش کردے یا اسے کسی ایسے فائدے کی پیشکش کردے جس کا معمول قرض سے پہلے نہ ہو۔

تیسرا ضابطہ: قرض کی واپسی کے وقت قرض پر اضافہ، خواہ وہ صفت میں ہو یا مقدار میں ہو، کسی اثاثہ کی شکل میں ہو یا کسی منفعت کی شکل میں ہو، اس وقت جائز ہے جبکہ اس اضافہ کی نہ شرط لگائی گئی ہو اور نہ ہی اس کا عرف ہو۔ خواہ قرض رقم کی شکل میں ہو یا کسی اور شکل میں۔[1]

[1] المعايير الشرعية، ص:۵۲۲، رقم المعيار:۱۹

۳۔قرض پر نفع کے لیے حیلے:

چونکہ قرض پر نفع لینا سود کے زمرے میں آتا ہے اور ناجائز ہے،اس لیے ایسے سود کو حاصل کرنے کے لیے مختلف قسم کے حیلے وجود میں آگئے ہیں، جن میں سے چند اہم حیلوں کا یہاں تذکرہ کیا جاتا ہے:

ا۔ بیع الوفاء:

اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کو کوئی چیز اس شرط پر فروخت کرتا ہے کہ جب میں تمہاری رقم تمہیں واپس کردوں گا تو میری چیز مجھے (فروخت کنندہ کو) واپس کرنی ہوگی۔ یہ بھی درحقیقت قرض پر سود کا ایک حیلہ ہے کہ جس شخص نے اپنی چیز دوسرے کو بیچ دی ہے اسے اس چیز کے بدلے رقم (قرض) مل جاتی ہے، جبکہ رقم دینے والا کچھ عرصہ تک فروخت کنندہ کی چیز سے نفع اٹھاتا رہتا ہے۔

"بیع الوفاء" کی فقہی حقیقت میں فقہاء کا اختلاف ہے،تاہم راجح قول کے مطابق اگر صلبِ عقد (ایجاب وقبول) میں ہی یہ شرط لگادی گئی تو اس کی حیثیت "رہن" کی ہے اور اس پر رہن کے احکام لاگو ہوں گے۔ اور اگر صلبِ عقد میں یہ شرط نہ لگائی جائے، بلکہ عقد کے بعد صرف رقم واپس کرنے پر چیز واپس کرنے کا وعدہ کیا جائے تو یہ درست ہے اور ایسا وعدہ قضاء بھی لازم ہو جاتا ہے۔[1]

۲۔ بیع عینہ:

اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کو اپنی کوئی چیز ادھار مہنگی قیمت پر فروخت کرتا ہے اور پھر خود یا اپنے کسی نائب /وکیل کے ذریعے خریدار سے وہی چیز کم قیمت پر نقد خرید لیتا ہے۔ اس کو فقہاء "شراء ماباع باقل مما باع" بھی کہتے ہیں۔ یہ بھی درحقیقت قرض پر نفع کی ایک صورت ہے، کیونکہ چیز بیچنے والے کو اپنی چیز واپس مل جاتی ہے اور وہ دوسرے کو کم قیمت دے کر بعد میں اس سے زیادہ قیمت وصول کرتا ہے۔ یہ بھی جائز نہیں ہے۔ اس کی تفصیل پہلے باب میں گزر چکی ہے۔

۳۔قرض میں بیع کی شرط:

قرض پر نفع حاصل کرنے کا ایک حیلہ یہ بھی ہے قرض خواہ کسی کو قرض دیتے ہوئے مقروض کی کوئی چیز سستی قیمت پر خریدنے کی شرط عائد کردیتا ہے۔ مثلاً زید نے عمر کو ایک لاکھ روپے اس شرط پر قرض دیے کہ عمر اس کو اپنا موبائل (جس کی قیمت پچاس ہزار ہے) چالیس ہزار میں بیچے گا۔ یہ بھی شرعاً درست نہیں ہے، کیونکہ ایک تو یہ سود کا حیلہ

---

[1] فقه البيوع ١/ ٥٠٠

ہے۔دوسرا اس میں ''صفقة فی صفقة'' کی خرابی ہے۔

۴۔خیارِ شرط بطورِ حیلہ:

کبھی ایسا کیا جاتا ہے کہ کوئی شخص دوسرے کو اپنی کوئی چیز کچھ دنوں کے خیار شرط کے ساتھ بیچ دیتا ہے اور اس سے رقم لے کر، چیز اس کے حوالے کردیتا ہے۔دونوں کا مقصد خرید وفروخت نہیں ہوتا، بلکہ قرض پر نفع ہی مقصد ہوتا ہے۔اس مدت میں خریدار (قرض خواہ) اس چیز سے نفع اٹھاتا ہے، جبکہ بیچنے والا حاصل شدہ رقم سے فائدہ اٹھاتا رہتا ہے اور پھر خیار شرط کو استعمال کر کے معاملہ ختم کر دیا جاتا ہے۔خاص اسی مقصد کے لیے یہ حیلہ کرنا بھی درست نہیں ہے، البتہ کبھی اتفاقی طور پر ایسی صورتحال پیش آگئی، باقاعدہ شروع سے ہی چیز واپس کرنے کا مقصد نہ ہو تو جائز ہے، بشرطیکہ خیارِ شرط کے احکام کو مدنظر رکھا جائے۔

۵۔رہن سے انتفاع:

قرض پر نفع کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کو قرض دے کر مقروض سے کوئی مکان یا زمین وغیرہ بطورِ رہن رکھ لیتا ہے اور جب تک قرض وصول نہ ہو، اس مکان یا زمین وغیرہ کو استعمال کرتا رہتا ہے۔رہن سے انتفاع کی دو صورتیں ہیں:

ا۔راہن (رہن کی چیز کے مالک) کی اجازت کے بغیر اس چیز سے انتفاع حاصل کرنا۔اس پر تقریباً تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ یہ ناجائز ہے، البتہ مالکیہ کی ایک روایت کے مطابق اگر رہن کی چیز ایسی ہے جس پر مرتہن خرچہ کرتا ہے یا اسے نفقہ دیتا ہے تو بقدرِ خرچہ اس چیز کو استعمال کر سکتا ہے۔

۲۔راہن کی اجازت سے رہن کی چیز سے انتفاع حاصل کرنا۔اس کی بھی دو صورتیں ہیں:

الف۔عقدِ رہن کے اندر ہی یہ شرط لگائی گئی کہ مرتہن اس چیز سے انتفاع حاصل کرے گا تو یہ فقہاء حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے ہاں جائز نہیں ہے، جبکہ مالکیہ کے ہاں اگر یہ قرض کے بدلے رہن ہے تو جائز نہیں ہے، لیکن اگر دین کے بدلے میں ہے، مثلاً کسی مبیع کی قیمت وغیرہ کی وجہ سے رہن رکھا ہے تو ایک متعین مدت تک مفت نفع کی شرط لگانے کی گنجائش ہے۔

ب۔عقدِ رہن کے اندر ایسی کوئی شرط نہ لگائی گئی، بلکہ اس کے بعد بطورِ تبرع واحسان مالک نے مرتہن کو مرہونہ چیز سے انتفاع حاصل کرنے کی اجازت دے دی تو فقہاء مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے ہاں یہ جائز نہیں ہے، جبکہ فقہاء حنفیہ کے ہاں بعض نے اس کی اجازت دی ہے اور بعض نے اس کو ممنوع لکھا ہے۔معاصر فقہاء نے اس کو ممنوع لکھا ہے، کیونکہ

عصرِ حاضر میں رہن سے نفع حاصل کرنا مشروط و معروف ہو چکا ہے، اس لیے یہ جائز نہیں ہے۔[1]

واضح رہے کہ خیبر پختونخواہ کے بعض علاقوں میں قرض پر نفع کی جو صورت ''گانڑہ'' کے نام سے رائج ہے، وہ بھی در حقیقت ''رہن سے انتفاع'' کے زمرے میں آتا ہے اور قرض دے کر اس کے بدلے کوئی مکان یا زمین بطورِ رہن (گانڑہ) لینے میں اس مکان یا زمین سے نفع حاصل کرنا مشروط اور معروف ہے، لہٰذا وہ بھی جائز نہیں ہے۔ البتہ اگر مرتہن اور راہن آپس میں یہ معاملہ کر لیتے ہیں کہ مرتہن، رہن میں رکھی ہوئی چیز کو اجرت مثل کے بدلے استعمال کرے گا تو یہ جائز ہے، بشرطیکہ قرض کی وجہ سے اجرت میں کمی نہ کی جائے۔

۷۔ قرض کے عمومی ضوابط

۱۔ پہلا ضابطہ: قرض کا عقد ایجاب و قبول سے منعقد ہو جاتا ہے، لیکن قبضہ کرنے کے بعد ہی تام و مکمل ہوتا ہے۔ چونکہ قرض ایک عقدِ تبرع ہے اور ہر عقدِ تبرع اس وقت تام و مکمل ہوتا ہے، جب اس چیز پر قبضہ کیا جائے۔ لہٰذا اگر قرض دینے والا صرف زبانی طور پر کسی کو قرض دینے کی بات کر دیتا ہے تو دوسرا شخص اس قرض کا مالک نہیں سمجھا جائے گا، بلکہ مقروض شخص جب قرض پر قبضہ کر لے گا تو اس کے بعد ہی وہ قرض کا مالک ہو جائے گا۔ اس ضابطہ کو فقہاء نے یوں لکھا ہے:

- ينعقد القرض بالإيجاب والقبول ويتم بالقبض

۲۔ دوسرا ضابطہ: عقدِ قرض میں کفالہ کی شرط لگانا صحیح ہے۔ اگر قرض خواہ نے قرض دیتے وقت یہ شرط لگا دی کہ مقروض اس کو کفیل اور ضامن بھی مہیا کر کے دے گا، تاکہ اگر مقروض سے قرض وصول نہ ہو سکے تو ضمانت لینے والے سے قرض وصول کیا جا سکے تو یہ جائز ہے۔ اس ضابطہ کے الفاظ یہ ہیں:

- يصح القرض بشرط الكفالة

۳۔ تیسرا ضابطہ: عقدِ قرض کسی شرطِ فاسد سے فاسد نہیں ہوتا۔ چونکہ قرض ایک عقدِ تبرع ہے، اس لیے اگر اس میں کوئی فاسد شرط لگا دی گئی تو فقہاء کا اتفاق ہے کہ ایسی شرط پر عمل کرنا ضروری نہیں، بلکہ یہ شرط باطل ہے، جیسے کسی نے قرض پر نفع کی شرط لگا دی۔ البتہ اس بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ کیا ایسی شرط کی وجہ سے قرض کا عقد فاسد ہو جاتا ہے یا نہیں؟ فقہاء حنفیہ اور حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ ایسی شرط سے عقدِ قرض فاسد نہیں ہو گا، بلکہ قرض کا عقد اپنی جگہ درست رہے گا۔ دیگر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ شرط فاسد کی وجہ سے عقدِ قرض فاسد ہو جاتا ہے۔[2] اس کے الفاظ یہ ہیں:

---

[1] توثيق الديون. ص: ۲۲۰

[2] فتح القدير ۸۳/۶

- القرض لا يفسد بالشروط الفاسدة

۴۔ چوتھا ضابطہ: عقدِ قرض میں ایسے امور کی گنجائش دے دی گئی ہے، جن کی لین دین کے معاملات میں گنجائش نہیں ہے۔ چونکہ قرض ایک تبرع اور احسان کا معاملہ ہے، یہ کوئی مبادلہ یا لین دین نہیں ہے جس کا مقصد نفع کمانا ہو، اس لیے اس کی ترغیب کے لیے شریعت نے اس میں کئی گنجائشیں دی ہیں، جو دیگر معاملات میں نہیں دی گئیں۔ مثلاً بیع صرف میں دونوں جانب کی چیزوں پر قبضہ ضروری ہے، لیکن اگر کوئی شخص کسی کو سونا یا چاندی قرض پر دیتا ہے تو اس کی اجازت ہے اور ایک طرف کا قبضہ ہی کافی ہوتا ہے۔ اسی طرح عقدِ قرض کسی فاسد شرط کی وجہ سے فاسد بھی نہیں ہوتا۔

- يسمح في باب القرض فيما لا يسمح فيه في باب المبادلة

۵۔ پانچواں ضابطہ: جن چیزوں میں بیع سلم کرنا درست ہے، ان کو بطورِ قرض دینا بھی جائز ہے، اور جن چیزوں میں بیع سلم درست نہیں، ان کو قرض میں دینا بھی درست نہیں ہے۔ اس ضابطہ میں وہ بنیادی شرط بتائی گئی ہے جس کا تعلق قرض پر دیے جانے والے مال سے ہے کہ جس چیز کو بطورِ قرض دیا جا رہا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ مثلیات میں سے ہو، جیسے کیلی اشیاء، وزنی اشیاء اور عددیات متقاربہ۔ جہاں تک قیمیات کی بات ہے جیسے حیوانات اور عددیات متفاوتہ تو ان کو قرض میں نہیں دیا جا سکتا۔ یہی اصول بیع سلم کا بھی ہے۔ البتہ بیع سلم سے متعلق اس شرط میں فقہاء کا کچھ اختلاف ہے جس کی تفصیل پہلے باب میں گزر چکی ہے۔

- ما جاز السلم فيه جاز قرضه، وما لا فلا

۶۔ چھٹا ضابطہ: مشاع و مشترک چیز کو بطورِ قرض دینا صحیح ہے۔ مثلاً کوئی شخص دوسرے کو دس لاکھ روپے دے کر کہتا ہے کہ اس میں سے نو لاکھ روپے کاروبار کے لیے بطورِ مضاربت کے ہیں اور ایک لاکھ روپے قرض کے ہیں تو یہ درست ہے، اگرچہ وہ ایک لاکھ الگ نہیں ہے۔

- إقراض المشاع صحيح

۷۔ ساتواں ضابطہ: جو چیز بطورِ قرض لی گئی ہے، بالکل اسی جیسی چیز واپس کرنا ضروری ہے۔ چونکہ قرض میں ایسی چیز دی جا سکتی ہے جس کی مثل بازار میں ملتی ہے، اس لیے قرض لینے والے پر لازم ہے کہ وہ اسی جنس، نوع اور اسی کوالٹی کی چیز واپس کر دے جیسی چیز اس نے لی تھی۔ اسی طرح مقدار میں بھی برابری ضروری ہے۔

- الأصل رد مثل ما اقترض

۸۔ آٹھواں ضابطہ: مقروض شخص قرض کا مالک ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی سے قرض لے کر اس پر قبضہ کر لیتا ہے تو قرض لینے والا اس قرض کا مالک ہو جاتا ہے، لہٰذا وہ اس قرض پر جو بھی نفع کمائے گا وہ شرعاً جائز

ہوگا۔ اگر عقدِ قرض میں کوئی خرابی ہو، مثلاً سود کی شرط وغیرہ تو اس کی وجہ سے قرض پر کمایا ہوا نفع حرام نہیں ہوگا، بلکہ صرف اس سود کا گناہ ہوگا۔

- يملك المستقرض القرض

۹۔ نواں ضابطہ: قرض کے لیے وقت مقرر کرنا باطل ہے۔ اصول یہ ہے کہ قرض کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں کیا جاسکتا، بلکہ قرض خواہ کو ہر وقت اپنے قرض کے مطالبہ کا حق حاصل ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل اور فقہاء کی آراء کو ہم نے پہلے بیان کر دیا ہے۔

- تأجيل القرض باطل

۱۰۔ دسواں ضابطہ: دینِ صحیح/قرض صرف ادا کرنے سے یا قرض خواہ کی طرف سے بری اور معاف کرنے سے ساقط ہوتا ہے۔

- لا يسقط الدين الصحيح إلا بالأداء أو الإبراء

۱۱۔ گیارہواں ضابطہ: ہر وہ قرض جو نفع کھینچ لائے، وہ حرام ہے۔ قرض پر کسی بھی قسم کا مشروط یا معروف نفع سود کے زمرے میں آتا ہے۔ اس کی تفصیل بھی پہلے بیان کر دی گئی ہے۔

- كل قرض جر نفعا، فهو حرام

۸۔ قرض کی جدید صورتیں

۱۔ سیکورٹی ڈپازٹ (Security Deposit)

آج کل سیکورٹی ڈپازٹ کے نام سے دکان یا مکان کو کرایہ پر دینے سے پہلے مالک، کرایہ دار سے کچھ رقم وصول کرتا ہے اور پھر کرایہ داری کے معاملہ کے اختتام پر وہ رقم واپس کر دی جاتی ہے، البتہ اگر کرایہ دار کے ذمہ کچھ کرایہ رہ گیا ہو یا اس نے دکان یا مکان کی بجلی کا بل یا گیس بل ادا نہ کیا ہو تو سیکورٹی ڈپازٹ سے وہ رقم کاٹ کر بقیہ رقم واپس کر دی جاتی ہے۔ اس رقم کی حیثیت قرض کی ہے اور اس کی وجہ سے دکان یا مکان کے کرایہ کو عام معمول سے کم کرنا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ یہ قرض پر نفع کی ایک صورت ہوگی، اس رقم کو رہن اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ نقصان کے خطرے سے بچنے کے لیے رہن رکھنا جائز نہیں ہے، رہن تو دین کے بدلے رکھا جاتا ہے۔

۲۔ بیعانہ:

بیعانہ یا ٹوکن منی سے متعلق مختلف علاقوں اور تاجروں میں مختلف صورتیں رائج ہیں، بعض دفعہ تو بیعانہ کی

ادائیگی عقدِ بیع (یعنی خرید و فروخت کے معاملے) کے مکمل ہونے کے بعد ہوتی ہے اور بعض دفعہ خرید و فروخت سے پہلے، وعدۂ بیع کے بعد بیعانہ کی ادائیگی کر دی جاتی ہے۔ بیعانہ کی ان دونوں صورتوں کی شرعی حیثیت مختلف ہے۔ پہلی صورت میں (یعنی جب کہ اس کی ادائیگی خرید و فروخت مکمل ہونے کے بعد کی جائے) بیعانہ کی شرعی حیثیت جزوِ ثمن (قیمت کے ایک حصہ) کی ہے، اور دوسری صورت میں اس کی حیثیت امانت کی ہے، لیکن چونکہ عموماً اس رقم کے استعمال کی اجازت ہوتی ہے، اس لیے یہ انتہاء قرض کے حکم میں ہے۔ اگر خرید و فروخت کا معاملہ مکمل ہو گیا تو اس رقم کو قیمت میں شامل کیا جاسکتا ہے اور اگر کسی وجہ سے فریقین نے معاملہ ختم کر دیا تو یہ رقم واپس کرنا ضروری ہے۔

۳۔ کسان/زمیندار کو قرض دینا:

آج کل جن کسانوں/زمینداروں کو اپنی فصل کی کاشت اور اخراجات کے لیے قرض کی ضرورت ہوتی ہے، ان کو آڑھت کا کام کرنے والے لوگ یا منڈی والے یا بڑے دکاندار اس شرط پر قرض دیتے ہیں کہ کسان اپنی فصل انہی کے پاس فروخت کرنے کے لیے لائے گا یا انہی کے واسطے سے اپنی فصل فروخت کرے گا۔ یہ رقم چونکہ قرض ہوتی ہے، اس لیے اس سے متعلق دو اہم باتیں ذہن میں رکھنا ضروری ہیں:

۱۔ آڑھت اور دلالی کا کام کرنے والے اگر زمیندار کو اس شرط پر پیشگی رقم/قرض دیتے ہیں کہ زمیندار اپنی پیداوار اسی قرض دینے والے آڑھتی تک پہنچائے گا اور وہ اس پیداوار کو منڈی وغیرہ میں بیچ کر کسان سے اس پر کمیشن وصول کرے گا۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اگر آڑھت والے زمیندار سے مارکیٹ میں رائج کمیشن ہی لیتے ہیں اور مذکورہ قرض کی بنیاد پر مارکیٹ میں رائج کمیشن سے زیادہ نہیں لیتے تو یہ کمیشن جائز ہے۔ لیکن اگر آڑھت والے اس قرض کی وجہ سے اپنے کمیشن میں اضافہ کرتے ہیں تو یہ قرض پر نفع کی ایک صورت ہے جو کہ جائز نہیں ہے۔ یہ تو کمیشن کی بات تھی، جہاں تک اس شرط کی بات ہے تو اس کی تفصیل اگلے نکتے میں آرہی ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ قرض کا شرعی اصول یہ ہے کہ قرض محض خیر خواہی اور احسان کی بنیاد پر دیا جائے، قرض دینے والا اس میں اپنے مفاد کے لیے کوئی شرط نہ لگائے، اگر قرض دینے والا ایسی کوئی شرط لگاتا ہے تو وہ شرط لغو ہوتی ہے، اس پر عمل ضروری نہیں ہوتا۔ لہٰذا دکانداروں یا آڑھتی حضرات کا قرض دیتے ہوئے یہ شرط لگانا کہ زمیندار، اپنی فصل بکوانے کے لیے اسی دکاندار یا آڑھتی کے پاس لائے گا، یہ شرط شرعاً درست نہیں ہے، لغو ہے اور نہ ہی اس شرط کی پابندی کرنا شرعاً ضروری ہے، زمیندار کو مکمل شرعاً اختیار ہے کہ اپنی فصل، جس دکاندار یا آڑھتی کے پاس لے جانا چاہے، تو لے جاسکتا ہے۔

۴۔ بیسی / کمیٹی:

آج کل قرض کی ایک صورت ''بیسی'' یا'' کمیٹی'' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ در حقیقت قرض کا ایسا معاملہ ہے جس میں چند افراد آپس میں یہ معاہدہ کرتے ہیں کہ ان میں سے ہر شخص ہر ماہ ایک مقررہ رقم جمع کرائے گا اور پھر وہ جمع شدہ رقم انہی میں سے ایک شخص کو بطورِ قرض دے دی جائے گی، اور وہ شخص آئندہ اقساط کی شکل میں اس قرض کو واپس لوٹائے گا۔ اس کا فائدہ محض یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص کو یکمشت کثیر رقم بطورِ قرض مل جاتی ہے اور اقساط کی شکل میں ادائیگی کی وجہ سے اس قرض کی واپسی میں سہولت ہوتی ہے۔

جس طرح کمیٹی کی جمع کردہ رقم باہمی رضامندی سے بغیر قرعہ اندازی باری باری ہر ایک کو دینے میں کوئی مضائقہ نہیں، اسی طرح اگر مقروض کی باری کا تعین قرعہ اندازی کے ذریعے کیا جائے تو اس میں بھی شرعاً کوئی حرج نہیں، کیونکہ جہاں کسی معاملے میں ایک سے زائد جائز راستے ہوں تو ان میں سے ایک راستے کے تعین کے لیے قرعہ اندازی کرنا شرعاً جائز ہے۔

۵۔ بینک اکاؤنٹس (Accounts)

کمرشل بینکوں کے اکاؤنٹس میں رکھی ہوئی رقم کی حیثیت بھی قرض کی ہے، خواہ کرنٹ اکاؤنٹ ہو یا سیونگ اکاؤنٹ یا فکس ڈپازٹ ہو۔ اس پر کسی بھی قسم کا نفع وصول کرنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح مختلف بینک یا حکومت جو وقتاً فوقتاً عوام کو قرضے دیتی ہے، اگر ان میں اس کسی بھی قسم کے اضافہ کی شرط لگائی جائے تو وہ بھی سود میں داخل ہے، خواہ اس کو کیش کریڈٹ (cash credit) کا نام دیا جائے، اوور ڈرافٹ (overdraft) کا نام دیا جائے یا کسی اسکیم (جیسے اخوت اسکیم) کا نام دیا جائے۔

جس طرح ان اکاؤنٹس میں رقم رکھنے پر نفع لینا جائز نہیں ہے، اسی طرح اگر کوئی بینک کسی کرنٹ اکاؤنٹ ہولڈر کو ایسے اخراجات معاف کرتا ہے جن کا تعلق رقم رکھنے یا نکالنے سے نہ ہو تو وہ بھی قرض پر نفع کے زمرے میں آئے گا اور جائز نہیں ہوگا، جیسے کریڈٹ کارڈز اور لاکرز کے اخراجات، رقم ٹرانسفرنگ کے اخراجات اور لیٹر آف کریڈٹ کے اخراجات وغیرہ۔ تاہم جس بینک میں رقم رکھی گئی ہے، اگر وہ بینک اکاؤنٹ ہولڈر کے لیے ایسی خدمات انجام دیتا ہے جن کا تعلق رقم رکھنے یا نکالنے سے ہوں تو ایسی خدمات بلا معاوضہ یا بامعاوضہ دونوں طرح جائز ہیں، جیسے چیک بک، اے ٹی ایم کارڈ وغیرہ۔[1]

[1] المعايير الشرعية، ص:٥٢٤، رقم المعيار:١٩

۲۔مائیکرو فائنانس بینکنگ کے قرضے:

آج کل روابط و مواصلات کی مختلف کمپنیاں اپنی سم پر بذریعہ موبائل اکاؤنٹ کھلوانے کی سہولت دیتی ہیں، جس میں لوگ چھوٹی موٹی رقم رکھ کر ضرورت کے موقع پر استعمال کرتے ہیں اور ایسی کمپنیاں بسا اوقات ایک خاص مقدار کی رقم رکھنے پر کچھ منافع (فری منٹس، فری ایم ایس وغیرہ کی شکل) میں دیتی ہیں۔اس کو آج کل مائیکرو فائنانس بینکنگ (microfinance banking) کہتے ہیں۔ان میں ٹیلی نار کمپنی کا ''ایزی پیسہ اکاؤنٹ''اور جیز کمپنی کا ''جیز کیش'' وغیرہ شامل ہے۔

اس قسم کے اکاؤنٹس کھولنے کے بعد مندرجہ ذیل انعامات دیے جاتے ہیں:

- پہلی دفعہ اکاؤنٹ کھولنے پر کچھ رقم (مثلاً سو روپے ۱۰۰) روپے کا انعام دیا جاتا ہے۔
- اکاؤنٹ میں پورا دن ایک ہزار کا بیلنس رکھنے پر کچھ فری منٹس اور فری ایم ایس ملتے ہیں۔
- کبھی ایسا ہوتا ہے کہ چند متعین دنوں کے لیے اکاؤنٹ میں کچھ رقم رکھنے پر بذریعہ قرعہ اندازی اکاؤنٹ ہولڈر کو انعام ملتا ہے۔
- کبھی کسی ٹرانزیکشن پر اور لوڈ کرنے پر بطورِ انعام یا کیش بیک کے نام سے کچھ رقم ملتی ہے۔

اس قسم کے انعامات کے حکم سے پہلے یہ سمجھ لیا جائے کہ اکاؤنٹ میں رقم محفوظ رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ بیلنس براہِ راست صارف کی اپنی سم میں قابلِ استعمال حالت میں جمع نہیں ہوتی، بلکہ پہلے اپنے نمبر پر موبائل کمپنی سے ایک الگ اکاؤنٹ کھلوانا ہوگا، اور پھر اس الگ اکاؤنٹ میں مذکورہ رقم جمع ہوگی، یہ اکاؤنٹ کمپنی کے تصرف میں ہوگا، تاہم مذکورہ رقم جمع کروانے والا جب چاہے اپنے اکاؤنٹ سے یہ رقم نکلوا سکتا ہے۔اس سے بات بالکل واضح ہوتی ہے کہ اس رقم کی حیثیت ''قرض'' کی ہے۔

اس اکاؤنٹ کے انعامات/ سہولیات کا اصولی حکم یہ ہے کہ کمپنی کی طرف سے جو بھی انعام/ سہولت کچھ رقم رکھنے پر مشروط ہو، وہ قرض پر نفع ہے اور سود و حرام ہے۔ جیسے سابقہ انعامات میں دوسری اور تیسری قسم کا انعام، جس میں کچھ رقم رکھنے پر فری منٹس/ایم ایس وغیرہ ملتے ہیں یا چند دنوں تک رقم رکھنے پر بذریعہ قرعہ اندازی کچھ انعام دیا جاتا ہے۔ جہاں تک ان سہولیات یا انعامات کی بات ہے جن کے لیے کسی قسم کی رقم رکھنے کی شرط نہ ہو، وہ لینا جائز ہے، جیسے پہلی دفعہ اکاؤنٹ کھولنے پر سو روپے انعام لینا یا ٹرانزیکشن یا ایزی لوڈ کرنے پر کچھ انعام یا کیش بیک لینا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کسی قسم کے قرض پر مشروط نفع نہیں ہے، بلکہ یہ انعام صرف اکاؤنٹ استعمال کرنے اور کاروباری تعلق کی وجہ سے ملتا ہے۔اسی

طرح اس کے علاوہ دیگر سہولیات، جیسے ایزی لوڈ کرنا، بل وغیرہ جمع کرانا، یہ بھی جائز ہیں۔

۷۔ موبائل سم لون (Advance Balance)

آج کل بعض کمپنیاں موبائل کی سم میں ایڈوانس کے نام سے صارف کو کچھ بیلنس یا لون دیتی ہیں اور جب صارف سم میں بیلنس ڈالتا ہے تو اس سے زیادہ رقم کاٹی جاتی ہے۔ یہ صورت بظاہر قرض پر نفع کی معلوم ہوتی ہے، کیونکہ کمپنی مثلاً بیس روپے کا بیلنس دے کر اس کے بدلے میں صارف سے پچیس روپے کاٹ لیتی ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت میں کسی قسم کا قرض نہیں ہے، بلکہ یہ کمپنی کی طرف سے ایک خاص مقدار میں اس کمپنی کا نیٹ ورک استعمال کرنے کی اجازت ہے جو کمپنی ادھار کی صورت میں عام معمول سے کچھ زیادہ قیمت پر صارف کو بیچ دیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ صارف اگر چاہے تو ایڈوانس بیلنس کو رقم کی صورت میں نکال نہیں سکتا، لہذا یہ اجارہ ہے اور جائز ہے۔

۸۔ بانڈز (Bonds)

حکومت وقتاً فوقتاً لوگوں سے قرض وصول کرنے کے لیے مختلف ناموں کے بانڈز جاری کرتی ہے اور اس پر بانڈز خریدنے والوں کو مختلف طریقوں سے نفع/انعام بھی دیتی ہے۔ بانڈز خریدنا در حقیقت حکومت کو قرض دینا ہے، اس میں کسی چیز کی خرید و فروخت نہیں ہوتی۔ لہذا اس پر حکومت سے کسی بھی قسم کا نفع یا انعام لینا قرض پر نفع ہے جو کہ سود کے زمرے میں آتا ہے اور حرام ہے۔ اس کی مزید تفصیل کتاب کے آخری باب میں موجود ہے۔

۹۔ بل آف ایکسچینج (Bill of Exchange)

اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص/ادارہ دوسرے شخص کو مخصوص رقم کی، متعینہ تاریخ کو ادائیگی کا حکم لکھ کر دے رہا ہوتا ہے۔ یہ عمومی طور پر خریدار کے ذمہ لازم شدہ قیمت/قرض کی ایک قانونی دستاویز ہوتی ہے، جس پر فروخت کنندہ اور خریدار دستخط کر دیتے ہیں اور فروخت کنندہ متعینہ وقت پر اس سے اپنا دین/قرض وصول کرتا ہے۔ آج کل اس کی خرید و فروخت بھی ہوتی ہے۔ بل آف ایکسچینج در حقیقت دین/قرض کی نمائندگی کرنے والا ایک دستاویز ہے، لہذا اسے کسی اور کو کم یا زیادہ قیمت پر بیچنا جائز نہیں ہے۔ اس کی تفصیل کتاب کے آخری باب میں ایک مستقل مضمون میں موجود ہے۔

چوتھا باب

جدید و معاصر تحقیقات

Contemporary Studies on Financial Contracts

اس باب میں میرے اُن تحقیقی مقالات و مضامین کو شامل کیا جارہا ہے جو مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوچکے ہیں۔ ان میں سے کچھ مقالات طویل ہیں اور کچھ مختصر۔ مقالات و مضامین کی ترتیب میں کسی خاص پہلو کی رعایت نہیں رکھی گئی ہے، تاہم ہر مقالہ کے شروع میں مقالہ کے بنیادی عنوانات اور خاکہ دے دیا گیا ہے تاکہ سمجھنے میں آسانی رہے۔

اس باب میں مندرجہ ذیل مضامین و مقالات شامل ہیں:

- انسانی دودھ کا کاروبار: تعارفی و فقہی جائزہ
- مالِ خبیث: صورتیں اور احکام
- قمار کا تعارف و احکام
- معاصر اسلامی بینکاری کی شرعی بنیادیں
- بینک اکاؤنٹس: تعارف و شرعی حیثیت
- چیک کا تعارفی و فقہی جائزہ
- بینک کارڈز: تعارفی و فقہی جائزہ
- ایل سی: تعارفی و فقہی جائزہ
- رسک مینجمنٹ: تعارف، شرعی حیثیت، اصول
- قرضوں کی خرید و فروخت
- بانڈز: تعارف اور شرعی جائزہ
- بل آف ایکسچینج: تعارف و شرعی حیثیت
- توثیق الدیون
- فرنچائز: تعارف، شرعی حیثیت، احکام
- تشہیر: تعارف، شرعی حیثیت، حدود
- عقود المشتقات کی شرعی حیثیت
- بذریعہ نمونہ خرید و فروخت
- پگڑی اور زرِ ضمانت
- نفع کی تحدید اور مصنوعی طلب
- بین الاقوامی تجارت کے احکام
- نیٹ ورک مارکیٹنگ کی شرعی حیثیت
- آن لائن تجارت کی شرعی حیثیت
- پی ٹی سی کی شرعی حیثیت
- مال و دولت اور خرچ: اسلامی تعلیمات
- معاشی منصوبہ بندی اور اسلام
- بے روزگاری اور اسلام

انسانی دودھ کا کاروبار: تعارفی و فقہی جائزہ

(Human Milk Bank)

یہ مقالہ شش ماہی مجلہ ''راحت القلوب''(۲۰۱۸ء) کے شمارہ نمبر:۲، میں شائع ہوا ہے جو ایچ ای سی سے (Y) کٹیگری میں منظور شدہ ہے۔اس مقالے کا خاکہ اور فہرست یہ ہے:

- تعارف
- ملک بینک کے قیام کی وجوہات
- دودھ کے جمع کرنے اور حفاظت کا طریقہ کار
- طبعی رضاعت کے فوائد
- ملک بینک کے نقصانات
- شرعی احکام

تعارف

پیدائش کے فوراً بعد بچے کی زندگی کی نگہداشت اور افزائش دودھ کے علاوہ کسی اور غذا سے ناممکن ہے،اسی لیے فطری اور قدرتی طور پر ایسے وقت میں ماں کی چھاتیوں میں دودھ پیدا ہو جاتا ہے۔ہم صدیوں سے سنتے آئے ہیں،بلکہ تجربہ اور مشاہدہ بھی یہی ہے کہ بچوں کی غذائیت اور بہتر صحت ونشو نما کے لیے ماں کا دودھ صرف بہتر ہی نہیں،ضروری ہے۔لیکن بسا اوقات عورت میں کسی بیماری کی وجہ سے،یا غذائی کمی اور کمزوری کی وجہ سے دودھ کی کمی ہو جاتی ہے اور وہ اپنے بچے کو دودھ پلانے پر قادر نہیں ہوتی،بلکہ آج کے زمانے میں جب مرد و عورت کی مساوات کے نعرے بلند ہو گئے اور عورت بھی مرد کی طرح میدانِ عمل اور روزگار میں مصروف ہو گئی تو ایک نیا عذر بھی وجود میں آگیا کہ ایسی عورتوں کو اتنا وقت ہی نہیں ملتا کہ وہ اپنے بچوں کو دودھ پلا سکے۔این ڈی ٹی وی کے مطابق عالمی ادارہ صحت(who)اور یونیسف (unicef) کے اندازے کے مطابق دنیا بھر میں بر سرِ روزگار خواتین میں سے صرف بیس فیصد خواتین ہی اپنے بچوں کو دودھ پلانے کی قابل ہیں۔[1]

---

[1] http://taakbs.blogspot.com/2013/06/milk-bank.html

ماں کے دودھ سے محروم ایسے بچوں کے لیے زمانہ قدیم میں یہ صورت رائج تھی کہ اُنہیں دودھ پلانے کے لیے کسی دوسری عورت کے سپرد کر دیا جاتا تھا، لیکن ماضی قریب میں ایسے بچوں کے لیے ماں کے دودھ کا متبادل مصنوعی دودھ تیار ہونے لگا، جس کی ابتداء سن ۱۹۴۳ء میں برطانیہ میں ہوئی تھی اور اس کے بعد پوری دنیا میں مصنوعی دودھ تیار اور استعمال ہونے لگا۔[1]

مصنوعی دودھ نے جتنی تیزی سے ترقی کرلی، اتنی ہی جلدی اس کے نقصانات کا لوگوں نے مشاہدہ کیا، دوسری طرف انسانی دودھ کی اہمیت اور بچے کے لیے غیر مضر اور مفید ہونا بھی ثابت تھا۔ جہاں کچھ عورتیں مختلف اسباب کی بناء پر اپنے بچوں کو دودھ پلانے پر قادر نہ تھیں، وہاں کئی عورتیں ایسی تھیں جن کا دودھ ان کے بچوں کی ضرورت سے زیادہ تھا۔ یہی سے لوگوں میں یہ سوچ پیدا ہوگئی کہ کیوں نہ جن عورتوں کا دودھ ضرورت سے زیادہ ہے، ان سے دودھ لے کر جمع کیا جائے اور ان بچوں کو فراہم کیا جائے جو اپنی ماں کے دودھ سے محروم ہیں۔ اس طرح انسانی دودھ کے باقاعدہ ادارے قائم ہوگئے، جنہیں عربی میں "بنوك الحليب" اور انگریزی میں "Human Milk Bank" کہا جاتا ہے۔

ملک بینک کی ابتداء کے بارے میں کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ یہ پہلی جنگ عظیم کے تقریباً پچاس سال بعد وجود میں آگئے تھے، جبکہ اکثر مؤلفین کی رائے یہ ہے کہ یہ بیسویں صدی کی ساتویں دہائی یعنی ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء کے درمیان وجود میں آئے ہیں۔[2]

مغربی ممالک میں ملک بینک بڑی تیزی سے ترقی کی راہ پر گامزن اور ارتقائی مراحل طے کر رہا ہے، لیکن ملک بینک سے متعلق امتِ مسلمہ کے ذہنوں میں ایک قسم کا خلفشار پیدا ہوا کہ کیا ملک بینک کا تصور اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ ہے اور اس کی گنجائش ہے؟ اس میں کسی قسم کی شرعی خرابی پائی جاتی ہے یا نہیں؟ اگر ہاں تو اُس کو دور کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اور اس قسم کے دوسرے سوالات۔ ان کے حل تلاش کرنے کے لیے فقہ اسلامی کے ماہرین نے اس موضوع پر کچھ مقالات اور ابحاث بھی تحریر کیے ہیں، لیکن زیادہ تر مقالات عربی زبان میں ہیں، اُردو میں اس موضوع پر بہت کم مواد ملتا ہے۔ زیرِ نظر مختصر مقالے میں ملک بینک کے موضوع کے اکثر جوانب اور پہلوؤں کے احاطہ کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ مختصر تعارف کے بعد ملک بینک سے متعلقہ شرعی مسائل بیان کیے گئے ہیں، تاہم شرعی نقطہ نظر سے پہلے چند اہم نکات، جیسے ملک بینک کے قیام کی وجوہات، طبعی رضاعت کے فوائد اور ملک بینک کے قیام کے نقصانات کا بھی مختصراً ذکر کر دینا

---

(۱) بنوك الحليب، دكتور عبلة الكحلاوي، ص:۱۱

(۲) البنوك الطبية البشرية واحكامها الفقهية، دكتور اسماعيل، ص:۳۲٤

مناسب معلوم ہوتا ہے، اس لیے پہلے ان نکات کو بیان کیا جائے گا، اس کے بعد ملک بینک سے متعلق شرعی احکام کا تذکرہ کیا جائے گا۔

ملک بینک کے قیام کی وجوہات

ملک بینک کے قیام کی وجوہات دو قسم کی ہیں:

۱۔ایک بنیادی وجہ وہ بچے ہیں جو کسی وجہ سے اپنی ماں کے دودھ سے محروم ہیں، ان کو انسانی دودھ فراہم کرنے کی غرض سے ملک بینک قائم کیے گئے، مثلاً: وہ بچے(premature babies) جو بذریعہ آپریشن یا خود ہی طبعی مدتِ حمل سے پہلے پیدا ہو جائے، ان کو ماں دودھ نہیں پلا سکتی۔اسی طرح کچھ بچے وقت پر پیدا ہو جانے کے باوجود جسمانی کمزوری اور وزن کی کمی کی وجہ سے یا کسی بیماری اور انفیکشن(infection) کے لاحق ہو جانے کی وجہ سے انسانی دودھ کے زیادہ محتاج ہوتے ہیں اور مصنوعی دودھ ان کے لیے مضر ہوتا ہے۔

۲۔ملک بینک کے قیام کی دوسری بنیادی وجہ مصنوعی دودھ کا مضرِ صحت ہونا اور عورتوں کا دودھ پلانے پر قادر نہ ہونا یا باوجود قدرت کے بچوں کو دودھ نہ پلانا ہے۔ مثلاً یا تو عورت بیماری اور دودھ کی کمی کی وجہ سے بچے کو دودھ نہیں پلا سکتی یا عورت ایسی ادویات استعمال کرتی ہے یا حاملہ ہے جس کی وجہ سے ایسی حالت میں بچے کو دودھ پلانا مضر ہو سکتا ہے، یا کسی روزگار میں مشغول ہو جانے کی وجہ سے اُسے دودھ پلانے کے لیے وقت نہیں ملتا، بلکہ بعض عورتیں یہ سمجھتی ہیں کہ بچے کو دودھ پلانے سے ان کے جسم کے حسن اور خوبصورتی میں نقص آسکتا ہے، اس لیے وہ دودھ پلانے سے کتراتی ہیں۔[1]

دودھ کے جمع کرنے اور حفاظت کا طریقہ کار

انسانی دودھ جمع کرنے والے ادارے پہلے اچھی طرح اس بات کا اطمینان کر لیتے ہیں کہ جس عورت کا دودھ لیا جا رہا ہے وہ ٹی بی، ایچ آئی وی یا ہیپاٹائٹس جیسے متعدی امراض کا شکار تو نہیں ہے۔ بعض ادارے یہ شرط بھی عائد کرتے ہیں کہ عورت سگریٹ نوشی کرنے والی اور ایسی ادویات استعمال کرنے والی بھی نہ ہو جس سے دودھ کے مضرِ صحت ہونے کا اندیشہ ہے۔ بعض ادارے یہ ضروری خیال کرتے ہیں کہ عورت نے قریبی عرصہ میں کسی کو خون نہ دیا ہو، نہ عورت کو کسی کا خون دیا گیا ہو، نہ اعضاء کی منتقلی(transplantation) ہوئی ہو، البتہ اگر اس کے بعد بارہ ماہ گزر چکے ہیں تو دودھ لیا جا سکتا ہے۔

---

[1] موسوعة الطبية الفقهية، ص:٤٨٧

اس کے بعد ادارے کا تربیت یافتہ عملہ عورت کی چھاتی سے دودھ جمع کرتا ہے۔ایسا دودھ یا تو ہاتھوں سے نکالا جاتا ہے یا بریسٹ پمپ(breast pump)کے ذریعے سے حاصل کیا جاتا ہے۔دودھ لیتے وقت ہاتھ اور بریسٹ پمپ کا صاف وشفاف ہونے کا ضرور خیال رکھا جاتا ہے اور ایسا دودھ باقاعدہ لیبل شدہ اور جراثیم سے پاک کنٹینرز (containers)میں نکالا جاتا ہے اور کولڈ اسٹوریج کے ذرائع سے ہی بینکوں کو پہنچایا جاتا ہے۔

جب دودھ ملک بینک کے پاس آجاتا ہے تو شروع شروع میں اُسے خشک کر کے سفوف اور پاوڈر بنالیا جاتا تھا، جس میں مصنوعی دودھ کی طرح پانی ملا کر دودھ تیار کر لیا جاتا تھا، لیکن بعد میں اس طریقہ کار کو اس لیے ترک کر دیا گیا کہ اس سے ایک خاص قسم کے جراثیم(مضادات الاجسام/antibodies)مفقود ہو جاتے تھے، جن کا انسانی دودھ میں ہونا ضروری ہے۔اسی طرح ابتداء میں دودھ کو خاص کنٹینرز میں رکھ کر ان کنٹینرز کو ٹھنڈی جگہ پر تقریباً تین مہینے کے لیے رکھا جاتا تھا، لیکن آج کل ایسے دودھ کے پیسچرائز(pasteurize)سے پہلے فریج اور فریزر میں دودھ کو تقریباً(۴) سینٹی گریٹ درجہ حرارت میں(۴۸) سے لے کر(۷۲) گھنٹوں کے لیے رکھا جاتا ہے، تاہم یہ ہدایت اور کوشش کی جاتی ہے کہ جتنا جلدی ہو سکے، دودھ کو پیسچرائز کر کے اس کے جراثیم ختم کر دیے جائیں۔

دودھ کا باقاعدہ بیکٹریل(bacterial)ٹیسٹ کیا جاتا ہے، اگر دودھ میں جراثیم پائے جائیں تو اُنہیں ختم کرنے کے لیے دودھ کو پیسچرائز(pasteurize)کیا جاتا ہے، جس کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے جاتے ہیں، تاہم سب میں یہ بات مشترک ہے کہ خاص ٹمپریچر میں کچھ متعین وقت کے لیے دودھ کو ایک خاص مقدار کی درجہ حرارت، خاص طریقے سے پہنچا کر جراثیم ختم کیے جاتے ہیں۔

یہ ہدایت بھی ملتی ہے کہ دودھ نکالنے کے بعد فریزر وغیرہ میں منفی بیس سینٹی گریٹ(-20°C) میں زیادہ سے زیادہ چھ مہینے کے لیے دودھ رکھا جا سکتا ہے، چھ مہینے کے اندر اندر اس کا استعمال کیا جائے۔اور جب بچے کو ایسا دودھ پلانا شروع کیا جائے تو استعمال شدہ دودھ زیادہ سے زیادہ تین مہینے کے اندر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

منجمد دودھ کو پگلانے کے لیے اُسے آہستہ آہستہ گرم کیا جائے یا گرم پانی سے کنٹینر کو دھویا جائے، لیکن پانی سینتیس سینٹی گریٹ (37 °C) سے زیادہ گرم نہ ہو۔مائیکروویو(microwave)میں ایسا دودھ پگلانے کے لیے گرم نہ کیا جائے اور جس دودھ کو ایک مرتبہ پگلا دیا جائے، اُسے دوبارہ منجمد نہ کیا جائے۔[1]

---

[1] یہ تفصیل درج ذیل ویب سائٹس سے لی گئی ہے:

• https://www.ncbi.nlm.nih.gov/pubmed/27336107 /• www.westerncape.gov.za/.../health/donorbank

طبعی رضاعت کے فوائد

نومولود بچے کے لیے ماں کا دودھ قدرت کا بہترین تحفہ ہے۔ جدید تحقیق سے یہ بات پوری طرح واضح ہوچکی ہے کہ ماں کا دودھ بچے کے لیے ایک مکمل اور بھرپور غذا ہے، مصنوعی دودھ اس کا متبادل نہیں ہوسکتا، بلکہ اطباء کی تحقیق کے مطابق براہِ راست ماں کی چھاتی سے دودھ پینے میں وہ فوائد ہیں جو نہ مصنوعی دودھ میں پائے جاتے ہیں اور نہ ہی کسی عورت کا دودھ نکالنے کے بعد بچے کو پلانے سے وہ فوائد حاصل ہوسکتے ہیں۔ ماں کے دودھ سے حاصل ہونے والے فوائد مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ ماں کا دودھ آسانی سے ہضم ہوجاتا ہے، بلکہ ماں کے دودھ میں موجود پروٹین بھی زود ہضم ہوتے ہیں اور ان سے الرجی کا امکان کم ہوتا ہے اور زیادہ گرم یا ٹھنڈا نہیں ہوتا، بلکہ قدرتی طور پر اس کی حرارت بچے کے لیے مناسب اور مفید ہوتی ہے۔

۲۔ ماں کا دودھ غذائیت سے بھرپور ہوتا ہے جس سے بچے کے جسم کو بہتر طریقے سے نشو نما ملتی ہے، بلکہ تحقیق سے یہ بھی ثابت ہوچکا ہے کہ اس میں وٹامن اے وافر مقدار میں ہوتا ہے جو بچے کو طاقتور اور صحت مند بناتا ہے۔

۳۔ ماں کے دودھ میں بڑی مقدار میں ایک خاص قسم کا ایسڈ (essential feed acid) ہوتا ہے جو بچوں کے دماغ، خون کی نالیوں اور اعصابی نظام کی نشو نما کے لیے اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ ماں کے دودھ میں ایک فیگو سائٹ خلیہ (macrophages) ہوتا ہے جو جراثیم اور مضر اجزاء کو ختم کرتا ہے۔

۴۔ ماں کے دودھ میں ویسے پروٹین کی مقدار زیادہ ہوتی ہے یہ پروٹین انفیکشن کو کنٹرول میں رکھنے والے ہوتے ہیں جو بچے کو دست، سانس کی بیماریوں اور کان کے انفیکشن کے علاوہ دماغ کی جھلی کی سوجن اور پیشاب کی نالی کے انفیکشن سے محفوظ رکھنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

۵۔ ماں کے دودھ سے بچے کے دانت آسانی سے نکلتے ہیں اور جبڑے اور آنتوں کو مضبوط کرنے میں مددگار ہوتا ہے۔

۶۔ ایک رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ماں کا دودھ پینے والے بچے کم بیمار پڑتے ہیں، ایک تو اس وجہ سے اور دوسرے ماں کے ساتھ زیادہ نزدیک رہنے کے سبب ایسے بچوں کے رویے میں مثبت اثرات پائے جاتے ہیں۔

۷۔ خود ماں بچے کو دودھ پلانے کے باعث کئی بیماریوں سے محفوظ رہتی ہے، مثلاً چھاتی کا سرطان، اور ہڈیوں کا بھر بھرا پن وغیرہ۔ اسی طرح ولادت کی وجہ سے عورت کے رحم کو جو ناہمواری پیش آتی ہے، بچے کو دودھ پلانے سے وہ ختم

ہو جاتی ہے اور رحم اپنی اصلی اور طبعی حالت کی طرف آسانی سے لوٹ آتا ہے۔

۸۔ماں کا دودھ پینے سے بچہ ماں سے قربت، انسیت اور گہرا تعلق محسوس کرتا ہے۔

۹۔ماں کا دودھ قدرتی طور پر نہایت صاف ستھرا ہوتا ہے اور اس کا درجہ حرارت ہمیشہ مناسب ہوتا ہے۔

۱۰۔بعض تحقیقی رپورٹز میں ان کے علاوہ فوائد کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ مثلاً ماں کا دودھ پینے والے بچوں میں بلڈ پریشر اور اس سے متعلقہ امراض بہت کم پائے جاتے ہیں۔ شوگر، موٹاپے اور خون کے سرطان سے محفوظ رہتے ہیں۔ ایسے بچوں میں منفی رویے جیسے غصہ اور رونا وغیرہ، نہیں ہوتے۔ جو ماں اپنے بچے کو دودھ پلائے اس کا رحم انفیکشن وغیرہ سے محفوظ رہتا ہے وغیرہ۔[1]

ملک بینک کے نقصانات

جہاں تک ملک بینک کے قیام اور اس کے دودھ کے استعمال کی شرعی خرابیوں کا ذکر ہے تو اس کی تفصیل ''شرعی احکام'' کے عنوان کے تحت بیان کی جائے گی۔ یہاں صرف ملک بینک کی دنیوی خرابیوں اور نقصانات کا تذکرہ کیا جائے گا، جن کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔انسانی دودھ کے بینک میں دودھ پر (چھاتی سے نکالنے سے لے کر بچے کو پلانے تک) کئی مراحل آتے ہیں، ایسے مراحل میں دودھ میں کسی وائرس کا آجانا کوئی بعید نہیں ہے، جیسے مشاہدے میں آیا ہے کہ ایسے دودھ میں ایچ آئی وی وائرس (human immunodeficiency virus) آجاتا ہے جو ایڈز (AIDS) کا سبب بنتا ہے۔ اسی طرح اس میں ہیپاٹائٹس بی وائرس (hepatitis B virus) بھی پایا گیا ہے جو جگر کے کینسر کا سبب بنتا ہے۔

۲۔مختلف مراحل سے گزارنے اور کیمیکل یا دوسرے اجزاء ملانے کی وجہ سے ایسے دودھ میں وہ خصوصیات مکمل طور پر نہیں پائی جاتیں جو ایک ماں کے دودھ میں پائی جاتی ہیں۔

۳۔بچے کو براہِ راست اپنا دودھ پلانے کے بجائے ملک بینک کے دودھ کے استعمال سے نہ تو بچے کو وہ فوائد حاصل ہوتے ہیں جو براہِ راست چھاتی سے دودھ پینے میں ہوتے ہیں، جیسے دانتوں کا آسانی سے نکل آنا، جبڑوں کی مضبوطی وغیرہ اور نہ ہی ماں کو وہ فوائد حاصل ہوتے ہیں جو دودھ پلانے میں عورت کو ملتے ہیں، مثلاً بچے کو دودھ پلانے سے ماں کے جسم

---

[1] یہ تفصیلات ان ویب سائٹس سے لی گئی ہیں:
http://www.shefa-online.net/news/displayArticle.asp?aid=380&x=
http://www.aljazeera.net/health/2002/4/4-1-1.htm

سے اکسیتو سین (oxytocin) کا مادہ خارج ہو جاتا ہے، جس سے رحم دوبارہ طبعی حالت کی طرف لوٹ آتا ہے، اس سے عورت چھاتیوں کے کینسر سے محفوظ رہتی ہے اور دودھ نہ پلانے کی وجہ سے ماں اور بچے درمیان انسیت و قربت کی بھی کمی پائی جاتی ہے۔

۴۔ ایسے دودھ کا حصول نہایت مہنگا ہوتا ہے، کیونکہ ایک تو عموماً عورت اپنا دودھ مفت میں نہیں دیتی۔ دوسرے اس کی حفاظت کے لیے تربیت یافتہ عملہ، مشینری اور بہت سارا وقت چاہیے ہوتا ہے، ان سب کے اخراجات ملا کر جب ملک بینک دودھ بیچے گا تو اس کا خریدنا آسان نہیں ہوگا۔ اس سے استفادہ کرنے والے صاحبِ ثروت ہوں گے اور اپنا دودھ بیچنے والی عورتیں غرباء و مساکین ہوں گی جو اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے اپنے جسم کا ایک جزء بیچنے پر مجبور ہوں گی۔

۵۔ مدتِ رضاعت میں بچے کو جو دودھ فراہم کیا جاتا ہے، اس سے بچے کی طبیعت اور اخلاق پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ یہ بات طبی تحقیق سے بھی ثابت ہو چکی ہے۔ ملک بینک میں موجود مخلوط دودھ مختلف اخلاق و عادات والی عورتوں کا ہو سکتا ہے، لہٰذا ایسے دودھ کا استعمال بچے کے رویے اور اخلاق و خصائل کے لیے مضر ہو سکتا ہے۔[1]

شرعی احکام

ملک بینک سے کئی شرعی مسائل متعلق ہیں، جن کو ہم چار عنوانات سے بیان کر سکتے ہیں:

۱۔ رضاعت کے ثبوت کی کیفیت

۲۔ مخلوط دودھ سے رضاعت کا ثبوت

۳۔ انسانی دودھ کی خرید و فروخت

۴۔ ملک بینک کے قیام کا شرعی حکم

۱۔ رضاعت کے ثبوت کی کیفیت:

پہلا اور اہم مسئلہ یہ ہے کہ رضاعت کے ثبوت کے لیے براہ راست عورت کے پستانوں سے دودھ پینا ضروری ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں فقہاء کرام کی دو آراء سامنے آئی ہیں:

۱۔ جمہور فقہاء کرام جن میں حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ شامل ہیں، کی رائے یہ ہے کہ رضاعت کے ثبوت کے لیے براہ راست عورت کے پستانوں سے دودھ پینا ضروری نہیں ہے، بلکہ اگر عورت کا دودھ نکال کر کسی برتن وغیرہ میں ڈال کر بچے کو مدتِ رضاعت میں پلا دیا جائے تو رضاعت ثابت ہو جائے گی۔ اس کی مثالیں دیتے ہوئے فقہاء نے ''وجور''

---

(1) مجلة مجمع الفقه الإسلامي ٢/ ٢٦٤، البنوك الطبيه البشرية وأحكامها الفقهية، ص:٣٢٧.

اور ''سعوط'' کی صورتیں بیان کی ہیں۔ ''وجور'' کا مطلب ہے کہ عورت کا دودھ نکال کر کسی برتن وغیرہ میں ڈال کر کسی بچے کے حلق میں ڈال دیا جائے اور ''سعوط'' کا مطلب یہ ہے کہ دودھ نکال کر بچے کی ناک میں ڈال دیا جائے۔ دونوں صورتوں میں اگر دودھ حلق سے اتر گیا تو رضاعت ثابت ہو جائے گی۔

علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ اس مسئلہ کی وضاحت کچھ یوں کرتے ہیں:

معنى السعوط: أن يصب اللبن في أنفه من إناء أو غيره، والوجور: أن يصب في حلقه صبا من غير الثدي،واختلفت الرواية في التحريم بهما، فأصح الروايتين أن التحريم يثبت بذلك كما يثبت بالرضاع، وهو قول الشعبي و الثوري و أصحاب الرأي وبه قال مالك في الوجور، والثانية : لا يثبت بهما التحريم وهو اختيار ابي بكر ومذهب داود وقول عطاء الخراساني في السعوط، لأن هذا ليس برضاع وإنما حرم الله تعالى ورسوله بالرضاع، ولأنه حصل من غير ارتضاع فأشبه ما لو دخل من جرح في بدنه، ولنا ما روى ابن مسعود عن النبي- صلى الله عليه و سلم- : [لا رضاع إلا ما أنشز العظم وأنبت اللحم] رواه أبو داود، ولأن هذا يصل به اللبن إلى حيث يصل بالارتضاع، ويحصل به من إنبات اللحم وإنشاز العظم ما يحصل من الارتضاع، فيجب أن يساويه في التحريم.[1]

سعوط کا مطلب ہے کہ کسی برتن وغیرہ سے دودھ بچے کی ناک میں ڈالا جائے اور وجور کا مطلب ہے دودھ چھاتی کے علاوہ کسی دوسری چیز سے بچے کے حلق میں ڈالا جائے۔

ان دونوں صورتوں میں حرمت ثابت ہو گی یا نہیں، اس سلسلے میں روایات مختلف ہیں۔ صحیح روایت یہ ہے کہ ان سے بھی حرمت رضاعت ثابت ہو جائے گی، یہی شعبیؒ، ثوریؒ اور اصحابِ رائے کا مسلک ہے اور وجور کے سلسلے میں امام مالکؒ کا بھی یہی قول ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ ان صورتوں میں حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ اس رائے کو اختیار کرنے والے امام ابو بکرؒ اور داؤد ظاہری ہیں، جبکہ سعوط کے عدمِ حرمت کے بارے میں عطاء خراسانیؒ بھی ان کے ساتھ ہیں، کیونکہ (یہ حضرات یہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ) اللہ اور اس کے رسول نے رضاعت سے حرمت کے ثبوت کا فرمایا ہے اور یہ رضاعت نہیں ہے، بلکہ ایسا ہے جیسے کسی کے بدن میں زخم کے ذریعے دودھ داخل

[1] المغني ۹/۱۹۶

کیا جائے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے سرورِ دوعالم ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''رضاعت صرف اس دودھ سے ثابت ہوتی ہے جو ہڈی کو مضبوط اور گوشت کی بڑھوتری کرے''۔ چونکہ براہ راست دودھ پینے کی طرح ان دونوں صورتوں میں بھی دودھ وہاں تک پہنچ جاتا ہے جہاں وہ ہڈی کی مضبوطی اور گوشت کی بڑھوتری کا سبب بنتا ہے، اس لیے یہ دونوں صورتیں (سعوط اور وجور) حرمت ثابت کرنے میں براہ راست دودھ پینے کی طرح ہیں۔

علامہ حصکفیؒ رضاعت کی اصطلاحی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

شَرْعًا: مَصٌّ مِنْ ثَدْيِ آدَمِيَّةٍ، وَلَوْ بِكْرًا أَوْ مَيِّتَةً أَوْ آيِسَةً، وَأُلْحِقَ بِالْمَصِّ الْوَجُورُ وَالسَّعُوطُ، فِي وَقْتٍ مَخْصُوصٍ.(۱)

علامہ خرشی مالکیؒ لکھتے ہیں:

الرضاع عرفا: وصول لبن آدمي لمحل مظنة غذاء آخر لتحريمهم بالسعوط والحقنة.(۲)

علامہ نووی شافعیؒ لکھتے ہیں:

والسعوط والوجور كالرضاع، فإذا صب اللبن في أنفه من أناء أو غيره أو صب في حلقه صبا من غير الثدى فكلا الأمرين الحكم فيهما حكم الرضاع.(۳)

۲۔ دوسری رائے ظاہریہ کی ہے۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ رضاعت کے ثبوت کے لیے براہ راست عورت کے پستانوں سے دودھ پینا ضروری ہے۔ امام احمدؒ کی ایک روایت بھی اسی طرح ہے، لیکن حنابلہ کا راجح قول جمہور کی طرح ہے جس کی طرف علامہ ابن قدامہؒ نے اشارہ کیا ہے۔

علامہ ابن حزمؒ لکھتے ہیں:

من سقي لبن امرأة فشربه من أناء أو حلب في فيه فبلعه أو أطعمه بخبز أو في

---

(۱) الدر المختار ۳/ ۲۰۹

(۲) شرح مختصر خليل ٤/ ١٧٦

(۳) المجموع شرح المهذب ۱۸/ ۲۱۹

طعام أو صب في فمه أو في أنفه أو في أذنه أو حقن به، فكل ذلك لا يحرم شيئا، ولو كان ذلك غذاءه دهره كله.[1]

علامہ ابن حزمؒ نے رضاعت کے مقصد اور اصطلاحی مفہوم کو چھوڑ کر محض رضاعت کے لغوی معنی کو ملحوظ رکھا ہے، لیکن اس سلسلے میں جمہور فقہاء کا قول ہی راجح ہے، کیونکہ کئی احادیث ایسی ملتی ہیں جن میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ: "لا رضاع إلا ما شد العظم وأنبت اللحم" اور "لا يحرم من الرضاعة إلا ما فتق الأمعاء"۔ یعنی جس رضاعت سے بچے کے گوشت کو بڑھوتری اور ہڈیوں کو مضبوطی حاصل ہو جائے اور جس دودھ سے اس کی آنتیں کھل جائیں اس سے رضاعت ثابت ہوتی ہے۔ یہ بات اس صورت میں بھی پائی جاتی ہے جس میں عورت کا دودھ نکال کر کسی برتن میں ڈالنے کے بعد بچے کو پلایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے مدتِ رضاعت مقرر کرنے میں جہاں قرآن و حدیث کی نصوص سے استنباط کیا ہے وہیں وقت کی تحدید کی یہ توجیہ بھی بیان کی ہے کہ ایسے وقت کے بعد دودھ سے بچے کے گوشت کو بڑھوتری اور ہڈیوں کی مضبوطی حاصل نہیں ہوتی۔[2]

لہٰذا ملک بینک میں موجود عورتوں کے دودھ سے بھی رضاعت ثابت ہو جائے گی۔ اس قسم کے مفہوم کی چند احادیث ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

- أن عائشة ﷺ قالت: دخل علي النبي -ﷺ- وعندي رجل، فقال: يا عائشة! من هذا؟ قلت: أخي من الرضاعة، قال: يا عائشة! انظرن من إخوانكن، فإنما الرضاعة من المجاعة.[3]
- عن أم سلمة-ﷺ- قالت: قال رسول الله -صلى الله عليه و سلم-: لا يحرم من الرضاعة إلا ما فتق الأمعاء في الثدي وكان قبل الفطام.[4]
- عن ابن مسعود-ﷺ- قال: لا رضاع إلا ما شد العظم وأنبت اللحم.[5]

---

[1] المحلى ١٠/ ٧

[2] بدائع الصنائع ٤/ ٦

[3] صحيح البخاري ص: ٣٧٨، حديث نمبر: ٢٦٤٧

[4] سنن الترمذي ٣/ ٤٥٨، حديث نمبر: ١١٥٢

[5] سنن ابی داود ٢/ ١٨٠، حديث نمبر: ٢٠٦١

۲۔ مخلوط دودھ سے رضاعت کا ثبوت:

دوسرا اہم مسئلہ جسے یہاں بیان کرنا ضروری ہے، یہ ہے کہ جب عورت کے دودھ میں کوئی دوسری چیز مل جائے تو ایسے دودھ کے پینے سے رضاعت ثابت ہوگی یا نہیں؟ اس مسئلہ کی جو تفصیل یہاں مقصود ہے اُسے تین نکات میں بیان کیا جائے گا، کیونکہ ملک بینک میں عموماً عورتوں کے دودھ کے ساتھ تین قسم کی اشیاء ملائی جاتی ہیں:

الف- پانی

ب-دواء یا کیمیکل

ج-دوسری عورت کا دودھ

الف، ب- جس دودھ میں پانی یا دواء ملائی گئی ہو، اس کا حکم:

جس دودھ میں پانی یا دواء ملائی گئی ہو اور وہ کسی بچے کو پلایا جائے تو اس سے حرمتِ رضاعت ثابت ہونے یا نہ ہونے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر عورت کا دودھ غالب ہو اور پانی یا دواء مغلوب اور کم ہو تو ائمہ ثلاثہ (امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ) اور امام ابو یوسف و امام محمدؒ کی رائے یہ ہے کہ ایسے دودھ سے حرمتِ رضاعت ثابت ہو جاتی ہے، کیونکہ اصل اعتبار غالب چیز کا ہوتا ہے اور مغلوب چیز معدوم کے درجے میں ہوتی ہے، اس کا اعتبار نہیں ہوتا۔ جبکہ امام ابو حنیفہؒ کی رائے کے مطابق اگر دودھ کسی پانی یا دواء وغیرہ سے مل جائے تو اس سے حرمت ثابت نہیں ہوتی، خواہ دودھ غالب ہو یا مغلوب۔ اگرچہ حنابلہ کی ایک روایت یہ ہے کہ اس صورت میں حرمتِ رضات ثابت نہ ہوگی، لیکن ان کے ہاں راجح اور اصح قول حرمت کے ثبوت کا ہی ہے۔

اگر دودھ مغلوب اور کم ہو، جبکہ پانی یا دواء غالب اور زیادہ ہو تو ایسی صورت میں حنفیہ، مالکیہ، حنابلہ اور ایک روایت کے مطابق شافعیہ کا مسلک یہ ہے کہ حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہوگی، جبکہ شافعیہ کا اصل مسلک اور حنابلہ کی ایک روایت کے مطابق اس صورت میں بھی حرمت ثابت ہو جائے گی۔

واضح رہے کہ حنفیہ کے ہاں اگر دودھ میں کوئی دوسری چیز ملا کر اُسے اس طرح پکایا جائے کہ وہ دودھ نہ رہے، بلکہ کسی کھانے کی چیز کی شکل اختیار کرلے تو اس چیز کے کھانے سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی، لیکن ظاہر ہے کہ ملک بینک میں دودھ سے کوئی اور چیز نہیں بنائی جاتی، ورنہ اس طرح کے بینکوں کا اصل مقصد ہی ختم ہو جائے گا، اس لیے حنفیہ کی یہ رائے ملک بینک پر لاگو نہیں ہو سکتی ہے۔[1]

---

[1] المبسوط للسرخسي ٥/ ١٤٠، الفقه على المذاهب الأربعة ٤/ ١٢٨، مغني المحتاج ٣/ ٤١٥، الإنصاف ٩/ ٢٤٨

ملک بینک میں دودھ غالب ہی ہوتا ہے، پانی یادواء قلیل مقدار میں ہوتی ہے جن کو دودھ پگلانے یا اس کی حفاظت کے لیے یا کسی اور مقصد کے لیے اضافی طور پر (additives) ملایا جاتا ہے، اس لیے ایسے دودھ سے جمہور علماء کرام کی رائے کے مطابق حرمتِ رضاعت ثابت ہو جائے گی۔ حنفیہ کے ہاں بھی صاحبینؒ کے قول پر فتوی دیا گیا ہے۔[1]

اگر غور کیا جائے تو اس صورت میں امام ابو حنیفہؒ کی رائے کے مطابق بھی حرمتِ رضاعت ثابت ہو جائے گی، کیونکہ علامہ شامیؒ کی تحقیق یہ ہے کہ دودھ میں جو چیز ملائی جاتی ہے اگر وہ ثخین اور موٹی چیز ہو، جس کو باقاعدہ لقمہ بنا کر کھایا جاتا ہو تو اس صورت میں امام صاحب کی رائے حرمت کے عدمِ ثبوت کی ہے، لیکن اگر دودھ میں کوئی مائع چیز جیسے پانی ملا دیا جائے جس کو لقمہ بنا کر نہ کھایا جاتا ہو، بلکہ اُسے پیا جاتا ہو تو اس صورت میں امام صاحب کی رائے یہ ہے کہ حرمتِ رضاعت ثابت ہو جائے گی۔ آپؒ لکھتے ہیں:

وَكَلَامُنَا فِيمَا إِذَا كَانَ الطَّعَامُ رَقِيقًا يُشْرَبُ حَسْوًا، وَهَذَا تَثْبُتُ بِهِ الْحُرْمَةُ كَمَا سَمِعْته، وَلَمْ أَرَ مَنْ صَحَّحَ خِلَافَهُ؛ وَلَا يُقَالُ: يَلْزَمُ مِنْ تَقَاطُرِ اللَّبَنِ عِنْدَ رَفْعِ اللُّقْمَةِ أَنْ يَكُونَ الطَّعَامُ رَقِيقًا يُشْرَبُ. لِأَنَّهُ لَوْ كَانَ كَذَلِكَ لَمْ يَكُنْ التَّقَاطُرُ مِنْ اللَّبَنِ وَحْدَهُ بَلْ يَكُونُ مِنْهُمَا مَعًا، فَعُلِمَ أَنَّ الْمُرَادَ كَوْنُ الطَّعَامِ ثَخِينًا لَا يُشْرَبُ، وَلَفْظُ اللُّقْمَةِ مُشْعِرٌ بِذَلِكَ أَيْضًا فَافْهَمْ.[2]

علامہ ابن ہمامؒ نے بھی اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔ آپؒ لکھتے ہیں:

أَمَّا عِنْدَ رَفْعِ اللُّقْمَةِ إِلَى فِيهِ فَأَكْثَرُ الْوَاصِلِ إِلَى جَوْفِهِ الطَّعَامُ حَتَّى لَوْ كَانَ ذَلِكَ الطَّعَامُ رَقِيقًا يُشْرَبُ، اعْتَبَرْنَا غَلَبَةَ اللَّبَنِ إِنْ غَلَبَ وَأَثْبَتْنَا الْحُرْمَةَ.[3]

ج۔ مختلف عورتوں کے مخلوط دودھ کا حکم:

ملک بینک میں ہر عورت کا دودھ الگ نہیں رکھا جاتا، بلکہ کئی عورتوں کا دودھ مخلوط ہوتا ہے، ایسی صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب کئی عورتوں کا دودھ ایک دوسرے کے ساتھ مل جائے تو کیا ایسا مخلوط دودھ بچے کو پلانے سے حرمتِ رضاعت ثابت ہو گی یا نہیں؟ اور اگر حرمت ثابت ہوتی ہے تو کیا یہ حرمت ہر اس عورت کے ساتھ متعلق ہو گی جس کا دودھ ملک بینک میں ہے یا بعض عورتوں یا کسی خاص عورت کے ساتھ اس حرمت کا تعلق ہو گا؟

---

(۱) الدر المختار ۳/ ۲۱۸

(۲) حاشية ابن عابدين ۳/ ۲۱۹

(۳) فتح القدير ۷/ ٤١٦

ائمہ اربعہ کی آراء میں غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں جتنی بھی عورتوں کا دودھ ملا ہوا اور مخلوط ہو اُن سب عورتوں کے ساتھ مخلوط دودھ پینے والے بچے کی رضاعت کا رشتہ ثابت ہو جائے گا، خواہ تمام عورتوں کا دودھ مساوی اور برابر ہو، کسی کا غالب اور زیادہ ہو اور کسی کا کم و مغلوب، بہر صورت یہی حکم ہے۔ یہ رائے اتفاقی ہے۔

البتہ فقہاء حنفیہ اور شافعیہ کا ایک قول یہ ہے کہ اگر کسی عورت کا دودھ غالب ہو تو رضاعت کا رشتہ صرف اُسی سے متعلق ہوگا، بقیہ عورتوں سے نہیں ہوگا، لیکن یہ قول ان کے ہاں بھی کوئی راجح یا صحیح نہیں ہے۔ لہذا جس وقت ملک بینک سے دودھ حاصل کیا جائے گا، اُس وقت تک جتنی بھی عورتوں نے ملک بینک میں اپنا دودھ جمع کرایا ہو، ہر اُس عورت کے ساتھ ایسے دودھ پینے والے بچے کا رضاعی رشتہ ثابت ہو جائے گا، جو ایک، دو نہیں، بلکہ کئی عورتیں ہو سکتی ہیں۔[۱]

۳۔ انسانی دودھ کی خرید و فروخت:

ملک بینک سے متعلق ایک اہم مسئلہ انسانی دودھ کی خرید و فروخت کا ہے، کیونکہ ملک بینک کو مفت میں دودھ فراہم کرنے والی خواتین نہ ہونے کے برابر ہیں، عموماً خواتین اپنا دودھ ملک بینک کو فروخت ہی کرتی ہیں اور ملک بینک اس کو آگے فروخت کرتا ہے۔

آزاد عورت کا دودھ نکال کر بیچنے کے حکم میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے۔ فقہاء حنفیہ اور مالکیہ کے ہاں انسانی دودھ کی خرید و فروخت جائز نہیں ہے، امام احمد بن حنبلؒ اور امام شافعیؒ کی ایک روایت بھی یہی ہے۔[۲]

ان کی ایک دلیل یہ ہے کہ انسان کے تمام اجزاء محترم و مکرم ہیں،[۳] اس کا کوئی جزء مال نہیں ہے کہ جس کی بیع کو جائز قرار دیا جائے۔ دوسرے اس لیے کہ احادیث میں آزاد آدمی کی بیع کو منع کیا گیا ہے، بلکہ علامہ ابن حجرؒ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے،[۴] لہذا جب مکمل انسان کی بیع جائز نہیں ہے تو اس کے جزء یعنی دودھ کی بیع کیسے جائز ہو سکتی ہے؟ تیسرے اس لیے بھی کہ باری تعالیٰ نے انسان کو اشیاء کا مالک بنا کر پیدا کیا ہے، اس کے کسی جزء کو مال قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ مملوک ہے، حالانکہ مالک اور مملوک میں تناقض اور منافات ہے۔

جبکہ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا اصل مسلک یہ ہے کہ انسانی دودھ کو نکالنے کے بعد خریدنا یا بیچنا جائز ہے، اس کی وجہ

---

(۱) الدر المختار ۳/ ۲۱۸، الشرح الكبير للدردير ۲/ ۵۰۳، المغني ۹/ ۱۹۷، مغني المحتاج ۳/ ٤١٥

(۲) المجموع شرح المهذب ۹/ ۲٥٤، المغني ٤/ ۳۲۹

(۳) الاسراء: ۷۰

(۴) فتح الباری ٤/ ۳۲٤

یہ بیان کی جاتی ہے کہ انسانی دودھ پاک اور ایک قابلِ انتفاع چیز ہے، لہٰذا اس کی بیع جائز ہونی چاہیے۔

علامہ ابن قدامہؒ ائمہ اربعہ کی آراء اور ان کی وجوہات کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

فأما في بيع لبن الآدميات فقال أحمد : أكرهه واختلف أصحابنا في جوازه، فظاهر كلام الخرقي جوازه، لقوله: وكل ما فيه المنفعة، وهذا قول ابن حامد ومذهب الشافعي، وذهب جماعة من أصحابنا إلى تحريم بيعه وهو مذهب أبو حنيفة و مالك، ولأنه مائع خارج من آدمية فلم يجز بيعه كالعرق، ولأنه من آدمي فأشبه سائر أجزائه، والأول أصح لأنه لبن طاهر منتفع به فجاز بيعه كلبن الشاة.[1]

عورتوں کے دودھ کے بارے میں امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ یہ مکروہ ہے، ہمارے اصحاب کا اس کے جواز کے بارے میں اختلاف ہے، امام خرقی کے کلام سے جواز معلوم ہوتا ہے، کیونکہ ان کا قول ہے کہ ''ہر وہ چیز جس میں نفع ہو، اس کی بیع جائز ہے۔'' یہی ابن حامد اور امام شافعی کی بھی رائے ہے۔ ہمارے چند اصحاب کے ہاں ایسے دودھ کی بیع ناجائز ہے، یہی رائے امام ابو حنیفہ اور امام مالک کی بھی ہے، کیونکہ یہ انسانی بدن سے نکلنے والا سیال مادہ ہے، جو پسینہ کی طرح ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ انسان کے دوسرے اجزاء کی طرح ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ دودھ پاک ہے، اس سے نفع بھی اٹھایا جا سکتا ہے، لہٰذا بکری کے دودھ کی طرح اس کی بھی بیع جائز ہے۔

فقہاء حنفیہ اور مالکیہ کے دلائل کے قوی ہونے کے باوجود یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ ملک بینک میں محض انسانی دودھ کی خرید و فروخت کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ اس میں دیگر دنیوی اور دینی خرابیاں بھی پائی جاتی ہیں، جن کا تذکرہ آگے آرہا ہے، اس لیے محض فقہاء شافعیہ اور حنابلہ کی رائے کی بنیاد پر ملک بینک کو جواز کی سند فراہم کرنا عجلت پسندی یا سطح بینی ہی سمجھی جائے گی۔

۴۔ملک بینک کے قیام کا شرعی حکم:

سابقہ تفصیلات کے بعد اب ہم اصل مسئلہ بیان کر سکتے ہیں کہ ملک بینک کا قیام شرعی نقطہ نظر سے کیسا ہے؟ اس سلسلے میں معاصر علماء کی تین آراء سامنے آئی ہیں:

۱۔اجازت ۲۔ممانعت ۳۔مشروط اجازت

---

[1] المغني ٤/ ٣٢٩

۱۔ پہلی رائے:

بعض معاصر علماء ملک بینک کے قیام کی اجازت دیتے ہیں۔ ان میں سے سرِ فہرست شیخ یوسف قرضاوی ہیں۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

أننا لا نجد هنا ما يمنع من إقامة هذا النوع من "بنوك الحليب"، مادام يحقق مصلحة شرعية معتبرة، ويدفع حاجة يجب دفعها، آخذين بقول من ذكرنا من الفقهاء، مؤيدًا بما ذكرنا من أدلة وترجيحات.[۱]

ان کے علاوہ دیگر کئی علماء عرب نے بھی یہی رائے اختیار کی ہے۔ ان حضرات کے دلائل کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ ایک دلیل یہ ہے کہ ملک بینک کے دودھ کے استعمال سے حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہوتی، کیونکہ حرمتِ رضاعت کے ثبوت کے لیے براہ راست چھاتی سے دودھ پینا ضروری ہے۔ دوسرے اس لیے بھی کہ جب ایک عورت کا دودھ دوسری عورت کے دودھ سے مل جائے تو بعض فقہاء کے ہاں اس سے حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہوتی، لہذا جب ملک بینک میں یہ خرابی (حرمت کا ثبوت) موجود نہیں ہے تو اس کا قیام ممنوع نہیں ہے۔

۲۔ ملک بین میں موجود دودھ پر کئی مراحل گزرتے اور اس میں کئی تغیرات پائے جاتے ہیں، مثلاً کیمیکل وادویات کی ملاوٹ، پانی اور دوسری عورتوں کے دودھ کا ملانا اور آگ کے استعمال کے ساتھ ساتھ تخفیف اور دودھ خشک کرنے کا عمل وغیرہ۔ ان تغیرات کے بعد ایسے دودھ سے حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہونی چاہیے۔

۳۔ ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ جب رضاعت میں شک واقع ہو جائے کہ بچے نے کسی عورت کا دودھ پیا ہے یا نہیں تو اس صورت میں بھی حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ ملک بینک میں جتنی عورتوں کا دودھ موجود ہوتا ہے، ان کے بارے مکمل معلومات نہیں ہوتیں اور یہ بھی معلوم نہیں ہوتا ہے کہ بینک میں کس عورت کا دودھ موجود ہے، اس لیے شک کی وجہ سے حرمت ثابت نہیں ہو گی۔

۴۔ ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ کئی فقہی قواعد ایسے ہیں جن میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ لوگوں کی مصالح کی رعایت اور ان سے ضرر کو دور کرنے کی مکمل کوشش کی جائے، جیسا کہ ایک مشہور قاعدہ ہے: "الضرر يزال"۔[۲]

---

[۱] مجلة مجمع الفقه الإسلامي ٢/ ٢٦٠

[۲] مجلة الأحكام العدلية ص: ١٨ (المَادَّةُ ٢٠)

ملک بینک میں بھی اُن بچوں کے لیے مصلحت ہے اور ان سے ضرر دور کیا جاتا ہے جن کی مائیں ان کو دودھ پلانے سے قاصر رہتی ہیں۔

۵۔ایک دلیل یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ آج کے دور میں ایسے بنکوں کی شدید ضرورت وحاجت ہے اور ضرورت کے موقع پر حکم میں آسانی پیدا ہوتی ہے، بلکہ آسانی اور تخفیف کا ایک سبب ''عمومِ بلویٰ'' بھی ہے جو یہاں پایا جاتا ہے کہ بچوں کو اپنی ماں کا دودھ نہ ملنا ایک اجتماعی وعمومی مسئلہ بن گیا ہے۔[1]

نقد و تبصرہ:

پہلی دلیل میں بیان کی گئی بات اگرچہ درست ہے، لیکن سابقہ تفصیلات سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ اس مسئلہ میں جمہور کی رائے زیادہ قوی ہے اور ملک بینک کی ایسی عمومی ضرورت نہیں ہے کہ بعض فقہاء کی رائے پر اس کی عام اجازت اور کھلی چھوٹ دی جائے۔

یہ بات بھی درست ہے کہ ملک بینک میں موجود دودھ پر کئی تغیرات اور مراحل آتے ہیں، لیکن اس حقیقت سے انکار کرنا ناممکن ہے کہ ان تغیرات سے دودھ کے بنیادی اوصاف اور اصلی ماہیت وحقیقت تبدیل نہیں ہوتی کہ اُسے کھانے کی چیز یا غیر دودھ قرار دے کر رضاعت کے عدمِ ثبوت کا قول اختیار کیا جائے۔

جہاں تک رضاعت میں شک کی بات ہے تو ہماری نظر میں یہ کوئی قوی دلیل نہیں ہے، کیونکہ شک کی جتنی بھی صورتیں فقہاء نے لکھی ہیں وہ سب رضاعت اور دودھ پینے کے ''وجود وعدم'' سے متعلق ہیں کہ بچے کے دودھ پینے اور نہ پینے میں شک واقع ہو جائے، یا جن فقہاء کے ہاں دودھ کی ایک خاص مقدار پینا شرط ہے اس میں شک ہو جائے۔

علامہ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں:

وإذا وقع الشك في وجود الرضاع أو في عدد الرضاع المحرم هل كملا أو لا، لم يثبت التحريم.[2]

---

[1] پہلی رائے کے دلائل وفتاوی کے لیے دیکھیں:

بنوك الحليب يوسف قرضاوي، مجلة مجمع الفقه الإسلامي ٢/ ٢٦٠، وتنبيه اللبيب حول بنوك الحليب، محمد بن فنخور ص:٣٨، بنوك الحليب البشري من منظور شرعي، احمد مصطفى القضاة، ص:١٩٠، فتاوى دار الإفتاء المصرية ٢/ ١٤٦، بنك لبن الأمهات، المفتي أحمد هريدى ٨ يولية ١٩٦٣م، فتاوى الأزهر ٩/ ٤٣١، الرضاع باللبن المجفف وبنك اللبن، المفتي عطية صقر، مايو ١٩٩٧، بنوك الحليب في ضوء الشريعة الإسلامية دراسة فقهية مقارنة، عبدالتواب مصطفى خالد معوض.

[2] المغني ٩/ ١٩٣

اگرچہ فقہاء کی تصریحات کے مطابق اگر کسی علاقے یا خاندان میں کسی عورت نے بچے کو دودھ پلایا اور دودھ پلانے والی عورت متعین طور پر معلوم نہ ہو تو ایسا بچہ اس علاقے یا خاندان میں نکاح کر سکتا ہے، لیکن اس سے بچنا بہر صورت اعلیٰ و بہتر ہے اور یہ محض اتفاقی صورتحال کا حکم ہے، اسے کلی اصول قرار دے کر ابتداء سے ہی اس طرح کے دودھ کے جمع کرنے، بیچنے اور پینے کی اجازت دینا کسی بھی طرح درست نہیں ہے۔[1]

لیکن اس کے باوجود پہلی رائے اختیار کرنے والے حضرات کی یہ دلیل درج ذیل وجوہات سے ہمیں کمزور نظر آتی ہے:

۱۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ شک کی بنیاد پر فقہاء نے جو نکاح کی اجازت دی ہے وہ محض ایک واقعہ یا صورت کا حکم ہے کہ اگر کبھی ایسی صورتحال پیش آجائے تو وہاں نکاح کی گنجائش ہے۔ اس سے اس بات کا جواز ثابت نہیں ہوتا کہ انسان قصداً کسی بچے کو کئی اجنبی عورتوں کا دودھ پلائے اور دودھ پلانے والی کو مجہول و نامعلوم رکھے۔ یہ رضاعت سے متعلق شریعت کے احکام کے ساتھ کھلواڑ ہے۔ یہی وجہ ہے فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ عورتوں پر واجب ہے کہ وہ بلاضرورت کسی اجنبی بچے کو دودھ نہ پلائے۔ جیسا کہ فتاویٰ ہندیہ میں مذکور ہے:

وَالْوَاجِبُ عَلَى النِّسَاءِ أَنْ لَا يُرْضِعْنَ كُلَّ صَبِيٍّ مِنْ غَيْرِ ضَرُورَةٍ، وَإِنْ فَعَلْنَ ذَلِكَ فَلْيَحْفَظْنَ أَوْ يَكْتُبْنَ.[2]

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ شک کی بنیاد پر فقہاء نے نکاح کی گنجائش دینے کے باوجود یہ لکھا ہے کہ اس صورت میں بھی نکاح نہ کرنا زیادہ افضل ہے۔ لہذا محض ایک جزوی واقعہ میں استحسان کی بنیاد پر دی گئی گنجائش کو لے کر یہ عمومی حکم جاری کرنا کہ ملک بینک کے لیے کئی عورتوں کا دودھ لے کر جمع کرنا جائز ہے، ہر گز مقاصدِ شریعت کے ساتھ ہم آہنگ بات نہیں ہے۔

یہ حقیقت اپنی جگہ درست ہے کہ ایسے بنکوں میں کئی بچوں کے لیے مصلحت ہے، لیکن اس مصلحت سے زیادہ ان میں مفاسد اور مضرتیں ہیں، دنیوی نقصانات کے ساتھ ساتھ شرعی خرابیاں بھی ان میں پائی جاتی ہیں اور فقہی قاعدہ ہے کہ مفاسد کو دور کرنا، مصالح کے حصول سے مقدم ہے۔ دَرْءُ الْمَفَاسِدِ أَوْلَى مِنْ جَلْبِ الْمَنَافِعِ.[3]

---

[1] الفتاوى الهندية ۱/ ۳۴۵

[2] حواله بالا ۱/ ۳۴۵

[3] مجلة الأحكام العدلية ص: ۱۹ (المَادَّةُ ۳۰)

جہاں تک بچوں کو واقع ہونے والے ضرر کی بات ہے تو اگرچہ ایسے بنکوں سے وہ ضرر دور ہو سکتا ہے اور ضرر کا ازالہ بھی شریعت میں مطلوب ہے، لیکن جب ایک ضرر کے ازالہ کی کوشش میں اسی جیسے یا اس سے بڑے دوسرے ضرر کے واقع ہونے کا اندیشہ ہو تو اس ضرر کو دور نہیں کیا جاتا ہے، یہی فقہی قاعدہ ہے۔ الضَّرَرُ لَا يُزَالُ بِمِثْلِهِ.[۱]

ملک بینک کے قیام سے اگرچہ کچھ ضرر ختم ہوگا، لیکن اس کے نتیجے میں اس سے بڑا ضرر لازم آئے گا۔ اور یہ بھی ایک فقہی قاعدہ ہے کہ جب دو ضرروں کے درمیان تعارض آجائے تو بڑے ضرر کو دور کرنے کے لیے چھوٹے ضرر کو برداشت کر لیا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک ظاہر سی بات ہے کہ ملک بینک کے قیام کی حاجت بھی مخصوص بچوں کو ہے، دنیا کے تمام یا اکثر بچے ملک بینک کے محتاج نہیں ہیں، لیکن ملک بینک کے نقصانات مخصوص لوگوں کو لاحق ہونے والے نہیں ہیں، بلکہ ان کا منفی اثر عام لوگوں پر پڑتا ہے، یہ بھی فقہی قواعد کے خلاف ہے، کیونکہ خاص ضرر کو دور کرنے کے لیے عام ضرر کا ارتکاب جائز نہیں ہوتا، بلکہ عام ضرر کو دور کیا جاتا ہے، اگرچہ خاص ضرر کا ارتکاب کرنا پڑ جائے۔[۲]

یہ بات بھی درست ہے کہ ضرورت وحاجت اور عموم بلوی کی وجہ سے حکم میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے، لیکن ملک بینک کی نہ حقیقی معنی میں ضرورت ہے اور نہ ہی حاجت، بلکہ ماؤں کا اپنے بچوں کو دودھ نہ پلانا بھی کوئی ایسا عمومی یا اکثری مسئلہ نہیں ہے کہ اس کو عموم بلوی قرار دیا جائے۔

ضرورت وحاجت تو اس لیے نہیں ہے کہ عموماً مسلم خواتین اپنے بچوں کو دودھ پلاتی ہیں اور اگر بعض خواتین کسی عذر یا بغیر عذر کے دودھ نہ پلائے تو اجرت پر دودھ پلانے والی عورتیں بھی مل جاتی ہیں اور اگر کسی جگہ ایسی عورتیں بھی نہ ملیں تو جانوروں کا دودھ، ورنہ مصنوعی دودھ تقریباً ہر جگہ دستیاب ہے، اس کے باوجود ملک بینک کی ضرورت یا حاجت کی وجہ بیان کرنا کسی بھی طرح درست نہیں ہے۔

۲۔ دوسری رائے:

اس کے برعکس اکثر معاصر علماء کرام کی رائے یہ ہے کہ ملک بینک کا قیام شرعاً جائز نہیں ہے اور اس میں ایک سے زیادہ شرعی خرابیاں پائی جاتی ہیں۔ ان حضرات کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ پہلے دو باتیں سمجھنا ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ اسلام کی نظر میں دودھ کے رشتوں کی بڑی اہمیت ہے، اسی لیے دودھ کے رشتوں کی حرمت کو قرآن وسنت میں نسب کے رشتوں کے برابر گردانا گیا ہے۔ قرآنِ مجید میں نسبی رشتوں کی

---

(۱) مجلة الأحكام العدلية ص: ١٩ (المَادَّةُ ٢٥)

(۲) ایسے قواعد کے لیے ملاحظہ فرمائیں: مجلة الأحكام العدلية ص: ١٩ (المَادَّةُ ٢٦)و (المَادَّةُ ٢٧) و(المَادَّةُ ٢٨)و (المَادَّةُ ٢٩)

حرمت کے ساتھ ساتھ اسی پیرائے میں رضاعت کے رشتوں کی حرمت بیان فرمائی گئی ہے چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَأُمَّهَاتُكُمُ اللَّاتِي أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوَاتُكُم مِّنَ الرَّضَاعَةِ﴾[1]

دوسری بات یہ ہے کہ شریعت جیسے نسب کے اختلاط والتباس کو پسند نہیں کرتی، اسی طرح رضاعت کے رشتوں کے اشتباہ واختلاط کو بھی پسند نہیں کرتی۔ اسی لیے فقہاء لکھتے ہیں کہ عورت اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر کسی اور کے بچے کو دودھ نہ پلائے اور اگر دودھ پلانا ضروری ہو تو اسے یاد رکھے یا اپنے پاس لکھ کر رکھ لیں اور خاندان کے لوگوں کو بتائے تاکہ کل کو دودھ کے رشتے کی حرمت پامال نہ ہو۔[2]

اب سمجھیں کہ ملک بینک میں جتنی عورتوں کا دودھ موجود ہوگا، دودھ پینے والے بچے کے ساتھ ان سب عورتوں کا رشتہ رضاعت ثابت ہو جائے گا۔ یہی جمہور فقہاء کی رائے ہے کہ رضاعت کے ثبوت کے لیے براہ راست پستان سے دودھ پینا ضروری نہیں ہے اور کئی عورتوں کے مخلوط دودھ سے بھی حرمت ثابت ہو جاتی ہے، جیسا کہ ہم نے تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔ لیکن یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگا کہ بچہ کو جو دودھ دیا گیا ہے اس میں کس کس خاتون کا دودھ شامل تھا، نتیجہ حرمتِ رضاعت کے باب میں وارد احکام شرع کی پاسداری تقریباً ناممکن ہو گی۔ ایسی صورتحال میں مستقبل میں ایسے بچے کا نکاح کسی ایسی عورت کی اولاد سے ہونے کا بھی امکان ہے جس نے ملک بینک میں اپنا دودھ جمع کرایا ہو، یہ نکاح شرعاً حرام ہے اور اس سے نسب کا اختلاط لازم آتا ہے۔ یہ ایک بنیادی شرعی خرابی ہے۔

۲۔ ملک بینک میں عموماً دودھ کی خرید وفروخت ہوتی ہے اور یہ بات ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں کہ انسانی دودھ کی بیع کے بارے میں میں صرف امام احمد بن حنبلؒ اور ایک روایت کے مطابق امام شافعیؒ کی رائے جواز کی ہے، جبکہ حنفیہ، مالکیہ اور شافعیہ کا اصل مسلک یہ ہے کہ اس کی بیع جائز نہیں ہے۔ لیکن جمہور کی رائے زیادہ مضبوط ہے۔ ایک تو اس لیے کہ انسانی دودھ کی بیع کے ساتھ ساتھ دیگر دنیوی اور شرعی خرابیاں بھی پائی جاتی ہیں اور دوسرے اس لیے بھی کہ ملک بینک کے قیام سے انسانی دودھ کی تجارت بڑے پیمانے پر شروع ہو جائے گی اور ایک انسانی عضو ہونے کی وجہ سے ضرورت کے مواقع میں اس کی بیع کی گنجائش دی جاسکتی ہے، لیکن اس طرح کھلی چھوٹ دینے کی گنجائش نہیں دی جاسکتی۔

۳۔ رضاعت کے ازروئے دیانت واجب ہونے پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے اور بعض کے نزدیک قضاء بھی ماں پر

---

[1] النساء: ۲۳

[2] البحر الرائق ۳/ ۲۳۸

اپنے بچے کو دودھ پلانا واجب ہے۔ جب کہ ملک بینکوں کے قیام سے ماں اس ذمہ داری کی ادائیگی سے پہلو تہی کرے گی۔ [۱]

۴۔ اسلامی تعلیم یہ ہے کہ بچہ نیک اور شریف عورت کا دودھ پیے تاکہ اچھے اخلاق سے مزین ہو، مگر ملک بینک میں ہر قسم کی عورتیں دودھ جمع کراتی ہیں، جس سے بچوں کے اخلاق و کردار متاثر ہوں گے اور دودھ کے اثرات لازمی طور پر ان میں ظاہر ہو کر رہیں گے۔ [۲]

اس سے بڑھ کر یہ بات اہم ہے کہ جن حنابلہ کے قول کو اختیار کر کے انسانی دودھ کی بیع کی گنجائش دی جاتی ہے، خود ان کا کہنا ہے بچے کو کافرہ اور فاجرہ عورت کا دودھ پلانا ناپسندیدہ اور مکروہ ہے۔ چنانچہ علامہ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں:

كره أبو عبد الله الارتضاع بلبن الفجور والمشركات، وقال عمر بن الخطاب وعمر بن عبد العزيز ﷺ: اللبن يشتبه فلا تستق من يهوديه ولا نصرانية ولا زانية، ولا يقبل أهل الذمة المسلمة، ولا يرى شعورهن، ولأن لبن الفاجرة ربما أفضى إلى شبه المرضعة في الفجور ويجعلها أما لولده فيعتبر بها ويتضرر طبعا وتعيرا، الإرتضاع من المشتركة يجعلها أما لها حرمة الأم مع شركها ربما مال إليها في محبة دينها، ويكره الإرتضاع بلبن الحمقاء كيلا يشبهها الولد في الحمق فإنه يقال: إن الرضاع يغير الطباع. [۳]

۵۔ ان کے علاوہ دوسری رائے اختیار کرنے والے حضرات اُن فقہی قواعد سے بھی استدلال کرتے ہیں جن کا ذکر پہلی رائے پر نقد و تبصرہ کے ذیل میں ہو چکا ہے۔ مثلاً مفاسد سے بچنا، منافع کے حصول سے مقدم ہے۔ ایک ضرر کے ازالہ کے لیے اسی جیسے یا اس سے بڑے ضرر کا ارتکاب جائز نہیں ہے۔ جب دو مضرتوں کا تعارض ہو جائے تو بڑے ضرر کو دور کرنے کے لیے چھوٹے ضرر کا ارتکاب کیا جا سکتا ہے۔ لہذا مخصوص بچوں کو پیش آنے والے قلیل ضرر کی بنیاد پر بڑے ضرر اور مفاسد کا ارتکاب کر کے ملک بینک قائم کرنا جائز نہیں ہے۔ [۴]

اسلامی فقہ اکیڈمی، جدہ نے اپنی ایک قرارداد میں ملک بینک کے قیام کو ناجائز قرار دیا ہے، جس کی عبارت اور خلاصہ درج ذیل ہے:

---

[۱] الموسوعة الفقهية الكويتية ٢٢/ ٢٣٩

[۲] البحر الرائق ٣/ ٢٣٨

[۳] المغني ٩/ ٢٢٩

[۴] مجلة الأحكام العدلية، ص: ١٩ (المادة ٢٥)

بعد أن عرض على المجمع دراسة فقهية، ودراسة طبية حول بنوك الحليب،وبعد التأمل فيما جاء في الدراستين ومناقشة كل منهما مناقشة مستفيضة شملت مختلف جوانب الموضوع وتبين منها:

أولاً: أن بنوك الحليب تجربة قامت بها الأمم الغربية ، ثم ظهرت مع التجربة بعض السلبيات الفنية والعلمية، فيها فانكمشت وقل الاهتمام بها،

ثانياً: أن الإسلام يعتبر الرضاع لحمة كلحمة النسب، يحرم به ما يحرم من النسب بإجماع المسلمين . ومن مقاصد الشريعة الكلية المحافظة على النسب، وبنوك الحليب مؤدية إلى الاختلاط أو الريبة .

ثالثاً: أن العلاقات الاجتماعية في العالم الإسلامي توفر للمولود الخداج أو ناقص الوزن أو المحتاج إلى اللبن البشري في الحالات الخاصة ما يحتاج إليه من الاسترضاع الطبيعي ، الأمر الذي يغني عن بنوك الحليب.

قرر ما يلي :

أولاً : منع إنشاء بنوك حليب الأمهات في العالم الإسلامي .

ثانياً : حرمة الرضاع منها .[1]

اکیڈمی کے سامنے ملک بینک سے متعلق فقہی اور طبی تحقیق پیش کی گئی ،اس میں غور کرنے اور مناقشہ کے بعد اس موضوع کے درج ذیل پہلو واضح ہو گئے ہیں:

اول:-ملک بینک کا قیام ایک تجربہ تھا جسے مغربی ممالک نے شروع کیا، لیکن فنی خرابیاں اور علمی لحاظ سے بعض منفی نتائج سامنے آنے کے بعد یہ تجربہ کافی حد تک ناکام ہو گیا۔

دوم:-یہ ایک اتفاقی مسئلہ ہے کہ دودھ پلانے سے بھی ایسے ہی حرمت ثابت ہوتی ہے جیسے نسب سے ثابت ہوتی ہے،اور حفاظتِ نسب مقاصدِ شریعت میں سے ہے، جبکہ اس طرح کے ملک بینک قائم کرنے میں شریعت کے ایک اہم مقصد (نسب کی حفاظت) کے فوت ہونے، نسب کے اختلاط اور شک وشبہ کا قوی امکان ہے۔

سوم:-عالم اسلامی کے اجتماعی تعلقات ایسے بچوں کے لیے جو ناتمام یا کم وزن والے ہوں یا انہیں

---

[1] قرارات وتوصيات مجمع الفقه الإسلامي التابع لمنظمة المؤتمر الإسلامي ١ - ١٧٤ (ص: ٧) قرار رقم: ٦(٦/٢) بشأن بنوك الحليب. مجلة المجمع - ع ٢، ج ٣٨٣/١.

مخصوص حالات میں انسانی دودھ کی ضرورت ہو، فطری طریقہ پر دودھ پلانے کے مواقع فراہم کرتے ہیں، جس کی وجہ سے ملک بینک کی حاجت نہیں رہتی۔

ان وجوہات کی بناء پر یہ طے کیا گیا کہ:

اول:۔اسلامی ممالک میں انسانی دودھ فروخت کرنے والے بینک بنانا ممنوع ہے۔

دوم:۔ان بینکوں سے حاصل شدہ دودھ اگر کسی بچہ کو پلادیا جائے تو اس سے حرمتِ رضاعت ثابت ہو جائے گی۔[1]

نقد و تبصرہ:

پہلی رائے کی نسبت دوسری رائے کے دلائل زیادہ قوی اور شرعی و فقہی اصولوں کے موافق ہیں۔ملک بینک میں موجود اختلاطِ نسب، دودھ کی بیع اور اس جیسی دیگر خرابیاں پائی جاتی ہیں، اس لیے ملک بینک کی عام اجازت دینا درست نہیں ہے، کیونکہ اس کی عمومی ضرورت پیش نہیں آئی، لیکن اس بات سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا کہ ضرورت کے وقت حرام اور ناجائز امر جائز ہو جاتا ہے۔[2]

اس لیے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا واقعی ملک بینک یا دودھ کی اسٹوریج کی کہیں بھی حقیقی ضرورت نہیں پائی جاتی؟ ممکن ہے کسی خاص جگہ یا خاص افراد کو انسانی دودھ کی اسٹوریج کی ضرورت پڑتی ہو، اس لیے ایسی تحقیق کے بغیر یک جنبش ملک بینک کو ناجائز قرار دینا ہماری نظر میں درست معلوم نہیں ہوتا، بلکہ جہاں سخت ضرورت ہو، وہاں مخصوص اجازت دینے کی گنجائش ہے۔

۳۔ تیسری رائے:

بعض معاصر علماء نے درج بالا دونوں آراء کے درمیان ایک تطبیقی منہج اور درمیانہ راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ ملک بینک کے قیام کو یکسر ناجائز اور حرام قرار دینے میں ایک بڑا حرج لازم آتا ہے، لیکن اس کو

---

[1] دوسری رائے کے دلائل کی مزید تفصیل و فتاوی کے لیے دیکھیں:
الإفادة الشرعية في بعض المسائل الطبية ص: ۲٦۰، بنوك الحليب، الدكتور محمد علي البار- مجلة مجمع الفقه الإسلامي ۲/ ۲٦۱- تنبيه اللبيب حول بنوك الحليب، محمد بن فنخور ص:۳۱- بنوك الحليب وموقف الشريعة الاسلامية منها، أمل بنت إبراهيم بن عبدالله الدباسي، مجلة الجمعية الفقهية السعودية، العدد السادس والعشرون، ذوالقعده، ۱٤۳٦- فتاوى اللجنة الدائمة المجموعة الأولى ۲۱/ ٤۳، الفتوى رقم: ۱۵۹۹۰.

[2] الأشباه والنظائر ص: ۱۰۷، غمز عيون البصائر ۱/ ۲۷۷

مباح قرار دے کر عمومی اجازت دینے میں بھی بہت سے مفاسد اور خرابیاں جنم لینے کا قوی اندیشہ ہے، لہذا دونوں آراء کو اس طرح جمع کیا جائے کہ عالمِ اسلام میں عام حالات کے اندر ملک بینک کے قیام کو ممنوع قرار دیا جائے، تاہم درج ذیل امور وتدابیر اختیار کرنے کے بعد کسی خاص ملک بینک کے قیام کی اجازت دینے کی گنجائش ہے:

۱. دودھ میں دوسری اشیاء ملا کر اُسے باقاعدہ پکایا جائے، تاکہ اس کی اصلی ہیئت اور شکل برقرار نہ رہے اور اس کی صفات میں تغیر آجائے۔
۲. دودھ کی بیع نہ کی جائے، بلکہ تبرع کی بنیاد پر بینک قائم کیا جائے۔
۳. شرعی خرابیوں، مثلاً بے ستری، سے اجتناب کیا جائے۔
۴. ایسی عورت کا دودھ لیا جائے جو سلیم الفطرت ہو، کافرہ اور فاسقہ نہ ہو۔
۵. ملک بینک کے دودھ کو طبعی رضاعت کا قائم مقام ومتبادل نہ سمجھا جائے۔
۶. دودھ دینے والی عورت اور دودھ پینے والے بچے کے اہل خانہ کے درمیان تعارف وشناخت پیدا کی جائے، تاکہ اختلاط نسب سے بچا جاسکے۔[۱]

ترجیح:

سابقہ آراء اور دلائل سے یہ مسئلہ تقریباً واضح ہو گیا کہ ملک بینک کے قیام میں دنیوی خرابیوں اور نقصانات کے ساتھ ساتھ کئی شرعی خرابیاں بھی پائی جاتی ہیں اور ان آراء میں تیسری رائے کسی حد تک ایک متوسط اور معتدل قرار دی جاسکتی ہے، تاہم ہماری نظر میں اس رائے میں تھوڑا تغیر اور اضافہ ضروری ہے۔ وہ اس طرح کہ عام حالات میں اور ہر کسی کے لیے ایسے بینکوں کا قیام شرعی نقطہ نظر سے ناجائز قرار دیا جائے، لیکن دوسری طرف اس پہلو کو بیک جنبش پس پشت ڈال دینا اور یہ کہہ دینا بھی درست نہیں ہے کہ انسانی دودھ کی اسٹورنگ کی ضرورت کسی بھی جگہ کسی بھی بچے کے لیے نہیں ہے، کیونکہ آج کل بعض بچے ماں کے پیٹ میں سات مہینے گزارنے سے قبل پیدا ہو جاتے ہیں، ان کا وزن بہت کم ہوتا ہے۔ ایسے بچوں کو (premature) اور (low birth weight) LBW کہا جاتا ہے۔ ان میں براہ راست دودھ چوسنے اور نگلنے کی صلاحیت (coordination) نہیں ہوتی۔ دوسری طرف مصنوعی دودھ یا جانوروں کا دودھ ان کے لیے مضر ہوتا ہے، بلکہ ایسے دودھ سے آنتیں پھٹ جانے اور موت واقع ہو جانے کا قوی اندیشہ ہوتا ہے۔ اب ایک

(۱) بنوك الحليب البشري من منظور شرعي، احمد مصطفى القضاة، ص:۱۹۷

راستہ تو یہ ہے کہ ایسے بچوں کے لیے ان کی اپنی ماں کا دودھ نکال کر اسٹور کیا جائے، لیکن بسا اوقات ایسے بچوں کی اپنی ماں کا دودھ نہیں ہوتا، یا مختلف قسم کی ادویات کے استعمال کی وجہ سے اپنی ماں کا دودھ ان کے لیے مضر ہوتا ہے۔ ایسی صورت حال میں اگر ایسے بچوں کی جان بچانے کی خاطر کسی ہسپتال میں اجنبی عورتوں کا دودھ لے کر اسٹور کیا جائے تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، کیونکہ یہ حقیقی ضرورت ہے، لیکن اس کے لیے درج ذیل شرائط وتدابیر کو مد نظر رکھنا ضروری ہے:

۱۔ پہلی شرط یہ ہے کہ عورتوں سے دودھ لینا اور آگے بچوں کو مہیا کرنا مفت اور بطورِ عطیہ کے ہو، دودھ کی خرید وفروخت سے اجتناب کیا جائے، البتہ اگر کسی بچے کی جان بچانے کی خاطر مفت دودھ نہ ملے تو خریدنے کی بھی گنجائش ہے، لیکن بیچنے والے کے لیے قیمت لینا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے، جیسا کہ ہمارے اکابر نے خون کے بارے یہی رائے اختیار کی ہے۔[1]

۲۔ ایسا دودھ صرف ان بچوں کو مہیا کیا جائے جن میں دودھ چوسنے کی صلاحیت نہ ہو اور مصنوعی دودھ یا جانور کا دودھ ان کے لیے مضر ہو، ہر بچے کو نہ پلایا جائے۔

۳۔ دودھ کی ایسی اسٹورنگ محض ضرورت کے درجے میں نجی طور پر جائز ہے، اسے باقاعدہ کاروبار بنانا اور عام لوگوں سے دودھ کا لین دین درست نہیں ہے۔

۴۔ غیر مسلم عورتوں کے دودھ سے اجتناب کرنا بہتر ہے، کیونکہ اس کے منفی اثرات بچے کے اخلاق وعادات پر پڑ سکتے ہیں۔

۵۔ جن عورتوں سے بطورِ عطیہ دودھ لیا جائے ان کا مکمل بائیو ڈیٹا، ان کے نام، ولدیت، پتہ، فون نمبرز وغیرہ لکھ لیا جائے اور یہ ڈیٹا ہسپتال یا ادارے میں محفوظ کر لیا جائے اور اس کی ایک کاپی بچے کے والدین کو دے دی جائے، تاکہ ان کو مکمل علم حاصل ہو کہ ہمارے بچے نے کس کس عورت کا دودھ پیا ہے۔

۶۔ کسی مستند عالم ومفتی کے زیرِ نگرانی ایک تحریر تیار کی جائے جس میں رضاعت سے متعلق اہم احکام مختصر طور پر مذکور ہوں اور نمبر (۵) میں مذکورہ ڈیٹا کے ساتھ اس تحریر کو منسلک کر کے بچے کے والدین کو فراہم کیا جائے، تاکہ اُنہیں رضاعت سے متعلق مکمل آگاہی حاصل ہو اور مستقبل میں اختلاط نسب کا کوئی اندیشہ نہ رہے۔[2]

---

(۱) جواہر الفقہ ۷/۴۵

(۲) غمز عیون البصائر ۱/ ۲۷۷

مالِ خبیث: صورتیں اور احکام
(Ill-gotten gains)

یہ مقالہ سہ ماہی مجلہ "المظاہر" (۱۴۳۹ھ) اور میگزین "شریعہ اینڈ بزنس" میں شائع ہوا ہے۔ اس مقالہ کے بنیادی عنوانات حسبِ ذیل ہیں:

تمہید

خبث کی اقسام واحکام:

- پہلی قسم: عدمِ ملک کی وجہ سے واقع ہونے والا خبث

شرعی حکم

- دوسری قسم: ناجائز عقد کی وجہ سے مال میں واقع ہونے والا خبث

۱۔ عقدِ باطل کے ذریعے حاصل شدہ مال

۲۔ عقدِ فاسد کے ذریعے حاصل شدہ مال

- حرام مالِ میراث

تمہید

مال ودولت کو اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں نعمت اور زینت قرار دیا ہے۔ (۱) اسی لیے مال کے حصول اور مالک بننے کو منع نہیں فرمایا، لیکن یہ بھی بتلایا کہ ہر چیز کا اصل اور حقیقی مالک اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ وہ جیسے حکم کرے، مال اُسی کے مطابق حاصل اور خرچ کرے۔ کسبِ مال کے شرعی طریقوں سے حاصل شدہ مال حلال وپاک ہے، لیکن غیر شرعی طریقوں سے حاصل کیا ہوا مال حرام ہے، جس سے اجتناب کی شریعت میں تاکید آئی ہے۔

مالِ حرام ہر زمانے میں کسی نہ کسی صورت میں پایا جاتا رہا ہے، تاہم اس کے اسباب اور صورتیں مختلف ہوتی رہتی ہیں۔ آج کل مال حرام کی بہتات ہے۔ سود کا دور دورا ہے۔ سودی بینکوں سے معاملات کیے جاتے ہیں۔ جوا اور قمار بازی کا بازار گرم ہے۔ حرام اور نشہ آور اشیاء کی خرید وفروخت ہو رہی ہے اور شرعی شرائط اور پابندیوں کو بالائے طاق رکھ کر

---

(۱) الکهف، آیت: ٤٦

معاملات کیے جاتے ہیں، جن کی وجہ سے ایک جائز عقد بھی ناجائز ہو جاتا ہے اور اس سے حاصل شدہ مال میں خبث آ جاتا ہے۔ چوری، ڈاکہ زنی، لوٹ مار اور غصب کے ذریعے حاصل شدہ مال کو تو ہر مسلمان حرام اور خبیث سمجھتا ہے، لیکن کسی ناجائز عقد اور معاملہ کرنے سے مال میں جو خبث آتا ہے، عموماً اس بارے میں لوگوں کو علم نہیں ہے یا جان بوجھ کر اُسے ہلکا اور خفیف سمجھا جاتا ہے، حالانکہ شرعی قواعد اور اصولوں کے خلاف ورزی کرکے جو معاملہ کیا جائے اس سے حاصل شدہ مال میں بھی قباحت، حرمت اور خبث کا عنصر آتا ہے۔

مالِ حرام، اس کی صورتیں و اقسام اور ہر صورت کا شرعی حکم پر علماء نے مختلف مقالات اور تحریریں لکھی ہیں۔ اس سلسلے میں استاذ محترم مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مد ظلہم کا تحقیقی مقالہ "أحكام المال الحرام" بہت ہی جامع اور مدلل ہے جو اُن کی معرکۃ الآراء کتاب "فقہ البیوع" کی دوسری جلد میں موجود ہے۔ یہاں مال حرام کی ہر صورت، اس کے حکم اور ہر ہر جزء کی تفصیلات مقصود نہیں ہیں، بلکہ مال میں واقع ہونے والے خبث اور حرمت کی صورتوں کا مختصر سا خاکہ اور حکم شرعی کا بیان مقصود ہے۔

خبث کی اقسام واحکام

مال کے اندر حرمت یا خبث کا عنصر داخل ہونے کے کئی اسباب ہیں، جن کو درج ذیل دو بنیادی اور چند ذیلی اقسام کے تحت سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خبث کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں:

۱۔ عدمِ ملک کی وجہ سے مال میں واقع ہونے والا خبث

۲۔ کسی ناجائز عقد کی وجہ سے مال میں واقع ہونے والا خبث۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے:

پہلی قسم: عدمِ ملک کی وجہ سے واقع ہونے والا خبث

اس عنوان کے تحت وہ صورتیں بیان کی جائیں گی جن میں مال کا اصل اور حقیقی مالک کوئی اور ہوتا ہے، لیکن کسی ناجائز سبب کی وجہ سے مال اصل مالک کے ہاتھ سے نکل کر کسی دوسرے شخص کے قبضہ میں آ جاتا ہے۔ اگرچہ عقد باطل کے ذریعے کمائے ہوئے مال میں بھی خبث لعدم الملک ہوتا ہے، تاہم اُسے ہم دوسری بنیادی قسم کے تحت بیان کریں گے، تاکہ تمام عقود کا حکم ایک جگہ آ جائے، اس لیے یہاں عقد کے علاوہ دوسرے غیر شرعی اسباب سے حاصل شدہ مال کا تذکرہ کیا جائے گا اور اُن کے شرعی احکام کا بیان ہوگا۔

اگر غور کیا جائے تو اس قسم کے تحت دو صورتیں آتی ہیں:

الف-بلااجازت حاصل شدہ مال

ب-اجازت کے ساتھ لیا گیا مال

الف-بلااجازت حاصل شدہ مال:

مالک کی اجازت ورضامندی کے بغیر اس کا مال لیا جائے۔ جیسے چوری، لوٹ مار، غصب اور رشوت وغیرہ۔ اگرچہ رشوت میں بظاہر دینے والے کی رضامندی ہوتی ہے، لیکن درحقیقت وہ دینے پر مجبور ہوتا ہے اور عموماً دلی طور پر راضی نہیں ہوتا، اس لیے رشوت بھی اسی قسم میں داخل ہے۔

ب-اجازت کے ساتھ لیا گیا مال:

مالک کی اجازت ورضامندی کے ساتھ اس کا مال لیا جائے، لیکن اس کے باوجود شریعت کی نظر میں مال لینے والا مال کا مالک نہ بنے۔ جیسے سود اور قمار وجوا وغیرہ۔ اسی میں عقدِ باطل کی تمام صورتیں بھی آتی ہیں، لیکن اُنہیں بعد میں بیان کیا جائے گا۔

شرعی حکم:

درج بالا دونوں صورتوں سے متعلق شرعی احکام کا خلاصہ تین نکات میں بیان کیا جائے گا:

۱-اصل حکم:

اگر مال کا اصل مالک معلوم ہے تو ایسا مال اصل مالک کو واپس لوٹانا ضروری ہے، خواہ مال اس کی رضامندی سے لیا گیا ہو یا رضامندی کے بغیر۔ اگر مال کا مالک معلوم نہ ہو یا اس کا انتقال ہو چکا ہو تو اس کے ورثاء کو دے دیا جائے گا۔ اگر ورثاء کا علم بھی نہیں ہے تو ایسا مال بلانیتِ ثواب صدقہ کرنا ضروری ہے۔ کسی غریب مستحق زکوۃ شخص کو دے دیا جائے۔ البتہ اگر مال صدقہ کر چکنے کے بعد اصل مالک آجائے تو اس کو اپنی طرف سے اس کا مال دینا ضروری ہوگا اور جو مال صدقہ کیا ہے وہ صدقہ کرنے والے (قابض) کی طرف سے صدقہ ہو جائے گا۔

صدقہ کرنے کی صورت میں کیا باقاعدہ کسی مستحق زکوۃ شخص کو مالک بنا کر دینا ضروری ہے یا دوسرے ایسے خیر کے کاموں میں بھی خرچ کیا جا سکتا ہے جہاں تملیک نہ پائی جاتی ہو؟ اس سلسلے میں ہمارے اکابر نے عمومی طور پر تملیک کو ضروری قرار دیا ہے، تاہم استاذ محترم مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کی تحقیق یہ ہے کہ ایسے مال میں تملیک ضروری نہیں ہے، بلکہ کسی خیر کے کام میں لگانے کی بھی گنجائش ہے۔[1]

---

[1] فتاوی عثمانی ۳/۱۲۹

۴۔انتفاع:

ایسے مال کا اصل حکم تو وہی ہے جو پہلے بیان کیا جا چکا ہے، لیکن ایسے مال سے انتفاع بہر صورت حرام نہیں ہے۔ اس میں کچھ تفصیل ہے، جس کو یہاں بیان کیا جاتا ہے:

الف-مالِ حرام سے خود انتفاع حاصل کرنا:

اگر کسی شخص کے پاس اتنا حلال مال موجود ہے جس سے اس کا اور اس کے اہل وعیال کا گزارا چل سکے تو حرام مال سارا کا سارا اصل مالک کو یا اس کے ورثاء کو دینا ضروری ہے، ورنہ صدقہ کرنا ضروری ہے۔ لیکن اگر کسی شخص کے پاس صرف حرام مال ہے اور حلال مال بالکل نہیں ہے یا اتنا ہے کہ جس سے وہ اپنی ضرورت پوری نہیں کر سکتا اور حرام مال کو ایک ساتھ صدقہ کرنا بھی مشکل ہے تو ایسا شخص بقدرِ ضرورت حرام مال اپنے اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کر سکتا ہے۔

اگر حرام رقم کے استعمال کے وقت یہ شخص مستحق زکوۃ تھا اور اس مال کا اصل مالک بھی معلوم نہیں ہے تو بعد میں اس پر یہ لازم اور واجب نہیں ہے کہ اس نے جتنا حرام مال استعمال کیا ہے اتنا مال صدقہ کرے، تاہم یہ بہتر ہے کہ استطاعت کے بعد اتنا مال صدقہ کر دے۔ لیکن اگر حرام رقم کے استعمال کے وقت یہ شخص مستحق زکوۃ نہیں تھا تو جتنا حرام مال اس نے استعمال کیا ہے وہ اس کے ذمہ قرض سمجھا جائے گا۔ لہٰذا اس کو چاہیے کہ حرام رقم کی مقدار لکھ لے، پھر حسبِ ضرورت حرام مال اس نیت سے استعمال کرے کہ جیسا ہی حلال رقم آجائے تو فوراً اتنی رقم کا صدقہ کر دے گا جتنی حرام رقم استعمال کی ہے۔ ایسی صورت میں اس شخص کو چاہیے کہ توبہ واستغفار بھی کرتا رہے اور حلال کمانے کی بھرپور کوشش بھی کرتا رہے۔

استاذ محترم مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مد ظلہم لکھتے ہیں:

۷-ما وجب التّصدّق به واحتاج إليه يجوز صرفُه إلى نفسه، فإن كان فقيراً لايجب عليه التّصدّقُ بمثله، وإن كان غنيّاً وجب عليه أن يتصدّق بمثله، ويجوز له إذا لم يكن المالُ الحلالُ كافياً لسدّ حاجته، يسوغُ للمفتى بعد النّظر فى أحواله أن يُفتيَه بجواز الاقتراض ممّا عنده من المال الحرام، بشرط أن يُلزمَ نفسَه تسديد هذا القرض إلى الفقراء من المال الحلال كلّما تيسّر له ذلك.[1]

انسان پر جس مال کا صدقہ کرنا لازم ہوتا ہے اور وہ خود اس کا محتاج ہے تو اس رقم کو اپنی ضرورت میں

---

[1] فقه البيوع ۲/ ۱۰۵۵

استعمال کرنا جائز ہے۔ اگر وہ فقیر ہے تو اس پر استعمال شدہ رقم کی مقدار صدقہ کرنا واجب نہیں ہے اور اگر غنی ہے تو اس پر استعمال شدہ مال کے بقدر رقم صدقہ کرنا لازم ہے۔ اگر اس کے پاس موجود حلال مال اس کی ضروریات کے لیے کافی نہ ہو تو بھی اس کے لیے حرام رقم اپنی ضرورت میں استعمال کرنا جائز ہے۔ مفتی ایسے شخص کے احوال میں غور و فکر کر کے اُسے یہ فتویٰ دے سکتا ہے کہ وہ حرام رقم سے ضرورت کے بقدر رقم بطورِ قرض لے کر استعمال کرے اور جیسے ہی حلال مال میسر آجائے، استعمال کیے ہوئے حرام مال کے بقدر رقم فقراء پر صدقہ کر دے۔

ب- حرام مال اپنی اولاد یا بیوی کو دینا:

مالِ حرام ایسی بالغ اولاد کو دینا جن کا نفقہ والد پر لازم نہیں ہے اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر اولاد مستحقِ زکوۃ ہیں (یعنی ان کی ملکیت میں ساڑھے سات تولے سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت کے برابر نقدی یا اور کوئی ضرورت سے زائد سامان نہ ہو) تو مستحقِ زکوۃ ہونے کی وجہ سے ان کو یہ رقم دینا جائز ہے، اور ان کے لیے والد صاحب کی دی ہوئی حرام رقم کا استعمال بھی جائز ہے، کیونکہ مالک نہ ملنے کی صورت میں مال حرام کسی مستحقِ زکوۃ شخص کو بلانیتِ ثواب صدقہ کرنا ضروری ہوتا ہے، اس کے لیے اجنبی کو دینا ضروری نہیں ہے، بلکہ مستحقِ زکوۃ اولاد کو بھی یہ رقم دی جا سکتی ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں لکھا ہے:

له مال فيه شبهة إذا تصدق به على أبيه يكفيه ذلك ولا يشترط التصدق على الأجنبي.[١]

کسی کے پاس موجود مال میں شبہ ہو، اگر وہ اسے اپنے والد پر صدقہ کر دے تو کافی ہے، اس پر یہ لازم نہیں ہے کہ کسی اجنبی شخص کو صدقہ کرے۔

اسی مفہوم کا ایک مسئلہ علامہ شامیؒ نے بیان کیا ہے:

وفي الخانية: وضعت ملاءتها ووضعت الأخرى ملاءتها ثم أخذت الأولى ملاءة الثانية لا ينبغي للثانية الانتفاع بملاءة الأولى، فإن أرادت ذلك قالوا ينبغي أن تتصدق بها على بنتها الفقيرة بنية كون الثواب لصاحبتها إن رضيت، ثم تستوهب الملاءة من البنت: لأنها بمنزلة اللقطة.[٢]

---

[١] الفتاوى الهندية ٥ / ٣٤٩

[٢] حاشية ابن عابدين ٤ / ٢٨٥

اگر کسی عورت نے اپنی پلنگ کی چادر رکھی اور دوسری کسی عورت نے بھی رکھی۔ پھر پہلی عورت نے دوسری عورت کی چادر اٹھالی تو دوسری عورت کے لیے مناسب نہیں ہے کہ پہلی عورت کی چادر لیکر استعمال کرے۔ اگر وہ اسے استعمال کرنا چاہتی ہے تو فقہاء فرماتے ہیں کہ اسے چاہیے کہ یہ چادر اپنی حاجت مند بیٹی کو اس نیت سے صدقہ کردے کہ اگر چادر کی مالکن راضی ہو تو اس صدقہ کا ثواب اس کو ملے۔ پھر بیٹی سے بطورِ گفٹ چادر لیکر استعمال کرے، کیونکہ اس کا حکم لقطہ جیسا ہے۔

لیکن اگر اولاد مستحق زکوۃ نہیں ہے، اس کے باوجود والد نے ان کو حرام رقم دے دی تو اگر والد صاحب کے پاس صرف حرام رقم ہی ہو، حلال رقم بالکل نہ ہو تو اولاد کے لیے یہ رقم استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر والد صاحب کے پاس حلال و حرام دونوں مال مخلوط ہیں تو پھر اولاد کے لیے والد صاحب کے پاس موجود حلال رقم کے بقدر مال لے کر خرچ کرنا جائز ہے، اس سے زیادہ جائز نہیں ہے۔ اگر حلال رقم کی مقدار معلوم نہیں ہے تو غالب گمان پر عمل کر سکتے ہیں۔

فتاوی عالمگیری میں ہے:

لو أن فقيرا يأخذ جائزة السلطان مع علمه أن السلطان يأخذها غصبا أيحل له؟ قال إن خلط ذلك بدراهم أخرى، فإنه لا بأس به، وإن دفع عين المغصوب من غير خلط لم يجز.[1]

اگر کوئی فقیر شخص بادشاہ سے انعام وصول کرے، حالانکہ اسے معلوم ہو کہ یہ انعام بادشاہ نے کسی سے غصب کیا ہے تو کیا فقیر کے لیے یہ حلال ہے؟ (جواب) اگر بادشاہ نے غصب شدہ مال کو اپنے دوسرے مال کے ساتھ ملا دیا تھا تو فقیر کے لیے یہ انعام لینا جائز ہے، لیکن اگر غصب شدہ مال مخلوط نہ ہو، بلکہ جدا ہو اور بعینہ وہی مال فقیر کو دیا جائے تو فقیر کے لیے لینا جائز نہیں ہے۔

اگر بیوی مستحق زکوۃ نہ ہو تو شوہر کی ذمہ داری ہے کہ وہ کہیں سے حلال رقم (قرض سے ہو یا کسی اور جائز طریقہ سے) لا کر بیوی کو بطورِ نفقہ دے، لیکن اگر وہ ایسا نہ کرے اور حرام رقم میں سے ہی بیوی کو نفقہ دے تو بیوی کے لیے اپنا جائز خرچ لینا درست ہے اور حرام کا گناہ شوہر پر ہو گا، لیکن اگر شوہر کے پاس حلال رقم بالکل ہی نہ ہو تو حرام رقم کو قرض کے طور پر لے کر بیوی کو خرچہ کے لیے دے سکتا ہے، لیکن شوہر کے مستحق زکوۃ نہ ہونے کی صورت میں بعد میں اتنی رقم صدقہ کرنا ضروری ہو گا۔

---

[1] الفتاوى الهندية ٥ / ٣٤٢

علامہ شامیؒ نے نقل کیا ہے کہ:

وفي جامع الجوامع: اشترى الزوج طعاما أو كسوة من مال خبيث، جاز للمرأة أكله ولبسها، والإثم على الزوج. تتارخانية.[1]

اگر شوہر نے مالِ خبیث سے کھانا یا کپڑے خرید لیے تو عورت کے لیے اسے کھانا اور پہننا جائز ہے، گناہ شوہر کے ذمے ہوگا۔

۳۔ مالِ حرام کے ذریعے معاملہ کرنا:

جس شخص کے پاس حرام مال ہو اس کے ساتھ بیع وشراء کا معاملہ کرنے میں درج ذیل تفصیل ہے:

الف۔ سارا مال حرام ہو یا حرام وحلال الگ الگ ہو:

کسی کے پاس صرف حرام مال ہی ہو، حلال مال بالکل نہ ہو، یا حلال مال بھی موجود ہو، لیکن حرام اور حلال دونوں الگ الگ ہوں، مخلوط نہ ہو۔ ایسی صورت میں جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ ایسے شخص کے حرام مال میں کسی دوسرے کے لیے بھی معاملہ کرنا جائز نہیں ہے، لہذا کوئی شخص اپنی کوئی چیز اس شخص کے حرام مال کے بدلے فروخت نہ کرے۔

اگر کسی کو یہ معلوم نہ ہو کہ یہ شخص مجھے حلال رقم سے مال دے رہا ہے یا حرام رقم سے تو ایسی صورت میں اگر اس کے پاس حلال رقم زیادہ اور حرام کم ہو تو لینے والے کے لیے لینا جائز ہے، ورنہ نہیں۔ اور اگر کسی کو یہ بھی معلوم نہ ہو کہ حلال رقم غالب ہے یا حرام تو وہ غالب گمان پر عمل کر سکتا ہے۔

لیکن امام کرخیؒ کی رائے یہ ہے کہ اگر معاملہ کرتے وقت باقاعدہ حرام مال کی طرف اشارہ نہ کرے، بلکہ مطلق عقد کر لیا جائے اور بعد میں یہ شخص حرام رقم سے قیمت ادا کر دے تو دوسرے شخص کے لیے لینا جائز ہے۔ بعض فقہاء نے کثرت حرام کی وجہ سے امام کرخیؒ کے قول پر فتوی دیا ہے، تاکہ لوگوں کو حرج لاحق نہ ہو۔

علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

وَقَالَ أَبُو بَكْرٍ: لَا يَطِيبُ فِي الْكُلِّ، لَكِنْ الْفَتْوَى الْآنَ عَلَى قَوْلِ الْكَرْخِيِّ دَفْعًا لِلْحَرَجِ عَنْ النَّاسِ. وَفِي الْوَلْوَالِجِيَّةِ: وَقَالَ بَعْضُهُمْ: لَا يَطِيبُ فِي الْوُجُوهِ كُلِّهَا وَهُوَ المختار، لَكِنْ الْفَتْوَى الْيَوْمَ عَلَى قَوْلِ الْكَرْخِيِّ دَفْعًا لِلْحَرَجِ لِكَثْرَةِ الْحَرَامِ.[2]

---

[1] حاشية ابن عابدين ٦/ ١٩١

[2] حواله بالا ٥/ ٢٣٥

ابو بکرؒ فرماتے ہیں کہ تمام صورتوں میں (بائع کے لیے حرام مال لینا) حلال نہیں ہے، لیکن آج کل لوگوں سے حرج دور کرنے کی وجہ سے امام کرخیؒ کے قول پر فتوی ہے۔ ولوالجیہ میں ہے: بعض نے فرمایاہے کہ تمام صورتوں میں حرام مال لینا جائز نہیں ہے، یہ پسندیدہ قول ہے، لیکن کثرت حرام کی وجہ سے لوگوں سے حرج دور کرنے کے لیے آج کل کرخیؒ کے قول پر فتوی ہے۔

ب۔ حلال وحرام مال مخلوط ہو:

اگر حلال وحرام رقم دونوں اس طرح مخلوط ہوں کہ ان میں تمیز نہ ہو سکے تو اس صورت میں حلال رقم کے بقدر تو خود استعمال کرنا یا کسی کو بطورِ ثمن وغیرہ دینا جائز ہے، لیکن حلال رقم کی مقدار سے زیادہ رقم میں حضرات صاحبین کی رائے یہ ہے کہ ایسی رقم نہ خود استعمال میں لانا جائز ہے اور نہ کسی اور کے لیے یہ رقم بطورِ ہدیہ یا ثمن وغیرہ کے لینا جائز ہے، جبکہ امام ابو حنیفہؒ کی رائے یہ ہے کہ اس صورت میں قابض حرام رقم کو مخلوط کر دینے کی وجہ سے مکمل رقم کا مالک بن گیا، اگرچہ "ملک خبیث" ہے، جیسا کہ "بیع فاسد" میں ہوتا ہے، لہذا جب تک یہ شخص حرام رقم کے بقدر مال صدقہ نہیں کرے گا، اس کے لیے حلال رقم سے زائد رقم استعمال میں لانا جائز نہیں ہے، لیکن دوسرے لوگوں کے لیے اس شخص کے مخلوط مال میں معاملہ کرنا جائز ہے، خواہ اس شخص نے حرام مال کے بقدر رقم صدقہ کی ہو یا نہیں۔ لوگوں کی ضرورت اور آسانی کے لیے کئی متاخرین فقہاء نے امام ابو حنیفہؒ کے قول پر فتوی دیا ہے، لہذا اس پر عمل کرنے کی گنجائش ہے۔[1]

دوسری قسم: ناجائز عقد کی وجہ سے مال میں واقع ہونے والا خبث

اس عنوان کے تحت اس مال کی تفصیل بیان کی جائے گی جو کسی ناجائز عقد کی وجہ سے انسان کے قبضہ میں آیا ہو۔ بعض صورتوں میں ایسا مال انسان کی ملکیت میں داخل ہی نہیں ہوتا اور بعض صورتوں میں انسان ایسے مال کا مالک ہو جاتا ہے، لیکن اس میں خبث پھر بھی موجود رہتا ہے۔ اس بحث کو ابتداءً دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلے حصے میں عقدِ باطل کے ذریعے حاصل ہونے والے مال کا اور دوسرے حصے میں عقدِ فاسد کے ذریعے حاصل شدہ مال کا حکم بیان کیا جائے گا۔

ا۔ عقدِ باطل کے ذریعے حاصل شدہ مال:

جو عقد نہ اصلاً درست ہو، نہ وصف کے اعتبار سے درست ہو وہ باطل ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ اگر کسی عقد کے رکن (یعنی ایجاب وقبول) یا محل (یعنی معقود علیہ، جیسے مبیع، ثمن، مستاجَر، اجرت وغیرہ) میں کوئی خلل واقع ہو جائے تو وہ باطل عقد ہے۔ مثلاً عقد کرنے والوں میں اہلیت نہ ہو، ایجاب وقبول ایک دوسرے کے موافق نہ ہو، بیع کے ایجاب اور

---

(۱) فقه البیوع ۲/ ۱۰۲۳

قبول میں تعلیق یا یا مستقبل کی طرف اضافت ونسبت ہو۔یا شراب، خنزیر، خون پر عقد کیا جائے۔معدوم چیز یا مجہول الذات چیز کو فروخت کیا جائے وغیرہ۔

عقدِ باطل شریعت کی نظر میں بالکل معتبر ہی نہیں ہے۔اس کے ذریعے جو چیز انسان کے قبضہ میں آتی ہے، وہ اس کی ملکیت میں داخل نہیں ہوتی، بلکہ اس کے پاس بطورِ امانت ہوتی ہے، اس لیے وہ اسے اپنے استعمال میں نہیں لا سکتا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عقدِ باطل کے ذریعے جو مال انسان کے پاس آیا ہے، اُسے اصل مالک کو واپس کیا جائے، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دو صورتیں ہیں اور ہر ایک کا حکم الگ ہونا چاہیے:

الف۔معقود علیہ ''عین'' ہو:

پہلی صورت یہ ہے کہ عقدِ باطل میں کسی ایسے حسی ومادی ''عین'' کو معقود علیہ بنایا جائے، جو شریعت میں حرام ہو، جیسے شراب، خنزیر اور خون وغیرہ کو فروخت کرنا۔اس صورت کا حکم ظاہر ہے کہ فروخت کنندہ کو جو رقم حاصل ہوئی ہے وہ اس کے پاس امانت ہے، اس پر لازم ہے کہ وہ رقم خریدار کو واپس کرے، اور خریدار پر بھی لازم ہے کہ حرام چیز واپس مالک کو دے دے۔

اس صورت میں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ حرام چیز واپس مالک کو دینے سے ''مسلمان شخص کو حرام چیز کا مالک بنانا'' لازم آئے گا، لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں تملیک سرے سے ہے ہی نہیں، بلکہ بائع سے جو چیز لی گئی تھی اور مشتری کے پاس بطورِ امانت رکھی تھی، وہی امانت اسے واپس کی جا رہی ہے۔

یہی حکم اس بیع باطل کا بھی ہے جس میں محل اور معقود علیہ یعنی بیچی جانے والی چیز میں کوئی خرابی نہ ہو، لیکن بیع کے دیگر ارکان ومقومات میں کوئی خرابی ہو، مثلاً معاملہ کرنے والے فریقین یا ان میں سے کوئی ایک فریق عقد کی اہلیت نہ رکھتا ہو وغیرہ۔البتہ اس صورت میں بیع کو ختم کرنا اور مبیع کو فروخت کنندہ کے حوالے کرنا اسی طرح ثمن کو مشتری کے حوالے کرنا، پہلی قسم کی طرح محض شریعت کے حق کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ فریقین کے حق کی وجہ سے ہے، کیونکہ اس قسم کے عقد کی وجہ سے نہ تو بیچی گئی چیز فروخت کنندہ کی ملکیت سے خارج ہوتی ہے اور نہ ہی قیمت خریدار کی ملکیت سے خارج ہوتی ہے، اس لیے ہر ایک کو اس کی چیز واپس کی جائے گی۔

مجلۃ الاحکام العدلیہ میں عقدِ باطل کا حکم یوں بیان کیا گیا ہے:

الْبَيْعُ الْبَاطِلُ لَا يُفِيدُ الْحُكْمَ أَصْلًا. فَإِذَا قَبَضَ الْمُشْتَرِي الْمَبِيعَ بِإِذْنِ الْبَائِعِ فِي الْبَيْعِ

الْبَاطِلِ ; كَانَ الْمَبِيعُ أَمَانَةً عِنْدَ الْمُشْتَرِي فَلَوْ هَلَكَ بِلَا تَعَدٍّ لَا يَضْمَنُهُ.[1]

''بیع باطل بالکل حکم کا فائدہ نہیں دیتی۔ جب خریدار، فروخت کنندہ کی اجازت سے بیع باطل میں مبیع پر قبضہ کرلے تو یہ چیز خریدار کے پاس امانت سمجھی جائے گی۔ اگر خریدار کی تعدی کے بغیر ہلاک ہوگئی تو وہ ضامن نہیں ہوگا۔''

ب۔ معقود علیہ ''منفعت'' ہو:

اگر باطل عقد میں معقود علیہ کوئی حسی ومادی چیز نہ ہو، بلکہ منفعت(services)اور حق ہو، لیکن کسی ناجائز وحرام چیز کی منفعت ہو۔ جیسے گانا سننے پر مغنیہ کو اجرت دینا، زنا کر کے اجرت دینا، جن آلالت کا جائز استعمال ممکن ہی نہیں ہے انہیں کرایہ پر لے کر کرایہ دینا وغیرہ۔ یہ اجارہ باطلہ ہے۔ ان تمام صورتوں میں اجرت اور کرایہ میں عدمِ ملک کی وجہ سے خبث آیا ہے۔

عقدِ باطل کا عام اصول وحکم ''تراد'' کا ہے۔ یعنی فریقین پر لازم ہوتا ہے کہ معاملہ ختم کر کے ہر ایک دوسرے کی چیز اس کو واپس کردے۔ اس کو دیکھا جائے تو بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ اس صورت میں بھی جن لوگوں سے رقم (بطورِ اجرت) وصول کی گئی ہے، ان کو رقم واپس کی جائے، لیکن اس صورت کی حقیقت میں غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کرایہ واجرت دینے والا نفع ومنفعت حاصل کرچکا ہے۔ اس منفعت کو دوبارہ وجود میں لاکر واپس کرنا محال ہے۔ اب اگر مغنیہ، زانیہ یا آلاتِ ملاہی کے مالک کو یہ حکم دیا جائے گا کہ حرام کام کی جو رقم بطورِ اجرت وصول کی گئی ہے وہ واپس اصل مالک (گانا سننے والے، زانی اور آلات موسیقی استعمال کرنے والے) کو دے دے تو ایک طرف سے ''رد'' پر عمل ہوجائے گا، لیکن دوسری طرف سے گانا سننے والا، زنا کرنے والا اور آلالت ملاہی استعمال کرچکنے والا اُس ''بدل'' (منفعت) کو واپس لوٹانے پر قادر نہیں ہے جو اس نے اجرت دے کر حاصل کی ہے۔ اس سے ایک تو ''تراد'' کے اصول پر مکمل عمل نہیں ہوسکے گا۔ دوسرے اس میں ''تعاون علی الاثم'' لازم آنے کا شبہ ہے، کیونکہ حرام منفعت کے حاصل کرنے والے کو اس کی رقم بھی واپس مل جائے تو اسے خوشی کے ساتھ حرام کام کی مزید جرءت وہمت مل سکتی ہے۔ اس لیے اس صورت میں یہ حکم دینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایسی اجرت اور آمدنی فقراء پر صدقہ کی جائے، اصل مالک کو واپس نہ کی جائے۔

---

[1] مجلة الأحكام العدلية ص: ٧٣ (المادة ٣٧٠)

علامہ ابن تیمیہؒ نے اس مسئلہ پر تفصیلی بحث فرمائی ہے۔ آپؒ لکھتے ہیں:

فإن الزاني ومستمع الغناء والنوح قد بذلوا هذا المال عن طيب نفوسهم، واستوفوا العوض المحرم. والتحريم الذي فيه ليس لحقهم، وإنما هو لحق الله تعالى، وقد فاتت هذه المنفعة بالقبض، والأصول تقتضي: أنه إذا رد أحد العوضين يرد الآخر، فإذا تعذر على المستأجر رد المنفعة لم يرد عليه المال.[1]

زانی اور گانا و نوحہ سننے والے نے یہ مال اپنی خوشی سے خرچ کیا ہے اور اس کے بدلے حرام عوض بھی وصول کر لیا ہے۔ جہاں تک حرمت کی بات ہے تو وہ ان (زانی اور گانا و نوحہ سننے والے) کے حق کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالی کے حق کی وجہ سے ہے۔ اور یہ منفعت (زنا، سماعت) حاصل کر لینے کے بعد ختم اور معدوم ہو گئی۔ اصول کا تقاضا یہ ہے کہ جب ایک فریق عوض لوٹائے تو دوسرا بھی لوٹا دے، جبکہ یہاں مستاجر (زانیہ، مغنیہ، نائحہ) کو اس کی منفعت لوٹانا مشکل ہے تو دوسرے فریق (زانی وغیرہ) کو اس کا مال بھی نہیں لوٹایا جائے گا۔

آپؒ کے شاگرد علامہ ابن قیم لکھتے ہیں:

وإن كان المقبوضُ برضى الدافع وقد استوفى عِوضه المحرم، كمن عاوض على خمر أو خنزير، أو على زنى أو فاحشة، فهذا لا يجبُ ردُّ العوض على الدافع، لأنه أخرجه باختياره، واستوفى عوضه المحرم، فلا يجوزُ أن يجمع له بينَ العوض والمعوض، فإن فى ذلك إعانة له على الإثم والعدوان، وتيسير أصحاب المعاصى عليه. وماذا يريد الزانى وفاعل الفاحشة إذا علم أنه ينال غرضه، ويستردِ ماله، فهذا مما تُصان الشريعة عن الإتيان به، ولا يسوغُ القولُ به، وهو يتضمن الجمع بين الظلم والفاحشة والغدر فطريقُ التخلص منه، وتمام التوبة بالصدقة به، فإن كان محتاجاً إليه، فله أن يأخذ قدر حاجته، ويتصدق بالباقى.[2]

اگر دینے والے کی رضامندی سے مال پر قبضہ کیا گیا ہو اور دینے والے نے اس کے بدلے عوض حاصل کر لیا ہو، جیسے شراب، خنزیر یا زنا یا کسی اور فحش کام کے بدلے عوض دینا۔ ایسا مال دینے

[1] اقتضاء الصراط المستقيم ١٤/ ٤٠

[2] زاد المعاد في هدي خير العباد ٥/ ٧٧٩

والے کو واپس کرنا ضروری نہیں ہے، کیونکہ اس نے اپنے اختیار سے دیا ہے اور اس کے بدلے عوض بھی وصول کر لیا ہے، لہذا عوض اور معوض دونوں اسی کو دینا جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ اس میں گناہ اور ظلم پر تعاون ہے اور گناہ گاروں کے لیے آسانی پیدا کرنا ہے۔ زنا کرنے والا اور فحش کام کرنے والا اس کے علاوہ اور کیا چاہتا ہے کہ اپنی غرض بھی پوری کر لے اور انہیں ان کا مال بھی واپس مل جائے، شریعت اس سے بچنے کی تاکید کرتی ہے، لہذا یہ قول اختیار نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اس میں ظلم، فحاشی اور غدر ہے۔ ایسے مال سے خلاصی حاصل کرنے کا یہی راستہ ہے کہ اسے صدقہ کر دیا جائے۔ اگر وہ خود حاجت مند ہے تو بقدر حاجت لے کر بقیہ مال صدقہ کر دے۔

۲۔ عقدِ فاسد کے ذریعے حاصل شدہ مال:

فقہاء حنفیہ کے ہاں عقد فاسد سے مراد ایسا معاملہ ہے جو اصلاً درست ہو، لیکن وصف کے اعتبار سے درست نہ ہو۔ یعنی معاملے کے رکن (ایجاب و قبول) اور مقومات (فریقین، ثمن، مبیع) کی ذات میں کوئی خرابی نہ ہو، لیکن اس میں کسی خارجی وصف کی وجہ سے فساد آیا ہو۔ جیسے کوئی فریق بیع میں ایسی شرط لگادے جس سے شریعت نے منع کیا ہے۔ مثلاً فروخت کنندہ اس شرط پر مکان بیچ دے کہ ایک مہینے تک وہ خود مکان میں رہے گا۔ فساد کے اسباب میں سود کی شرط، اکراہ، غرر، ضرر، شرط فاسد، بیع قبل القبض، ثمن یا مبیع میں جہالت، بیع کو کسی وقت کے ساتھ مقید کرنا اور مبیع کے حوالے کرنے پر قدرت نہ ہونا شامل ہے۔

ایسی خرید و فروخت اس حد تک تو معتبر ہے کہ اگر خریدار نے خریدی ہوئی چیز پر قبضہ کر لیا تو وہ اس کا مالک بن جائے گا، لیکن اس معاملے میں ناجائز اور خلافِ شریعت بات کے داخل ہونے کی وجہ سے ایسے معاملے کو ختم کرنا ضروری ہوتا ہے۔

اس طرح کے معاملے کے نتیجے میں خریدار جس چیز پر قبضہ کر لیتا ہے اور فروخت کنندہ جس قیمت کو وصول کرتا ہے، ان دونوں میں خبث ہوتا ہے، اسی لیے شریعت کا حکم یہ ہے کہ یا تو اس معاملے سے خرابی اور فساد والی بات کو دور کر کے درست کر دیا جائے یا سرے سے معاملہ ہی ختم کر کے فروخت کنندہ کو اس کی چیز اور خریدار کو اس کی قیمت واپس کر دی جائے، لیکن ایسے معاملے کو ختم کرنے سے پہلے حاصل شدہ چیز یا قیمت سے انتفاع حاصل کرنے اور اس میں کوئی تصرف کرنے میں درج ذیل تفصیل ہے:

• خریدار کا حکم:

جس شخص نے فاسد معاملہ کر کے کوئی چیز خریدی ہو تو اس کے لیے ایسی چیز کو استعمال کرنا یا اس سے نفع حاصل کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ معاملہ درست کرنا یا فروخت کنندہ کو چیز واپس کرنا ضروری ہے۔ اگر خریدار نے ایسی چیز آگے کسی اور کو بیچ دی تو یہ معاملہ شرعاً جائز ہو جائے گا اور اسے ختم نہیں کیا جائے گا، کیونکہ یہ چیز بیچنے والے کی ملکیت میں داخل ہو چکی تھی، اگرچہ اس میں خبث تھا۔ لیکن ایسی چیز کو آگے فروخت کرنے کی صورت میں بیع فاسد کے خریدار کو جو نفع حاصل ہوگا، اُسے صدقہ کرنا ضروری ہوگا، کیونکہ مبیع (عین) معاوضات میں متعین ہو جاتی ہے۔ مثلاً زید نے خالد سے بیع فاسد کے ذریعے ایک ہزار روپے کا کپڑا خریدا اور اُسے آگے بارہ سو روپے میں بیچ دیا تو زید پر لازم ہے کہ یہ دو سو روپے صدقہ کر دے۔ چونکہ یہ نفع (دو سو روپے) زید کی دوسری رقم کے ساتھ مخلوط ہے، اس لیے زید اس کا مالک ہو جائے گا اور اگر وہ اس کے ذریعے کوئی چیز خریدے گا تو یہ بھی جائز ہے، لیکن زید کے ذمہ دو سو روپے کا صدقہ بہر حال واجب ہوگا۔

اگر ان بارہ سو روپے میں سے ہزار روپے زید کی ملکیت سے کسی وجہ سے نکل گئے اور صرف دو سو روپے بچ گئے تو ان کے ذریعے بھی خریداری جائز ہے، کیونکہ عقود معاوضات (خرید و فروخت) میں نقود متعین نہیں ہوتے، لہذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ دو سو روپے وہی حرام رقم ہے جو زید کو بیع فاسد کے ذریعے خریدی ہوئی چیز سے بطورِ نفع حاصل ہوئے ہیں، البتہ ہبہ (گفٹ) میں چونکہ نقود متعین ہو جاتے ہیں، اس لیے اگر زید کے پاس محض یہی دو سو روپے بچے ہوں تو ان دو سو روپے سے ہدیہ اور گفٹ کے طور پر کچھ لینا جائز نہیں ہوگا۔

علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

أن هذا الملك يفيد المشتري انطلاق تصرف ليس فيه انتفاع بعين المملوك بلا خلاف بين أصحابنا كالبيع والهبة والصدقة والإعتاق والتدبير والكتابة والرهن والإجارة، ونحو ذلك مما ليس فيه انتفاع بعين المبيع.

(وأما) التصرف الذي فيه انتفاع بعين المملوك كأكل الطعام ولبس الثوب وركوب الدابة وسكنى الدار والاستمتاع بالجارية، فالصحيح أنه لا يحل؛ لأن الثابت بهذا البيع ملك خبيث والملك الخبيث لا يفيد إطلاق الانتفاع؛ لأنه واجب الرفع وفي الانتفاع به تقرر له وفيه تقرير الفساد، ولهذا لم يفد الملك قبل القبض تحرزا عن تقرير الفساد.[1]

---

[1] بدائع الصنائع ٥/ ٣٠٤

(بیع فاسد کے ذریعے جو ملک حاصل ہوتی ہے وہ) ملک، مشتری کو ایسے تصرف کا اختیار دیتی ہے جس میں عین سے نفع حاصل نہ ہو، اس میں ہمارے اصحاب کا اختلاف نہیں ہے، جیسے بیع، ہبہ، صدقہ، آزاد کرنا، مدبر بنانا، مکاتب بنانا، رہن رکھنا اور اجارہ پر دینا اور اس جیسے دوسرے عقود جن میں مبیع کی عین سے نفع حاصل نہ ہو۔ رہا وہ تصرف جس میں عین سے نفع بھی حاصل ہو جائے، جیسے خریدا ہوا کھانا کھانا، کپڑے پہننا، سواری پر سوار ہونا، گھر میں رہائش اختیار کرنا، باندی سے استمتاع حاصل کرنا۔ صحیح قول یہ ہے کہ یہ سارے منافع حلال نہیں ہیں، کیونکہ بیع فاسد سے اگرچہ ملک ثابت ہوتی ہے، لیکن وہ ملکِ خبیث ہوتی ہے جو انتفاع کا فائدہ نہیں دیتی۔ یہ اس لیے کہ بیع فاسد کو ختم کرنا ضروری ہے، جبکہ اس سے انتفاع کی اجازت دینا اس بیع اور فساد کو مزید پختہ کرنے کے مترادف ہے، اسی لیے اس سے قبضہ سے پہلے ملک ثابت نہیں ہوتی، تاکہ فسادِ ملک سے بچا جاسکے۔

• فروخت کنندہ کا حکم:

جہاں تک فروخت کنندہ کا تعلق ہے جس نے بیع فاسد کے ذریعے اپنی کوئی چیز فروخت کر کے رقم حاصل کی ہے تو اس کے لیے بھی یہی حکم ہے کہ وہ فاسد معاملہ درست کردے یا معاملہ ختم کر کے رقم واپس خریدار کے حوالے کردے۔ لیکن اگر فروخت کنندہ نے اس رقم کے ذریعے کسی اور سے کوئی چیز خرید لی تو یہ جائز ہے اور اس رقم کے ذریعے کمایا ہوا نفع بھی اس کے لیے حلال ہے، اس کی وجہ بھی وہی ہے جو پہلے گزر چکی ہے کہ نقود، معاوضات مالیہ میں متعین نہیں ہوتے، لہٰذا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ فروخت کنندہ نے اسی رقم سے نفع حاصل کیا ہے جو اُسے بیع فاسد میں ملی تھی۔ بیع فاسد سے حاصل شدہ رقم کو استعمال کرنے سے فروخت کنندہ کی سابقہ ذمہ داری ختم نہیں ہوگی کہ سابقہ فاسد معاملہ درست یا ختم کردے، بلکہ اس کے ذمہ اب بھی یہ لازم ہوگا۔

صاحبِ ہدایہ لکھتے ہیں:

ومن اشترى جارية بيعا فاسدا وتقابضا فباعها وربح فيها تصدق بالربح ويطيب للبائع ما ربح في الثمن" والفرق أن الجارية مما يتعين فيتعلق العقد بها فيتمكن الخبث في الربح، والدراهم والدنانير لا يتعينان على العقود فلم يتعلق العقد الثاني بعينها فلم يتمكن الخبث فلا يجب التصدق، وهذا في الخبث الذي سببه

فساد الملك.[1]

جس شخص نے بیع فاسد کے ذریعے باندی خریدی اور بائع و مشتری دونوں نے ثمن و مبیع پر قبضہ کر لیا اور مشتری نے باندی کو آگے نفع کے ساتھ بیچا تو نفع کو صدقہ کرے، جبکہ بائع نے ثمن سے جو نفع کمایا ہو وہ اس کے لیے حلال ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ باندی ایسی چیز ہے جو متعین ہو جاتی ہے، اس لیے عقد اس کی ذات سے متعلق ہو گیا اور نفع میں خبث آگیا، جبکہ دراہم و دینار عقود کے اندر متعین نہیں ہوتے، اس لیے دوسرا عقد ان سے متعلق نہیں ہے، لہذا خبث نہیں پایا گیا، اس لیے نفع کا صدقہ کرنا ضروری نہیں ہے۔ یہ اس خبث کا حکم ہے جس کا سبب فسادِ ملک ہوتا ہے۔

حرام مالِ میراث

اگر کسی شخص کا انتقال ہو جائے اور اس کی ملکیت میں حرام مال موجود تھا جو ترکہ کی صورت میں مرحوم کے ورثاء کی طرف منتقل ہو گیا۔ کیا ایسا مال مرحوم کے ورثاء کے لیے حلال ہے؟ اگر ورثاء کو یہ علم ہی نہیں ہے کہ ہمارے مرحوم مورث کے مال میں حرام مال بھی موجود ہے تو اس صورت میں فقہاء حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ ورثاء کے لیے یہ مال حلال ہے۔ ایسے مال کے استعمال سے ورثاء کو گناہ نہ ہو گا، بلکہ اصل کمانے والا (مرحوم) گناہ گار ہو گا۔ لیکن اگر ورثاء کو اس بات کا علم ہے کہ ہمارے مورث (مرحوم) کے مال میں حرام مال بھی موجود ہے تو ایسی صورت میں یہ مال ورثاء کے لیے حلال ہے یا حرام؟ اس سلسلے میں فقہ حنفی کی کتابوں میں غور کرنے سے چار اقوال سامنے آتے ہیں:

۱۔ بعض علماء نے یہ قول اختیار کیا ہے کہ اس صورت میں بھی ورثاء کے لیے ترکہ کا حرام مال لینا اور استعمال کرنا حلال ہے۔

۲۔ علامہ حصکفیؒ نے اس قول پر رد کرتے ہوئے دوسری رائے اختیار فرمائی ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ ورثاء کے لیے ایسا مال حلال نہیں ہے، بلکہ مطلقاً حرام ہے، خواہ اس حرام مال کا مالک معلوم ہو یا نہ ہو۔ آپؒ لکھتے ہیں:

فِي الْمُجْتَبَى مَاتَ وَكَسْبُهُ حَرَامٌ فَالْمِيرَاثُ حَلَالٌ ثُمَّ رَمَزَ وَقَالَ لَا نَأْخُذُ بِهَذِهِ الرِّوَايَةِ وَهُوَ حَرَامٌ مُطْلَقًا عَلَى الْوَرَثَةِ فَتَنَبَّهْ.[2]

مجتبیٰ میں ہے کہ کوئی شخص فوت ہو گیا، اس کی کمائی حرام ہے تو میراث حلال ہو گی۔ پھر اشارہ

---

[1] الهداية في شرح بداية المبتدي ۳/ ۵۳

[2] الدر المختار ٦/ ۳۸٦

کرتے ہوئے کہا کہ ہم اس روایت کو نہیں لیتے، یہ مال ورثاء پر مطلقاً حرام ہے۔

۳۔ تیسری رائے علامہ ابن نجیمؒ کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ حرام مالِ میراث کا مالک اگر معلوم ہے تو یہ مال اصل مالک کو واپس کر دیا جائے گا، ورثاء کے لیے حلال نہیں ہوگا۔ لیکن اگر اس حرام مال کا مالک معلوم نہیں ہے تو پھر ورثاء کے لیے یہ مال حلال ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

الحرمة تتعدى في الأموال مع العلم إلا في حق الوارث فإن مال مورثه حلال له وإن علم بحرمته منه من الخانية و قيده في الظهيرية بألا يعلم أرباب الأموال. [1]

اگر حرام مال کا علم ہے تو اموال کے اندر حرمت متعدی اور منتقل ہو سکتی ہے، البتہ وارث کے حق میں حرمت منتقل نہیں ہو گی، بلکہ مورث کا مال اس کے لیے حلال ہے، اگرچہ یہ معلوم ہو کہ ترکہ میں حرام مال موجود ہے۔ فتاوی ظہیریہ میں اس کو ایک قید کے ساتھ مقید کیا ہے کہ شرط یہ ہے کہ اس مال کا مالک معلوم نہ ہو (ورنہ حلال نہیں ہوگا)۔

۴۔ آخری اور چوتھی رائے علامہ شامیؒ کی ہے جو سب سے زیادہ تفصیلی ہے۔ آپؒ کی رائے کا حاصل یہ ہے کہ حرام مالِ میراث کی تین صورتیں ہیں:

۱۔ اگر حرام مال کا مالک معلوم ہے تو یہ مال ورثاء کے لیے حلال نہیں ہے، بلکہ یہ مال مالک کو لوٹایا جائے گا۔

۲۔ اگر حرام مال کا مالک معلوم نہیں ہے، لیکن حرام مال معلوم، متعین اور الگ موجود ہے، مرحوم کے دیگر اموال کے ساتھ مخلوط نہیں ہے تو یہ بھی ورثاء کے لیے حلال نہیں ہے، بلکہ اسے اصل مالک کی طرف سے صدقہ کیا جائے گا۔

۳۔ تیسری صورت یہ ہے کہ حرام مال کا مالک معلوم نہیں ہے اور حرام مال مرحوم کے دیگر اموال کے ساتھ مخلوط ہو گیا ہے، جس میں متعین طور پر پتہ نہ چلے کہ کونسا مال حرام ہے اور کونسا مرحوم کا اپنا حلال مال ہے تو ایسی صورت میں قضاءً یہ مال ورثاء کے لیے حلال ہے، لیکن دیانۃً ترکہ سے حرام مال کے بقدر مال صدقہ کرنا چاہیے۔

قضاءً حلال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی اور شخص مثلاً وصی یا نگران ایسے مال کو صدقہ نہیں کر سکتا۔ جہاں تک دیانت کے طور پر ایسے مال کے صدقہ کرنے کی بات ہے تو علامہ شامیؒ کی بعض عبارات سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایسے مال کو صدقہ کرنا واجب نہیں ہے، بلکہ محض بہتر ہے۔ جیسا کہ آپؒ کی درج ذیل کے عبارت کے آخر میں ہے:

---

[1] الأشباه والنظائر ص: ٣٢٠

وَالْحَاصِلُ أَنَّهُ إِنْ عَلِمَ أَرْبَابَ الْأَمْوَالِ وَجَبَ رَدُّهُ عَلَيْهِمْ، وَإِلَّا فَإِنْ عَلِمَ عَيْنَ الْحَرَامِ لَا يَحِلُّ لَهُ وَيَتَصَدَّقُ بِهِ بِنِيَّةِ صَاحِبِهِ، وَإِنْ كَانَ مَالًا مُخْتَلِطًا مُجْتَمِعًا مِنَ الْحَرَامِ، وَلَا يَعْلَمُ أَرْبَابَهُ وَلَا شَيْئًا مِنْهُ بِعَيْنِهِ حَلَّ لَهُ حُكْمًا، وَالْأَحْسَنُ دِيَانَةً التَّنَزُّهُ عَنْهُ.[1]

حاصل یہ ہے کہ اگر حرام اموال کے مالک معلوم ہوں تو مال ان کو لوٹا دیا جائے گا۔ اگر مالک معلوم نہ ہو، لیکن بعینہ حرام مال کا علم ہے تو وہ بھی وارث کے لیے حلال نہیں ہے، بلکہ اسے مالک کی طرف سے صدقہ کر دیا جائے گا۔ اور اگر مرحوم کا مال، حرام مال کے ساتھ مخلوط اور اکھٹا ہے، نہ اس کا مالک معلوم ہے اور نہ اس میں حرام مال متعین طور پر معلوم ہے تو حکماً ایسا مال ورثاء کے لیے حلال ہے، تاہم دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے مال سے خلاصی حاصل کر لینا بہتر ہے۔

لیکن درست یہ معلوم ہوتا ہے کہ تیسری صورت کے اندر ورثاء کے لیے ایسا مال صدقہ کرنا محض مستحب نہیں ہے، بلکہ واجب اور ضروری ہے، کیونکہ ورثاء کو مرحوم (مورث) کا مال منتقل ہوا ہے اور مرحوم نے جب حرام مال کو اپنے مال کے ساتھ خلط کر لیا تھا تو امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ کی رائے کے مطابق مرحوم اس حرام مال کا مالک نہیں بنا تھا، بلکہ اس پر لازم تھا کہ ایسا مال اصل مالک کو واپس کرتا، ورنہ صدقہ کر دیتا۔ اب یہی حکم ورثاء کے لیے بھی ہے، کیونکہ صرف مرحوم کی موت یا وراثت کوئی ایسا سبب یا عقد نہیں ہے کہ جس سے حرام مال حلال ہو جائے۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ کی رائے کے مطابق حرام مال کو اپنے مال کے ساتھ خلط کرنے کی وجہ سے مرحوم شخص حرام مال کا مالک بن گیا تھا، لیکن اس کی ملکیت خبیث تھی، لہذا اس پر لازم تھا کہ حرام مال کا بدل اصل مالک کو لوٹاتا، یا اگر اس کا علم نہ تھا تو صدقہ کرتا۔ اس سے پہلے مرحوم کے لیے حرام مال میں تصرف جائز نہیں تھا۔ مرحوم کے لیے یہ حکم محض مستحب نہیں، بلکہ واجب تھا۔ لہذا ورثاء کے لیے حکم بھی یہی ہے کہ اصل مالک کے معلوم نہ ہونے کی وجہ سے ایسا مال صدقہ کر دے۔

علامہ سرخسیؒ لکھتے ہیں:

وَإِذَا غَصَبَ دِرْهَمًا فَأَلْقَاهُ فِي دَرَاهِمَ لَهُ فَعَلَيْهِ؛ لِأَنَّهُ خَلَطَ الْمَغْصُوبَ بِمَالِهِ خَلْطًا يَتَعَذَّرُ عَلَى صَاحِبِهِ الْوُصُولُ إِلَى عَيْنِهِ، فَيَكُونُ مُسْتَهْلِكًا ضَامِنًا لِمِثْلِهِ، وَالْمَخْلُوطُ يَصِيرُ مَمْلُوكًا لَهُ عِنْدَ أَبِي حَنِيفَةَ، وَ عِنْدَهُمَا لِصَاحِبِهِ الْخِيَارُ بَيْنَ التَّضْمِينِ و-----

---

[1] حاشية ابن عابدين ٥/ ٩٩

الشَّرِكَةِ، وَكَذَٰلِكَ الْخِلَافُ فِي كُلِّ مَا يُخْلَطُ. (۱)

جب کسی نے درہم غصب کرلیااور اس کو اپنے دراہم میں ڈال دیاتو اس پر اس درہم کا بدل لازم ہے، کیونکہ اس نے مغصوبہ درہم کو اپنے مال کے ساتھ اس طرح خلط کرلیا کہ اصل مالک کے لیے بعینہ اپنے دراہم تک پہنچنا مشکل ہوگیا۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک خلط کرنے والے نے درہم کو ہلاک کردیا، اس لیے وہ اس درہم کے بدل کا ضامن ہوگا اور مخلوط مال کا مالک بن جائے گا۔ صاحبین کی رائے یہ ہے کہ درہم کے مالک کو اختیار ہے، چاہے تو غصب کرنے والے سے ضمان وصول کرے یا اس کے ساتھ شریک ہو جائے۔ یہی اختلاف ہر اس مال میں ہے جس کو مخلوط کیا جائے۔

اگرچہ علامہ شامیؒ کی سابقہ عبارت سے ایسے مال کا تصدق محض مستحب معلوم ہوتا ہے، لیکن درج ذیل عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؒ کی رائے بھی دیانت سے متعلق یہی ہے کہ ورثاء پر ایسا مال صدقہ کرنا لازم ہے۔ آپؒ لکھتے ہیں:

وَإِنْ مَلَكَهُ بِالْقَبْضِ وَالْخَلْطِ عِنْدَ الْإِمَامِ فَإِنَّهُ لَا يَحِلُّ لَهُ التَّصَرُّفُ فِيهِ أَدَاءُ ضَمَانِهِ، وَكَذَا لِوَارِثِهِ ثُمَّ الظَّاهِرُ أَنَّ حُرْمَتَهُ عَلَى الْوَرَثَةِ فِي الدِّيَانَةِ لَا الْحُكْمِ. (۲)

اگرچہ امام صاحبؒ کے نزدیک مرحوم شخص قبضہ کرنے یا خلط کرنے کی وجہ سے حرام مال کا مالک ہوگیا ہے، لیکن اس کے لیے ضمان اداء کرنے سے قبل تصرف کرنا جائز نہیں تھا، یہی حکم ورثاء کا بھی ہے۔ پھر ظاہر یہ ہے کہ ورثاء پر ایسے مال کی حرمت دیانت کے طور پر ہے، حکم اور قضاء کے طور پر نہیں ہے۔

مالِ حرام کے موضوع پر مزید تحقیق کے لیے ان کتب کی طرف مراجعت کی جاسکتی ہے:

۱-فقہ البیوع (احکام المال الحرام، جلد:۲) شیخ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مد ظلہم

۲-أحكام المال الحرام، دكتور عباس أحمد محمد الباز

۳-أحكام المال المختلط، رائدمحمود أحمد

۴-خلاصة الكلام في التخلص من المال الحرام، عزيز فرحان العنزي

---

(۱) المبسوط للسرخسي ۱٤/ ٥٢

(۲) حاشية ابن عابدين ٦/ ٣٨٦

قمار کا تعارف واحکام

(Gambling)

یہ مقالہ ماہنامہ مجلہ ''السعادۃ'' (۲۰۱۷ء)اور میگزین''شریعہ اینڈ بزنس'' میں شائع ہوا ہے۔اس مضمون میں قمار (جوا) کا تعارف،احکام اور جدید صورتوں کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔اس مضمون کے بنیادی نکات مندرجہ ذیل ہیں:

- قمار کا تعارف
- قمار کے عناصر
- قمار کا شرعی حکم
- قمار کے نقصانات
- قمار کی قسمیں
- قمار کی مروجہ صورتیں

قمار کا تعارف

''قمار'' عربی زبان کا لفظ ہے، عربی میں اس کا دوسرا نام ''میسر'' ہے،اِسے اُردو میں ''جوا'' اور انگریزی میں ''Gambling'' کہتے ہیں۔قمار کا لفظ ''قمر'' سے بنا ہے۔قمر کے معنی چاند کے ہیں۔جس طرح چاند بڑھتا اور کم ہوتا رہتا ہے،اسی طرح قمار (جوئے) میں انسان کا مال بھی کبھی کم اور کبھی زیادہ ہوتا رہتا ہے،اس لیے اس معاملہ کو عربی میں ''قمار'' کہتے ہیں۔[1]

قمار کی حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ معاملہ جس میں کسی غیر یقینی واقعے کی بنیاد پر کوئی رقم اس طرح داؤ پر لگائی گئی ہو کہ یا تو رقم لگانے والا اپنی لگائی ہوئی رقم سے ہاتھ دھو بیٹھے یا اُسے اتنی ہی یا اس سے زیادہ رقم کسی معاوضہ کے بغیر مل جائے۔

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے ''قمار'' کی حقیقت درج ذیل الفاظ میں بیان کی ہے:

''قمار ایک سے زائد فریقوں کے درمیان ایک ایسا معاہدہ ہے جس میں ہر فریق نے کسی غیر یقینی واقعے کی بنیاد پر اپنا کوئی مال (یا تو فوری ادائیگی کر کے یا ادائیگی کا وعدہ کر کے) اس طرح داؤ پر لگایا ہو

(۱) حاشیۃ ابن عابدین ۶/۴۰۳

کہ وہ مال یا تو بلا معاوضہ دُوسرے فریق کے پاس چلا جائے گا یا دُوسرے فریق کا مال پہلے فریق کے پاس بلا معاوضہ آجائے گا۔"[۱]

قمار کے مفہوم کو علامہ شامیؒ نے اس طرح بیان کیا ہے:

الْقِمَارَ هُوَ الَّذِي يَسْتَوِي فِيهِ الْجَانِبَانِ فِي احْتِمَالِ الْغَرَامَةِ. [۲]

"قمار وہ معاملہ ہے جس میں دونوں فریقین کو نقصان پہنچنے کا احتمال برابر ہو۔"

علامہ ابن قدامہؒ نے بھی تقریباً یہی مفہوم بیان کیا ہے، آپ لکھتے ہیں:

القمار: أن لا يخلو كل واحد منهما من أن يغنم أو يغرم. [۳]

اس کو مثال سے سمجھا جاسکتا ہے مثلاً ایک شخص دوسرے سے کہے کہ اگر پاکستان فلاں میچ جیت گیا تو میں تمہیں دس ہزار روپے دُوں گا، لیکن اگر پاکستان وہ میچ ہار گیا تو تم مجھے دس ہزار روپے دو گے۔ یا دو افراد کوئی کھیل کھیلے اور آپس میں یہ شرط لگادے کہ جو شخص کھیل جیتے گا وہ دوسرے سے ایک متعین رقم وصول کرے گا، یہ قمار (جوا) ہے۔

قمار کے عناصر

قمار کی تعریف سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قمار کے چار عناصر یا شرائط ہیں۔ اگر کسی معاملہ میں ان میں سے کوئی ایک عنصر یا شرط مفقود ہو تو وہ معاملہ شرعاً قمار کے تحت نہیں آئے گا۔ وہ چار عناصر یہ ہیں:

۱۔ جو معاملہ دو یا دو سے زائد فریقوں کے درمیان ہو رہا ہے وہ "عقدِ معاوضہ" ہو، یعنی دونوں جانب سے کچھ دینا طے ہو جائے۔ لہٰذا اگر صرف ایک طرف سے کچھ دینے کا وعدہ ہو اور دُوسری طرف سے کچھ دینے کا وعدہ نہ ہو، جیسے ایک شخص دوسرے سے کہے کہ آؤ میچ کھیلتے ہیں، اگر تم جیت گئے تو میں تمھیں اتنی رقم دوں گا، اگر میں جیت گیا تو تم مجھے کچھ بھی نہ دینا، تو یہ معاملہ چونکہ "عقدِ معاوضہ" نہیں ہے، اس لیے یہ قمار (جوا) میں داخل نہ ہوگا۔

۲۔ معاملہ کرنے والے شرکاء میں سے ہر ایک اپنا مال داؤ پر لگائے، لہٰذا اگر معاملہ کرنے والے فریق اپنا مال داؤ پر نہیں لگاتے، بلکہ کوئی تیسرا شخص (third party) جو اس معاملے میں خود شامل نہیں ہو رہا، وہ اپنی رقم خرچ کرے تو

---

[۱] اسلام اور جدید معاشی مسائل ۳/۳۵۸

[۲] حاشية ابن عابدين ٦/ ٤٠٣

[۳] المغني ١١/ ١٣١

یہ معاملہ جوا نہیں ہے۔ مثلاً ایک شخص، عمر اور خالد سے کہے کہ تم دونوں کھیلو، جو جیت جائے گا میں اُسے ہزار روپے انعام دُوں گا، تو یہ صورت جوا میں داخل نہیں ہے۔

۳۔ اپنے لگائے ہوئے مال سے زائد مال یا دوسرے کے مال کا حاصل ہونا کسی ایسے غیر یقینی واقعے پر موقوف ہو جس کے پیش آنے کا احتمال بھی ہو اور پیش نہ آنے کا احتمال بھی ہو۔ اگر ایک شخص دوسرے سے کہے کہ اگر آج سورج مغرب کی طرف غروب ہو گیا تو تم مجھے ایک ہزار روپے دو گے، اگر واپس مشرق کی طرف جا کر غروب ہو گیا تو میں تمھیں ایک ہزار روپے دوں گا، یہ قمار نہیں ہے، کیونکہ یہاں دوسرے کے مال کا حصول ایک یقینی واقعے پر موقوف ہے۔

۴۔ داؤ پر لگایا ہوا مال بلا معاوضہ ہاتھ سے چلا جائے، یا اپنے ساتھ دُوسرے کا مال بلا کسی معاوضہ کے کھینچ لائے۔ اگر کسی شخص نے اپنے مال کا حقیقی عوض حاصل کر لیا اور پھر اُسے انعام بھی مل گیا تو یہ جوا نہیں ہے۔ جیسے کسی شخص نے کوئی چیز اس کی "حقیقی دام" میں خریدی اور اس میں انعامی ٹکٹ بھی نکل آیا جس کی وجہ سے اُس نے انعام حاصل کر لیا تو یہ صورت جوا میں داخل نہیں، لیکن اس کے برعکس اگر وہ چیز "حقیقی دام" کے بدلے نہیں خریدی گئی، بلکہ انعام کے اعلان کی وجہ سے اُس چیز کی قیمت بڑھادی گئی تو اُس صورت میں وہ معاملہ قمار میں داخل ہو جائے گا۔[1]

قمار کا شرعی حکم

ابتدائے اسلام میں شراب کی طرح قمار بھی جائز تھا، لیکن پھر شریعت نے قمار کو شراب کی طرح تدریجاً حرام قرار دیا، کیونکہ قمار بھی لوگوں کی طبیعتوں میں رچ بس گیا تھا، انسانی جذبات کی رعایت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے یکدم قمار کو حرام نہیں فرمایا، بلکہ پہلے لوگوں کے دلوں میں قمار کی ناپسندیدگی اور نفرت پیدا کرتے ہوئے فرمایا:

{يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا}[2]

"لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ منافع بھی ہیں (مگر) ان کا گناہ ان کے منافع سے بڑھا ہوا ہے۔"

پھر اس کے بعد پوری وضاحت کے ساتھ قمار اور شراب کی حرمت پر درج ذیل آیت نازل ہو گئی:

---

(۱) بحوث في قضايا فقهية معاصرة ٢/٢٣٦

(۲) البقرة: ٢١٩

{يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۔ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ}[۱]

''اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بت وغیرہ اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی باتیں، شیطانی کام ہیں، پس ان سے بالکل الگ رہو، تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔ شیطان تو یوں چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان بغض واقع کر دے اور اللہ کی یاد اور نماز سے تم کو باز رکھے، سو اَب بھی باز (نہ) آؤ گے؟''

احادیث مبارکہ میں بھی قمار کی ممانعت موجود ہے۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے محض قمار کا ارادہ کرنے والے کو بھی گناہ گار قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

من قال لصاحبه: تعال أقامرك، فليتصدق.[۲]

''جس شخص نے اپنے ساتھی کو کہا: آؤ قمار کھیلیں، تو وہ (بطورِ کفارہ) صدقہ کرے۔''

قمار کے نقصانات

قمار میں ایسی کئی دنیوی اور دینی خرابیاں ہیں جن کی بناء پر شریعت نے قمار کو ناجائز قرار دیا ہے، قمار کی خرابیاں اور نقصانات محض انسان کی ذات تک محدود نہیں ہیں، بلکہ معاشرے کو بھی قمار کے بُرے اثرات ونتائج کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ذیل میں ان خرابیوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

۱۔ قمار کے شخصی نقصانات:

قمار کے بُرے اثرات قمار کھیلنے والے کے ذہن اور اس کی صحت پر اثر انداز ہوتے ہیں، کیونکہ ہر وقت قمار میں منہمک رہنے والے افراد زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کی اُمید اور خسارے کے خوف کی وجہ سے راحت و آرام اور اطمینان و سکون سے محروم ہو جاتے ہیں۔ مشاہدہ ہے کہ جوا کھیلنے والے بہت سے لوگ مجنون ہو جاتے اور امراضِ قلب میں مبتلا ہو کر زندگی گنوا دیتے ہیں۔

---

(۱) المائدة: ۹۰، ۹۱

(۲) صحيح البخاري ص: ۳۰۶، حديث نمبر: ۴۸۶۰

قمار کی وجہ سے انسان کی حرص اور لالچ میں اضافہ ہوتا ہے، وقت اور مال ضائع ہوتا ہے، یہاں تک کہ انسان فقر وفاقہ میں مبتلا ہو جاتا ہے، کیونکہ جوئے کی خاصیت ہے کہ ہارنے والے شخص کے دِل میں دوبارہ جوا کھیلنے کا شدید جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید اب کی بار جیت جاؤں۔ اس جذبے کی وجہ سے وہ مزید وقت اور سرمایہ خرچ کرتا ہے، اور اگر جیت جائے تو اور حرص بڑھ جاتی ہے۔ غرضیکہ جوا کھیلنے والا خواہ ہار جائے یا جیت جائے، بار بار اس کے دِل میں مزید جوا کھیلنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے، اس خواہش کی تکمیل میں اس کا کثیر وقت اور سرمایہ خرچ ہو جاتا ہے۔

جوا کھیلنے والوں کے درمیان بغض وعداوت اور دشمنی پیدا ہوتی ہے، کیونکہ جوئے کے اندر جب انسان ہار جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ اُسے اپنے حریف پر غصہ آتا ہے، کیونکہ اس کی خواہش یہ تھی کہ انعام اُسے ملتا، جو اُس کے بجائے کسی اور کے پاس چلا گیا، یہ ایک تباہ کن خرابی ہے۔

جوا کھیلنے کی وجہ سے اللہ کی یاد اور نماز سے غفلت ہوتی ہے، کیونکہ جوا کھیلنے والا جوئے میں اس قدر مشغول ہو جاتا ہے کہ اُسے اللہ کے ذکر اور نماز کی طرف توجہ ہی نہیں ہوتی، آخری دونوں خرابیوں (باہمی بغض وعداوت اور نماز سے غفلت) کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سورہ مائدہ کی آیت نمبر (۹۱) میں ذکر فرمایا ہے۔

۲۔ قمار کے معاشرتی نقصانات:

قمار کے معاشرتی خرابیوں میں سے ایک تو باہمی بغض وعداوت ہے کہ قمار کھیلنے والوں کے دِل میں ایک دوسرے کے لیے بغض وعداوت کے جذبات پیدا ہوتے رہتے ہیں جو کسی بھی معاشرے کے لیے انتہائی تباہ کن ہیں۔

اس کی ایک معاشرتی خرابی یہ بھی ہے کہ قمار دوسرے کئی جرائم کو جنم دیتا ہے، کیونکہ جب جوا کھیلنے والا اپنی ساری جمع پونجی ہار دیتا ہے تو جوئے کی لَت اور اس شخص کی حرص ولالچ اس کو سکون سے بیٹھنے نہیں دیتی، جس کے نتیجے میں وہ چوری، ڈاکہ زنی اور لوٹ مار کے ذریعے اپنی ہوس پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح معاشرے کو اس قسم کی ہولناک خرابیوں اور نقصانات کا شکار ہونا پڑتا ہے۔

قمار کی ایک اور بُری معاشرتی خرابی یہ ہے کہ اس کی وجہ سے کاہلی، سستی اور کام چوری میں اضافہ ہوتا ہے، کیونکہ جب کوئی جوا کھیلنے میں جیت جاتا ہے تو دوسرے لوگ اس کو دیکھ کر یہ خیال کرتے ہیں کہ اس شخص کو تھوڑی سی محنت سے اتنا مال مل گیا، لہذا محنت ومزدوری اور جان کھپانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے لوگوں کی صلاحیتیں ضائع ہوتی ہیں اور معیشت کی ترقی پر بُرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

قمار کی قسمیں

قمار کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں:

۱۔ پہلی قسم وہ ہے جس میں کوئی ایک فریق یقینی طور پر کوئی ادائیگی کرنے کا پابند نہیں ہوتا، بلکہ ہر فریق کی طرف سے ادائیگی کسی غیر یقینی واقعے پر موقوف ہوتی ہے۔ اگر وہ واقعہ پیش آتا ہے تو ایک فریق پر ادائیگی لازم ہو جاتی ہے، ورنہ دوسرے فریق کو ادائیگی کرنی پڑتی ہے۔ جیسے دو شخص آپس میں اس شرط پر کوئی گیم کھیلتے ہیں کہ ان میں سے جو ہار جائے گا، وہ دُوسرے کو ہزار روپے دے گا۔

۲۔ دُوسری قسم وہ ہے جس میں ایک فریق کی طرف سے ادائیگی یقینی اور متعین ہوتی ہے، جبکہ دُوسری طرف کی طرف سے ادائیگی غیر یقینی اور موہوم ہوتی ہے۔ جو فریق یقینی طور پر ادائیگی کرتا ہے، وہ در حقیقت اپنے مال کو اس طرح داؤ پر لگاتا ہے کہ یا تو داؤ پر لگایا ہوا مال اس کے ہاتھ سے کسی معاوضے کے بغیر چلا جائے گا یا پھر وہ اپنے ساتھ زیادہ مال بغیر کسی معاوضے کے کھینچ کر لائے گا۔[1]

قمار کی مروجہ صورتیں

ذیل میں قمار کی چند مروجہ صورتیں بطورِ مثال پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ کھیلوں میں قمار:

۱۔ پتنگ بازی اور کبوتر بازی	۲۔ کیرم بورڈ
۳۔ تاش	۴۔ شطرنج
۵۔ سنوکر	۶۔ ویڈیو گیم
۷۔ لڈو	۸۔ کرکٹ، فٹ بال وغیرہ

درج بالا صورتوں اور ان کے علاوہ دیگر کھیلوں کا اصولی حکم یہی ہے کہ اگر ان میں یہ شرط لگائی جاتی ہے کہ جو ہار گیا، وہ دُوسرے کو اتنی متعین رقم دے گا، یا جو ہار گیا وہ دکاندار کو کھیل کا خرچہ دے گا (جیسا کہ عموماً سنوکر اور ویڈیو گیم میں ہوتا ہے) تو اس طرح شرط لگانے سے یہ تمام صورتیں قمار میں داخل ہو جاتی ہیں اور ناجائز ہیں، لیکن ایسی کوئی شرط نہ ہو تو فی نفسہٖ اس طرح کے کھیل حرام نہیں ہیں، بشرطیکہ ان کی وجہ سے فرائض میں کوتاہی نہ ہو۔

(۱) بحوث في قضايا فقهية معاصرة ۲/۲۳۷

۲۔لاٹری(Lottery)

اس کی آج کل بہت سی شکلیں وجود میں آچکی ہیں، جیسے اسٹیٹ لاٹری(state lottery)اور اسکریچ کارڈ لاٹری(scratch card lottery)وغیرہ۔ان سب میں ایک مشترک بات ہے کہ اس میں مختلف لوگوں کو قرعہ اندازی کی بنیاد پر انعام حاصل کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔لوگ ٹکٹ خرید کر انعام کا موقع حاصل کرنے کے لیے کچھ متعینہ رقم داؤ پر لگاتے ہیں۔قرعہ اندازی کے نتیجے میں جس کا نمبر یا نام انعام یافتہ کی فہرست میں آجائے،اُسے انعام دیا جاتا ہے اور جس کا نام نہ آئے،وہ نہ صرف انعام سے،بلکہ اپنی اصل رقم سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ یہی قمار(جوا) کی حقیقت ہے جو کہ ناجائز ہے۔

۳۔اخباری کوپن(Coupon)

اخبارات یا رسائل میں مختلف قسم کے سوالات یا معمے شائع کیے جاتے ہیں اور یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ جو بھی ان کو حل کر کے بمع فیس ارسال کرے گا،اس کو قرعہ اندازی کی بنیاد پر انعام دیا جائے گا، یہ بھی قمار میں داخل ہے۔

۴۔بیمہ(Insurance)

اس میں انشورنس کی پالیسی خریدنے والے کی طرف سے دیا جانے والا پریمیم یقینی اور متعین ہوتا ہے، جبکہ اس کے بدلے میں انشورنس کمپنی کی طرف سے کچھ ملنا غیر یقینی ہوتا ہے، یہ بھی قمار کی شکل ہے۔

۵۔مصنوعات(Products)پر انعام:

مختلف تجارتی کمپنیاں اپنی مصنوعات (products)کو زیادہ سے زیادہ بیچنے کے لیے کبھی یہ اعلان کرتی ہیں کہ جو شخص ہماری کمپنی کی فلاں چیز(مثلاً چائے کا ڈبہ) خریدے تو وہ اس کے پیکٹ کا مخصوص نمبر لکھ کر اپنے پاس محفوظ رکھے،قرعہ اندازی کے نتیجے میں جو نمبر انعام کے مستحق قرار پائیں گے،ان کے درمیان انعام تقسیم کیا جائے گا۔اس طرح کے انعامات تین شرائط کے ساتھ جائز ہیں:

الف۔انعامات کی وجہ سے اُس چیز کی بازاری قیمت میں اضافہ نہ کیا جائے۔

ب۔انعامات کی وجہ سے اس چیز کی کوالٹی میں کمی نہ کی جائے۔

ج۔خریدار کا اصل مقصد اس چیز سے نفع حاصل کرنا ہو،انعام کا حصول مقصود نہ ہو۔[1]

---

[1] بحوث في قضايا فقهية معاصرة ۲/۲۳۲

جن انعامات میں قمار کا عنصر شامل نہ ہو وہ جائز ہیں، اس طرح کے انعامات کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

۱۔ وہ انعام جو کسی سابقہ وعدے یا معاہدے کے بغیر دیا جائے، جیسے کوئی طالبِ علم امتحان میں کامیاب ہو جائے تو اساتذہ یا رشتہ دار اس کو انعام دے دے، یہ گفٹ کے حکم میں ہے۔

۲۔ وہ انعام جس کے لیے پہلے باقاعدہ وعدہ یا معاہدہ کیا گیا ہو، لیکن جس کو انعام دیا جاتا ہے، اُس سے کسی بھی شکل میں معاوضہ وصول نہ کیا جائے، بلکہ دینے والا مفت اور تبرع کے طور پر انعام دے، تو یہ بھی جائز ہے۔[1]

قمار (جوا) کے موضوع پر مزید تحقیق کے لیے ان کتب کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے:

۱-الميسر والقمار، حقيقته وصوره المعاصرة: دراسة فقهية مقارنة، أحمد إبراهيم قيروز

۲- القمار وحقيقته وأحكامه، شيخ سليمان اللاحم

۳-القمار وأنواعه في ضوء الشريعة الإسلامية، شكري علي عبد الرحمن

۴-الميسر واستخدامه المعاصرة، دكتور عارف أسعد جمعة

---

(۱) بحوث في قضايا فقهية معاصرة ۲/۲۳۵

معاصر اسلامی بینکاری کی شرعی بنیادیں
(Islamic Banking)

یہ مقالہ ''جی سی ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ'' کے بین الاقوامی سیرت النبی کانفرنس (فروری ۲۰۱۹ء) کے لیے لکھا گیا تھا۔ اس مقالہ میں معاصر اسلامی بینکاری کی شرعی بنیادوں کا تعارف اور شرعی اصولوں کی روشنی میں ان کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مقالہ کا خاکہ حسبِ ذیل ہے:

تمہید

❁ **مبحث اول: اسلامی بینکاری کی شرعی بنیادیں**

پہلا حصہ: ذمہ داری (liability side)

دوسرا حصہ: اثاثہ جاتی حصہ (asset side)

❁ **مبحث دوم: مسلمہ اصول اور انطباق**

پہلی بحث: بنیادی مسلمہ اصول

دوسری بحث: اصولوں کا انطباق و تجزیہ

❁ **خاتمہ: نتائج و سفارشات**

تمہید

جب سے یہ دنیا وجود میں آئی ہے، تب سے تمدن رکھنے والی قوموں نے اپنی بقاء کی خاطر اپنی اپنی سوچ کی بنیاد پر مختلف معاشی نظام وضع کیے اور دنیا کے کسی نہ کسی خطے میں ان نظاموں کو عملی میدان سے بھی گزارا گیا، لیکن ایک جامع فلاح و بہبود کا ضامن معاشی نظام وجود میں نہ آسکا جو انسانیت کی رُو بہ زوال معیشت کو آسرا دے پاتا۔ ان مصنوعی نظاموں میں سرمایہ دارانہ نظام (capitalism) اور اشتراکی نظام (socialism) زیادہ مشہور ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام نے فرد کو معاشی سرگرمیوں میں اتنی کھلی چھوٹ دے دی کہ اس کے نتیجے میں لوگوں کے سفلی جذبات کی تسکین کر کے معاشرتی اور اخلاقی بگاڑ پیدا ہونے لگا۔ معاشی بحران کے بنیادی اسباب، جیسے سود، قمار، سٹہ وغیرہ، نے جنم لیا اور آمدنی کی تقسیم میں ایسی ناہمواری پیدا ہو گئی کہ دولت کے بہاؤ کا سارا رُخ امیروں کی طرف ہو گیا اور غریب، غریب تر ہونے لگا۔

دوسری طرف اشتراکیت نے جہاں جاگیر داری اور ساہو کاری کو جنم دیا، وہیں فرد کی آزادی کو سلب کر کے ذاتی منافع ۔ محرک کو ختم کر دیا اور ترقی کی راہ میں سستی اور کاہلی جیسی رکاوٹیں پیدا ہو گئیں۔

اسلام کسی معاشی نظام کا نام نہیں، بلکہ یہ مکمل ضابطہ حیات ہے، اسی لیے اسلامی تعلیمات جس طرح انسانی زندگی کے دیگر پہلوؤں کے بارے میں راہنمائی کرتی ہیں اسی طرح معاشی سفر میں بھی اسلام ہمارے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اسلام نے ہمیں ایسی تعلیمات اور اصول و قواعد دیے ہیں جن کی روشنی میں ہم اپنا ایسا معاشی نظام قائم کر سکتے ہیں جس میں سرمایہ دارانہ اور اشتراکیت سے پیدا ہونے والی خرابیاں نہ ہوں۔

پچھلی دو صدیوں میں سرمایہ دارانہ نظام نے پوری دنیا کو اپنے شکنجہ میں جکڑ رکھا ہے۔ یوں تو اس نظام نے بہت سی مہلک چیزوں پر چند سطحی فوائد کا ملمع چڑھا کر پیش کیا ہے، مگر اس کا یہ کارنامہ مہلک ترین ہے کہ سود جیسی گھناؤنی اور قابل نفرت چیز کو کنونشنل بینکنگ سسٹم کا دلکش اور نظر فریب لبادہ پہنا کر پیش کیا اور یہی اس نظام کا سب سے قوی جال ہے۔ کنونشنل بینکاری میں جہاں دنیوی خرابیاں پائی جاتی ہیں، وہیں اس میں شرعی خرابیاں، جیسے سود، قمار وغیرہ، بھی موجود ہیں۔ لیکن محض کنونشنل بینکاری کو غلط قرار دے کر یہ کہنا کہ بینکاری کی اسلام میں کوئی گنجائش ہی نہیں ہے، یہ اپنی ذمہ داری سے پہلو تہی کے مترادف ہے، کیونکہ اس نظام کا شرعی متبادل پیش کرنا بھی ہماری ہی ذمہ داری ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ موجودہ معاشی نظام میں بینک کی بڑی اہمیت و ضرورت ہے۔ معاصر معیشت کے پہیے کو چلانے میں بینک اہم کردار ادا کرتا ہے اور اس کو ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے، لہذا ہمارے لیے بینکوں سے یکسر کنارہ کش ہو جانا ہماری معیشت کی تباہی کا سبب ہے۔ چنانچہ ہمارے لیے اسلامی اصول و قواعد کے مطابق بینکاری نظام کو استوار کرنے کے بعد ہی مستحکم معاشی نظام کا نفاذ ممکن ہے جو کسی قوم وملت، خصوصاً اسلامی معاشرے کی ترقی میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔

اگر ہم قرآن اور نبوی تعلیمات پر ایک نظر ڈالیں تو ان سے بھی ہمیں یہی رہنمائی ملتی ہے کہ لوگوں کی معاشی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کے لیے جائز راستوں کی تلاش ایک دینی و شرعی فریضہ ہے۔ اس کے لیے درج ذیل تین نکات کافی ہیں:

۱۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے صرف سود کے حرام قرار دینے پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ اس سے پہلے ہی نفع کمانے کے جائز راستے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیع کو حلال قرار دیا اور فرمایا: ﴿وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا﴾۔[1]

۲۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس قید خانے میں بادشاہ کا پیغام پہنچا اور اُن سے خواب کی تعبیر پوچھی گئی

[1] البقرة: ٢٧٥

توانہوں نے خواب کی تعبیر بعد میں بتائی کہ سات سال کے قحط کی مصیبت آنے والی ہے، لیکن اس مصیبت اور مشکل سے نکلنے کا راستہ پہلے بتلا دیا اور فرمایا کہ ضرورت کی مقدار سے زیادہ فصل کو ان کی بالیوں میں ہی رہنے دو، تاکہ بعد میں قحط کے زمانے میں کام آئے۔[1]

۳۔ جب سرورِ دو عالم ﷺ سے پوچھا گیا کہ ایک صاع کھجور کے بدلے دو صاع کھجور خریدنا کیسا ہے تو آپ ﷺ نے اس کو سود قرار دیا، لیکن اس کے ساتھ ہی اس کا متبادل جائز طریقہ بھی بتا دیا اور فرمایا کہ دو صاع کھجوروں کو پہلے دراہم کے بدلے بیچ دو اور پھر اُن دراہم سے ایک صاع کھجور خرید لو۔[2]

جب یہ بات واضح ہو گئی کہ بینک ایک معاشی معاملات کے لیے ایک اہم عنصر اور ضرورت ہے، جس سے چھٹکارا ناممکن ہے اور شرعی اعتبار سے اس نظام کا متبادل پیش کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے تو اگلا مرحلہ ہمارے سامنے یہ آتا ہے کہ بینکاری کیا ہے اور اس کو اسلامی اصول و قواعد کی روشنی میں کیسے چلایا جا سکتا ہے؟

اسلامی بینکاری سے مراد ایسا ادارہ ہے جو موجودہ دور کے مالی و معاشی اور مصرفی معاملات کو شریعت کے اصول و قواعد کے تحت انجام دیتا ہے۔ انوسٹوپیڈیا پر اسلامی بینکاری کی بنیادوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یوں تعریف کی گئی ہے:

Islamic banking, also known as non-interest banking, is a banking system that is based on the principles of Islamic, or Shariah, law and guided by Islamic economics. Two fundamental principles of Islamic banking are the sharing of profit and loss and the prohibition of the collection and payment of interest.[3]

اسلامک بینکنگ، جو غیر سودی بینکنگ کے نام سے بھی مشہور ہے، بینکاری کا ایسا نظام ہے جس کی بنیاد اسلامی قوانین پر رکھی گئی ہے اور اسلامی معیشت کے ذریعے اس کی راہنمائی کی جاتی ہے۔ اس نظام کے دو بنیادی اصول ہیں: ایک نفع و نقصان میں شراکت اور دوسرا سود کے لین دین کی ممانعت۔

---

(۱) یوسف: ٤٧

(۲) صحيح البخاري، ۱/۳۹۲، حديث نمبر: ۲۲۰۱

(3) https://www.investopedia.com/terms/i/islamicbanking.asp

معاصر علماء اور مفکرین نے اسلامی بینکاری کے لیے کچھ اصول اور شرعی بنیادیں مقرر کی ہیں جن کی روشنی میں اسلامی بینکاری کے قیام کے لیے کوششیں ہو رہی ہیں۔ ان کوششوں کا آغاز ۱۹۶۳ء میں ڈاکٹر احمد نجار رحمہ اللہ نے کیا تھا جنہوں نے شرعی مضاربہ کی بنیاد پر مصر میں اسلامی بینک کا تجربہ کیا تھا۔

زیرِ نظر مقالہ میں ہم ان شرعی بنیادوں کا شرعی جائزہ پیش کریں گے۔ تمہید کے بعد ہم اپنے مقالے کو دو حصوں اور ایک خاتمہ پر تقسیم کرتے ہیں۔ پہلے حصے میں اسلامی بینکاری کی شرعی بنیادوں کی تفصیل کا بیان ہو گا۔ دوسرے حصے میں دو ابحاث ہیں: پہلی بحث میں اسلامی بینکاری سے متعلق چند بنیادی شرعی مسلمہ اصولوں کا تذکرہ کریں گے اور دوسری بحث میں اسلامی بینکاری کی شرعی بنیادوں پر اُن اصولوں کے انطباق کی اور ان کے تجزیہ کی کوشش کریں گے اور خاتمہ کے ذیل میں نتائج اور سفارشات پیش کی جائیں گی۔

مبحث اول: اسلامی بینکاری کی شرعی بنیادیں

اسلامی بینکوں کی تمویلی سرگرمیوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

پہلا حصہ: ذمہ داری (Liability Side)

سرمایہ کی وصولی، جس کو "liability side" کہتے ہیں۔ اس حصے میں بینک اپنے ڈیپازیٹرز سے سرمایہ وصول کرتا ہے۔ اس حصے کے دو شرعی بنیادیں ہیں:

- اگر اسلامی بینک کا اکاؤنٹ ہولڈر صرف رقم کی حفاظت چاہتا ہے اور اُسے کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھتا ہے تو یہ رقم قرض کے حکم میں ہے۔ اس پر بینک کوئی نفع فراہم نہیں کرتا۔
- اگر اکاؤنٹ ہولڈر اپنی رقم پر نفع کی طلب بھی رکھتا ہے اور اُسے سیونگ اکاؤنٹ (accountsaving) یا فکسڈ ڈپازٹ (fixed deposit) میں رکھتا ہے تو اسلامی بینک ایسے اکاؤنٹ ہولڈر کے ساتھ باقاعدہ شرعی عقد کرتا ہے۔ یہ عقد دو قسم کا ہوتا ہے:

۱۔ یا تو اسلامی بینک وکیل بن کر رقم وصول کرتا ہے اور اکاؤنٹ ہولڈر کی رقم کو کاروبار میں لگا کر نفع کماتا ہے۔ اس صورت میں اسلامی بینک اپنے لیے وکالت پر متعین اجرت لیتا ہے اور بقیہ نفع اکاؤنٹ ہولڈر کو دیا جاتا ہے۔

۲۔ یا شرکت و مضاربت کا شرعی عقد کرتا ہے۔ ایسی صورت میں اکاؤنٹ ہولڈر کی حیثیت شرکت میں کام نہ کرنے والے، یعنی خوابیدہ شریک (sleeping partner) کی ہوتی ہے اور مضاربت میں رب المال (سرمایہ فراہم کرنے والے) کی، جبکہ بینک شرکت کی صورت میں عملی شریک (working partner) ہوتا ہے اور مضاربت کی

صورت میں مضارب ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں میں بینک اس رقم کو آگے شرعی عقود کے ذریعے استعمال میں لا کر نفع کماتا ہے اور ایک خاص فیصدی تناسب سے خود نفع لیتا اور اپنے اکاؤنٹ ہولڈر کو بھی نفع فراہم کرتا ہے۔

دوسرا حصہ: اثاثہ جاتی حصہ (Asset Side)

بینک کی تمویلی سرگرمیوں کا دوسرا حصہ اثاثہ جاتی حصہ "asset side" کہلاتا ہے۔ جس میں اسلامی بینک اپنے تمویل کار (کلائنٹ) کو مختلف سہولیات فراہم کر کے نفع کماتا ہے۔ یہ سہولیات کلائنٹ کی ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے شرعی عقود کی روشنی میں فراہم کیے جاتے ہیں۔ ایسے شرعی عقود کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

ا۔ نفع و نقصان کی بنیاد پر کسی کو سرمایہ فراہم کرنا۔ اس میں دو عقود شامل ہیں: ایک مشارکہ اور دوسرا مضاربہ۔

۲۔ اپنی مملوکہ چیز بیچ کر یا کرایہ پر دے کر نفع کمانا، یا کوئی خدمت سرانجام دے کر رقم وصول کرنا۔ اس قسم میں مرابحہ، اجارہ، سلم، استصناع اور حوالہ کے عقود داخل ہیں۔ ذیل میں ان تمام عقود کا مختصر خاکہ اور اصول بیان کیے جاتے ہیں:

ا۔ مشارکہ:

مشارکہ جدید اصطلاح ہے۔ یہ دراصل فقہی اصطلاح "شرکۃ" سے ماخوذ ہے، لیکن شرکۃ ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے، جبکہ مشارکہ کا مفہوم محدود ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ "شرکۃ" کے معنی شریک ہونے اور حصہ دار بننے کے آتے ہیں اور فقہاء نے شرکۃ کی مختلف قسمیں بیان کی ہیں، جن کا حاصل یہ ہے کہ شرکۃ کی ابتداء دو قسمیں ہیں:

ا۔ شرکۃ الملک: دو یا دو سے زیادہ افراد کا کسی چیز یا سامان وغیرہ میں شریک ہونا۔ یہ شرکت کبھی "اختیاری" ہوتی ہے کہ شرکاء اپنے اختیار سے کوئی مشترکہ چیز خرید لیں اور کبھی یہ شرکت "جبری" ہوتی ہے اور شرکاء کے عمل کے بغیر وجود میں آتی ہے، جیسے کسی کا انتقال ہو جائے تو اس کا ترکہ ورثاء کے درمیان خود بخود مشترک ہو جاتا ہے۔

۲۔ شرکۃ العقد: یہ ایسی شرکت ہے جو شرکاء کے باہمی معاہدے سے وجود میں آتی ہے اور اصل مقصد نفع کمانا ہوتا ہے، اس کو "commercial enterprise" کہہ سکتے ہیں۔ شرکۃ العقد کی آگے تین قسمیں ہیں:

الف۔ شرکۃ الاموال: جس میں شرکاء اپنا اپنا سرمایہ لگا کر مشترکہ کاروبار کرتے ہیں۔

ب۔ شرکۃ الاعمال: اس میں سرمایہ کے بجائے شرکاء مشترکہ طور پر خدمات انجام دیتے ہیں اور ملنے والی اجرت باہم تقسیم کر لیتے ہیں۔

ج۔ شرکۃ الوجوہ: شرکت کی اس قسم میں شرکاء اپنی ساکھ کی بنیاد پر اُدھار اشیاء خرید کر مشترکہ طور پر انہیں بیچتے

ہیں اور نفع باہم تقسیم کر لیے ہیں۔[1]

جہاں تک مشارکہ کی بات ہے تو اُس کے تحت عموماً ''شرکۃ الاموال'' اور کبھی کبھی ''شرکۃ الاعمال'' آتی ہے، اس میں شرکۃ کی تمام اقسام داخل نہیں ہیں۔

۲۔ مضاربہ:

مضاربہ دو یا دو سے زائد افراد کے درمیان ایسا معاملہ جس میں ایک فریق سرمایہ فراہم کرتا ہے اور دوسرا فریق اس سرمایہ سے اس معاہدے کے تحت کاروبار کرتا ہے۔ سرمایہ فراہم کرنے والا ''رب المال'' اور عمل کرنے والا، کاروبار کا انتظام وانصرام (management) سنبھالنے والا ''مضارب'' کہلاتا ہے۔ کاروبار کے نفع میں سے ایک متعین نسبت کا حصہ مضارب کو اور بقیہ نفع رب المال کو ملتا ہے۔[2]

مضاربہ اور شرکۃ میں یہ فرق ہے کہ شرکت میں تمام شرکاء سرمایہ لگاتے ہیں، جبکہ مضاربہ میں صرف رب المال سرمایہ لگاتا ہے۔ شرکۃ میں تمام شرکاء عمل کر سکتے ہیں، جبکہ مضاربہ میں صرف مضارب عمل کرتا ہے۔ اور شرکۃ میں تمام شرکاء اپنے اپنے سرمایہ کے تناسب سے نقصان میں شریک ہوتے ہیں، جبکہ مضاربہ میں خسارہ کی صورت میں نقصان نفع سے پورا کیا جاتا ہے، ورنہ صرف رب المال نقصان برداشت کرتا ہے، مضارب کا صرف عمل رائیگاں جاتا ہے۔

مشارکہ ومضاربہ کے اُصول:

فقہاء کرام نے قرآن وحدیث کی روشنی میں مشارکہ ومضاربہ کے لیے کچھ شرائط واصول مقرر کیے ہیں، جن کی تفصیل ہم نے دوسرے باب میں بیان کردی ہے، تاہم چونکہ یہ دونوں عقود ''نفع ونقصان'' پر مبنی ہوتے ہیں، اس لیے صرف نفع ونقصان کے اہم اصول یہاں ذکر کیے جاتے ہیں:

۱۔ مشارکہ اور مضاربہ میں نفع کی شرح عقد کے وقت ہی طے ہونا ضروری ہے۔ کسی شریک یا مضارب کے لیے لگی بندھی رقم مقرر کرنا درست نہیں ہے، بلکہ حقیقی نفع کا فیصدی تناسب مقرر ہونا ضروری ہے۔

۲۔ امام مالک اور امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ شرکۃ میں یہ ضروری ہے کہ جس شریک نے جتنا سرمایہ لگایا ہے، نفع میں اس کو اتنا ہی تناسب ملے۔ اگر کسی نے بیس فیصد سرمایہ لگایا ہے تو نفع کا بیس فیصد ہی وصول کرے گا۔ امام احمدؒ کی رائے کے مطابق اس سلسلے میں اختیار ہے کہ نفع کی شرح کا تناسب کچھ بھی ہو سکتا ہے، خواہ سرمایہ کے تناسب کے برابر ہو یا

(۱) بدائع الصنائع ٦/ ٥٦

(۲) حوالہ بالا ٦/ ٧٩

اس سے کم یا زیادہ۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں عام حالات میں نفع کا تناسب، سرمایہ کاری کے تناسب سے کم یا زیادہ رکھنا جائز ہے، لیکن اگر کوئی شریک باقاعدہ یہ شرط لگادے کہ وہ کاروبار میں عمل نہیں کرے گا تو اس کا نفع، اس کی سرمایہ کاری کے تناسب سے زیادہ رکھنا درست نہیں ہے۔ البتہ مضاربہ میں نفع کا کوئی تناسب مقرر نہیں ہے، صرف ابتداء میں فیصدی حصہ مقرر ہونا ضروری ہے، خواہ وہ جتنا بھی ہو۔

۳۔ نقصان اور خسارے کی صورت میں ہر شریک اپنی سرمایہ کاری کے تناسب سے نقصان برداشت کرے گا۔ اگر کسی نے بیس فیصد سرمایہ لگایا ہے تو نقصان کا بیس فیصد حصہ وہ برداشت کرے گا۔ البتہ مضاربت میں خسارہ ہو جائے تو اسے پہلے نفع سے پورا کیا جائے گا، اگر نقصان، نفع سے زیادہ ہے تو وہ صرف رب المال برداشت کرے گا، مضارب کا صرف عمل ضائع ہو جاتا ہے کہ اُسے کوئی نفع نہیں ملتا۔[1]

یہ نفع ونقصان کے چند اصول ہیں، ورنہ شرکۃ و مضاربت میں اس سے زیادہ تفصیل موجود ہے، جس سے قصداً تعرض نہیں کیا گیا، کیونکہ اس کی مکمل تفصیل دوسرے باب میں بیان کر دی گئی ہے۔

اسلامی بینک مشارکہ و مضاربہ کو منصوبوں کی تمویل (project financing) کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ رواں اخراجات کی تمویل (financing of the working capital) کے لیے بھی اسے اختیار کیا جاتا ہے اور درآمدات و برآمدات (import & export) میں بھی ان عقود کے ذریعے معاملات کیے جاتے ہیں۔

شرکت متناقصہ (Diminishing Musharakah)

شرکت متناقصہ کی اصطلاح بھی جدید ہے۔ آج کل اسلامی بینکاری میں عموماً مکانات کی تمویل (house financing) کے لیے اس طریقے کو اختیار کیا جاتا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ سب سے پہلے اسلامی بینک اور کلائنٹ مشترکہ رقم سے ایک مکان خریدتے ہیں اور دونوں اس مکان میں شریک ہو جاتے ہیں۔ پھر بینک کے حصے کو مختلف یونٹس میں تقسیم کیا جاتا ہے اور کلائنٹ مختلف اوقات میں بینک کے حصے کا ایک ایک یونٹ خریدتا جاتا ہے، جس کے نتیجے میں کلائنٹ کا حصہ مکان میں بڑھتا جاتا ہے اور بینک کا حصہ کم ہوتا جاتا ہے۔ بینک کے حصے کے جتنے یونٹس ابھی تک کلائنٹ نے نہیں خریدے، ان حصوں کو کلائنٹ اپنے استعمال میں لاتا ہے اور اس کے بدلے بینک کو کرایہ ادا کرتا ہے، لیکن یونٹس کی خریداری کی وجہ سے بینک کا حصہ کم ہوتا جاتا ہے، اس لیے کرایہ میں بھی اسی تناسب سے کمی ہوتی رہتی ہے۔

---

[1] الفقه على المذاهب الأربعة ۳/ ۴۳

۳۔ مرابحہ:

مرابحہ شریعت میں ایسی بیع کا نام ہے جس میں سامان کا مالک سامان بیچتے ہوئے خریدار کو بتائے کہ یہ سامان اس نے کتنے میں خریدا یا اس پر کتنی لاگت آئی اور اس کی بنیاد پر اس کا نفع طے کرے۔[1]

اسلامی بینکاری میں مرابحہ کا جو طریقہ کار رائج ہے وہ مرابحہ کے عام تصور سے تھوڑا مختلف ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ:

۱۔ پہلے بینک اور کلائنٹ کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا ہے، جس کو بینکنگ کی اصطلاح میں (master facility agreement murabaha) کہتے ہیں۔ اس معاہدہ میں کلائنٹ، بینک سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ مطلوبہ سامان بینک سے خریدے گا۔ اس کے علاوہ سامان کی قیمت، بینک کا نفع اور ادائیگی کا طریقہ کار اور دیگر معاملات کی تفصیلات طے کی جاتی ہیں۔

۲۔ اس کے بعد بینک مطلوبہ سامان خریدتا ہے، لیکن عموماً بینک اسی کلائنٹ کو اپنا وکیل مقرر کرتا ہے کہ وہ بینک کی وکالت و نیابت میں جا کر مطلوبہ سامان خرید لے۔

۳۔ سامان کلائنٹ کو موصول ہوتا ہے اور وہ اسے اپنے قبضہ میں لا کر بینک کو اطلاع کر دیتا ہے۔ کلائنٹ جب تک یہ سامان بینک سے خرید نہ لے، سامان بینک کی ملکیت میں ہوتا ہے اور سامان کے تلف یا ضائع ہونے یا کسی نقصان کی صورت میں بینک اس کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

۴۔ پھر ایک الگ معاہدہ (execution of murabaha) کے تحت کلائنٹ، بینک سے وہ سامان خرید لیتا ہے اور اس کی ملکیت حاصل کرتا ہے، کلائنٹ عموماً سامان کی قیمت قسطوں میں بینک کو ادا کرتا ہے۔ ان تمام مراحل سے وجود میں آنے والے عقد کو آج کل کی اصطلاح میں "المرابحۃ للآمر بالشراء" اور انگریزی میں اسے (murabaha to the purchase order) کہتے ہیں۔

مرابحہ چونکہ ایک بیع کا عقد ہے، اس لیے بیع کی تمام شرائط اس پر بھی لاگو ہوں گی۔ چند بنیادی شرائط یہ ہیں کہ عقد کرنے والوں میں اہلیت ہو۔ غیر معلوم یا معدوم چیز یا غیر مملوک چیز کو یا قبضہ سے پہلے کسی چیز کو نہ بیچا جائے۔ عقد کو مستقبل کی طرف منسوب نہ کیا جائے۔ اگر ادھار یا قسط وار معاملہ ہے تو ادائیگی کا وقت معلوم ہو۔

(۱) درر الحکام فی شرح مجلۃ الاحکام ۱/۱۱۴

۴۔اجارہ:

اجارہ فقہ اسلامی کی ایک اصطلاح ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی شخص یا سامان(equipment) کی جائز اور متعین منفعت کو متعین اجرت کے بدلے ایک متعین مدت کے لیے کسی کو دینا۔[1]

فقہ میں اجارہ کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں: ایک کو "إجارة الأشخاص" (employment) کہتے ہیں یعنی اجرت کے بدلے شخصی خدمات فراہم کرنا۔ دوسری قسم کو "إجارة الأعيان" (leasing) کہتے ہیں، یعنی کسی سامان، زمین وغیرہ کو اجرت کے بدلے استعمال کے لیے دینا۔

فائنانشل بینکوں میں ہائر پرچیز(hire purchase) کی صورت رائج ہے، جس میں کئی شرعی خرابیاں پائی جاتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں اسلامی بینکوں میں جو اجارہ رائج ہے اُسے "الإجارة التمويلية" اور "الإجارة المنتهية بالتمليك" کہتے ہیں، جس کا طریقہ کار کچھ یوں ہے:

۱۔ جب کسی شخص یا ادارہ کو کسی مشینری یا گاڑی وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ اپنی رقم نہ لگا سکنے کی وجہ سے بینک کے پاس اجارہ کی سہولت حاصل کرنے کے لیے آتا ہے تو بینک اس کی حالات کا جائزہ لے کر اس کی درخواست قبول کرتا ہے اور کلائنٹ کے ساتھ اگریمنٹ(facility agreement) کر لیتا ہے، جس میں اجارہ کی شرائط اور وضاحتیں موجود ہوتی ہیں۔

۲۔ بینک اپنے کلائنٹ کی مطلوبہ گاڑی یا مشینری وغیرہ کسی شخص سے خرید کر یا اس کی بکنگ متعلقہ کمپنی میں کرا دیتا ہے، جس کی قیمت بینک ادا کرتا ہے اور گاڑی بھی بینک کے نام پر بک ہوتی ہے۔

۳۔ گاڑی کے حصول کے بعد بینک یہ گاڑی اُس کلائنٹ کو اجارے کے شرعی اصول و قواعد (rules & regulations) کے مطابق ایک معینہ مدت کے لیے کرائے پر دے دیتا ہے۔

۴۔ جب کرایہ داری کی مدت پوری ہو جاتی ہے تو بینک ایک الگ مستقل عقد کے ذریعے وہ گاڑی کلائنٹ کو بیچ دیتا ہے، یا اُسے ہبہ (gift) کر دیتا ہے، لیکن اگر کلائنٹ کو اس گاڑی کے لینے میں کوئی رغبت نہ ہو تو بینک کلائنٹ کو اس کا زرِ ضمانت(security deposit) واپس کر کے گاڑی کو مارکیٹ میں فروخت کر دیتا ہے۔

اجارہ کے عقد کے لیے فقہاء نے مختلف اُصول و قواعد اور شرائط مقرر کی ہیں، جن میں بنیادی یہ ہیں کہ جس چیز کو اجارہ پر دیا جائے وہ معلوم، متعین اور قابل نفع ہو۔ وہ چیز بذات خود کرایہ پر دینے والے (مؤجر) کی ملکیت میں ہو، اگر اجارہ

---

[1] مجلة الاحكام العدلية (المادة:٤٠٥)

کے دوران اس چیز کو نقصان لاحق ہو گیا تو مالک ہی برداشت کرے۔ کرایہ معلوم و متعین ہو اور اس کی ادائیگی کا وقت بھی متعین ہو۔[۱]

۵۔ سلم:

بیع سلم ایسی بیع ہے جس میں چیز کی مکمل قیمت فی الفور وصول کر لی جاتی ہے اور فروخت کنندہ یہ ذمہ داری قبول کرتا ہے کہ وہ ایک متعین مدت کے بعد چیز فراہم کرے گا۔ یہ نقد بیع ہے، لیکن اس میں مبیع اُدھار ہوتا ہے۔[۲]

اس کے لیے بھی فقہاء نے کئی شرائط مقرر کی ہیں۔اہم اور بنیادی شرائط یہ ہیں:

مکمل قیمت فی الفور وصول کی جائے۔ جس مال کی فراہمی پر معاملہ ہوا ہے وہ ایسا مال ہو کہ کسی بھی جگہ مل سکے۔ مال کا مجموعہ ایسا ہو کہ اس کی ہر اکائی دوسرے کے قریب قریب ہو، مختلف اور الگ الگ صفات کی اشیاء کا مجموعہ نہ ہو۔ مال کی فراہمی کی تاریخ متعین ہو۔مال کی جنس، نوع، صفات اور مقدار کی مکمل وضاحت ہو۔

فقہاء حنفیہ وحنابلہ کے ہاں ایک شرط یہ بھی ہے کہ خریدار کو مال کی فراہمی کم از کم ایک مہینہ بعد کی جائے، جبکہ مالکیہ کم از کم پندرہ دن مقرر کرتے ہیں اور شافعیہ کے ہاں کم از کم مدت بھی مقرر نہیں ہے۔فقہاء حنفیہ کے ہاں یہ بھی ضروری ہے کہ مال ایسا ہو جو عقد کے وقت سے لے کر فراہمی کی تاریخ تک بازار میں موجود ہو، تاہم دیگر ائمہ کے ہاں یہ ضروری نہیں ہے، صرف فراہمی کے وقت چیز دستیاب ہو تو کافی ہے۔[۳]

سلم کے طریقے کو زرعی شعبہ میں اختیار کیا جا سکتا ہے۔اسلامی بینک کاشتکاروں کو پیشگی رقم فراہم کر کے مطلوبہ فصل پر عقدِ سلم کرلے اور پھر فصل وصول کر کے اُسے بازار میں فروخت کر دے، لیکن اس صورت میں بینک کے لیے فصل اور دیگر اشیاء سنبھالنا مشکل ہوتا ہے، اس لیے عموماً اسلامی بینک "السلم الموازي" (parallel salam) پر عمل کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک جدید اصطلاح ہے جس کا طریقہ یہ ہے کہ اسلامی بینک اپنے کلائنٹ سے پیشگی رقم لے کر ایک متعین مدت کے بعد گاڑی یا کسی اور چیز کی فراہمی کا معاہدہ کرتا ہے، جس میں کلائنٹ رب السلم (خریدار) اور بینک مسلم الیہ (بائع) ہوتا ہے۔ پھر بینک اس مدت کے اندر کسی تیسرے فریق یا ادارے کو پیشگی رقم دیکر اُنہی صفات کی گاڑی وغیرہ کی

---

(۱) مجلة الاحكام العدلية، ص:۸۱

(۲) حواله بالا ص:۳۱ (المادة: ۱۲۳)

(۳) الموسوعة الفقهية الكويتية ۲۵/ ۱۹۱. اس کی مزید تفصیل پہلے باب میں گزر چکی ہے۔

خریداری کا معاہدہ (سلم) کرتا ہے، اس میں بینک رب السلم (خریدار) اور تیسرا فریق مسلم الیہ (بائع) ہوتا ہے۔ بینک تیسرے فریق سے گاڑی وغیرہ وصول کر کے اپنے کلائنٹ کو دے دیتا ہے اور دونوں معاملوں کے درمیان قیمت کا فرق بینک کا نفع ہوتا ہے۔

۲۔ استصناع:

استصناع (manufacturing contract) سے مراد ''آرڈر پر کوئی چیز تیار کروانا'' ہے۔ یعنی ایک انسان کسی دوسرے کو مخصوص رقم کے عوض متعین صفات پر مشتمل کسی ایسی چیز کے بنانے کا آرڈر دے جو ابھی تک تیار نہیں ہے۔[۱]

استصناع بھی چونکہ ایک بیع ہے، لہذا اس کے لیے بیع کی تمام شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ فقہاء نے اس کے لیے مزید کچھ الگ شرائط بھی طے کی ہیں۔ مثلاً: جس چیز کا آرڈر دیا جا رہا ہے وہ معاشرہ میں رائج ہو اور باقاعدہ اسے تیار کرواتے ہوں۔ چیز کی تمام صفات متعین ہوں۔ فقہاء حنفیہ کے ہاں یہ بھی ضروری ہے کہ اس معاہدہ میں فراہمی کا وقت متعین نہ کیا جائے۔ تاہم بیع سلم کی طرح مکمل قیمت پیشگی دینا ضروری نہیں ہے۔[۲]

اسلامی بینک استصناع (manufacturing contract) کی بنیاد پر اس طرح معاملہ کر سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص بینک سے رقم کے حصول کی خواہش رکھتا ہے اور وہ مینوفیکچرر ہے تو بینک بحیثیت خریدار اس کے ساتھ استصناع کا معاہدہ کرے اور اُسے پیشگی قیمت دے کر مطلوبہ صفات کی چیز تیار کروالے اور پھر وہ چیز لے کر نفع کے ساتھ مارکیٹ میں فروخت کر دے۔

اسلامی بینک اس عقد کو ہاؤس فائنانسنگ (house financing) کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً کلائنٹ کے پاس زمین ہے، لیکن وہ اس پر گھر بنانا چاہتا ہے تو اسلامی بینک اس پر بطورِ استصناع کلائنٹ کے لیے گھر بنا سکتا ہے، بلکہ اگر کلائنٹ کے پاس زمین نہ ہو تو بھی اسلامی بینک ایک متعین زمین پر گھر بنانے کا آرڈر لے سکتا ہے۔ کولڈ ہاؤسز، اسٹور یج ہاؤسز، آلات واوزار کی تیاری اور بی او ٹی (BOT) کے معاملات کے لیے بھی اس عقد کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اسلامی بینک ''الاستصناع الموازي'' کا معاملہ بھی کرتے ہیں۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ اگر کسی کلائنٹ کو گھر یا مشینری وغیرہ کی ضرورت ہے تو بینک طے شدہ صفات کا گھر اور مشینری تیار کروانے کا معاہدہ کرتا ہے اور کلائنٹ سے قیمت

(۱) مجلة الاحكام العدلية، ص:۳۱ (المادة: ۱۲٤)

(۲) الموسوعة الفقهية الكويتية ۳/ ۳۲۸

اقساط میں وصول کرتا ہے۔اس صورت میں بینک صانع (بائع) ہے اور کلائنٹ مستصنع (خریدار) ہے۔اس کے بعد بینک کسی ادارے یا کسی تیسرے فریق سے وہ گھر یا مشینری وغیرہ تیار کرواتا ہے اور تیسرے فریق کے ساتھ بھی استصناع کا معاملہ کرتا ہے، جس میں بینک مستصنع (خریدار) اور تیسرا فریق صانع (بائع) ہوتا ہے۔بینک مطلوبہ صفات کا گھر یا مشینری وصول کر کے اپنے کلائنٹ کو نفع رکھ کر فراہم کر دیتا ہے۔

۷۔حوالہ/سفتجہ:

حوالہ ایک عقدِ توثیق ہے جس کے ذریعے قرض کو اصل مقروض (محیل) کے ذمہ سے کسی دوسرے شخص (محتال علیہ) کے ذمہ کی طرف منتقل کیا جاتا ہے، تاکہ قرض کی وصولی آسان ہو جائے۔[1]

حوالہ کی طرح رقوم کی ترسیل کا ایک اور طریقہ ''سفتجہ'' ہے جس میں ایک شخص دوسرے کو رقم دے کر یہ شرط لگا دیتا ہے کہ یہ رقم فلاں شہر میں مجھے یا میرے فلاں نائب کے حوالے کر دینا۔[2]

اسلامی بینک حوالہ اور سفتجہ کو عام چیک، جو کوئی شخص لکھ کر دوسرے کو دیتا ہے تاکہ بینک سے رقم نکالی جا سکے، ٹریولر چیک(traveler cheque) کریڈٹ کارڈز(credit cards) اور بل آف ایکسچینج (bill of exchange) وغیرہ کے لیے استعمال کرتا ہے۔ان سب میں تین فریق ہوتے ہیں:

۱۔ایک بینک ہوتا ہے جو حقیقت میں اکاونٹ ہولڈرز کا مقروض ہے۔

۲۔دوسرا حاملِ چیک یا اکاؤنٹ ہولڈر، جو قرض خواہ ہے۔

۳۔اور تیسرا فریق وہ شاپ یا ادارہ یا شخص ہے جو ان کارڈز یا چیک وغیرہ کی بنیاد پر رقم یا اشیاء فراہم کرتا ہے اور پھر بینک سے اپنی رقم وصول کر لیتا ہے۔

مبحثِ دوم: بنیادی مسلمہ اصول اور ان کا انطباق

پہلی بحث: بنیادی مسلمہ اصول

پہلا اصول:

اسلامی بینک کی تمام سرگرمیاں، خدمات اور تمویلی طریقوں کا شرعی احکامات کے موافق ہونا ضروری ہے۔اس سلسلے میں قرآن اور نبوی تعلیمات سے جو قواعد مستنبط ہوتے ہیں اُن میں سے چند اہم اور بینکاری سے متعلقہ یہ ہیں:

---

(۱) مجلة الاحكام العدلية (المادة: ٦٧٣)

(۲) فقه المعاملات ٢/ ٦١

۱۔ربا (interest) سے اجتناب بہر حال ضروری ہے، جس کی ممانعت کئی آیات واحادیث میں آئی ہے۔

سود کی دو بنیادی قسمیں ہیں:

۱۔ربا القرض: قرض پر سود کا لین دین

۲۔ربا البیع: ہم جنس اشیاء کی بیع میں سود کا لین دین

روایتی بینکوں میں دونوں قسم کا سود پایا جاتا ہے۔قرض پر اکاؤنٹ ہولڈرز کو سود دیا جاتا ہے اور آگے قرض فراہم کر کے سود وصول کرتے ہیں۔اسی طرح روایتی بینک ایک ملک کی کرنسی میں کسی کے ساتھ کمی بیشی اور اُدھار معاملہ بھی کرتے ہیں جو کہ سود کے زمرے میں آتا ہے، کیونکہ ایک ملک کی کرنسی ایک جنس سمجھی جاتی ہے اور ہم جنس اشیاء کی بیع میں کمی زیادتی اور اُدھار شرعاً ممنوع ہے۔[1]

۲۔قمار (gam bling) یعنی جوئے سے احتراز کرنا بھی ضروری ہے۔قمار کی حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ معاملہ جس میں کسی غیر یقینی واقعے کی بنیاد پر کوئی رقم اس طرح داؤ پر لگائی گئی ہو کہ یا تو رقم لگانے والا اپنی لگائی ہوئی رقم سے ہاتھ دھو بیٹھے یا اُسے اتنی ہی یا اس سے زیادہ رقم کسی معاوضہ کے بغیر مل جائے۔[2]

قمار کو جہاں قرآن میں رجس اور گندگی قرار دیا ہے۔[3] وہاں آپ ﷺ نے محض قمار کے ارادہ کو بھی گناہ قرار دیا ہے اور فرمایا: ''جس شخص نے اپنے ساتھی کو کہا آؤ قمار کھیلیں، تو وہ (بطورِ کفارہ) صدقہ کرے۔''[4]

مختلف قسم کی لاٹریز (lotteries) اور بیمہ (insurance) قمار ہی کی بنیاد پر حرام ہے، لہذا اسلامی بینکوں کو بھی ان سے اجتناب کرنا ہوگا۔

۳۔احادیث میں غرر (uncertainty) سے بچنے کی بھی سخت تاکید آئی ہے۔[5] لہذا اس سے بھی احتراز کرنا ہوگا۔ غرر ایسی جہالت کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے معاملے کا انجام نامعلوم ہو جائے اور جو عموماً نزاع کا ذریعہ بنے۔

غرر کی کئی صورتیں آج کل رائج ہیں۔ مثلاً معدوم چیز کی بیع، غیر مملوک چیز کی بیع، قبضہ سے پہلے کسی چیز کو بیچنا،

---

(۱) صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۵۸۷

(۲) معجم لغة الفقهاء ۱/٤٤٥

(۳) المائدة: ۹۰

(٤) صحيح البخاري، حديث نمبر: ٤٨٦٠

(۵) صحيح مسلم، حديث نمبر: ۱۵۱۳

بیچی جانے والی چیز کی مقدار، صفات یا اس کی قیمت معلوم نہ ہو وغیرہ۔ ان خرابیوں کی حرمت پر الگ الگ احادیث بھی آئی ہیں اور یہ غرر کے تحت بھی آتی ہیں۔ تمویلی سرگرمیوں میں اس قسم کی خرابیوں سے مکمل اجتناب کرنا ضروری ہے۔

۴۔ حلال و حرام کی مکمل رعایت کرنا ضروری ہے۔ تمویلی سرگرمیوں کی عملی کاروائی بھی شریعت کے موافق ہو اور عملی کاروائی کے علاوہ حرام اشیاء کی تجارت میں ملوث ہونا یا ممنوع و حرام خدمات فراہم کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

۵۔ ضرر سے بچنا بھی ضروری ہے۔ احادیث میں دوسروں کو ضرر پہنچانے سے منع فرمایا ہے۔[۱] لہذا ایسی سرگرمیاں یا ایسی اشیاء کی تجارت جو معاشرے کے لیے مضر ہوں اُن سے بچنا ضروری ہے اور حکومتی قوانین کی پاسداری بھی ضروری ہے۔

۲۔ قرض کے سلسلے میں شرعی اصول یہ ہے کہ جب بینک کے پاس کوئی قرض رکھتا ہے تو بینک اس کا مالک ہو جاتا ہے اور اُسے اپنے استعمال میں لا سکتا ہے، البتہ قرض خواہ (کرنٹ اکاؤنٹ ہولڈر) جب چاہے اپنے قرض کا مطالبہ کر سکتا ہے اور اگر قرض کی رقم بینک کے پاس ضائع ہو گئی تو بینک اس کا ضامن ہو گا۔[۲]

دوسرا اُصول:

شریعت میں ربح اور نفع کمانے کے کچھ اُصول یا بالفاظِ دیگر کچھ ذرائع اور وسائل مقرر ہیں جن کے ذریعے نفع کمانے کی اجازت دی گئی ہے۔ وہ وسائل اور ذرائع کیا ہیں؟ اس کے لیے درج ذیل تین نکات سمجھنا ضروری ہیں:

ا۔ سرورِ دو عالم ﷺ کی ایک طویل حدیث ہے جس میں ایک اہم جملہ ہے، جس کو فقہاء نے قاعدہ فقہیہ قرار دیا ہے، وہ جملہ یہ ہے:

الخراج بالضمان۔[۳]

نفع، ذمہ داری کے بدلے ملتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز انسان کے ضمان (risk) میں اس طرح آجائے کہ اس چیز کی ہلاکت یا نقصان کی ذمہ داری وہ شخص برداشت کرے تو اس چیز کا نفع بھی اُسی شخص کو ملے گا۔

۲۔ سابقہ اصول کی طرح ایک اُصول یہ بھی ہے: ''الغنم بالغرم'' یعنی نفع، نقصان کے بدلے ملتا ہے۔ اگر

---

(۱) السنن الكبرى، حديث نمبر: ۱۹۷۲

(۲) درر الحكام في شرح مجلة الاحكام ۳/ ۸۲

(۳) سنن ابي داؤد، حديث نمبر: ۳۵۱۰

کوئی شخص کسی چیز کا نقصان برداشت کرے گا تو اُسے نفع ملے گا، ورنہ نہیں۔ یہ قاعدہ بھی ایک حدیث سے ماخوذ ہے۔[1]

درج بالا دونوں باتیں الگ الگ حدیث سے بھی ثابت ہیں اور دونوں کا فی الجملہ مفہوم سرورِ دو عالم ﷺ نے "ربح مالم یضمن" کی حدیث میں بیان فرمایا ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

لا يحل سلف وبيع ولا شرطان في بيع ولا ربح مالم يضمن ولا بيع ما ليس عندك۔[2]

ترجمہ: قرض اور بیع (ایک دوسرے پر معلق کر کے) درست نہیں ہے، بیع میں دو شرطیں کرنا درست نہیں، جو چیز ضمان میں نہ آئی ہو اس کا نفع حلال نہیں اور جو چیز تمہارے پاس نہ ہو اس کی بیع درست نہیں ہے۔

۳۔ فقہاء نے نفع کے استحقاق کے لیے ایک اور ضابطہ ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

يستحق الربح إما بالمال وإما بالعمل وإما بالضمان.[3]

انسان تین چیزوں کے بدلے نفع کا مستحق بنتا ہے: ۱۔ اپنا مال خرچ کر کے۔ ۲۔ عمل کر کے۔ ۳۔ ضمان و نقصان برداشت کر کے۔

اس قاعدے کو سابقہ دونوں قواعد کے ساتھ ملا کر سمجھنا ضروری ہے، لہٰذا صرف "مال" کے ذریعے نفع کمانا درست نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ ضمان و نقصان برداشت کرنا بھی ضروری ہے، جیسا سابقہ قواعد میں آیا ہے، ورنہ سود جائز قرار دیا جائے گا۔ اسی طرح صرف "ضمان" یعنی رسک بھی ایسی چیز نہیں ہے کہ اس کے بدلے نفع لیا جائے، بلکہ اس کے ساتھ عمل یا مال خرچ کرنا ضروری ہے۔

تیسرا اُصول:

شریعت کی نظر میں نقود اور کرنسی محض ایک وسیلہ ہے۔ صرف نقود کی بنیاد پر نفع حاصل کرنا جائز نہیں ہے، جیسا کہ روایتی بینک صرف زر (money) کی بنیاد پر ہی نفع کا لین دین کرتے ہیں۔ شرعاً نقود و کرنسی کے ذریعے نفع کمانے کی درج ذیل صورتیں ہیں:

---

[1] السنن الكبرى، حديث نمبر: ١٥٤١

[2] سنن الترمذي، حديث نمبر: ١٢٣٤

[3] بدائع الصنائع ٦/ ٦٢

۱۔ان کے ذریعے کوئی عین اور جامد چیز خریدی جائے، پھر اُسے اپنے استعمال میں لاکر یا آگے بیچ کر یا کرایہ پہ دے کر نفع کمایا جائے۔

۲۔ نقود وکرنسی آگے کسی شریک یا مضارب کو دی جائے اور وہ عمل کر کے نفع کمائے۔اس صورت میں بھی نفع ان اشیاء سے مل رہا ہے جس کی تجارت شریک یا مضارب کرتا ہے اور کرنسی کے ساتھ ساتھ کرنسی کا مالک نقصان کا رسک بھی برداشت کرے گا۔

یہ بہت اہم نکتہ ہے جس سے یہ ثمرہ سامنے آتا ہے کہ اسلامک بینکنگ کو حقیقی اثاثوں پر مبنی فائنانسنگ (asset-backed financing)ہونا چاہیے اور اسے باقاعدہ ایک تجارتی ادارہ بن کر کام کرنا ہوگا۔روایتی بینکوں کی طرح محض زر(money)یا دستاویزات(monetary papers)کے ذریعے نفع کے لین دین کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔

چوتھا اصول:

شریعت کی نظر میں کسی بھی معاملے کے نتیجہ اور انجام پر حکم لاگو نہیں ہوتا،بلکہ حکم کا تعلق معاملے کی حقیقت اور عملی کاروائی(procedure) سے ہوتا ہے،بشرطیکہ نتیجہ شریعت کی نظر میں جائز ہو۔لہذا اگر دو ایسے معاملات جن کی عملی کاروائی ایک دوسرے سے مختلف ہے، لیکن دونوں کا نتیجہ ایک ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ دونوں کا حکم بھی ایک ہو۔

اس اصول کی ایک واضح مثال حدیث نبوی میں پائی جاتی ہے۔ آپ ﷺ نے ایک صحابی کو خیبر کا عامل مقرر فرمایا،وہ آپ ﷺ کی خدمت میں کھجور کی ایک خاص قسم "جنیب"،لیکر آئے۔آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ کیا خیبر کی ساری کھجوریں ایسی ہی ہوتی ہیں؟انہوں نے کہا کہ نہیں،ہم دو صاع عام کھجوریں دے کر اس کھجور کا ایک صاع یا عام کھجوروں کے تین صاع دے کر اس کے دو صاع خریدتے ہیں۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو،البتہ عام کھجوروں کو دراہم کے بدلے بیچ دو اور پھر دراہم سے یہ جنیب کھجور خرید لو۔[1]

اس حدیث میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں طریقوں کا نتیجہ اور انجام یکساں ہے، لیکن چونکہ دونوں طریقے اور ان کی عملی کاروائی بذاتِ خود ایک دوسرے سے مختلف ہے،اس لیے عملی کاروائی(Procedure)کو دیکھتے

[1] صحيح البخاري، حديث نمبر:۲۰۱۱

ہوئے ایک طریقے کو آپ ﷺ نے منع فرمایا اور دوسرے طریقے کی اجازت دے دی۔ اس کو درج ذیل نقشہ سے سمجھا جاسکتا ہے:

پہلا طریقہ	شرعی حیثیت	دوسرا طریقہ	شرعی حیثیت
دو صاع عام کھجور دیکر ایک صاع عمدہ کھجور یا تین صاع عام کھجور دیکر دو صاع عمدہ کھجور خریدنا	دو ہم جنس اشیاء کی کمی بیشی کے ساتھ بیع	دو یا تین صاع عام کھجور کو دراہم [illegible] بیچنا	دو خلافِ جنس اشیاء کی بیع
نتیجہ ایک کلو اضافی کھجور کا حصول	**حکم شرعی** سود اور حرام	پھر دراہم کے ذریعے ایک یا دو صاع عمدہ کھجور خریدنا	دو خلافِ جنس اشیاء کی بیع
		نتیجہ ایک کلو اضافی کھجور کا حصول	**حکم شرعی** جائز نفع

پانچواں اصول:

قرآن و حدیث میں وعدہ پورا کرنے کی تاکید اور وعدہ خلافی پر وعید آئی ہے۔ قرآن مجید میں کہیں وعدہ خلافی کو قابل نفرت چیز قرار دیا ہے تو کہیں فرمایا گیا ہے کہ اس بارے میں باز پرس ہوگی۔[۱] احادیث میں وعدہ کی پاسداری کے بارے میں اس سے بھی زیادہ سخت تاکید آئی ہے اور وعدہ خلافی کو منافق کی نشانیوں میں سے ایک نشانی بتلایا گیا ہے۔[۲]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وعدہ پورا کرنا شرعاً مطلوب ہے، البتہ اس بارے علماء کا اختلاف ہے کہ کیا وعدہ پورا کرنا محض مستحب ہے یا واجب اور اگر واجب ہے تو صرف دیانۃً واجب ہے یا قضاء بھی واجب ہے؟ اس سلسلے میں علماء کی آراء مختلف ہیں، تاہم راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ وعدہ پورا کرنا دیانۃً واجب ہے اور قضاء صرف ضرورت وحاجت کے موقع پر واجب قرار دیا جاسکتا ہے یا وعدہ کے لازم ہونے پر حکومتی قانون جاری ہو جائے۔[۳]

چھٹا اُصول:

مختلف احادیث کو سامنے رکھتے ہوئے یہ اصول اخذ کیا جاسکتا ہے کہ دو معاملات کو ایک ساتھ اس طرح انجام دینا

[۱] الصف: ۲، ۳، الإسراء: ۳٤

[۲] صحیح البخاري، حدیث نمبر:۳۳

[۳] فقه البیوع ۱/۷۷ تا ۱۰۰

کہ ایک معاملہ دوسرے کے لیے شرط اور اس پر معلق ہو یہ شرعا جائز نہیں ہے۔ مثلاً ایک شخص دوسرے سے کہے کہ میں آپ سے یہ گھر ایک سال تک اس شرط پر کرایہ پر لیتا ہوں کہ سال کے آخر میں تم مجھے یہ گھر اتنی رقم کے عوض بیچ دو گے۔ یہ شرعا درست نہیں ہے۔ اس کو بعض احادیث میں "بيعتان في بيعة" اور بعض میں "صفقة في صفقة" سے تعبیر کیا گیا ہے۔[1]

دوسری بحث: اصولوں کا انطباق و تجزیہ

اسلامی بینک کے کرنٹ اکاؤنٹ کی رقم کی شرعی حیثیت قرض کی ہے۔ اس پر ہمارے ذکر کردہ اصولوں میں سے پہلا اصول لاگو ہوتا ہے کہ ایسی رقم پر اکاؤنٹ ہولڈر کو سود دینا حرام ہے۔ اسی طرح آگے کسی کو قرض دے کر اس پر بھی سود نہیں دیا جا سکتا۔ پہلے اصول کا آخری نکتہ یعنی جزء نمبر (۶) یہ تھا کہ مقروض کے لیے قرض کو اپنے استعمال میں لانا شرعا جائز ہے، لہذا اگر بینک ایسی رقم کو اپنے استعمال میں لاتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ قرض خواہ (اکاؤنٹ ہولڈر) کے مطالبہ پر اُسے اس کی رقم واپس کرنا ضروری ہے۔

جہاں تک اسلامی بینک کے سیونگ اکاؤنٹ اور فکسڈ ڈیپازٹ کی بات ہے تو ان کے لیے رقم لینے کی صورت میں اسلامی بینک کو باقاعدہ مشارکہ یا مضاربہ کا عقد کرنا ہوگا اور یہ دونوں عقود شرعا ثابت و جائز ہیں۔ اسلامی بینک ایسی رقوم کو آگے کاروبار میں لگا کر اکاؤنٹ ہولڈر کو فیصدی تناسب سے نفع دیتا رہتا ہے۔ ذیل میں ہم اسلامی بینک کی تمویلی سرگرمیوں کے شرعی بنیادوں کا الگ الگ جائزہ لیتے ہیں:

۱۔ مشارکہ:

جہاں تک نفسِ شرکت کی بات ہے تو یہ آپ ﷺ کے قولی، فعلی اور تقریری احادیث سے ثابت ہے۔ مثلاً آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

إن الله يقول: أنا ثالث الشريكين ما لم يخن أحدهما صاحبه.[2]

ترجمہ: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں دو شریکوں کے درمیان تیسرا شریک ہوں، جب تک کوئی ایک خیانت نہ کرے۔

---

(۱) سنن الترمذي، حديث نمبر: ۱۶۱۰

(۲) سنن ابي داود، حديث نمبر: ۳۳۸۵

حضور ﷺ کے فعل سے بھی شرکت ثابت ہے، چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت سائب بن ابی السائب رضی اللہ عنہ کے ساتھ شرکت کا عقد کیا تھا۔ (۱) اسی طرح آپ ﷺ کی موجودگی میں صحابہ کرام شرکت ومضاربت کے معاملات کرتے تھے اور آپ ﷺ نے ان کو منع نہیں فرمایا، لہذا آپ کے سکوت (سنتِ تقریریہ) سے بھی شرکت کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

اسلامی بینکاری میں "مشارکہ" کی اصطلاح اگرچہ نئی ہے، لیکن اس کی بنیاد بھی شرکت کی ہی اقسام ہیں، لہذا اس کے جواز میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل نکات ذہن میں رکھنا ضروری ہیں:

۱۔ مشارکہ کے اندر بھی شرکت کی شرائط اور اُصولوں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

۲۔ ہمارے ذکر کردہ اصولوں میں پہلے تین اصول اس عقد پر منطبق ہوتے ہیں اور مشارکہ میں نفع نقصان بالکل ابتداء میں طے ہونا ضروری ہے، تاکہ کوئی غرر یا قمار کا اندیشہ نہ ہو۔ اسی طرح دوسرے اصول کے مطابق اس عقد میں اگر بینک اور اکاؤنٹ ہولڈرز کو نفع ملتا ہے تو وہ ان کے "ضمان" کے ساتھ ہی مربوط ہونا چاہیے۔ یعنی نقصان کی صورت میں اکاؤنٹ ہولڈرز اور بینک دونوں نقصان برداشت کریں، بلکہ بینک نے آگے جس فریق کے ساتھ مشارکہ کا عقد کیا ہو وہ بھی اپنے سرمایہ کے تناسب سے نقصان کا ذمہ دار ہو، تاکہ یہ "الخراج بالضمان" اور "الغنم بالغرم" وغیرہ کے اصولوں کے مطابق ہو۔ اور اس عقد میں چونکہ صرف رقوم کی بنیاد پر نفع نہیں کمایا جارہا، بلکہ اس کے ساتھ ضمان بھی ہے، اس لیے اس پر تیسرا اصول بھی منطبق ہوتا ہے۔

۳۔ مشارکہ میں حقیقی نفع اس وقت معلوم ہوتا ہے جب مشارکہ کے تمام اثاثہ جات کو نقد میں تبدیل کیا جائے، لیکن آج کل کثیر المقاصد (multi-purpose) اور مستقل بنیادوں پر جاری رہنے والے کاروبار میں ہر شریک کے لیے تمام اثاثہ جات کو نقد میں تبدیل کرنا ناممکن ہے، اس لیے معاصر علماء کی رائے یہ ہے کہ ایسی صورتحال میں "تنضیض حکمي" کا طریقہ اختیار کیا جائے، یعنی اثاثہ جات کو حقیقت میں نقد میں تبدیل کرنے کے بجائے معتبر حسابی پیمانوں اور اندازوں کی بنیاد پر اثاثہ جات کی قیمت متعین کرلی جائے جس سے نفع کا پتہ چل جائے گا۔ (۲)

چونکہ اس طرح نفع معلوم کیا جاسکتا ہے اور اس میں ایسی جہالت نہیں ہے جو نزاع اور جھگڑے کا سبب بنے، لہذا

(۱) نیل الاوطار ۵/ ۳۱۵، کتاب الشركة والمضاربة، حدیث نمبر:۲

(۲) قرارات وتوصيات مجمع الفقه الإسلامي، رقم القرار: ۳۰، البند:۷، ص: ٤٤

یہ طریقہ جائز ہے اور جو شریک اپنا نفع لے کر نکل رہا ہے، گویا کہ وہ شرکت میں اپنے حصہ کو بینک پر فروخت کر رہا ہے۔ لہذا اب بینک اس اس کا حصہ خرید کر اس کے حصے کا بھی مالک ہو جائے گا۔

۴۔ بینکوں میں اکاؤنٹ ہولڈر مختلف اوقات میں رقوم جمع کراتے اور نکلواتے رہتے ہیں، لہذا ہر اکاؤنٹ ہولڈر کی رقم اور نفع کے لیے الگ حساب رکھنا تقریباً ناممکن ہے، اس کے لیے عموماً یومیہ پیداوار کی بنیاد (on the basis of daily products) پر نفع تقسیم کرنے کا اصول اختیار کیا جاتا ہے، جسے عربی میں "طریق النمر" کہتے ہیں۔ اس کے لیے پہلے بینک کے کل سرمایہ کا نفع معلوم کیا جاتا ہے، پھر یہ دیکھا جاتا ہے کہ تمام ڈیپازیٹرز کا فی روپیہ فی یوم نفع کا اوسط کیا ہے اور مدتِ مشارکہ میں کس شخص کی کتنی رقم کتنے دنوں تک بینک میں رہی؟ پھر جس کی جتنی رقم جتنے دنوں کے لیے بینک میں تھی اس کے حساب سے نفع تقسیم کیا جاتا ہے۔[1]

اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ نفع کا ایک تخمینی طریقہ ہے۔ اس میں یہ نہیں معلوم کہ کس شخص کی رقم سے نفع ہوا ہے اور کس کی رقم سے نہیں، لہذا یہ درست نہیں ہونا چاہیے، لیکن فقہاء کی تصریح کے مطابق جب مشارکہ وجود میں آ جائے تو اس کے بعد یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کس کی رقم سے کتنا نفع ہوا، بلکہ کاروبار کی مجموعی رقوم کے نفع کو دیکھا جاتا ہے، لہذا اس طریقہ کو بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔[2]

مشارکہ متناقصہ:

مشارکہ متناقصہ کے طریقہ کار کو دیکھا جائے تو اس میں تین عقود انجام پاتے ہیں:

۱۔ مشترکہ طور پر مکان کی خریداری

۲۔ کلائنٹ کا بینک کے حصے کو اجارہ پر لینا

۳۔ کلائنٹ کا بینک کے حصے کو تھوڑا تھوڑا خریدنا

ان میں پہلا اور تیسرا عقد بیع کا ہے اور دوسرا اجارہ کا، جن میں کوئی بھی ناجائز نہیں ہے، البتہ مزید چند باتیں درج ذیل ہیں:

۱۔ اس میں ابتداء کے اندر کلائنٹ سے آئندہ کے عقود کے لیے وعدہ لیا جاتا ہے اور اس وعدہ کو لازم سمجھا جاتا ہے، لیکن ہم نے پانچویں اصول کے تحت مختصراً ذکر کر دیا تھا کہ وعدہ دیانۃً لازم ہے اور اس کو ضرورت وحاجت کے وقت

---

[1] بحوث في قضايا فقهية معاصرة ۱۷۶/۲

[2] بدائع الصنائع ۵۴/۶

قضاء بھی لازم کیا جاسکتا ہے اور موجودہ دور میں تجارتی وعدوں کو لازم قرار دینے کی ضرورت ہے، اس لیے اس کی گنجائش ہے۔

۳۔ مشارکہ متناقصہ میں چونکہ تین عقود ہوتے ہیں، اس لیے یہ طریقہ بظاہر ہمارے ذکر کردہ چھٹے اصول کے مطابق نہیں ہے، بلکہ اس کے خلاف ہے، کیونکہ اُس کے مطابق دو یا زیادہ عقود کو جمع کرنا درست نہیں ہے، لہذا یہ طریقہ درست نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن اگر چھٹے اصول اور اس سلسلے کی احادیث کو صحیح سمجھا جائے تو یہ شبہ نہیں ہوتا، کیونکہ اصول نمبر (٦) یعنی ''صفقة فی صفقة'' کا مطلب یہ ہے کہ ایک عقد کو دوسرے عقد کے ساتھ اس طرح مشروط و معلق نہ کیا جائے کہ اگر پہلا عقد نہیں ہوگا تو دوسرا بھی نہیں ہوگا۔ جبکہ مشارکہ متناقصہ میں تینوں عقود الگ الگ ہوتے ہیں اور کوئی عقد دوسرے کے ساتھ مربوط و مشروط نہیں ہوتا، بلکہ اگر ایک عقد نہ کیا جائے تو دوسرا عقد اپنی جگہ برقرار ہوتا ہے، لہذا یہ اصول نمبر (٦) اور حدیث کے خلاف نہیں ہے۔

۲۔ مضاربہ:

مضاربہ بھی ایک شرعی عقد ہے جو کئی احادیث اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل سے ثابت ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

ثلاث فيهن البركة: البيع إلى أجل والمقارضة وأخلاط البر بالشعير للبيت لاللبيع.[1]

ترجمہ: تین چیزوں میں برکت ہے: معینہ مدت کے لیے ادھار فروخت کرنا۔ مضاربہ کی بنیاد پر کسی کو مال دینا۔ گھریلو ضرورت کے لیے گندم میں جو کی ملاوٹ کرنا، البتہ فروخت کرنے کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں۔

اس کے ساتھ اسلامی بینکوں پر مضاربہ کے شرعی اصولوں (مثلاً نفع ونقصان وغیرہ) کی مکمل رعایت کرنا لازم اور ضروری ہے۔

مزید دو قابل غور نکات یہ ہیں:

ا۔ مضاربہ میں سرمایہ فراہم کرنے والے (رب المال) کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ مضارب (مثلاً بینک) کو کسی خاص کاروبار یا مقام تک محدود کرے تاکہ وہ اس کے باہر کام نہ کرے، لیکن اسلامی بینک میں عموماً اکاؤنٹ ہولڈرز کو یہ

(1) سنن ابن ماجة، حديث نمبر: ٢٢٨٩

اختیار نہیں دیا جاتا۔ لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ انتظامی مجبوریوں کی وجہ سے ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہر شخص کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اسلامی بینک سے مضاربہ کرے یا نہ کرے، لہٰذا اس اختیار کے ہوتے ہوئے، اگر انتظامی مجبوری کی وجہ سے ہر اکاؤنٹ ہولڈر کو کاروبار اور مقام وغیرہ کی تحدید کا اختیار نہ دیا جائے، جبکہ وہ خود بھی اس پر راضی ہو تو اس میں کوئی شرعی خرابی نہیں ہے۔

۲۔ مضاربہ میں بھی شرکت کی طرح ''تنضیض حکمی'' اور ''یومیہ پیداوار کی بنیاد پر نفع کی تقسیم'' کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، جس پر شرکت کے تحت ہم نے مختصر بات کر دی ہے۔

۳۔ مرابحہ:

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

{وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا}[1]

اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کر دیا ہے۔

لہٰذا ہر وہ معاملہ جو بیع کے زمرے میں آتا ہے، وہ حلال ہے اور مرابحہ بھی بیع کی ایک قسم ہے، جس میں بینک باقاعدہ عین/سامان فروخت کر کے نفع کماتا ہے، اس لیے درج بالا آیت اور اصول (۳) کی پہلی شق کے مطابق یہ بھی شرعاً جائز ہے۔ اسی طرح جب کلائنٹ، بینک کی طرف سے مطلوبہ چیز خریدتا ہے تو اس وقت وہ بینک کی ملکیت ہے اور جب تک دوسرا عقد نہیں ہوتا وہ بینک کی ملکیت ہی میں رہتی ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ بینک کے ضمان میں ہے اور اگر اس دوران میں وہ چیز ضائع ہو جائے تو بینک کے کھاتے سے ضائع ہو گی اور اس کے نتیجے میں دوسرے اصول ''الخراج بالضمان'' کی پاسداری ہو جاتی ہے۔

البتہ اس سلسلے میں مزید شرعی نکات درج ذیل ہیں:

۱۔ مرابحہ میں سب سے پہلے کلائنٹ سے یہ وعدہ لیا جاتا ہے کہ وہ بعد میں بینک سے مطلوبہ چیز خریدے گا، اگر نہ خریدے اور بینک کو وہ چیز کسی دوسری جگہ فروخت کرنا پڑے تو کلائنٹ حقیقی نقصان کا ذمہ دار ہو گا۔ اس وعدہ کو قضاءً لازم قرار دیا گیا ہے۔ اس کی کچھ تفصیل ہم نے شرکت متناقصہ کے تحت بیان کر دی ہے کہ ایسے وعدوں کو اصول نمبر (۵) کے تحت ضرورت وحاجت کی وجہ سے قضاءً لازم کیا جا سکتا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اگر ایسے وعدہ کو لازم نہ کیا جائے تو

[1] سورة البقرة: ۲۷۵

اس میں بینک کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے، جبکہ اصول نمبر (۱) میں یہ بات گزر چکی ہے کہ شریعت میں کسی کو ضرر پہنچانے سے منع کیا گیا ہے۔

۲۔ اسلامی بینک مرابحہ میں نفع کی تعیین کے لیے سودی بینکوں کے باہمی شرح سود (bench mark) کو معیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں، جیسے پاکستان میں کائبور (KIBOR) کو معیار بنایا جاتا ہے۔ اس عمل کی ناپسندیدگی میں تو کوئی شبہ نہیں، لیکن اس کی وجہ سے عقدِ مرابحہ ناجائز نہیں ہوتا، کیونکہ نفع کے لیے شرح سود کو معیار بنانا محض ایک نتیجہ ہے، جبکہ اصول نمبر (۴) کے تحت یہ بات گزر چکی ہے کہ شرعی حکم نتیجہ پر نہیں، بلکہ پروسسز اور عملی کاروائی پر لاگو ہوتا ہے، لہذا اگرچہ سودی بینکوں اور اسلامی بینکوں کا نفع (نتیجہ) ایک جیسا ہو، لیکن چونکہ عملی کاروائی دونوں کی مختلف ہے، ایک میں سودی کاروائی ہے دوسرے میں بیع کا جائز طریقہ ہے، اس لیے اول ناجائز اور دوسرا طریقہ جائز ہے۔

۳۔ بینک پر لازم ہے کہ اس وقت چیز کلائنٹ کو فروخت کرے جب وہ چیز باقاعدہ بینک کی ملکیت میں آجائے، تاکہ اس پر غیر مملوک کی بیع کا شبہ نہ ہو اور یہ "الخراج بالضمان" کے اصول کے موافق ہو۔

۴۔ مرابحہ میں عموماً کلائنٹ کو چیز قسطوں پر بیچی جاتی ہے۔ کلائنٹ سے شروع میں یہ عہد لیا جاتا ہے کہ اگر وہ قسط میں تاخیر کرے گا تو اُسے ایک متعین رقم صدقہ کرنی ہوگی، جو بینک کے واسطے سے کسی خیراتی و فلاحی کام میں صرف کی جائے گی۔

اگرچہ صدقہ کسی پر لازم نہیں کیا جاسکتا، لیکن اگر کوئی شخص ایسی غلطی کرے جس کا تعلق حقوق العباد سے ہو تو ضرورت کے وقت بعض صورتوں میں اس التزام کو لازم کیا جاسکتا ہے۔ اسلامی بینک اگر تاخیر سے بچنے کے لیے ایسے ممکنہ حل پر عمل نہیں کرے گا تو اسے کئی معاشی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور فقہاءِ مالکیہ کی ایک رائے کے مطابق اس طرح کے التزام سے صدقہ لازم ہو جاتا ہے۔[1]

اسی کے ساتھ یہ نکتہ بھی ذہن میں رہے کہ اگر کلائنٹ اپنی رضامندی سے ایسا التزام کرتا ہے تو اس کو "نذر" یعنی منت پر قیاس کرکے لازم کیا جاسکتا ہے۔

۴۔ اجارہ:

عقدِ اجارہ بھی ایک شرعی عقد ہے جو قرآن، حدیث اور اجماعِ امت سے ثابت ہے۔ سرورِ دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے:

---

(۱) تحرير الكلام في مسائل الالتزام ص: ۱۷٦

من استأجر أجيرا فليعلمه أجره.[1]

جو شخص کسی کو مزدوری پر رکھے تو اُسے اس کی اجرت بتادے۔

دوسری جگہ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ:

أعط الأجير أجره قبل أن يجف عرقه.[2]

مزدور کو اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ہی اجرت دے دیا کرو۔

لہذا اس عقد کی مشروعیت میں کوئی شبہ نہیں ہے، لیکن اسلامی بینک کے اختیار کردہ اجارہ کے لیے مزید درج ذیل نکات کی وضاحت ضروری ہے:

۱۔ اسلامی بینک اپنے کلائنٹ سے ابتداء ہی میں یہ وعدہ لیتا ہے کہ وہ مطلوبہ چیز بینک سے اجارہ پر لے گا اور اس وعدہ کو قضاء لازم سمجھا جاتا ہے۔ وعدہ کے لزوم سے متعلق ہم نے اس سے پہلے شرکتِ متناقصہ اور مرابحہ کے تحت تفصیل بیان کردی ہے کہ اس کی گنجائش ہے۔

۲۔ اسلامی بینک جب مطلوبہ چیز خرید لے تو اس کے بعد کلائنٹ کو اجارہ پر دے دے اور کلائنٹ کے قبضہ کے بعد کرایہ لینا شروع کرے، اس سے پہلے کرایہ شروع کردینا درست نہیں، تاکہ یہاں "ربح مالم يضمن" لازم نہ آئے اور اصول نمبر (۲) پر مکمل عمل ہو۔

۳۔ مدتِ اجارہ کے اختتام پر اسلامی بینک وہ چیز کلائنٹ کو تھوڑی سی رقم کے بدلے بیچ دیتا ہے یا اُسے گفٹ (ہبہ) کردیتا ہے، لیکن یہ آخری عقد بالکل الگ ہونا چاہیے، اس کا عقدِ اجارہ کے ساتھ ایسا مشروط تعلق نہیں ہونا چاہیے کہ ایک عقد دوسرے کے ساتھ مشروط اور اس پر معلق ہو، تاکہ یہاں اصول نمبر (۶) کی خلاف ورزی نہ ہو اور "صفقة فی صفقة" لازم نہ آئے۔ اس کی کچھ تفصیل مرابحہ میں گزر چکی ہے۔

۴۔ کلائنٹ سے شروع ہی میں یہ التزام کروایا جاتا ہے کہ اگر کلائنٹ کرایہ کی ادائیگی میں تاخیر کرے گا تو اُسے ایک متعین رقم صدقہ کرنی ہوگی۔ اس پر صدقہ لازم ہونے کا شبہ ہوسکتا ہے، لیکن یہ "التزام بالتبرع" ہے جس کی گنجائش ہے۔

(۱) السنن الكبرى، حديث نمبر: ١٢٠١

(۲) سنن ابن ماجة، حديث نمبر: ٢٤٤٣

۵۔ مدتِ اجارہ کے دوران اجارہ پر دی ہوئی چیز بینک ہی کی ملکیت میں رہنا ضروری ہے۔ اگر نقصان ہو جائے تو وہ بینک ہی برداشت کرے گا، لیکن آج کل اسلامی بینک اس نقصان سے بچنے کے لیے "تکافل" کی پالیسی خرید لیتے ہیں جو مروجہ انشورنس کا اسلامی متبادل ہے۔ تکافل شرعاً درست ہے یا نہیں؟ یہاں اس کی تفصیل مقصود نہیں ہے، لیکن کئی معاصر فقہاء نے وقف کی بنیاد پر اس کی اجازت دی ہے، لہذا اسلامی بینک کے لیے تکافل پالیسی خریدنے کی بھی گنجائش ہے۔[1]

۵۔ سلم:

عقدِ سلم بھی شرعی عقد ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب آپ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو لوگ کھجوروں میں دو اور تین سال کے لیے سلم کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

من أسلف في شيء ففي كيل معلوم ووزن معلوم إلى أجل معلوم.[2]

جو شخص کھجور میں سلم کرے تو معلوم پیمانے اور معلوم وزن میں ایک معلوم مدت کے لیے کرے۔

جیسا کہ اس سے پہلے گزر چکا ہے کہ اسلامی بینک عموماً "سلم موازی" (parallel salam) کا معاملہ کرتے ہیں جو دو عقودِ سلم کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل دو بنیادی امور کو مد نظر رکھنا ضروری ہے:

۱۔ چونکہ سلم موازی میں دو عقودِ سلم ہوتے ہیں، جبکہ اصول نمبر چھ (۶) کے تحت یہ تفصیل گزر چکی ہے کہ ایک عقد میں دو معاملے جمع کرنا شرعاً درست نہیں ہے، اس لیے سلم موزای کے دونوں عقود کا ایک دوسرے سے الگ ہونا ضروری ہیں اور ایک عقد دوسرے پر مشروط نہیں ہونا چاہیے، ورنہ یہ عقد اصول نمبر (۶) کے خلاف ہونے کی وجہ سے درست نہ ہوگا۔

۲۔ ایک ضروری بات یہ بھی ہے کہ سلم موازی صرف تیسرے شخص سے کرنا جائز ہے۔ یہ درست نہیں ہے کہ اسلامی بینک ایک شخص کے ساتھ ایک عقد سلم کرکے اس کو فروخت کنندہ بنا کر اس سے کوئی چیز خرید لے اور پھر اُسی کے ساتھ دوسرا عقدِ سلم کرکے اس کو خریدار بنادے، کیونکہ اس سے "بیع عینہ" (buy back) لازم آئے گا جو کہ شرعاً

---

(۱) بحوث في قضايافقهية معاصرة ١٨٧/٢

(۲) صحيح البخاري، حديث نمبر: ٢٢٤٠

درست نہیں ہے۔[1]

اس کے علاوہ اگر بینک کے لیے اشیاء واعیان کو سنبھالنا مشکل ہو تو سلم موازی کے بجائے ایک اور حل یہ بھی ہے کہ بینک کسی تیسرے فریق سے یہ وعدہ لے سکتا ہے کہ وہ مطلوبہ صفات کی چیز بینک سے خرید لے گا۔ چونکہ یہ باقاعدہ عقد نہیں، بلکہ محض ایک وعدہ ہے، اس لیے بینک زیادہ قیمت بھی لگا سکتا ہے اور اس کو سابقہ عقدِ سلم کے ساتھ معلق بھی کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ استصناع:

عقدِ استصناع کا ثبوت بھی احادیث سے ملتا ہے، چنانچہ آپ ﷺ کے بارے میں آیا ہے کہ آپ نے انگوٹھی بنوانے کا حکم دیا تھا۔[2] اور ایک جگہ یہ بھی آیا ہے کہ آپ ﷺ نے منبر آرڈر پر بنوایا تھا۔[3] لہذا فقہاء حنفیہ کے ہاں یہ عقد درست ہے، اور اس کی ایک بنیادی دلیل ''تعامل'' بھی ہے کہ آپ ﷺ کے دور سے لے کر آج تک لوگ اپنی ضروریات کی چیزیں آرڈر پر بنواتے آئے ہیں اور کسی سے اس کی ممانعت منقول نہیں ہے۔

اسلامی بینک چونکہ عموماً ''استصناع موازی'' پر عمل کرتے ہیں، اس لیے ان پر لازم ہے کہ استصناع موازی کے دونوں عقود کو الگ الگ رکھے اور بیع عینہ (buy back) سے اجتناب کرے۔ ان دونوں باتوں کی وضاحت بیع سلم کے تحت ہو چکی ہے۔

اس کے علاوہ عقدِ استصناع میں یہ ضروری نہیں ہے کہ بینک خود ہی گھر وغیرہ تعمیر کرے، بلکہ بینک، اپنے کلائنٹ کے علاوہ کسی ٹھیکہ دار کی خدمات بھی حاصل کر سکتا ہے۔

۷۔ حوالہ:

عقدِ حوالہ کا ثبوت کئی احادیث سے ملتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

مطل الغني ظلم ومن أتبع على ملي فليتبع.[4]

مالدار کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے، جب تم میں سے کسی کو (اپنا حق وصول کرنے کے لیے) کسی مالدار

---

[1] سنن دار قطني، حديث نمبر: ۲۱۱

[2] صحيح البخاري، حديث نمبر: ۵۸۷۶

[3] حواله بالا، حديث نمبر: ۲۵۶۹

[4] صحيح البخاري، حديث نمبر: ۲۲۸۸

شخص کے پیچھے لگادیا جائے تو اس کے پیچھے لگ جانا چاہیے۔

بلکہ ایک اور حدیث میں اس سے بھی زیادہ وضاحت آئی ہے جس کے الفاظ یوں ہیں:

ومن أحيل على مليء فليتبع.(۱)

جب تم میں سے کسی کو مالدار شخص کی حوالگی میں دیا جائے تو اسے چاہیے کہ اس کو قبول کرے۔

ان احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص پر کسی دوسرے کا قرض ہو اور اصل مقروض اپنے قرض خواہ کو کسی تیسرے شخص (محال علیہ) کے سپرد کردے کہ ثالث اس کا قرضہ ادا کرے گا تو قرض خواہ کو خواہ مخواہ کی ضد کے بجائے اس حوالہ کو قبول کرلینا چاہیے۔ یہ عقدِ حوالہ ہے۔

''سفتجہ'' بھی حوالہ کے قریب قریب عقد ہے، البتہ سفتجہ میں کسی کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ رقم بھیجی جاتی ہے۔ اس کے جواز وعدمِ جواز میں فقہاء کا اختلاف ہے، لیکن معاصر فقہاء نے اس کی گنجائش دی ہے، کیونکہ موجودہ دور میں ایک جگہ سے دوسری جگہ رقم بھیجنے میں کافی محنت اور خرچ اُٹھانا پڑتا ہے، اس لیے اُس محنت پر اجرت اور نفع لینا جائز ہے۔(۲) اس کی کچھ تفصیل پہلے باب میں ''بیع صرف'' کے عنوان کے تحت بیان کردی گئی ہے۔

لہٰذا اگر اسلامی بینک کسی اکاؤنٹ ہولڈر کی رقم کسی دوسرے شخص کے اکاؤنٹ میں یا کسی دوسرے بینک میں منتقل کرتا ہے تو اس پر فیس وصول کرسکتا ہے۔ اسی طرح اگر اسلامی بینک ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف رقم بھیجنے کی خدمت سرانجام دیتا ہے تو اس پر بھی فیس وصول کرسکتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم نکتہ یہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ ایسی صورت میں دو عقود وجود میں آتے ہیں: ایک قرض کا عقد کہ بینک ایک شخص سے قرض لے کر دوسری جگہ اس کے نائب کو دیتا ہے۔ دوسرا اجارہ کا عقد کہ اسلامی بینک اجیر ومزدور کی حیثیت سے رقوم کی ترسیل کے لیے خدمت کرتا ہے، جس پر معاوضہ وصول کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ آج کل ایزی پیسہ وغیرہ پر بھی علماء نے انہی دونوں عقود کی بنیاد پر فیس لینے کی اجازت دی ہے۔

خاتمہ: نتائج وسفارشات

سابقہ تفصیل کو سامنے رکھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا جانا آسان ہو جاتا ہے کہ معاصر اسلامی بینکاری جن بنیادوں پر قائم ہے اور تمویلی سرگرمیوں کے لیے جو طریقے اختیار کررہی ہے وہ تین قسم کے ہیں:

(۱) المعجم الاوسط، حدیث نمبر: ۸۵۸۲

(۲) المعايير الشرعية ص: ۱۷۲، رقم المعيار: ۱۶

ا۔ نفع ونقصان کی بنیاد پر کیے جانے والے معاملات۔ ان میں شرکت ومضاربت کی بنیادیں آتی ہیں۔

۲۔ اشیاء اور اعیان کی خرید وفروخت کر کے نفع کمانا۔ اس میں مرابحہ، سلم اور استصناع کے طریقے شامل ہیں۔

۳۔ خدمات (services) اور منفعت فراہم کر کے نفع کمانا۔ اس میں اجارہ اور حوالہ کے معاملات آتے ہیں۔

ان کے بارے میں ہمارے تجزیہ کا خلاصہ یہ ہے کہ معاصر اسلامی بینکاری میں جن بنیادوں پر تمویلی سرگرمیاں کی جاتی ہیں، وہ بنیادیں اصلاً قرآن اور نبوی تعلیمات سے ثابت ومستنبط ہیں۔ ان بنیادوں کے لیے فقہاء کرام نے کچھ اختلاف کے ساتھ قرآن وحدیث کی روشنی میں کچھ اصول اور شرائط مقرر کی ہیں، جن کا مختصر تذکرہ بھی ہم نے کر دیا۔ اگر انہی بنیادوں کو لیا جائے اور ان کی آبیاری ان کے شرعی اصول وشرائط سے ہو تو ان کی بنیاد پر جو اسلامی بینک وجود میں آتا ہے اور تمویلی سرگرمیاں سرانجام دیتا ہے شرعی نقطہ نظر سے اس کی گنجائش وجواز معلوم ہوتا ہے۔ ان بنیادوں پر درست عمل کرنے کی صورت میں جہاں اسلامی بینکاری کی ترقی ممکن ہے، وہاں یہ اسلامی نظامِ معیشت کے قیام کے لیے ایک سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔

آخر میں ہم چند توجہ طلب پہلو اور سفارشات کا تذکرہ کریں گے، کیونکہ ان کے بغیر شرعی بنیادوں پر اسلامی بینکاری کے قیام میں خلل آسکتا ہے:

- ❖ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلامی بینکنگ میں بنیادی اور اہم چیز "شریعہ گورننس" ہے، جس کے ذمہ دو کام ہونے چاہییں: پہلا کام "فقہی کردار" ہے کہ بینک کے معاملات میں غور وفکر کر کے اُن کے بارے میں شرعی رائے دے۔ دوسرا کام "نگرانی" ہے کہ اپنے جاری کردہ فتوی یا شرعی رائے کی نگرانی کر کے اس کو عملا نافذ بھی کرے۔
- ❖ دوسری بات یہ ہے کہ عوامی سطح پر شرعی آگہی، اس شعبے کی طرف لوگوں کے رجحان بڑھانے اور ان کے ذہنوں میں موجود اشکالات کو دور کرنے اور مینجمنٹ، اکاؤنٹنگ، اور دیگر شعبوں کے حوالے سے آگاہی ضروری ہے۔ اس حوالے سے تحقیقی، علمی وفقہی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ لہذا تعلیمی شعبوں کو اس جانب متوجہ کرنا چاہیے کہ اس پر کام کرے۔
- ❖ محض علمی وتحقیقی کام کر کے اسلامی بینکوں کو آزاد نہیں چھوڑنا چاہیے، بلکہ اسلامی بینکوں کو اپنا عملی رخ بھی مضبوط کرنا چاہیے، کیونکہ عموماً اسلامی بینکوں میں یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ان کا عملی رُخ کمزور ہے۔ سٹاف کو شرعی عقد اور اصول وشرائط کا مکمل علم نہیں ہوتا، جس کی وجہ سے عقد میں شرعی خامی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے

سٹاف کو شرعی عقود سے متعلق مکمل آگہی اور واقف کرانا نہایت ضروری ہے۔اس حوالے سے حکومت کو بھی چاہیے کہ اسلامی بینکوں کی سرپرستی اور پشت پناہی کرے۔

- اسلامی بینکنگ میں چونکہ متبادل طور پر مشارکہ، مضاربہ اور مرابحہ وغیرہ کے کنٹریکٹ ہوتے ہیں،اس لیے ان میں ٹیکسز، بالخصوص سیل ٹیکسز کے مسائل کھڑے ہوں گے۔اس سلسلے میں اسٹیٹ بینک اور ریگولراتھارٹی کی یہ ذمہ داری ہے کہ ایسی منصفانہ قانون سازی کرے جس کی وجہ سے صارفین اور بینکوں پر غیر ضروری ٹیکسوں کا بوجھ نہ پڑے۔

بینک اکاؤنٹس: تعارف وشرعی حیثیت

(Bank Accounts)

یہ مضمون میگزین ''شریعہ اینڈ بزنس'' (۲۰۱۷ء) میں شائع ہوا ہے۔اس مضمون کے بنیادی عنوانات مندرجہ ذیل ہیں:

تمہید

- اکاؤنٹس کی اقتصادی اہمیت
- اکاؤنٹس کی اقسام
- فقہی حیثیت

تمہید

موجودہ دور میں لوگ مختلف اغراض ومقاصد کے تحت بینکوں کے پاس اپنی رقم رکھتے ہیں۔اس کے لیے پہلے بینک کے پاس اکاؤنٹ بنانا پڑتا ہے جو مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ان کو عربی میں ''الودائع المصرفية'' اور انگریزی میں ''bank accounts'' کہتے ہیں۔بینک اکاؤنٹس ایسی چیز ہے کہ لاتعداد لوگ اس کے محتاج نظر آتے ہیں اور انہیں اس کی ضرورت پڑتی ہے۔اس سے کئی شرعی احکام متعلق ہیں،اس لیے اس مضمون میں ہم بینک اکاؤنٹس کی چند اہم اور بنیادی باتوں کا تذکرہ کریں گے۔

اکاؤنٹس کی اقتصادی اہمیت

۱۔یہ ایک حقیقت ہے کہ مالی معاملات میں رقوم کی ادائیگی کے طریقوں کا اضافہ ایک مفید اور احسن بات سمجھی جاتی ہے۔بینک میں رقم رکھ کر بذریعہ چیک کسی کو رقم ادا کرنا بھی ایک طریقہ اور اچھی سہولت ہے،بلکہ عصر حاضر میں بینک اکاؤنٹس کی رقوم کو بذریعہ انٹرنیٹ بینک کسی بھی دوسرے شخص کو بھیجی جاسکتی ہے۔

۲۔اکاؤنٹس میں جو رقوم رکھی جاتی ہیں وہ اگر اکاونٹ ہولڈر کے پاس ہوتی تو ان رقوم کو منافع بخش کاروبار یا پروجیکٹ میں لگانا آسان نہ ہوتا،کیونکہ بعض لوگوں کے پاس رقم ہی کم ہوتی ہے اور بعض لوگ کاروبار اور مالی معاملات سے اچھی طرح واقف نہیں ہوتے کہ خود معاملات کرسکے،اس لیے ایسے لوگوں کی رقمیں بینک جمع کر کے کسی نفع بخش جگہ میں

انویسٹ کر سکتا ہے۔

۳۔ عصرِ حاضر میں لوٹ مار اور چوری، ڈکیتی کی وارداتوں کی کثرت کی وجہ سے خطیر سرمایہ اپنے پاس محفوظ رکھنا یا ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا تقریباً ناممکن ہو چکا ہے، اس کا بہترین حل یہی ہے کہ اپنی رقمیں بینک کے پاس بطورِ حفاظت رکھی جائیں۔

اکاؤنٹ کی اقسام

عموماً بینک میں چار قسم کے اکاؤنٹس ہوتے ہیں:

۱۔ کرنٹ اکاؤنٹ:

اس کو عربی میں ''الودیعة الجاریة'' اور انگریزی میں ''current account'' کہتے ہیں۔ یہ ایسا اکاؤنٹ ہے جس میں رقم رکھنے والے کو اختیار ہوتا ہے کہ جب چاہے، جتنی مقدار میں چاہے اپنے اکاؤنٹ سے رقم نکال سکتا ہے اور بینک پر فوراً ادائیگی لازم ہوتی ہے۔ اس قسم کے اکاؤنٹ ہولڈر کو بینک کی طرف سے کسی قسم کا نفع یا سود نہیں ملتا، بلکہ اس کے برعکس بینک، اکاؤنٹ ہولڈر سے فیس وصول کرتا ہے۔ اس اکاؤنٹ میں تمام لوگوں کی رقمیں مخلوط ہوتی ہیں اور بینک کو ایسی رقمیں اپنے استعمال میں لانے کی مکمل اجازت ہوتی ہے، البتہ بینک تمام رقم انوسٹ نہیں کرتا، بلکہ کچھ رقم اپنے پاس رکھتا ہے، تاکہ بوقتِ طلب اکاؤنٹ ہولڈر کو اداء کی جاسکے۔

۲۔ فیکسڈ ڈپازٹ:

اس قسم کو عربی میں ''الودیعة الثابتة'' اور انگریزی میں ''fixed deposit'' کہتے ہیں۔ اس قسم کے اکاؤنٹ میں رقم رکھنے والوں کو یہ اختیار حاصل نہیں ہوتا کہ وہ جب چاہے اپنے اکاؤنٹ سے رقم نکال سکے، بلکہ رقم نکالنے کے لیے ایک مدت متعین ہوتی ہے جو پندرہ دن سے لے کر سال تک ہو سکتی ہے، جس سے پہلے اکاؤنٹ ہولڈر رقم نہیں نکال سکتا، اور بینک کی طرف سے اکاؤنٹ ہولڈر کو ایک خاص تناسب سے نفع (یا سود) بھی ملتا ہے۔

۳۔ سیونگ اکاؤنٹ:

اکاؤنٹ کی اس قسم کو عربی میں ''ودیعة التوفیر'' اور انگریزی میں ''saving account'' کہتے ہیں۔ یہ قسم اس اعتبار سے کرنٹ اکاؤنٹ کی طرح ہے کہ اکاؤنٹ ہولڈر کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ جب چاہے اپنے اکاؤنٹ سے رقم نکال سکتا ہے، البتہ ساری رقم بیک وقت نہیں نکال سکتا، بلکہ اس کی تحدید ہوتی ہے کہ فی یوم ایک خاص مقدار کی رقم ہی نکال سکتا ہے یا اکاؤنٹ ہولڈر پر یہ لازم کیا جاتا ہے کہ کچھ مدت پہلے ہی بینک کو نوٹس دے دے کہ میں اتنی رقم نکالنا چاہتا

ہوں، جبکہ دوسری طرف یہ قسم فکسڈ ڈپازٹ کی طرح ہے کہ اکاؤنٹ ہولڈر کو خاص تناسب سے نفع یا سود ملتا ہے۔

۴۔لاکرز:

بینک کے اندر کچھ لاکرز بنے ہوتے ہیں، جن میں لوگ سونا، چاندی، اہم ڈاکومنٹس وغیرہ رکھتے ہیں اور اس کے بدلے بینک کو باقاعدہ فیس اور کرایہ دیتے ہیں، ان کو عربی میں "الخزانات المقفولة" اور انگریزی میں "lockers" کہتے ہیں۔ان میں رکھی ہوئی اشیاء کے ساتھ بینک اور اس کے عملہ کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، بلکہ عموماً نہیں یہ علم ہی نہیں ہوتا کہ لاکرز میں کس نے کیا رکھا ہے۔

فقہی حیثیت

جہاں تک لاکرز کی بات ہے تو اس کی فقہی حیثیت بالکل واضح ہے کہ اس میں لاکرز کو اجارہ (کرایہ) پر لے کر اُسے استعمال میں لایا جاتا ہے، اس کے جائز ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے۔بقیہ تینوں اکاؤنٹس کے سلسلے میں کنوینشنل اور غیر سودی بینکوں میں رکھی ہوئی رقم کی فقہی حیثیت الگ الگ ہے، ذیل میں دونوں سے متعلق تفصیل بیان کی گئی ہے:

ا۔کنوینشنل بینکوں کے اکاؤنٹس:

کنوینشنل بینکوں کے اکاؤنٹس میں جو رقم رکھی جاتی ہے، اس کی فقہی حیثیت میں علماء کی دو آراء سامنے آئی ہیں:

۱- اکثر معاصر علماء کی رائے یہ ہے کہ کنوینشنل بینکوں کے تینوں قسم کے اکاؤنٹس میں رکھی ہوئی رقم کی فقہی حیثیت قرض کی ہے، کیونکہ قرض کے دو بنیادی عنصر ہیں جو یہاں پائے جاتے ہیں:

الف- ایک یہ کہ قرض لینے والے (بینک) کو یہ اجازت حاصل ہو کہ وہ اس رقم کو اپنے استعمال میں لاسکے، یہ عنصر یہاں موجود ہے۔

ب- دوسرا یہ کہ قرض لینے والا قرض لی ہوئی چیز کو واپس کرنے کا ذمہ دار وضامن ہو۔یہ عنصر بھی یہاں پایا جاتا ہے کہ بینک ایسی رقوم کو واپس کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

اگرچہ ان اکاؤنٹس کو "ودیعت" کا نام دیا جاتا ہے، لیکن چونکہ اصل مقصود ودیعت وامانت نہیں ہے، اس لیے محض ظاہری الفاظ کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، کیونکہ یہ ایک فقہی اصول ہے کہ عقود ومعاملات میں ظاہری الفاظ کے بجائے معانی ومقاصد کا اعتبار ہوتا ہے،[1] لہذا ایسی رقم کی فقہی حیثیت قرض کی ہے اور اس پر کسی بھی قسم کا نفع وصول کرنا سود کے

---

(1) مجلة الأحكام العدلية (المادّة: ٣)

زمرے میں آئے گا اور حرام ہو گا۔[1]

۲۔ بعض علماء کرام کی رائے یہ ہے کہ چونکہ سیونگ اکاؤنٹس اور فکسڈ ڈپازٹ کے اکاؤنٹ ہولڈر کو ہر وقت اپنی رقم نکالنے کا اختیار حاصل نہیں ہوتا، اس لیے یہ رقم امانت نہیں ہو سکتی، بلکہ اس کی فقہی حیثیت دین کی ہے، جبکہ کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھی ہوئی رقم کی فقہی حیثیت قرض کی نہیں، بلکہ امانت کی ہے، کیونکہ ایک تو اس میں اکاؤنٹ ہولڈر کو ہر وقت رقم نکالنے کا اختیار حاصل ہوتا ہے اور ایسا صرف امانت میں ہوتا ہے۔ دوسرے اس لیے کہ اس اکاؤنٹ میں رقم رکھنے والے کی نیت قرض کی نہیں ہوتی، بلکہ اصل مقصد رقم کو بطورِ امانت و حفاظت رکھنا ہوتا ہے۔ تیسرے اس لیے کہ بینک ایسی رقم کی حفاظت پر باقاعدہ فیس وصول کرتا ہے اور ایسا صرف امانت میں ہو سکتا ہے، قرض میں نہیں۔[2]

لیکن یہ رائے کمزور معلوم ہوتی ہے، کیونکہ قرض خواہ بھی جب چاہے اپنی رقم واپس وصول کر سکتا ہے۔ اور اکاؤنٹ میں رقم رکھنے والوں کا مقصد اگر حفاظت ہی ہے تو بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ رقم قرض نہیں ہے، کیونکہ دوسرے کو اس نیت سے قرض دینا بھی درست ہے کہ میری رقم محفوظ رہے۔ جہاں تک فیس وصول کرنے کی بات ہے تو قرض کے بنیادی عنصر کے پائے جانے کے بعد محض ادارتی کاروائی کی فیس وصول کرنے سے یہ رقم امانت نہیں بن جاتی۔

إذا كانت الوديعة مبلغا من النقود أو أي شيء آخر مما يهلك بالاستعمال، وكان المودع عنده مأذونا في استعماله اعتبر العقد قرضا.[3]

جب نقود یا کسی ایسی چیز کو ودیعت میں رکھا جائے جو استعمال سے ختم ہوتی ہے اور جس کے پاس رکھی جائے اسے استعمال کی اجازت ہو تو یہ عقد قرض سمجھا جائے گا۔

شرعی حکم

سودی بینکوں کے سیونگ اکاؤنٹ اور فکسڈ ڈپازٹ میں رقم رکھنے کی شریعت میں اجازت نہیں ہے، کیونکہ اس میں سود ملتا ہے، البتہ کرنٹ اکاؤنٹ میں بطورِ حفاظت رقم رکھنا جائز ہے، البتہ یہاں تین باتیں ذہن میں رکھنا ضروری ہیں:

پہلی بات:

لاکرز کی فقہی حیثیت امانت کی ہے، اس لیے اگر بینک کی غفلت اور کوتاہی کے بغیر لاکرز میں موجود اشیاء چوری

(۱) بحوث في قضايا فقهية معاصرة ۲/ ۲۳۸

(۲) مجلة مجمع الفقه الإسلامي ۲/ ۱۷۹۰۳

(۳) المذكرات الايضاحية للقانون المدني الاردني ۲/ ۶۰۷ (المادة: ۸۲۶)

ہو جائے یا نہیں کوئی نقصان پہنچ جائے تو بینک ذمہ دار نہ ہوگا، لیکن بقیہ تینوں اکاؤنٹس میں موجود رقم کی حیثیت قرض کی ہے، اس لیے بینک اس رقم کا بہر حال ذمہ دار ہوگا۔

دوسری بات:

کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم رکھنے کی اجازت پر بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ اگرچہ بینک اس رقم پر سود نہیں دیتا، لیکن بینک، کرنٹ اکاؤنٹ کی رقوم کو اپنے سودی معاملات کے لیے استعمال کرتا ہے، لہذا کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم رکھنے والا بینک کے گناہ (سود) میں معاون بن رہا ہے جو کہ جائز نہیں ہونا چاہیے۔

لیکن یہ اشکال اس طرح دور کیا جاسکتا ہے کہ:

۱۔ عموماً بینک مکمل رقم کو انوسٹ نہیں کرتا اور نہ ہی آگے سود پر دیتا ہے، بلکہ کچھ رقم بطورِ ''سیولت'' (liquidity) رکھتا ہے تاکہ بوقتِ طلب اکاؤنٹ ہولڈر کی ڈیمانڈ پوری کی جاسکے، لہذا یہ کہنا مشکل ہے کہ کس شخص کی رقم بینک نے سودی معاملے میں استعمال کی ہے اور کس کی رقم بطورِ سیولت رکھی ہے اور نہ ہی کسی متعین شخص کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسی کی رقم سودی معاملے میں استعمال ہوئی ہے۔

۲۔ بینک کے انوسٹمنٹ کے کئی طریقے ہیں اور یہ تمام طریقے ناجائز نہیں ہیں، بلکہ کچھ جائز بھی ہیں، اس سے مزید یہ بات پختہ ہو جاتی ہے کہ کسی شخص کو متعین نہیں کیا جاسکتا کہ اسی کی رقم ناجائز کام میں لگی ہے، ممکن ہے اس کی رقم جائز ٹرانزیکشن میں استعمال ہوئی ہو۔

۳۔ بلا سود کسی کو قرض دینا جائز ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ معاملات میں نقود متعین کرنے سے بھی متعین نہیں ہوتے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ قرض وصول کرنے کے بعد مقروض ہی اس کا مالک بن جاتا ہے، قرض خواہ جب تک قرض واپس وصول نہ کرے، وہ اس رقم کا مالک نہیں بنتا۔ لہذا ان تمام باتوں کے مجموعہ سے یہ معلوم ہو گیا کہ اگر بینک کرنٹ اکاؤنٹ کی رقم کو اپنے استعمال میں لاتا ہے تو وہ اس کی اپنی رقم ہے، اس کے ساتھ اکاؤنٹ ہولڈر کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

۴۔ جہاں تک معصیت اور گناہ کے کام میں تعاون کی بات ہے تو اس سلسلے میں یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ ہر وہ عمل جو معصیت و گناہ کا سبب بن جائے اُسے ''إعانة على المعصية'' نہیں کہا جاتا اور نہ ہی اس طرح کا ہر عمل ناجائز ہے، بلکہ اس میں کچھ تفصیل ہے جو حضرت مفتی محمد شفیعؒ نے ''جواہر الفقہ'' میں تحریر فرمائی ہے۔ یہاں اس کا خلاصہ سمجھنے اور یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ کرنٹ اکاؤنٹ کی رقم کس طرح کی اعانت میں داخل ہے:

جو ''إعانة على المعصية'' یا بالفاظ دیگر گناہ میں تعاون حرام ہے اس سے مراد ایسا تعاون ہے کہ جس میں تعاون کرنے والا باقاعدہ حقیقت میں یا حکماً معصیت کا ارادہ کرے۔ ''حقیقت'' سے مراد یہ ہے کہ وہ زبان سے یا دل میں معصیت کا ارادہ کرے، جبکہ ''حکماً'' ارادے کا مطلب یہ ہے کہ تعاون کرنے والا جو کام یا چیز فراہم کر رہا ہے وہ گناہ کے علاوہ کسی اور چیز میں استعمال ہی نہ ہو۔ کرنٹ اکاؤنٹ کی رقم ان دونوں سے خارج ہے، کیونکہ اس میں انسان کی نہ حقیقت میں ایسی نیت ہوتی ہے نہ ہی رقم کوئی ایسی چیز ہے جو جائز کام میں استعمال نہ ہو سکے۔

اگر حقیقت میں یا حکما معصیت کا ارادہ نہ ہو، لیکن اس کے باوجود انسان کا عمل یا فراہم کردہ چیز گناہ کا سبب بنے تو اُسے ''تسبب'' کہتے ہیں، جس کی دو قسمیں ہے:

الف۔سببِ قریب: کوئی چیز اپنی حالتِ موجودہ میں گناہ کے کام میں استعمال ہو سکے، اس میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کی ضرورت نہ ہو۔

ب۔سببِ بعید: تغیر و تبدل کے بعد ہی اُس چیز کو گناہ کے کام میں استعمال کیا جا سکے، اس کے بغیر اس چیز کو گناہ میں کام میں استعمال نہ کیا جا سکتا ہو۔

سببِ بعید مکروہ تنزیہی ہے، لیکن کرنٹ اکاؤنٹ کی رقم سببِ قریب میں داخل ہے، کیونکہ اُسے حرام کام میں استعمال کرنے کے لیے تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ سببِ قریب کا کیا حکم ہے؟ سببِ قریب کی بھی دو قسمیں ہیں:

الف۔جالب و محرک: ایسا سببِ قریب جو کہ محرک و باعث ہو، یعنی اگر یہ سبب نہ ہوتا تو گناہ کرنے والے شخص کی طرف سے کام ہی وجود میں نہ آتا۔

ب۔غیر جالب و غیر محرک: دوسری قسم ایسے سببِ قریب کی ہے جو محرک و باعث نہ ہو، یعنی گناہ کا کام اس سبب پر موقوف نہ ہو، اگر وہ سبب نہ ہوتا تو بھی گناہ کا کام وجود میں آ سکتا ہو۔

سببِ قریب کی پہلی قسم تو حرام ہے، لیکن کرنٹ اکاؤنٹ کی رقم اس قسم میں داخل نہیں ہے، کیونکہ بینک کا سودی معاملہ کرنٹ اکاؤنٹ ہولڈر کی رقم پر موقوف نہیں ہے، لہذا یہ رقم سببِ قریب کی دوسری قسم (غیر محرک) میں داخل ہے۔

سببِ قریب کی دوسری قسم کا حکم یہ ہے کہ اگر سبب بننے والے شخص کی نیت ہی معصیت کی ہو تو یہ حرام ہے، اگر یہ نیت نہ ہو، لیکن اُسے علم ہو کہ میری یہ چیز آگے حرام اور گناہ کا سبب بن رہی ہے تو یہ مکروہ ہے، اگر علم ہی نہ ہو تو

مکروہ بھی نہیں ہے۔ کرنٹ اکاؤنٹ کی رقم اس قسم میں داخل ہے، لیکن اکاؤنٹ ہولڈر کی نیت یہ نہیں ہوتی کہ وہ گناہ میں معاون بنے، بلکہ اُسے علم ہی نہیں ہوتا کہ اُسی کی رقم آگے حرام ٹرانزیکشن میں استعمال ہوگی یا نہیں، اس لیے کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم رکھنا مکروہ بھی نہیں ہے، ورا گراسے علم ہے تو زیادہ سے زیادہ مکروہ ہے۔[1]

تیسری بات:

اگرچہ سودی بینکوں کے کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم رکھنے کی گنجائش ہے، لیکن غیر سودی بینکوں کی موجودگی میں سودی بینکوں کے کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم نہیں رکھنی چاہیے، کیونکہ اس میں اطمینان بھی ہے اور دوسرے اس لیے بھی کہ سودی بینک اپنے کرنٹ اکاؤنٹ ہولڈر کو کچھ تحائف اور سہولیات دیتا ہے جو قرض پر نفع کے زمرے میں آسکتا ہے جو کہ سود ہے، البتہ سہولیات اور تحائف اگر اس طرح مشروط اور معروف نہ ہوں کہ اکاؤنٹ ہولڈر قانونی طور پر اس کا مطالبہ کرسکے، بلکہ اس کے دینے اور نہ دینے کا اختیار بینک کو حاصل ہو تو ایسی سہولت یا تحفہ لینے کی گنجائش ہے۔[2]

۲۔ غیر سودی بینکوں کے اکاؤنٹس:

غیر سودی بینکوں کے لاکرز اور کرنٹ اکاؤنٹ کی فقہی حیثیت وہی ہے جو کنوینشنل بینکوں کے لاکرز اور کرنٹ اکاؤنٹ کی ہے، لاکرز کی حیثیت اجارہ اور کرنٹ اکاؤنٹ کی حیثیت قرض کی ہے۔ البتہ غیر سودی بینکوں کے سیونگ اکاؤنٹس اور فکسڈ ڈپازٹ کی فقہی حیثیت کنوینشنل بینکوں سے الگ ہے۔ غیر سودی بینکوں کے سیونگ اکاؤنٹ اور فکسڈ ڈپازٹ کے لیے مضاربہ یا مشارکہ کی بنیاد پر رقم لی جاتی ہے اور اکاؤنٹ ہولڈر کو متعین سود کے بجائے فیصدی تناسب سے ایک خاص حصہ بطورِ نفع ملتا ہے۔ یہ رقم بینک کے پاس شرکت یا مضاربت کا راس المال ہے، قرض نہیں، اور اس کا حکم امانت والا ہے، لہٰذا اگر بینک کی غفلت و کوتاہی کے بغیر یہ رقم ضائع ہوجائے تو بینک ذمہ دار نہیں ہوگا۔

اس موضوع کی مزید تفصیلات کے لیے استاذ محترم حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کا مقالہ "أحكام الودائع المصرفية" کا مطالعہ مفید رہے گا، جو حضرت کی کتاب "بحوث في قضايا فقهية معاصرة" کی دوسری جلد میں موجود ہے۔

---

[1] بحوث في قضايا فقهية معاصرة ۲۲۸/۲

[2] حواله بالا . ۲/۲٤

چیک کا تعارفی و فقہی جائزہ

(Cheque)

یہ مقالہ سہ ماہی مجلہ ''تعلیم و تحقیق'' (جلد ۱، شمارہ ۲-۳/اپریل، ستمبر ۲۰۱۹ء) میں شائع ہو چکا ہے۔ اس مقالہ کے بنیادی عنوانات حسب ذیل ہیں:

- چیک کا تعارف
- چیک کے فریق
- چیک کی اقسام
- چیک اور بل آف ایکسچینج میں فرق
- چیک کی شکل
- چیک کی فقہی حیثیت
- چیک پر قبضہ کی تحقیق

چیک کا تعارف

جب کوئی شخص بینک میں اپنا اکاؤنٹ اور کھاتہ کھولتا ہے تو بینک اس شخص کو ایک ''چیک بک'' دیتا ہے، جس میں ایک ہی شکل کے کئی کاغذات اور فارم ہوتے ہیں۔ جب بھی اس شخص کو بذریعہ چیک اپنے اکاؤنٹ سے رقم نکالنی مقصود ہوتی ہے تو وہ اس میں سے ایک کاغذ (چیک) پر رقم، تاریخ لکھ کر اور دستخط کر کے بینک میں موجود اپنے اکاؤنٹ سے رقم نکال لیتا ہے۔ اس صورتحال سے چیک کی تعریف یہ سامنے آتی ہے کہ:

''چیک ایک ایسا دستخط شدہ دستاویز ہوتا ہے جو کھاتہ دار (اکاؤنٹ ہولڈر) جاری کرتا ہے، تاکہ اس کے ذریعے بینک میں موجود اپنے اکاؤنٹ سے ایک مخصوص مقدار کی رقم نکال سکے، خواہ وہ رقم خود وصول کرے، یا بنک کو حکم دے کہ کسی دوسرے شخص کو حوالے کر دے یا کسی دوسرے شخص کے اکاؤنٹ میں منتقل کر دے۔''

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم چیک کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

هو ورق يُصدره من له حساب في بنك، فيُريد أن يسحب به مبلغا من رصيده عند البنك، إما ليأخذ ذلك المبلغ بنفسه، أو ليأخذ منه شخص آخر مكتوب عليه

اسمه، أو ليأخذه من ذلك الحساب من يعرضه على البنك بدون تسميته. وفي هذه الحالة الأخيرة يسمّى الشيك "الشيك لحامله" (Bearer Cheque).[1]

"چیک ایسا دستاویز ہے جو کھاتہ دار جاری کرتا ہے، تاکہ اس کے ذریعے بینک میں موجود اپنے اکاؤنٹ سے رقم نکال سکے، یا تو وہ خود رقم وصول کرے، یا جس شخص کا نام چیک پر لکھا ہوتا ہے وہ وصول کرے، یا جو شخص بھی بینک کو چیک پیش کرے وہی رقم وصول کرے، اور اس آخری صورت میں چیک کو "بیئرر چیک" کہتے ہیں۔"

کیمبرج ڈکشنری میں چیک کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

A printed form, used instead of money, to make payments from your bank account.[2]

"چیک ایک پرنٹ شدہ فارم ہے جو زر کی جگہ استعمال ہوتا ہے، اس کے ذریعے اپنے بینک کے اکاؤنٹ سے ادائیگی کی جاتی ہے۔"

معاییر شرعیہ میں چیک کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

الشيك: صك يحرر وفقا لشكل معين، يتضمن أمرا صادرا من شخص (يسمى الساحب) إلى شخص آخر (يسمى المسحوب عليه) بدفع مبلغ معين من النقود إلى شخص ثالث (يسمى المستفيد) بمجرد الاطلاع.[3]

"چیک ایک ایسا وثیقہ ہے جو ایک خاص شکل میں لکھا جاتا ہے، جس میں ساحب (کھاتہ دار) کی طرف سے بینک (مسحوب علیہ) کو یہ حکم ہوتا ہے وہ تیسرے شخص (مستفید) کو محض اطلاع اور چیک دکھانے پر ایک خاص رقم ادا کر دے۔"

چیک کے فریق

چیک کے معاملہ میں عموماً تین فریق ہوتے ہیں:

---

[1] فقه البيوع ٤٤١/١

[2] Cambridge Advanced Learner's Dictionary - 3rd Edition

[3] المعايير الشرعية، رقم المعيار: ١٦، ص: ١٧٨

الف- چیک پر دستخط کرکے اس کو جاری کرنے والا، جس کو انگریزی میں ''drawer''اور عربی میں ''ساحب''یا''مرتب'' کہتے ہیں۔

ب- وہ فریق جس کو چیک پیش کیا جاتا ہے، جو عموماً بینک ہی ہوتا ہے، اس کو انگریزی میں'' payer '' اور عربی میں''مسحوب عليه''یا''مرتب إليه'' کہتے ہیں۔

ج- وہ شخص جس کے لیے چیک جاری کیا جاتا ہے تاکہ وہ رقم وصول کرے، اس کو انگریزی میں''payee'' اور عربی میں''مستفيد'' کہتے ہیں۔

کبھی اس میں دو ہی فریق ہوتے ہیں، ایک چیک جاری کرنے والا اور دوسرا بینک، اس صورت میں چونکہ چیک جاری کرنے والا خود ہی رقم وصول کرتا ہے، اس لیے مستفید وہ خود ہوتا ہے۔

چیک کی اقسام

چیک کی کئی اقسام ہیں، اُن میں سے چند مشہور درج ذیل ہیں:

ا۔ بیئرر چیک (Bearer Cheque)

اس کو عربی میں ''الشيك لحامله'' کہتے ہیں۔ یہ چیک کی ایک سادہ قسم ہے، جو شخص بھی یہ چیک بینک کو پیش کرتا ہے، بینک اس کو ادائیگی کر دیتا ہے، خواہ چیک جاری کرنے والے نے حامل چیک کے لیے ہی چیک جاری کیا ہو یا کسی دوسرے شخص کے لیے جاری کیا ہو، بینک اس قسم کی ادائیگی کا ذمہ دار نہیں ہوتا ہے۔

۲۔ اوپن چیک (Open Cheque)

اُوپن چیک کو کیش چیک(cash cheque) بھی کہا جاتا ہے۔ یہ چیک کی سب سے غیر محفوظ قسم ہوتی ہے، کیونکہ اس میں کوئی بھی شخص بآسانی بینک سے رقم نکلوا سکتا ہے۔ اگر کسی شخص سے یہ چیک گم ہو جائے تو یہ اُس شخص کے حق میں بہت نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے کہ کوئی بھی فرد اُس چیک کے ذریعے پیسے نکلوا سکتا ہے۔

۳۔ آرڈر چیک(Order Cheque)

اس کو عربی میں ''الشيك الموقع بالاسم'' کہہ سکتے ہیں، جس پر وصول کنندہ کا نام ہوتا ہے، اس کے علاوہ کوئی اور شخص اس چیک کے ذریعے رقم نہیں نکال سکتا۔ جب اس قسم کا چیک بینک کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو بینک ضروری تصدیق و توثیق کرکے ہی ادائیگی کرتا ہے، یہ بینک کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

۴۔ کراس چیک (Cross Cheque)

اس کو عربی میں "الشيك المسطر" کہتے ہیں۔ یہ بھی عام چیک کی طرح ہوتا ہے، البتہ اس پر دو خاص قسم کی لکیریں ہوتی ہیں جو اس کو دوسرے چیک سے ممتاز کرتی ہیں۔ اس چیک کے ذریعے عام فرد کو رقم نہیں دی جاتی، بلکہ بینک پر لازم ہوتا ہے کہ اپنے ہی کسی کلائنٹ کے اکاؤنٹ میں یا کسی دوسرے بینک کے اکاؤنٹ میں رقم منتقل کردے، اسی لیے حامل چیک کے لیے اکاؤنٹ ضروری ہے تاکہ اس میں رقم منتقل ہو جائے۔ بالفاظ دیگر یہ چیک صرف اور صرف آپ کے اپنے اکاؤنٹ میں جمع ہو سکتا ہے۔

۵۔ مدتی چیک (Postdated Cheque)

اس کو انگریزی میں "postdated cheque" کہتے ہیں۔ اس قسم کا چیک آئندہ کسی تاریخ کے لیے جاری کیا جاتا ہے، اس تاریخ سے پہلے اس کے ذریعے رقم نہیں نکالی جاسکتی۔

۶۔ رقم کی منتقلی کا چیک (Account Payee Cheque)

اس کو عربی میں "الشيك المقيد في الحساب" کہتے ہیں۔ یہ بھی عام چیک کی طرح ہوتا ہے، البتہ اس کے ذریعے براہ راست کیش نہیں حاصل کی جاسکتی، بلکہ چیک پر جو شرائط لکھی ہوں، ان کے مطابق ادائیگی ہوتی ہے۔ مثلاً چیک جاری کرنے والا چیک پر کوئی ایسا جملہ لکھ دیتا ہے جس سے بینک کو علم ہو جاتا ہے کہ اس کے ذریعے صرف ایک اکاؤنٹ سے دوسرے اکاؤنٹ کی طرف رقم منتقل کیا جانا مقصود ہے، جیسے "payee account" وغیرہ۔

۷۔ سیاحتی چیک (Traveler Cheque)

اس کو عربی میں "الشيك السياحي" کہتے ہیں۔ یہ چیک مختلف قسم کے مالیاتی ادارے اپنے کسی برانچ وغیرہ کے نام جاری کرتے ہیں۔ اس کی قیمت مختلف ہوتی ہے اور اس میں مستفید مسافر ہوتا ہے جو اس چیک کو چیک جاری کرنے والے ادارے کے برانچ یا کسی ایسے ادارے کے سامنے پیش کر کے رقم حاصل کرلیتا ہے جو ادارہ اس قسم کے چیک قبول کرتا ہو۔ اس چیک پر مسافر دو جگہ دستخط کرتا ہے، ایک جگہ جب وہ ادارے سے چیک حاصل کرتا ہے اور دوسری جگہ اس وقت جب وہ چیک پیش کر کے رقم حاصل کرلیتا ہے۔

مثلاً ایک شخص پاکستان سے سعودی عرب جارہا ہے اس کے پاس کچھ رقم ہے، بجائے اس کے کہ یہ رقم اپنی جیب میں رکھ کر لے جائے وہ یہ رقم کسی بینک میں جمع کرا دیتا ہے۔ بینک اسی کے حساب سے ریالوں میں اسے چیک جاری کر دیتا ہے، اس چیک کی بنیاد پر وہ سعودی عرب میں متعلقہ بینک سے مطلوبہ رقم حاصل کر سکتا ہے۔

۸۔ حوالتی چیک (Cheque for bank Transfer)

اس کو عربی میں "شیکات التحویلات المصرفیة" کہتے ہیں۔اس قسم کے چیک بینک جاری کرتا ہے، جس کے لیے چیک جاری کیا جاتا ہے وہ بینک کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ رقم منتقل کرتا ہے، دوسری جگہ میں کبھی خود رقم وصول کرلیتا ہے اور کبھی کوئی دوسرا شخص اس کا نائب بن رقم وصول کرلیتا ہے۔[1]

ان اقسام کے علاوہ چیک کی تین قسمیں اور بھی ہیں، جن کا ذکر آخر میں ''چیک پر قبضہ کی بحث'' کے تحت آئے گا۔

چیک اور بل آف ایکسچینج میں فرق

۱۔بل آف ایکسچینج کسی بھی شخص یا ادارے کے نام جاری کیا جاسکتا ہے، جبکہ چیک صرف متعلقہ بینک کے نام ہی جاری کیا جاسکتا ہے۔

۲۔چیک کی ادائیگی بینک پر اطلاع کے وقت ہی ضروری ہوتی ہے، الا یہ کہ چیک جاری کرنے والے نے آگے کی تاریخ دی ہو، جبکہ بل آف ایکسچینج کی ادائیگی ایک مقررہ وقت پر ہی ہوتی ہے۔

۳۔چیک میں یہ ضروری ہوتا ہے کہ چیک جاری کرنے والے کا بینک میں اکاؤنٹ اور اس میں رقم موجود ہو، ورنہ اس کے بغیر چیک جاری کرنا جرم شمار ہوتا ہے، جبکہ بل آف ایکسچینج جاری کرنے والے کے لیے کسی قسم کا کوئی اکاؤنٹ ضروری نہیں ہوتا ہے۔

۴۔چیک میں کوئی ڈسکاؤنٹ نہیں ہوتا، جبکہ بل آف ایکسچینج میں ڈسکاؤنٹ (خصم) کا عمل ہوتا ہے۔[2]

چیک کی شکل

چیک ایک کاغذ اور پیپر ہوتا ہے، جس پر درج ذیل چیزیں لکھی ہوتی ہیں:

۱۔چیک کا نام، جیسے آرڈر یا بئیرر چیک وغیرہ۔

۲۔رقم کا اندراج اور اس کی ادائیگی کا غیر مشروط وغیر معلق حکم

۳۔ادائیگی کرنے والے بینک کا نام

---

(۱) المعاییر الشرعیة، رقم المعیار:۱۶، ص: ۱۷۹، زرکا تحقیقی مطالعہ، ص:۳۶۴

(۲) قرارات وتوصیات مجمع الفقه الإسلامي ۲/ ۱۱۹۲۱

۴۔ادائیگی کرنے والے بینک کی جگہ اور ایڈریس

۵۔چیک جاری کرنے کی تاریخ اور جہاں جاری کیا گیا ہے اس جگہ کا نام

۶۔چیک جاری کرنے والے کے دستخط

۷۔چیک جاری کرنے والے کا اکاؤنٹ نمبر

۸۔چیک کا نمبر

۹۔مستفید (جس کے لیے چیک جاری کیا گیا ہے اس) کا نام [۱]

درج بالا تمام باتیں ہر چیک کے لیے ضروری نہیں ہیں، بلکہ بسا اوقات ان میں سے کچھ باتیں بھی پائی جائیں جنہیں بینک ضروری سمجھتا ہے تو چیک قبول کر لیا جاتا ہے۔

چیک کی فقہی حیثیت

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ چیک کی فقہی تکییف و حیثیت کیا ہے؟ یہ کس قسم کے عقد میں داخل ہے؟ تو اس بحث کو ہم دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں:

پہلا حصہ:

چیک کے سلسلے میں اگر صرف دو فریق ہوں، ایک چیک جاری کرنے والا جو خود ہی مستفید اور رقم وصول کرنے والا بھی ہو اور دوسرا وہ بینک جو چیک دیکھنے پر ادائیگی کرتا ہے تو یہ محض اُس قرض کی واپس وصولی ہے جو کھاتہ دار کا بینک کے ذمہ تھا، اِس میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں ہے۔

دوسرا حصہ:

اگر چیک کے سلسلے میں تیسرا فریق بھی موجود ہو، مثلاً ایک چیک جاری کرنے والا، دوسرا ادائیگی کرنے والا بینک اور تیسرا وہ شخص جو چیک دکھا کر رقم وصول کرتا ہے، تو اس کی فقہی حیثیت میں علماءِ عصر کی مختلف آراء ہیں، جو کہ درج ذیل ہیں:

ا۔ پہلی رائے:

استاذ محترم مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے ''تکملہ فتح الملہم'' میں یہ رائے لکھی ہے کہ یہ عقدِ حوالہ

---

[۱] قرارات وتوصيات مجمع الفقه الإسلامي ۲/ ۱۱۹۱۸

نہیں ہے، بلکہ عقدِ وکالہ ہے، حوالہ کے نہ ہونے کی دو وجوہات ہیں:

الف-ایک وجہ تو یہ ہے کہ چیک پر ابتداء کوئی رقم نہیں لکھی ہوتی، بلکہ جب چیک جاری کرنے والا چیک جاری کرتا ہے تو اس وقت رقم کی مقدار لکھ کر دستخط کرتا ہے، لہذا جب مستفید، چیک پر قبضہ کرتا ہے، اس وقت بینک (محتال علیہ) کو اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ چیک پر کتنی رقم لکھی ہوئی ہے، لہذا یہاں ''مالِ محال بہ'' مجہول ہے، جس کی وجہ سے عقدِ حوالہ فاسد ہو جاتا ہے۔

ب-دوسری وجہ یہ ہے کہ بسااوقات چیک جاری کرنے والے کے اکاؤنٹ میں کوئی رقم موجود نہیں ہوتی، اس صورت میں بینک کو چیک مسترد کرنے کا بھی اختیار ہوتا ہے، لہذا اس طرح کی صورتحال میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ بینک اس حوالہ پر راضی ہے؟! حالانکہ حنفیہ کے ہاں ''محتال علیہ'' کی رضامندی عقدِ حوالہ کی صحت کے لیے ضروری ہے، لہذا یہ حوالہ منعقد نہیں ہوگا۔

لہذا صحیح تکییف یہ ہے کہ یہ عقدِ وکالہ ہے، گویا کہ چیک جاری کرنے والے نے مستفید (رقم وصول کرنے والے) کو اس بات کا وکیل بنا دیا کہ وہ جا کر اس کی نیابت میں بینک سے ایک مخصوص رقم وصول کرلے۔[1]

لیکن حضرت نے ''فقہ البیوع'' میں عام شخصی چیک کے بارے میں لکھا ہے کہ چیک جاری کرتے ہی ائمہ ثلاثہ کے نزدیک حوالہ منعقد ہو جائے گا، اگرچہ ابھی تک بینک کی رضامندی نہیں پائی گئی ہے، کیونکہ اُن حضرات کے نزدیک ''محال علیہ'' کی رضامندی ضروری نہیں ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ بینک میں چیک جاری کرنے والے کی رقم موجود ہو، کیونکہ ائمہ ثلاثہ حوالہ مطلقہ کے قائل نہیں ہے۔ البتہ حنفیہ کے نزدیک چیک جاری کرتے وقت حوالہ منعقد نہ ہوگا، کیونکہ بینک (محال علیہ) کی رضامندی نہیں پائی گئی ہے، جو کہ حنفیہ کے نزدیک ضروری ہے، البتہ جب بینک، چیک کو قبول کرلے گا تو اس وقت حوالہ منعقد ہو جائے گا۔[2]

۲۔دوسری رائے:

معاییرِ شرعیہ میں یہ رائے اختیار کی گئی ہے:

۱/۱۲ السحب على السحب الجاري:

يعتبر إصدار الشيك على الحساب الجاري حوالة إذا كان المستفيد دائنا بمبلغ

---

[1] تكملة فتح الملهم شرح صحيح الإمام مسلم ۱/۵۱۵

[2] فقه البيوع ۱/۴۴۸

الشيك للمصدر (الساحب أو المحرر). فيكون الساحب هو المحيل، والبنك المسحوب عليه، هو المحال عليه، والمستفيد هو المحال.

وإذا لم يكن مصدر الشيك مدينا للمستفيد، فليس ذلك بحوالة، إذ لا يتصور حوالة دين لا وجود له ولكن يعتبر وكالة بالقبض، وهي جائزة شرعا.

٢/١٢ السحب على المكشوف:

إذا كان المستفيد دائنا بمبلغ الشيك للمصدر فتحرير الشيكات على حساب للمصدر دون أن يكون له رصيد يعتبر حوالة مطلقة إذا قبل المصرف. أما إذا لم يقبل المصرف فليست حوالة، ويحق لحامل الشيك الرجوع على مصدره.

٣/١٢ الشيكات السياحية:

إن حامل الشيكات السياحية الذي وفى بقيمتها للمؤسسة المصدرة يعتبر دائنا لتلك المؤسسة، فإذا ظهرها حاملها لدائنه كان هذا التظهير حوالة للغير على هذه المؤسسة المصدرة المبنية، وهي حوالة مقيدة بما أداه حامل الشيكات السياحية من قيمتها للمؤسسة.[1]

اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ چیک کی تین صورتیں ہیں:[2]

۱۔ایک صورت یہ ہے کہ چیک جاری کرنے والا (ساحب) کسی کا مقروض ہو اور وہ اپنے قرض خواہ کے لیے چیک جاری کرے، مثلاً زید کا عمر کے ذمہ پانچ لاکھ روپے قرض ہے، عمر قرض کی ادائیگی نقد رقم کی صورت میں کرنے کے بجائے زید کے لیے اتنی رقم کا چیک اپنے بینک اکاؤنٹ کے نام سے جاری کر دیتا ہے تو اس کا یہ چیک جاری کرنا حوالہ کہلائے گا، جس میں مقروض شخص (عمر) محیل ہوگا، بینک محتال علیہ اور قرض خواہ (زید) محال کہلائے گا۔

اسی صورت کے اندر بھی تین صورتیں ہو سکتی ہیں:

---

[1] المعايير الشرعية ص:٥٣، رقم المعيار:٧

[2] عقدِ حوالہ کا مفہوم یہ ہے کہ اصل مقروض پر لازم شدہ قرض کسی تیسرے فریق کی طرف منتقل کیا جائے۔ جیسے زید کے ذمہ عمر کا قرض ہے تو خالد نے اس قرض کی ادائیگی کی ذمہ داری لے لی اور زید سے مطالبہ نہ کرنے کی بات طے ہو گئی۔ اس میں اصل مقروض (مثلاً زید) کو محیل، قرض خواہ (مثلاً عمر) کو محال، اور ادائیگی کی ذمہ داری لینے والے (مثلاً خالد) کو محتال علیہ کہتے ہیں۔ عقدِ حوالہ کی دو قسمیں ہیں:

۱۔حوالہ مطلقہ: ایسا حوالہ جس میں محتال علیہ (مثلاً خالد) کے ذمہ محیل (مثلاً زید) کا قرض نہ ہو۔

۲۔حوالہ مقیدہ: ایسا حوالہ جس میں محتال علیہ (مثلاً خالد) کے ذمہ محیل (مثلاً زید) کا قرض ہو اور اسی قرض سے ادائیگی کرنے کا کہا جائے۔ (مجلة الأحكام العدلية الْكِتَابُ الرَّابِعُ: الْحَوَالَةُ)

الف-چیک جاری کرنے والے کے اکاؤنٹ میں رقم موجود ہو،اس صورت میں بینک،چیک جاری کرنے والے کا مقروض ہوگا اور یہ ''حوالہ مقیدہ'' کہلائے گا۔یہی صورت آج کل عام رواج پذیر ہے اور عام طور پر ہوتا بھی یہی ہے کہ آدمی اس رقم کے اندر اندر ہی چیک جاری کرتا ہے جتنی اس کی رقم بینک اکاؤنٹ کے اندر ہوتی ہے۔اس صورت کو آج کل عربی زبان میں "السحب علی الحساب الجاری"اور انگریزی میں (withdrawals from a bank account) کہتے ہیں۔

ب-دوسری صورت یہ ہے کہ چیک جاری کرنے والے کے اکاؤنٹ میں رقم بالکل موجود نہ ہو،اس کے باوجود بینک اس کی طرف سے ادائیگی کردے تو اس صورت میں چونکہ بینک،چیک جاری کرنے والے کا مقروض نہیں ہے،اس لیے یہ ''حوالہ مطلقہ'' کہلائے گا۔اس کو عربی میں "السحب علی المشکوف"اور انگریزی میں(overdraft)کہتے ہیں۔لیکن اگر بینک نے چیک مسترد کردیا تو یہ حوالہ نہیں ہوگا،کیونکہ بینک کی رضامندی نہیں پائی گئی۔ایسی صورت میں حامل چیک،چیک جاری کرنے والے سے اپنے قرض کا مطالبہ کرے گا۔

ج-تیسری صورت یہ ہے کہ آدمی کے اکاؤنٹ میں رقم کم ہوتی ہے،لیکن وہ چیک زیادہ رقم کا جاری کرتا ہے،مثلاً بینک کے اندر اس کے پانچ لاکھ روپے جمع ہیں،لیکن وہ چھ لاکھ کا چیک جاری کرتا ہے۔ایسی صورت میں اگر بینک نے چیک مسترد کردیا تو کوئی حوالہ منعقد نہ ہوگا،اگر صرف اکاؤنٹ میں موجود رقم کے بقدر چیک قبول کرکے ادائیگی کرلی تو یہ ''حوالہ مقیدہ'' ہوگا اور اگر مکمل چیک قبول کرکے پوری ادائیگی کرلی تو یہاں دو صورتیں منعقد ہوئیں، یعنی حوالہ مقیدہ اور حوالہ مطلقہ،کیونکہ ڈیپازیٹر کی جتنی رقم پہلے سے بینک میں موجود ہے اتنی حد تک بینک کا ذمہ داری قبول کرکے چیک ہولڈر کو رقم دینا ''حوالہ مقیدہ'' ہے اور بقیہ رقم جو بینک اپنی طرف سے دے رہا ہے اس میں ''حوالہ مطلقہ'' ہے۔

۲۔دوسری صورت یہ ہے کہ چیک جاری کرنے والا اُس شخص (مستفید) کا مقروض نہ ہو،جس کے لیے اس نے چیک جاری کیا ہے،بلکہ اپنی طرف سے اسے کچھ رقم دینا چاہتا ہے جس کے لیے چیک جاری کرتا ہے تو یہ صورت حوالہ میں داخل نہیں،کیونکہ حوالہ منعقد ہونے کے لیے شرعاً ضروری ہے کہ محیل (چیک جاری کرنے والا) محال (مستفید) کا مقروض ہو،ایسی صورت میں یہ ''وکالہ بالقبض'' ہوگا کہ چیک جاری کرنے والے نے مستفید کو رقم کی وصولی کے لیے وکیل بنادیا۔

۳۔سیاحتی چیک(traveler cheque)میں چیک کا حامل اُس ادارے کا قرض خواہ ودائن سمجھا جائے گا جس کو اس نے قیمت اداء کرکے چیک حاصل کیا ہے، لہٰذا اس صورت میں اگر چیک کے حامل نے اس چیک کو اپنے

کسی قرض خواہ کے حق میں انڈورس کر دیا تو یہ "حوالہ مقیدہ" کہلائے گا۔

یہی دوسری رائے زیادہ درست معلوم ہوتی ہے، جہاں تک حضرت شیخ الاسلام صاحب کی بیان کردہ دو وجوہات کا تعلق ہے تو جب بینک کو چیک پیش کر لیا جاتا ہے اور بینک اس کو قبول کر لیتا ہے تو اس وقت "مالِ محال بہ" کی جہالت ختم ہو جاتی ہے اور بینک (محال علیہ) کی طرف سے رضامندی بھی پائی گئی، لہذا اس وقت حوالہ منعقد ہو جائے گا، بشرطیکہ مستفید اُس شخص کا قرض خواہ ہو جس نے چیک جاری کیا ہے، ورنہ یہ وکالہ ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ اکاؤنٹ میں رقم نہ ہونے کی صورت میں اگر بینک نے چیک مسترد کر دیا تو کوئی عقد منعقد ہی نہ ہوگا۔

اسی بات کو حضرت مفتی صاحب "فقہ البیوع" میں اس طرح لکھتے ہیں:

فلا تتم الحوالة عند إصدار هذا الشيك وتسليمه إلى المحال: لأن البنك، وهو المحال عليه، لم يتم رضاه بعد، ولكن إن قبل البنك الشيك، تمت الحوالة في ذلك الوقت، وحصل الاستيفاء بطريق الحوالة.[1]

چیک پر قبضہ کی تحقیق

علماء عصر کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ کیا چیک پر قبضہ کرنا اس کے "محتویٰ" یعنی اس پر لکھی ہوئی اور اس کے پیچھے موجود رقم پر قبضہ سمجھا جائے گا یا چیک محض ایک سند اور رسید ہے؟ بالفاظِ دیگر چیک پر قبضہ کرنا "قبضہ حکمی" میں داخل ہے یا نہیں؟ اس میں علماء عصر کی آراء کو ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے:

ا۔ پہلی رائے:

کئی معاصر علماء نے یہ عمومی رائے اختیار کی ہے کہ چیک پر قبضہ کرنا اس کے اندر درج شدہ رقم پر قبضہ کرنے کے حکم میں ہے، لہذا اگر ایک شخص نے دوسرے کو مثلاً ایک ہزار روپے کا چیک لکھ کر دے دیا تو یہ ایسا ہے جیسے اُس نے ایک ہزار روپے اُس شخص کو دے دیے۔ ان حضرات کے دلائل کا خلاصہ تین باتوں میں بیان کیا جاسکتا ہے:

الف۔ جس طرح فقہاء نے حوالہ کو بمنزلہ قبضہ قرار دیا ہے اسی طرح اگر چیک کی فقہی تکییف حوالہ بھی ہو تو بھی اس پر قبضہ در حقیقت اس میں درج شدہ رقم کا قبضہ سمجھا جائے گا۔[2]

ب۔ قبضہ کی کوئی حقیقت شریعت نے بیان نہیں کی، لہذا اس سلسلے میں عرف کی طرف رجوع کیا جائے گا اور آج

---

[1] فقه البيوع ١/٤٤٨

[2] قرارات وتوصيات مجمع الفقه الإسلامي ٢/ ١١٩٣٤

کل عرف تقریباً یہی ہے کہ چیک پر قبضہ کرنے کو اس میں درج شدہ رقم پر قبضہ سمجھا جاتا ہے۔[1]

ج- رہی یہ بات کہ اگر چیک جاری کرنے والے کے اکاؤنٹ میں رقم ہی نہ ہو اور بینک چیک کو مسترد کردے تو ایسی صورت میں چیک پر قبضہ، رقم پر قبضہ کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آج کل حکومتی قوانین میں اکاؤنٹ میں رقم نہ ہونے کے باوجود چیک جاری کرنے پر سخت سزائیں مقرر کی گئی ہیں، دوسری طرف یہی احتمال تو نقود اور کرنسیوں میں بھی ہے کہ وہ جعلی اور زیوف ہوں، لہذا یہ کوئی قوی اعتراض نہیں ہے۔[2]

پاکستان پینل کوڈ (pakistan panel code) کی دفعہ F-489 کے تحت اگر کسی شخص نے کاروباری اُدھار یا ذاتی قرضہ ادا کرنے کے لیے یا کسی چیز کی خریداری کی قیمت کی ادائیگی کے سلسلے میں یا کسی سروس کی فیس کی ادائیگی کے سلسلے میں چیک جاری کیا ہے اور اگر وہ چیک ریٹرن یا باؤنس ہو گیا تو وہ شخص جس نے چیک جاری کیا ہے اُس کی FIR کٹ سکتی ہے اور پاکستان پینل کوڈ (pakistan panel code) کے تحت اس شخص کے خلاف کریمنل (criminal) مقدمہ چل سکتا ہے اور اُس شخص کی گرفتاری بھی ہو سکتی ہے یا اُس پر جرمانہ عائد کیا جاسکتا ہے یا پھر اسے یہ دونوں سزائیں ہو سکتی ہیں۔

۲۔ دوسری رائے:

ایوفی (AAIOFI) نے ''معاییر شرعیہ'' میں درج ذیل رائے اختیار کی ہے:

۱/٦ يعتبر تسلم الشيك الحال الدفع قبضا حكميا لمحتواه إذا كان [الف] شيكا مصرفيا أو كان مصدقا أو في حكم المصدق، وذلك بأن تسحب الشيكات بين المصارف أو بينها وبين فروعها، وبناء على ذلك يجوز التعامل بالشيك فيما يشترطه فيه القبض كصرف العملات، وشراء الذهب أو الفضة به، وجعل الشيك رأس مال للسلم.

(ب) تسلم الشيك [ج] إذا كان له رصيد، [د] قابل للسحب بالعملة المكتوب بها عند استيفائه، [هـ] وتم حجز المؤسسة له.[3]

---

[1] قرارات وتوصيات مجمع الفقه الإسلامي ٢/ ١١٩٠٧

[2] حواله بالا ٢/ ١١٩٢٤

[3] المعايير الشرعية ص: ١٧٠، رقم المعيار: ١٦

اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ اگر چیک میں درج ذیل شرائط پائی جائیں تو اس پر قبضہ، اس میں درج شدہ رقم پر قبضہ سمجھا جائے گا، ورنہ نہیں:

الف- بینک کا چیک ہو (جس کا جاری کرنے والا بینک ہی ہوتا ہے) یا تصدیق شدہ چیک ہو (کہ بینک نے تصدیق کردی ہو کہ چیک جاری کرنے والے کے اکاؤنٹ میں رقم ہے) یا تصدیق شدہ چیک کے حکم میں ہو (یعنی ایک بینک دوسرے بینک کو یا ایک بینک اپنے ہی کسی برانچ کو چیک بھیجے)۔

ب- چیک ''نقد'' ہو، جس کو عربی میں ''الشيك الحال'' کہتے ہیں، یعنی ایسا چیک ہو کہ بینک کو پیش کرنے پر ہی بینک ادائیگی کردے، کیونکہ بسا اوقات فکسڈ ڈپازٹ میں جو رقم رکھی ہوتی ہے، وہ فی الحال نہیں لی جاسکتی، اس لیے اگر فکسڈ ڈپازٹ والے نے چیک جاری کردیا اور اس رقم کی وصولی کی تاریخ نہیں آئی تو یہ ''نقد'' چیک کے حکم میں نہیں ہوگا۔

ج- چیک کے پیچھے رصید (یعنی اکاؤنٹ میں رقم) موجود ہو۔

د- چیک پر جو کرنسی لکھی گئی ہے، اُسی کرنسی میں رقم نکالنا ممکن ہو۔

ھ- ادارے (بینک) نے چیک کو کراس کیا ہو، یعنی جس شخص کے لیے چیک جاری کیا گیا ہے، اس کے نام کراس چیک ہو، بیئرر چیک نہ ہو۔

اگر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی نہ پائی گئی تو چیک پر قبضہ، اس میں درج شدہ رقم پر قبضہ نہیں سمجھا جائے گا۔

۳- تیسری رائے:

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے ''تکملہ فتح الملہم''[1] میں مطلقاً یہ لکھا ہے کہ چیک پر قبضہ کو اس میں درج شدہ رقم پر قبضہ نہیں سمجھا جائے گا، لیکن حضرت نے اپنی نئی تصنیف ''فقہ البیوع'' میں اس موضوع پر تفصیلی کلام کیا ہے، جس کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

آپ لکھتے ہیں کہ ہر قسم کے چیک پر قبضہ اس میں درج شدہ رقم پر قبضہ سمجھنا ممکن نہیں ہے، کیونکہ چیک کی تین مندرجہ ذیل قسمیں ہیں:

الف- بینک چیک، جس کو عربی میں ''الشيك المصرفي'' اور انگریزی میں ''bank draft or cashiers cheque'' کہتے ہیں۔ اس سے مراد ایسا چیک ہے کہ جب کوئی شخص دوسرے کا مقروض بن جاتا ہے تو

---

[1] تكملة فتح الملهم ۵۱۵/۱

مقروض شخص بینک کو ایک مخصوص رقم (نقد ادا کر کے یا اپنے اکاؤنٹ سے منہا کر کے) ادا کرتا ہے اور اس کے بدلے بینک اس کے قرض خواہ کے نام ایک چیک جاری کرتا ہے، جس میں یہ ذمہ داری لی جاتی ہے کہ بینک اس کو چیک میں درج شدہ مخصوص رقم ادا کرے گا۔ مقروض اس چیک کو لے کر اپنے قرض خواہ کو دے دیتا ہے، قرض خواہ عموماً اس طرح کا چیک لے کر اپنے بینک کو دیتا ہے اور اس کا بینک چیک جاری کرنے والے بینک سے چیک کیش کروا کر رقم قرض خواہ (مستفید) کے اکاؤنٹ میں ڈال دیتا ہے۔

بہت سے معاصر علماء نے اس قسم کے چیک پر قبضہ کرنے کو اس میں درج شدہ رقم پر قبضہ قرار دیا ہے۔ معاییر شرعیہ میں بھی یہی رائے اختیار کی گئی ہے۔ ان حضرات نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ جب مقروض نے اپنے قرض خواہ کو مذکورہ چیک دے دیا تو گویا کہ اس نے قرض خواہ اور رقم کے درمیان تخلیہ کر لیا کہ وہ جب چاہے اپنی رقم بینک سے وصول کر سکتا ہے اور تخلیہ سے قبضہ ہو جاتا ہے۔

اس کی ایک اور فقہی تخریج بھی ممکن ہے، وہ یہ کہ مقروض نے بینک کو رقم ادا کر کے یا اپنے اکاؤنٹ سے منہا کر کے یہ حکم دے دیا کہ یہ رقم قرض خواہ کو دے دے، بینک نے چیک جاری کر کے اس کو قبول کر لیا، تو گویا کہ قرض خواہ نے بینک کو رقم وصول کرنے کا وکیل بنا دیا اور وکیل کا قبضہ دراصل مؤکل کا قبضہ شمار ہوتا ہے، لہٰذا یہاں بھی چیک جاری کرنے والے بینک کا قبضہ قرض خواہ (جس کے لیے چیک جاری کیا گیا ہے) کا قبضہ سمجھا جائے گا۔

اگرچہ اصل میں بینک کو مقروض نے رقم دے کر ادائیگی کا وکیل بنایا ہے، لیکن جب قرض خواہ نے چیک قبول کر کے رضامندی کا اظہار کر لیا تو گویا کہ چیک جاری کرنے والا بینک اس کا "وکیل بالقبض" ہو گیا۔ (کیونکہ اجازتِ لاحقہ، وکالتِ سابقہ کے حکم میں ہوتی ہے۔)

اگر یہ شبہ ہو کہ بسا اوقات قرض خواہ کو اس بینک کا علم نہیں ہوتا جس نے چیک جاری کیا ہے، لہٰذا وکیل مجہول ہے، لیکن یہ جہالت جھگڑے کا سبب بننے والی نہیں ہے، کیونکہ یہ آج کل قرض کی ادائیگی کا ایک قابلِ اعتماد ذریعہ ہے، اور امام ابو حنیفہؒ نے مجہول شخص کو وکیل بنانے کی اجازت دی ہے، بشرطیکہ جہالت جھگڑے کا سبب نہ بنے۔

یہ شبہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر چیک جاری کرنے والا بینک، قرض خواہ کا وکیل ہے تو اس کا قبضہ "قبضہ امانت" ہے، لہٰذا اس کے لیے چیک میں درج شدہ رقم اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں ہونا چاہیے، حالانکہ بینک اس طرح کی رقم کو ایک مستقل اکاؤنٹ میں منتقل کر دیتا ہے جس کو عربی میں "حساب المصروفات" اور انگریزی میں "payables" کہتے ہیں اور اس رقم کو اپنے استعمال میں لاتا ہے۔ اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ اس طرح کی رقم ابتداءً امانت کے حکم میں

ہے، لیکن دوسری رقوم کے ساتھ خلط کردینے کی وجہ سے انتہاءً یہ رقم بینک پر قرض اور مضمون بن جاتی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اس طرح کے چیک پر قبضہ بطورِ حوالہ یا وکالہ کے اصل رقم پر قبضہ شمار کیا جاسکتا ہے۔

ب۔ تصدیق شدہ چیک، جس کو عربی میں "الشيك المصدق" اور انگریزی میں "certified cheque" کہتے ہیں۔ اس قسم کا چیک ایک عام کھاتہ دار کسی دوسرے شخص کے لیے جاری کرتا ہے، البتہ اس پر بینک کی طرف سے یہ تصدیق ہوتی ہے کہ چیک جاری کرنے والے کے اکاؤنٹ میں قابل کیش رقم موجود ہے، جس کے لیے عموماً "accepted" کا کلمہ استعمال ہوتا ہے۔ بینک، چیک جاری کرنے والے کے اکاؤنٹ سے وہ رقم نکال کر اپنے حسابات میں ڈال دیتا ہے۔

اس قسم میں اور بینک کے چیک میں کوئی خاص فرق نہیں ہے، جس طرح بینک کے چیک میں چیک پر درج شدہ رقم محجوز ہوتی ہے یعنی الگ کر کے رکھ لی جاتی ہے، اب اکاؤنٹ ہولڈر وہ رقم نہیں نکال سکتا، بلکہ مستفید ہی لے سکتا ہے، اسی طرح یہاں بھی ہے، البتہ یہاں چیک جاری کرنے والا بینک کے بجائے ایک عام کھاتہ دار ہوتا ہے، لہذا جب تک چیک پر درج شدہ رقم چیک جاری کرنے والے کے لیے ممنوع و محجوز ہو، اس پر وہ تمام تفصیل جاری ہوگی جو بینک کے چیک میں بیان کردی گئی ہے۔

ج۔ شخصی چیک، جس کو عربی میں "الشيك الشخصي" اور انگریزی میں "personal cheque" کہتے ہیں۔ یہ چیک عام کھاتہ دار جاری کرتا ہے کہ بینک اس کے اکاؤنٹ سے ایک مخصوص رقم کی ادائیگی کرلے۔ اس میں بینک کی طرف سے کوئی تصدیق وتوثیق نہیں ہوتی کہ کھاتہ دار کے اکاؤنٹ میں رقم ہے یا نہیں اور نہ ہی بینک اس رقم کی ادائیگی کا التزام کرتا ہے، بلکہ جب بینک کے سامنے یہ چیک پیش ہوتا ہے تو بینک دیکھتا ہے کہ کھاتہ دار کے اکاؤنٹ میں رقم ہے یا نہیں اور حسبِ معاہدہ اُسے رقم نکالنے کا حق بھی ہے یا نہیں؟ اگر یہ دونوں باتیں پائی جائیں تو بینک ادائیگی کردیتا ہے، ورنہ بینک کو چیک مسترد کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔

آج کل اکثر لوگ خریداری کر کے فروخت کنندہ کے نام اس طرح کا (آرڈر یا بیرر) چیک جاری کردیتے ہیں، اس قسم کے چیک کی حقیقت "حوالہ" ہی ہے، جس میں چیک جاری کرنے والا "محیل"، فروخت کنندہ "محال" اور بینک "محال علیہ" ہوتا ہے، اس کی بقیہ تفصیل "چیک کی فقہی تکییف" کے تحت گزر چکی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس طرح کے چیک پر قبضہ کرنا، اس میں درج شدہ رقم پر قبضہ سمجھا جائے گا یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے ذریعے چیک جاری کرنے والے کا ذمہ تو بری ہوجائے گا، کیونکہ یہ حوالہ ہے اور حوالہ میں "محیل"

قرض خواہ کے مطالبہ سے بری ہو جاتا ہے، لیکن یہاں چیک پر قبضہ اس میں درج شدہ رقم پر قبضہ نہیں سمجھا جائے گا، کیونکہ کسی بھی چیز پر اس وقت قبضہ سمجھا جاتا ہے جب قابض کو اس چیز میں تصرف کرنے کی مکمل قدرت حاصل ہو جائے، جبکہ یہاں حاملِ چیک کو چیک میں درج شدہ رقم پر اس وقت تصرف کی قدرت حاصل ہوتی ہے جب چیک میں درج ذیل تین باتیں پائی جائیں:

۱۔ چیک جاری کرنے والے کے اکاؤنٹ میں رقم موجود ہو۔

۲۔ اُسے حسبِ معاہدہ اکاؤنٹ سے رقم نکالنے کا حق حاصل ہو۔

۳۔ اکاؤنٹ ہولڈر نے چیک جاری کرنے کے بعد بینک کو اس چیک پر رقم نکالنے سے منع نہ کیا ہو۔

اگر ان تین شرائط میں سے کوئی ایک شرط بھی نہ پائی گئی تو حاملِ چیک اس چیک پر رقم نہیں نکال سکتا، اس سے معلوم ہوا کہ حاملِ چیک کو صرف چیک پر قبضہ کرنے سے اس میں درج شدہ رقم میں تصرف کی قدرت حاصل نہیں ہوتی، لہذا اسے قبضہ حکمی کہنا درست نہیں ہے۔[1]

پہلی رائے کے دلائل کے جوابات:

۱۔ جہاں تک پہلی دلیل کا تعلق ہے کہ فقہاء نے حوالہ کو بمنزلہ قبضہ قرار دیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد صرف اتنی ہے کہ حوالہ کے ذریعے محیل (مقروض) کا ذمہ بری ہو جاتا ہے، یہ مراد نہیں ہے کہ بیعِ صرف میں بھی حوالہ بمنزلہ قبضہ کے ہے۔

۲۔ یہ بات کہ آج کل کے عرف میں چیک پر قبضہ، اس میں درج شدہ رقم پر قبضہ سمجھا جاتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک تو یہ کوئی عام عرف نہیں ہے، کیونکہ قرض خواہ کو چیک نہ لینے کا بھی قانونا اختیار ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ قبضہ حکمی (تخلیہ) صرف عام بیوعات میں معتبر ہوتا ہے، "بیعِ صَرف" میں صرف تخلیہ کافی نہیں ہوتا۔ فقہ حنفی میں تخلیہ کو بہت سے معاملات میں معتبر قرار دیا ہے، لیکن بیع صرف کو فقہاء حنفیہ نے بھی مستثنیٰ قرار دیا ہے کہ وہاں تخلیہ کافی نہیں ہے۔

۳۔ اسی طرح چیک کو نقود اور کرنسی پر قیاس کرنا بھی درست نہیں ہے، کیونکہ نقود خود معقود علیہ اور بیع صرف کا محل ہے اور بذاتِ خود مقصود ہوتے ہیں، اگر ان میں کوئی عیب نکل آئے تو بیعِ صرف باطل ہو جاتی ہے، جبکہ چیک خود مقصود اور معقود علیہ نہیں ہے، اگر ان میں کوئی عیب نکل آئے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ معقود علیہ میں عیب ظاہر ہوا ہے۔

---

[1] فقه البيوع ١/ ٤٤٩،٤٥٠.

اگرچہ حکومتی قوانین میں اکاونٹ میں رقم نہ ہونے کے باوجود چیک جاری کرنے پر سزائیں مقرر ہیں، لیکن اس سے یہ حقیقت تبدیل نہیں ہو سکتی کہ اس طرح کی صورتحال میں حامل چیک (قرض خواہ) کو اپنے حق پر قبضہ حاصل نہیں ہوتا، لہذا سزا مقرر کرنے سے چیک پر قبضہ، اس میں درج شدہ رقم پر قبضہ نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔[1]

وضاحت:

جن علماء نے چیک پر قبضہ کو قبضہ حکمی قرار دیا ہے، چونکہ اُنہوں نے چیک کے ساتھ کرنسی کے تبادلہ یا چیک کے ذریعے رقوم کی منتقلی کو "بیع صرف" قرار دیا ہے، اس لیے حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب مد ظلہم نے اُن کے دلائل کے جوابات میں اکثر "بیع صرف" کا تذکرہ کیا ہے، اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ حضرت بھی اس کے بیع صرف ہونے کے قائل ہیں، حضرت نے "فقہ البیوع" کے "باب الصرف" میں اپنی رائے کی مکمل وضاحت کر دی ہے۔

ثمرہ اختلاف:

اس مسئلہ کا "ثمرہ اختلاف" اور نتائج درج ذیل ہیں:

۱۔ جن صورتوں میں یا جن حضرات کے نزدیک چیک محض ایک سند اور رسید ہے، اس پر درج شدہ رقم پر قبضہ نہیں ہے، اُن کے نزدیک بیع سلم میں چیک راس المال نہیں بن سکتا، کیونکہ چیک پر قبضہ کرنا ثمن پر قبضہ نہیں ہے، لہذا اگر بیع سلم میں صرف چیک پر قبضہ کر لیا گیا تو بیع سلم درست نہیں ہوگی، کیونکہ ثمن (راس المال) پر قبضہ نہیں پایا گیا جو کہ بیع سلم کی صحت کے لیے ضروری ہے۔ اور جن صورتوں میں یا جن حضرات کی رائے میں چیک پر قبضہ کرنا درحقیقت اس رقم پر قبضہ کرنا ہے جس کی نمائندگی چیک کرتا ہے، ان کے نزدیک چیک، بیع سلم میں راس المال بن سکتا ہے۔

۲۔ اگر چیک محض رسید و سند ہے تو کسی مستحق زکوۃ کو محض چیک دینے سے زکوۃ ادا نہ ہوگی، جب تک وہ چیک کو کیش نہ کرالے، اگر چیک صرف رسید نہیں ہے، بلکہ اس پر درج شدہ رقم کا قبضہ ہے تو چیک کے ذریعے زکوۃ ادا ہو جائے گی۔

۳۔ اگر چیک کا قبضہ، رقم پر قبضہ نہیں ہے تو چیک کا معاملہ حوالہ یا وکالہ ہے، لیکن اگر چیک پر قبضہ، اصل رقم پر قبضہ ہے تو چیک کا معاملہ حوالہ یا وکالہ نہیں ہے، بلکہ استیفاء یا قرض کی ادائیگی ہے۔

۴۔ اگر چیک صرف سند ہے تو چیک کا چیک کے ساتھ تبادلہ درست نہیں ہوگا، کیونکہ یہ بیع الکالئ بالکالئ ہوگی، اگر چیک کا قبضہ، رقم کا قبضہ ہے تو یہ تبادلہ درست ہے، بشرطیکہ سود لازم نہ آئے۔

---

(1) فقه البيوع ۱/ ٤٥٠.

۵۔ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم نے ”تکملہ فتح الملہم“ میں لکھا ہے کہ ”چیک پر قبضہ اس کے اندر درج شدہ رقم پر قبضہ نہیں سمجھا جائے گا، لہذا چیک سے سونا، چاندی خرید نا جائز نہیں ہے، کیونکہ مجلس کے اندر تقابض نہیں پایا جاتا۔“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جن حضرات نے چیک پر قبضہ کو اس میں درج شدہ رقم پر قبضہ نہیں سمجھا، اُن کے نزدیک چیک کے ذریعے سونا، چاندی خرید نا جائز نہیں ہے، لیکن ایسا نہیں سمجھنا چاہیے، کیونکہ اگر چیک کے پیچھے سونا یا چاندی ہوتی تو ایسی صورت میں بذریعہ چیک سونا یا چاندی خریدنے میں تقابض ضروری ہوتا، کیونکہ یہ بیع صرف کا معاملہ ہوتا، لیکن حقیقت یہ نہیں ہے، چیک سونا یا چاندی کی نمائندگی نہیں کرتا، بلکہ کسی کرنسی کی نمائندگی کرتا ہے اور کرنسی کے ذریعے اُدھار سونا یا چاندی خرید نا جائز ہے، بشرطیکہ سونا یا چاندی پر مجلسِ عقد میں قبضہ کر لیا جائے۔ اس کا تذکرہ حضرت نے خود ”فتاوی عثمانی“[1] میں کیا ہے اور ”تکملہ فتح الملہم“ کے جدید ایڈیشن میں اس کی تصحیح بھی کر لی گئی ہے۔

چیک کے موضوع پر معاییر شرعیہ اور مجمع الفقہ الاسلامی کی قراردادوں میں بعض مقامات پر کچھ اہم نکات بیان کیے گئے ہیں، تاہم اس موضوع پر مستقل کتب مندرجہ ذیل ہیں:

۱-أحكام الشيك: دراسة فقهية تأصيلية مقارنة بالقانون، عيسى محمود عيسى

۲-الشيكات: مفهومها، وجرائمهاوالعقوبات المترتبة عليها، عبد العزيز بن سعد

۳-المسئولية الجنائية عن جرائم الشيك في ضوء الفقه وأحكام القضاء، إبراهيم حامد طنطاوي

---

[1] فتاوی عثمانی ۳/۱۵۰

بینک کارڈز: تعارفی و فقہی جائزہ
(Bank Cards)

یہ مقالہ میگزین "شریعہ اینڈ بزنس" (۲۰۱۷ء) اور مختلف ویب سائٹس جیسے (daleel.pk اور mazameen.com وغیرہ) پر شائع ہوا ہے۔اس مقالہ کے بنیادی عنوانات اور مباحث مندرجہ ذیل ہیں:

- تعارف واہمیت
- کارڈز کی اقسام
- کارڈز کے شرکاء
- فقہی حیثیت
- کارڈ ہولڈر اور تاجر سے فیس لینا
- کارڈز کے استعمال کا شرعی حکم
- کارڈز پر ملنے والے ڈسکاؤنٹس کا حکم

تعارف واہمیت

عصرِ حاضر میں دنیا سمٹ کر رہ گئی ہے۔ حیرت انگیز حد تک فاصلے کم ہو گئے ہیں۔اس کا سب سے زیادہ اثر معیشت وتجارت پر ہوا ہے،انسان دنیا کے ایک کونے میں بیٹھ کر دوسرے کونے میں تجارت کر سکتا ہے۔دوسری طرف چوری، ڈاکہ زنی اور لوٹ مار کی وارداتیں بڑھ گئی ہیں۔ایک ملک سے دوسرے ملک، بلکہ اندرون ملک بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ کثیر رقم لے جانا حفاظت کے نقطہ نظر سے دشوار ہے،لہذا ضرورت اس بات کی تھی کہ کوئی ایسا طریقہ ایجاد کیا جائے جس کے ذریعے رقوم کی منتقلی آسان، محفوظ اور تیز ہو۔اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے آج کل بینک مختلف قسم کے کارڈز جاری کرتے ہیں، جن کی وجہ سے رقم ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ محض کارڈ کی بنیاد پر ادائیگیاں ہو جاتی ہیں۔کسی بھی ملک میں جا کر بذریعہ کارڈ اُس ملک کی کرنسی حاصل کی جا سکتی ہے۔دنیا کے کسی بھی کونے میں بیٹھ کر بذریعہ انٹرنیٹ کارڈ استعمال کر کے خرید وفروخت ہو سکتی ہے اور سیکرٹ پاس ورڈ کی وجہ سے رقم کی چوری کا اندیشہ بھی نہیں رہتا۔

اس کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ جب حاملِ کارڈ خریداری کرتا ہے تو تاجر کو رقم دینے کے بجائے کارڈ دکھا دیتا ہے۔ تاجر اس کارڈ کو چیک کرتا ہے، ایک مشین سے گزار کر یہ اطمینان حاصل کرلیتا ہے کہ ادارے کی طرف سے اس پر خریداری کی اجازت ہے یا نہیں۔ اس کے بعد حاملِ کارڈ سے ایک بل پر دستخط لے لیتا ہے اور بعد میں وہ بل کارڈ جاری کرنے والے ادارے کو بھیج کر اس سے اپنی رقم وصول کرلیتا ہے۔

سابقہ تفصیل کی روشنی میں کارڈ کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے:

''یہ ایک پلاسٹک کا کارڈ ہے جسے بینک اور دیگر مالیاتی ادارے کسی شخص یا ادارے کے نام جاری کرتے ہیں اور حاملِ کارڈ اس کے ذریعے ضروریاتِ زندگی خریدنے یا نقد رقم حاصل کرنے پر قادر ہوتا ہے۔''

اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ نے کارڈ کی تعریف اس طرح کی ہے:

هي مستند يعطيه مصدره لشخص طبيعي أو اعتباري - بناء على عقد بينهما - يمكنه من شراء السلع أو الخدمات ممن يعتمد المستند دون دفع الثمن حالاً لتضمنه التزام المصدر بالدفع . ومن أنواع هذا المستند ما يمكن من سحب نقود من المصارف.[1]

''یہ ایک دستاویز ہے جو جاری کنندہ کسی حقیقی یا اعتباری شخص کو باہمی معاہدہ کی بنیاد پر دیتا ہے، تاکہ وہ اس کے ذریعے اشیاء و خدمات بغیر کسی فی الفور ادائیگی کے خرید سکے، کیونکہ جاری کنندہ ادائیگی کی ضمانت لیتا ہے۔ اس کی ایک قسم کے ذریعے بینکوں سے نقد رقم بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔''

عالمی سطح پر مختلف ادارے اس طرح کے کارڈز جاری کرتے ہیں، اس سلسلے میں جن اداروں کو سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی ہے وہ درج ذیل تین ادارے ہیں:

۱۔ ویزا کارڈ (visa card)

۲۔ ماسٹر کارڈ (master card)

۳۔ امریکن ایکسپریس (american express)

کارڈز کی اقسام

مختلف خدمات اور سہولتوں کے اعتبار سے یہ کارڈز چار قسم کے ہیں:

(۱) قرارات وتوصيات مجمع الفقه الإسلامي التابع لمنظمة المؤتمر الإسلامي ۱ – ۱۷٤، ص: ۱۰۰

۱۔ ڈیبٹ کارڈ(Debit Card)

اس کارڈ کو عربی میں "بطاقة الحسم الفوري" کہتے ہیں۔ یہ کارڈ صرف ایسے شخص کے لیے جاری کیا جاتا ہے جس کا ادارے میں اکاؤنٹ اور اکاؤنٹ میں بیلنس موجود ہوتا ہے۔ حامل کارڈ جب بھی کارڈ استعمال کرتا ہے، ادارہ اس کے اکاؤنٹ میں موجود رقم سے اس کی ادائیگی کر دیتا ہے۔ اِس کارڈ میں کسی قسم کے ادھار کی سہولت نہیں ہوتی اور نہ ہی کسی قسم کا سود دینا پڑتا ہے۔ اس کارڈ سے اشیاء کی خریداری ہو سکتی ہے، نقد رقم بھی نکالی جا سکتی ہے اور دیگر خدمات اور سروسز کے واجبات کی ادائیگی بھی اس کے ذریعے کی جا سکتی ہے۔

۲۔ چارج کارڈ(Charge Card)

اس کو عربی میں "بطاقة الائتمان والحسم الآجل" کہتے ہیں۔ اس کارڈ کے حامل کا ادارے میں پہلے سے اکاؤنٹ موجود نہیں ہوتا۔ اگر اکاؤنٹ موجود ہو تو اس میں بیلنس کا ہونا ضروری نہیں ہوتا، اسی لیے اس میں حامل کارڈ کو اُدھار کی سہولت حاصل ہوتی ہے، لہذا جب وہ کارڈ کو استعمال کر لیتا ہے تو بینک اس کی طرف سے ادائیگی کر دیتا ہے اور حامل کارڈ کو چند ایام کی مہلت دے دی جاتی ہے۔ اگر حامل کارڈ وقت کے اندر ادائیگی نہیں کرتا تو اس کے کارڈ کا اجراء منسوخ کر دیا جاتا ہے اور طے شدہ مدت میں ادائیگی نہ کرنے کی صورت میں حامل کارڈ کو سود بھی دینا پڑتا ہے۔ اس مدت کو انگریزی میں (grace period) اور عربی میں "فترة السماح" کہتے ہیں۔ اس کارڈ میں اس وقت تک کارڈ کی تجدید نہیں کی جاتی جب تک حامل کارڈ سابقہ واجبات ادا نہ کر لے۔

۳۔ کریڈٹ کارڈ(Credit Card)

اس کارڈ کا عربی نام "بطاقة الائتمان المتجدد" ہے۔ اس کارڈ کے حامل کا بھی ادارے میں کوئی اکاؤنٹ اور اس میں بیلنس ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ اگر اس کے ذریعے نقد رقم حاصل کی جائے تو اس پر فی الفور سود لگنا شروع ہو جاتا ہے، لیکن اشیاء کی خریداری کی صورت میں ادارہ حامل کارڈ کو ایک متعین وقت فراہم کرتا ہے جس میں ادائیگی کی صورت میں سود ادا نہیں کرنا پڑتا، لیکن اگر اس مدت سے تاخیر ہو گئی تو پھر سود لگنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس میں تجدید مدت (rescheduling) کی سہولت بھی موجود ہوتی ہے، یعنی حامل کارڈ سابقہ واجبات ادا کیے بغیر مزید مہلت اور مدت حاصل کر لیتا ہے، لیکن اس کی وجہ سے شرح سود میں اضافہ ہو جاتا ہے۔[1]

---

[1] المعايير الشرعية ص: ۱۰، رقم المعيار:۲

چارج کارڈ اور کریڈٹ کارڈ میں مزید فروق یہ ہیں کہ چارج کارڈ میں ہر ماہ مکمل ادائیگی کرنی ہوتی ہے، جبکہ کریڈٹ کارڈ میں یہ ضروری نہیں ہے۔ چارج کارڈ میں عموماً سالانہ فیس ہوتی ہے، جبکہ کریڈٹ کارڈ میں سالانہ فیس بہت کم یا بالکل نہیں ہوتی۔ کریڈٹ کارڈ بنسبت چارج کارڈ کے بڑے پیمانے پر قبول کیے جاتے ہیں۔ ماہرین نے ان کے علاوہ بھی کئی باریک فروق لکھے ہیں، تاہم بنیادی فروق یہی ہیں جو اوپر لکھ دیے گئے ہیں۔

۴۔ اے ٹی ایم کارڈ (ATM Card)

یہ "automated teller machine" کا مخفف ہے۔ یہ کارڈ ادارہ اپنے کھاتہ داروں کو اس غرض سے جاری کرتا ہے کہ وہ جہاں چاہے اے ٹی ایم مشین سے اپنی ضرورت کے بقدر نقد رقم نکال سکے، گویا کہ یہ صرف رقم نکالنے کا کارڈ ہے۔ یہ کارڈ کبھی کبھی سابقہ تینوں کارڈز کے ضمن میں بھی دے دیا جاتا ہے کہ اُسی کارڈ کو اے ٹی ایم کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

کارڈز کے شرکاء

کارڈز جاری کرنے، اسے وصول کرنے اور استعمال کرنے کی تفصیل کو دیکھا جائے تو اس معاہدے میں درج ذیل افراد شامل ہوتے ہیں:

۱۔ عالمی ادارے:

اس کو عربی میں "المركز العالمي للبطاقة" اور انگریزی میں (card networks) کہتے ہیں۔ عالمی اداروں میں مشہور ویزا، ماسٹر کارڈ اور امریکن ایکسپریس ہیں۔ عموماً کارڈز پر ان اداروں کے ٹریڈ مارک چلتے ہیں اور یہی ادارے کارڈز کی نوعیت طے کرتے ہیں اور روزانہ کلیرنس کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ یہ ادارے مختلف بینکوں اور اداروں کو اپنے نام کے کارڈز جاری کرنے کی اجازت دیتے ہیں اور اس پر باقاعدہ ان سے فیس وصول کرتے ہیں۔

۲۔ جاری کنندہ:

اس کو عربی "البنك المصدر" اور انگریزی میں (issuing bank) کہتے ہیں۔ یہ وہ بینک یا ادارہ ہوتا ہے جو کارڈ جاری کرتا ہے اور حامل کارڈ کے کارڈ استعمال کرنے کی صورت میں تاجر کو رقم کی ادائیگی کرتا ہے۔

۳۔ حامل کارڈ:

اس کو عربی میں "حامل البطاقة" اور انگریزی میں (card member/card holder) کہتے ہیں۔ وہ شخص جو اپنے نام پر کارڈ حاصل کرتا ہے اور اسے اپنی ضرورت کے تحت استعمال کرتا ہے۔

۴۔ تاجر:

اس کو عربی میں ''التــاجر''اور انگریزی میں (mercant) کہتے ہیں۔ جس سے حامل کارڈ خریداری کرتا ہے اور پھر وہ اپنی رقم براہ راست یا بالواسطہ کارڈ جاری کرنے والے بینک یا ادارے سے وصول کرتا ہے۔

۵۔ تاجر کا بینک:

اس کو عربی میں ''مصرف التاجر''اور انگریزی میں (merchant's bank) کہتے ہیں۔ یہ بینک ہر صورت میں نہیں ہوتا، کیونکہ اگر تاجر کارڈ جاری کرنے والے بینک سے براہ راست رابطہ کر کے اپنی رقم وصول کر لیتا ہے تو تاجر کے بینک کی ضرورت نہیں ہوتی، لیکن اگر تاجر اپنے بینک سے رابطہ کر کے اس کے واسطے سے کارڈ جاری کرنے والے ادارے سے اپنی رقم وصول کرتا ہے تو درمیان میں تاجر کا بینک بھی عمل کرتا ہے۔

فقہی حیثیت

کارڈ ہولڈر، تاجر (دکاندار) اور کارڈ جاری کرنے والے ادارے کے درمیان ہونے والے اس معاہدے کی فقہی حیثیت کیا ہے؟ اس سلسلے میں علماء معاصرین کی مختلف آراء سامنے آئی ہیں، اُن میں سے درج ذیل تین زیادہ مشہور ہیں:

ا۔ وکالہ:

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ ''عقدِ وکالہ'' ہے، گویا کہ کارڈ ہولڈر نے کارڈ جاری کرنے والے ادارے کو ادائیگی کا وکیل بنا دیا، لہذا کارڈ ہولڈر، مؤکل اور ادارہ، وکیل ہے، جبکہ تاجر (یعنی دکاندار) بائع اور کارڈ ہولڈر، خریدار ہے۔

التكييف السائد لهذه العلاقة - علاقة صاحب البطاقة بالبنك - هو عقد الوكالة حيث يكون البنك فيه وكيلا لصاحب البطاقة، ويكون صاحب البطاقة الآمر بالدفع موكلا، والتاجر مستفيدا.[1]

لیکن یہ فقہی تکییف درست معلوم نہیں ہوتی، کیونکہ عقدِ وکالت میں وکیل کی ذمہ داری صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ ادائیگی کر دے، جبکہ اس معاملے میں کارڈ جاری کرنے والا ادارہ صرف ادائیگی نہیں کرتا، بلکہ وہ اس رقم کا باقاعدہ ضامن بھی ہوتا ہے اور وکالت میں ضمانت نہیں پائی جاتی۔

۲۔ کفالہ:

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ معاملہ ''عقدِ کفالہ'' کا ہے جس میں اصل مقروض کے ساتھ ساتھ شخصِ ثالث

[1] مجلة مجمع الفقه الإسلامي ٢/ ٢٣٦١٣ (الدكتور عبد الستار الخويلدي)

(ضمانت لینے والے) سے بھی قرض کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے، لہذا کارڈ ہولڈر (یعنی اصل مقروض) مکفول عنہ ہے، کارڈ جاری کرنے والا ادارہ، کفیل اور تاجر، مکفول لہ ہے۔

العلاقة بين مصدر البطاقة وحاملها فيها معنى الضمان: لأن المصدر ضامن للديون المتعلقة بذمة حامل البطاقة تجاه التجار الذين يشترون منهم والضمان (الكفالة) التزام ما في ذمة الغير.[1]

اگر غور کیا جائے تو یہ تکییف دو وجہ سے درست معلوم نہیں ہوتی:

۱۔ایک تو اس لیے کہ عقدِ کفالہ میں شخصِ ثالث (ضمانت لینے والے) کا ذمہ اصل مقروض کے ذمہ کے ساتھ مل جاتا ہے اور قرض خواہ کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ جس سے چاہے اپنے قرض کا مطالبہ کر سکتا ہے، جبکہ یہاں ایسی صورتحال نہیں ہے، کیونکہ کارڈ ہولڈر، کارڈ دکھا کر بری ہو جاتا ہے، اس کے بعد تاجر صرف ادارے سے ہی مطالبہ کر سکتا ہے، اصل مقروض سے مطالبہ نہیں کیا جاتا۔

۲۔دوسرے اس لیے بھی کہ اس معاملہ میں مکفول لہ (تاجر) غیر متعین ہے، یہ معلوم نہیں ہے کہ کارڈ ہولڈر کہاں کارڈ استعمال کرے گا۔

۳۔حوالہ:

تیسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ معاملہ ''حوالہ'' ہے جس میں قرض، اصل مقروض کے ذمہ سے دوسرے شخص (ادائیگی کی ذمہ داری لینے والے) کے ذمہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی اصل مقروض کارڈ ہولڈر ہے، جس کا قرض ادارے کی طرف منتقل ہو گیا، لہذا کارڈ ہولڈر، محیل ہے۔ادارہ، محتال علیہ اور تاجر، محتال لہ ہے۔ یہی تکییف زیادہ درست معلوم ہوتی ہے۔[2]

دو باتیں:

تاہم یہاں مزید دو باتیں ذہن میں رہنی چاہیے:

۱۔اگرچہ بعض صورتوں میں اس معاملے میں تین سے زیادہ فریق جمع ہو جاتے ہیں، جیسے حاملِ کارڈ، اس کا بینک، تاجر، اس کا بینک اور کارڈ جاری کرنے والا ادارہ، لیکن عموماً تین ہی فریق ہوتے ہیں، (حاملِ کارڈ، تاجر، ادارہ یعنی بینک)

(۱) مجلة مجمع الفقه الإسلامي ۲/ ۱۳۵۱٤. بطاقات الائتمان: الدكتور محمّد علي القري بن عيد

(۲) فقه البيوع ٤٥٣/۱

کیونکہ کارڈ جاری کرنے والا عالمی ادارہ ہر ملک میں کسی بینک کو اپنے نام کے کارڈ جاری کرنے کی اجازت دے دیتا ہے اور اس کے بدلے اس سے فیس لیتا ہے، لہذا بینک ہی کارڈ جاری کرتا ہے، البتہ اگر درمیان میں تاجر کا بینک آجائے، مثلاً تاجر اپنے بینک میں بل دے کر رقم وصول کرلے اور تاجر کا بینک، کارڈ جاری کرنے والے بینک کو بل بھیج کر اس سے وصولی کرلے تو اس صورت میں بقیہ تفصیل وہی رہے گی جو پہلے بیان ہو چکی ہے، البتہ تاجر کا بینک تاجر کا وکیل قرار دیا جائے گا۔

۲۔دوسری بات یہ کہ حوالہ کی دو قسمیں ہیں: ایک ''حوالہ مطلقہ'' ہے، جس میں ضمانت لینے والے (محتال علیہ) کے پاس مقروض کی رقم موجود نہیں ہوتی اور نہ اس کے ساتھ ادائیگی کو مربوط کیا جاتا ہے، یہ صورت عموماً ''چارج کارڈ'' اور ''کریڈٹ کارڈ'' میں ہوتی ہے، جس میں حاملِ کارڈ کا ادارے میں کوئی اکاؤنٹ یا بیلنس نہیں ہوتا کہ جس سے ادارہ ادائیگی کرے۔ حوالہ کی دوسری قسم ''حوالہ مقیدہ'' کی ہے، جس میں ادائیگی کو اس رقم کے ساتھ مقید و مربوط کرلیا جاتا ہے جو اصل مقروض کی ہوتی ہے اور ضمانت لینے والے (محتال علیہ) کے پاس رکھی ہوتی ہے، یہ صورت ''ڈیبٹ کارڈ'' میں پائی جاتی ہے، جس میں ادارہ، حاملِ کارڈ کے اکاؤنٹ سے رقم کی ادائیگی کرتا ہے۔[1]

کارڈ ہولڈر اور تاجر سے فیس لینا

کارڈ جاری کرنے والا ادارہ کارڈ جاری کرنے پر حاملِ کارڈ اور تاجر دونوں سے فیس وصول کرتا ہے، ذیل میں اس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:

ا۔حاملِ کارڈ سے فیس لینا:

ادارہ، حاملِ کارڈ سے دو قسم کی فیس وصول کرتا ہے:

الف۔رسوم عضویہ (membership fee)

ب۔رسوم سنویہ (annual fee)

''رسوم عضویہ'' سے مراد وہ فیس ہے جو ادارہ شروع میں کارڈ جاری کرنے کے وقت وصول کرتا ہے، یہ ایک متعین اور لم سم رقم ہوتی ہے اور صرف ایک بار لی جاتی ہے، جبکہ ''رسوم سنویہ'' سے مراد وہ فیس ہے جو کارڈ کی تجدید (Renew) پر لی جاتی ہے، یہ بھی متعین رقم کی صورت میں ہوتی ہے، البتہ یہ فیس ''رسوم عضویہ'' سے کم ہوتی ہے۔

اس فیس کے بارے میں علماء عصر کی دو رائے ہیں:

---

[1] مجلة الأحكام العدلية (المادّة:٦٧٨) و(المادّة:٦٧٩)

۱۔ پہلی رائے:

پہلی رائے یہ ہے کہ حاملِ کارڈ سے اس طرح کی فیس وصول کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ اس قرض پر نفع لیا جارہا ہے جو ادارہ، حاملِ کارڈ کی طرف سے ادائیگی کر کے اس کو فراہم کرتا ہے،اور قرض پر نفع لینا سود کے زمرے میں آتا ہے، لہٰذا یہ جائز نہیں ہے۔ لیکن یہ رائے درج ذیل وجوہات کی بناء پر درست معلوم نہیں ہوتی:

الف۔ یہ فیس، قرض کے ساتھ مرتبط نہیں ہوتی، کہ جتنا قرض لیا جائے گا، اُتنی فیس وصول کی جائے گی، بلکہ ایک متعین رقم ہوتی ہے، خواہ قرض زیادہ ہو یا کم۔

ب۔ اگر کوئی حاملِ کارڈ اپنے کارڈ کو بالکل استعمال نہ کرے تو اس سے بھی یہ فیس لی جاتی ہے، حالانکہ اس صورت میں کارڈ ہولڈر کو کسی قسم کا کوئی قرض نہیں دیا گیا۔

ج۔ ڈیبٹ کارڈ میں بھی یہ فیس وصول کی جاتی ہے، حالانکہ اس میں ادارہ، حاملِ کارڈ کو کوئی قرض فراہم نہیں کرتا، بلکہ اُسی کے اکاؤنٹ سے ادائیگی کرتا ہے۔

ان تینوں باتوں کے مجموعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ فیس، قرض کی بنیاد پر نہیں لی جاتی، لہٰذا اسے سود نہیں کہا جاسکتا۔

۲۔ دوسری رائے:

دوسرے اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ کارڈ ہولڈر سے اس قسم کی فیس لینا شرعاً جائز ہے، کیونکہ یہ اُن خدمات کی اُجرت و معاوضہ ہے جو ادارہ، حاملِ کارڈ کے لیے انجام دیتا ہے، جیسے کارڈ بنوانا، اس کا اکاؤنٹ کھول کر حساب و کتاب رکھنا، بذریعہ ڈاک اس کو معلومات فراہم کرنا، کارڈ قبول کرنے والے تاجروں کی طرف راہنمائی کرنا اور اس جیسی دوسری خدمات جن میں ادارے کا عملہ اور مشینیں وغیرہ استعمال ہوتی ہیں، لیکن یہ ضروری ہے کہ یہ فیس ''اجرتِ مثل'' ہو۔ اجرت مثل کا مطلب یہ ہے کہ وہاں اس طرح کی خدمات پر عموماً جو معاوضہ لیا جاتا ہے وہی لیا جائے۔[1]

۲۔ تاجر سے فیس لینا:

کارڈ جاری کرنے والا ادارہ، کارڈ قبول کرنے والے تاجر ودکاندار سے بھی فیس وصول کرتا ہے۔ یہ فیس بیچی جانے والی اشیاء وخدمات میں ایک خاص تناسب سے مقرر کی جاتی ہے، جیسے دو فیصد (2٪) یا چار فیصد (4٪) وغیرہ۔

تاجر سے اس قسم کی فیس لینا جائز ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں معاصر علماء کی تین آراء سامنے آئی ہیں:

---

[1] فقه البیوع ۱/۴۵۸

۱۔ پہلی رائے:

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ فیس بل آف ایکسچینج (bill of exchange) کی کٹوتی کی طرح ہے، جس طرح اُس میں قرض خواہ اپنے قرض کو جلدی وصول کرنے کے لیے کسی بینک وغیرہ سے کچھ کم رقم لے کر اُس کو اپنا بل فروخت کردیتا ہے، اسی طرح یہاں بھی تاجر کا جو قرض حاملِ کارڈ کے ذمہ لازم تھا، اُس کو جلدی وصول کرنے کے لیے تاجر کچھ فیس دے کر کارڈ جاری کرنے والے ادارے سے اپنا قرض وصول کرلیتا ہے، لہذا جس طرح بل آف ایکسچینج کی کٹوتی سود ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے، اسی طرح یہ فیس بھی ناجائز ہے۔

لیکن یہ رائے درست معلوم نہیں ہوتی، کیونکہ بل آف ایکسچینج میں ''بیع مؤجل''، یعنی اُدھار معاملہ ہوتا ہے اور قرض کی وصولی کے لیے مستقبل کی ایک تاریخ مقرر کرلی جاتی ہے، جبکہ یہاں ایسی بات نہیں ہے، بلکہ یہاں معاملہ نقد ہی کا ہوا ہے، صرف حاملِ کارڈ نے خود رقم اداء کرنے کے بجائے تاجر کو ادارے کے سپرد کردیا ہے، لہذا دونوں میں فرق ہے۔

۲۔ دوسری رائے:

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ فیس لینا جائز ہے، کیونکہ ادارہ، تاجر کے لیے اس کام کا وکیل ہے کہ وہ کارڈ ہولڈر سے قرض لے کر تاجر کے حوالے کردے، لہذا یہ فیس وکالت کی اجرت ہے جو کہ جائز ہے۔

اگرچہ اس رائے پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ اگر ادارہ، تاجر کا وکیل ہے تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ ادارہ پہلے حاملِ کارڈ سے قرض وصول کرتا اور اس کے بعد تاجر کے حوالے کرتا، حالانکہ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ ادارہ اپنی طرف سے ادائیگی کرتا ہے اور پھر حاملِ کارڈ سے وصول کرتا ہے، لیکن اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ ایسا انتظامی مصلحت کی وجہ سے کیا جاتا ہے، تاکہ حاملِ کارڈ اور تاجر کے ساتھ ربط بحال رہے، اس میں کوئی شرعی خرابی نہیں ہے۔

۳۔ تیسری رائے:

تیسری رائے یہ ہے کہ کارڈ کا معاملہ ''حوالہ'' ہے اور حوالہ میں ضمانت لینے والا (ادارہ) جتنی ادائیگی کرتا ہے، اصل مقروض (حاملِ کارڈ) سے صرف اُتنی رقم کا ہی مطالبہ کرسکتا ہے، لیکن اس کے باوجود یہ فیس درج ذیل وجوہات کی بناء پر جائز ہے:

الف- حاملِ کارڈ اور تاجر کے درمیان نقد معاملہ ہوتا ہے، اُدھار کا معاملہ نہیں ہوتا، لہذا ادارے کے ذمے بھی (حوالہ کی وجہ سے) ''دینِ حال'' لازم ہے اور دیونِ حالہ میں کمی کرنا جائز ہے، یہ ''ضع وتعجل'' کی ممانعت میں نہیں آئے گا، کیونکہ وہ صرف دیون مؤجلہ کے ساتھ خاص ہے۔

ب-ادارہ، تاجر کو ایک مشین فراہم کرتا ہے جس کے ذریعے تاجر کارڈ چیک کرتا ہے، اس فیس کو اُس مشین کی اجرت قرار دی جاسکتی ہے۔

ج-ادارہ، تاجر کو وہ اَوراق بھی فراہم کرتا ہے جس پر وہ حاملِ کارڈ سے دستخط لیتا ہے، اس فیس کو اُن اوراق کا معاوضہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

د-کارڈ جاری کرنے والا ادارہ، تاجر کے لیے کسٹمر اور گاہک فراہم کرتا ہے، لہذا یہ عمل ''سمسرہ'' یعنی دلالی کے مشابہ ہے اور دلالی پر اجرت لینا جائز ہے۔ (۱)

کارڈز کے استعمال کا شرعی حکم

ا۔ڈیبٹ کارڈ کا استعمال اور اس کے ذریعے خرید و فروخت جائز ہے، تاہم حاملِ کارڈ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ کارڈ کو کسی غیر شرعی کام میں استعمال نہ کرے۔

۲۔چارج کارڈ کو تین شرائط کے ساتھ استعمال کرنے کی گنجائش ہے:

الف-ڈیبٹ کارڈ مہیا نہ ہو یا اس سے ضرورت پوری نہ ہو رہی ہو، اگر ڈیبٹ کارڈ سے ضرورت پوری ہو رہی ہے تو چارج کارڈ استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

ب-کارڈ ہولڈر اس بات کا مکمل انتظام کرے کہ وہ معین مدت (grace period) سے پہلے ادائیگی کرلے، تاکہ سود عائد ہونے کا امکان باقی نہ رہے۔

ج-حاملِ کارڈ کی ذمہ داری ہے کہ وہ کارڈ کو غیر شرعی کاموں میں ہرگز استعمال نہ کرے۔

۳۔عام حالات میں کریڈٹ کارڈ کا استعمال جائز نہیں، اس کی بجائے ''ڈیبٹ کارڈ'' کا استعمال کرنا چاہیے، تاہم اگر ڈیبٹ کارڈ مہیا نہ ہو تو انتہائی ناگزیر حالات میں اور مجبوری کی صورت میں کریڈٹ کارڈ کا استعمال اُن تین شرائط کے ساتھ جائز ہے جو چارج کارڈ کے استعمال کے سلسلے میں اُوپر بیان ہو چکی ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ ایک بات یہ بھی ہے کہ اگرچہ حامل کارڈ سود عائد ہونے سے پہلے پہلے ادائیگی کر بھی لے، تاہم چونکہ کریڈٹ کارڈ کا معاہدہ سود کی بنیاد پر ہوتا ہے، لہذا حامل کارڈ پر لازم ہے کہ وہ سودی معاہدہ کرنے پر توبہ و استغفار بھی کرے۔ (۲)

---

(۱) فقه البيوع ٤٦١/١

(۲) فتاوی عثمانی ۳۵۴/۳

۴۔اے ٹی ایم کارڈ کا استعمال بلاشبہ جائز ہے۔
اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ نے کریڈٹ کارڈز کو بالکل حرام قرار دیا ہے، جبکہ ڈیبٹ کارڈز وغیرہ کی مشروط اجازت دی ہے۔اس حوالے سے اکیڈمی کی ایک قرارداد ہے، جس کا اہم حصہ ذیل میں لکھا جاتا ہے:

أولا: لا يجوز إصدار بطاقة الائتمان غير المغطاة ولا التعامل بها إذا كانت مشروطة بزيادة فائدة ربوية، حتى ولو كان طالب البطاقة عازما على السداد ضمن فترة السماح المجاني.

ثانيا: يجوز إصدار البطاقة غير المغطاة إذا لم تتضمن شرط زيادة ربوية على أصل الدين. ويتفرع على ذلك:

أ۔ جواز أخذ مصدرها من العميل رسوما مقطوعة عند الإصدار أو التجديد بصفتها أجرا فعليا على قدر الخدمات المقدمة منه.

ب ۔ جواز أخذ البنك المصدر من التاجر عمولة على مشتريات العميل منه، شريطة أن يكون بيع التاجر بالبطاقة بمثل السعر الذي يبيع به بالنقد.

ثالثا: السحب النقدي من قبل حامل البطاقة اقتراض من مصدرها، ولا حرج فيه شرعا إذا لم يترتب عليه زيادة ربوية ، ولا يعد من قبيلها الرسوم المقطوعة التي لا ترتبط بمبلغ القرض أو مدته مقابل هذه الخدمة. وكل زيادة على الخدمات الفعلية محرمة ، لأنها من الربا المحرم شرعا ، كما نص على ذلك المجمع في قراره رقم ١٣ (٢/١٠) و ١٣ (٣/١).

رابعا: لا يجوز شراء الذهب والفضة وكذا العملات النقدية بالبطاقة غير المغطاة.[1]

"**اولا**۔ اگر سود کی شرط لگائی جائے تو کریڈٹ کارڈ کا اجراء اور اس کا استعمال جائز نہیں ہے، اگرچہ حامل کارڈ کا یہ عزم ہو کہ مدتِ مہلت کے اندر اندر ادائیگی کر دے گا۔

ثانیا۔ اگر اصل قرض پر سود لینے کی شرط نہ لگائی جائے تو کریڈٹ کارڈ کا اجراء جائز ہے۔

اس پر یہ مسائل متفرع ہوتے ہیں کہ:

الف۔ کارڈ کے اجراء یا تجدید کے بدلے حامل کارڈ سے خدماتِ فعلیہ کا معاضہ ایک متعین فیس کی صورت میں لینا جائز ہے۔

---

[1] قرارات وتوصيات مجمع الفقه الإسلامي التابع لمنظمة المؤتمر الإسلامي ١ - ١٧٤ (ص: ١٨٧) قرار رقم: ١٠٨ (١٢/٢)

ب- بینک کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ وہ تاجر سے خریداری کے بدلے فیس وصول کرے، بشرطیکہ کارڈ پر فروخت کرنے والا تاجر بازاری قیمت پر اشیاء فروخت کرے۔

ثالثا- حاملِ کارڈ، بینک سے جو نقد رقم لیتا ہے وہ شرعاً قرض کے حکم میں ہے اور اس میں فی نفسہ کوئی حرج نہیں ہے، بشرطیکہ اس پر سود کی شرط نہ لگائی جائے۔ اور جو متعین فیس لی جاتی ہے، جس کا قرض کی مقدار یا مدت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، وہ سود نہیں ہے۔ البتہ خدماتِ فعلیہ سے زیادہ رقم لینا سود کے زمرے میں آئے گا۔

رابعا- کریڈٹ کارڈ کے ذریعے سونا، چاندی اور کرنسی خریدنا جائز نہیں ہے۔''

نکتہ: سودی معاہدہ

یہاں ایک شبہ ہوتا ہے کہ چارج کارڈ اور کریڈٹ کارڈ کے استعمال کی چند شرائط کے ساتھ اجازت دے دی گئی ہے، حالانکہ اُن میں سودی معاہدہ ہوتا ہے، اس طرح کے سودی معاہدہ میں ملوث ہونا شرعاً کیسے جائز ہو سکتا ہے؟ جیسے سابقہ قرارداد میں بھی کریڈٹ کارڈ کو سودی معاہدہ کی وجہ سے ناجائز لکھا ہے۔

بعض علماء نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ جب کسی کو مکمل اطمینان ہو کہ وہ وقت کے اندر ادائیگی کر لے گا تو اس کے لیے اس طرح کے معاہدے میں شریک ہونے کی گنجائش ہے، کیونکہ اُسے یہ علم ہوگا کہ اس سودی معاہدے پر مستقبل میں عمل ہونا ہی نہیں ہے، لہٰذا ضرورت کے وقت اس طرح کے معاہدے میں شرکت کی جاسکتی ہے۔ اس کے لیے بطورِ دلیل وہ حدیث پیش کی جاتی ہے جس میں آتا ہے کہ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا (جو کہ پہلے باندی تھی) کو خرید رہی تھی تو اس کے موالی یہ شرط عائد کر رہے تھے کہ اس کا ''ولاء'' ہمارا ہوگا۔ آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس شرط کی اجازت دے دی اور فرمایا: ''اُن کے لیے ولاء کی شرط رکھ دو، کیونکہ ولاء تو آزاد کرنے والے کے لیے ہوتی ہے۔''[1] چونکہ اس شرط پر مستقبل میں عمل نہیں ہونا تھا، اس لیے آپ ﷺ نے اس کی اجازت دے دی، اسی طرح یہاں بھی گنجائش ہے۔

البتہ شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ یہ دلیل کمزور ہے، کیونکہ حدیث میں جس شرط کا ذکر ہے، اُس کو ختم کرنا اور اس پر عمل نہ کرنے دینا آپ ﷺ کی قدرت اور اختیار میں تھا، جبکہ یہاں ایسا نہیں ہے، کارڈ ہولڈر کو اس طرح کی شرط پر عمل نہ کرنے کا اختیار نہیں ہوتا، لیکن اُن کا کہنا ہے کہ آج کل کے معاملات میں اس

(۱) صحيح البخاري، حديث نمبر:۲۱۶۸

طرح کی شرائط کی کثرت ہو چکی ہے، (جس کو عموم بلوی کہتے ہیں) جیسا کہ ٹیلیفون اور بجلی وغیرہ کے بلوں میں تاخیر پر جرمانہ کی شرط ہوتی ہے، لہذا وہاں یہ کہنا مشکل کا باعث ہوگا کہ اس طرح کے معاملہ میں سرے سے شریک ہونا ہی جائز نہیں ہے۔ اسی طرح یہاں بھی اگر ڈیبٹ کارڈ یا دوسرے ذرائع سے ضرورت پوری نہ ہو سکتی ہو تو حاجت کی وجہ سے اس طرح کے معاہدے میں شرکت کی گنجائش ہے، بشرطیکہ مدت کے اندر اندر ادائیگی کا پورا عزم وانتظام ہو۔[1]

کارڈز پر ملنے والے ڈسکاؤنٹس کا حکم

آج کل کریڈٹ کارڈ اور ڈیبٹ کارڈ پر کارڈ ہولڈر کو کچھ ڈسکاؤنٹ بھی دیا جاتا ہے جو کبھی فروخت کنندہ (vendor) کی طرف سے ملتا ہے تو کبھی کارڈ جاری کرنے والے بینک کی طرف سے۔ اس قسم کے ڈسکاؤنٹس کے شرعی حکم میں مندرجہ ذیل تفصیل ہے:

الف- کریڈٹ کارڈ پر ملنے والا ڈسکاؤنٹ:

ہمارے ہاں غیر سودی بینک کریڈٹ کارڈ جاری نہیں کرتے، البتہ کونشل بینک یہ کارڈ جاری کرتے ہیں اور کارڈ ہولڈر کو ڈسکاؤنٹ بھی ملتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا گیا ہے کہ صرف ناگزیر حالات اور مجبوری میں ہی کریڈٹ کارڈ کے استعمال کی گنجائش ہے تو ان حالات میں اگر کارڈ ہولڈر کو ڈسکاؤنٹ ملتا ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ کارڈ ہولڈر کو اگر فروخت کنندہ/دکاندار (vendor) کی طرف سے ڈسکاؤنٹ ملتا ہے تو اس کے لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ یہ ڈسکاؤنٹ کسی قسم کے قرض وغیرہ کی وجہ سے نہیں ملتا، نہ ہی ڈسکاؤنٹ کا یہ معاملہ مقروض (کارڈ ہولڈر) اور قرض خواہ (بینک) کے درمیان طے پایا ہے، بلکہ یہ کسی تیسرے فریق کی طرف سے ملنے والا ہدیہ/گفٹ ہے جو کہ جائز ہے۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کارڈ ہولڈر کو بینک کی طرف سے ڈسکاؤنٹ دیا جائے۔ یہ بھی شرعی اعتبار سے جائز ہے، کیونکہ اس میں کسی قسم کی شرعی خرابی نہیں ہے۔ نہ تو اس میں جوا/قمار ہے کہ کارڈ ہولڈر نے اپنی رقم کو داؤ پر لگایا ہو اور نہ ہی اس میں قرض پر نفع کے حصول (كل قرض جر نفعا فهو ربا) کی خرابی ہے، کیونکہ قرض پر ملنے والا جو نفع سود کے زمرے میں آتا ہے، اس سے مراد وہ نفع ہے جو مقروض (کارہولڈر) کی طرف سے قرض خواہ (بینک) کو دیا جائے، جبکہ یہاں صورتحال اس کے برعکس ہے۔

---

(۱) فقه البيوع ١/٤٦

ب-ڈیبٹ کارڈ پر ملنے والا ڈسکاؤنٹ:

ڈیبٹ کارڈ پر ملنے والے ڈسکاؤنٹس کی بھی دو صورتیں ہیں:

۱-ڈیبٹ کارڈ پر ملنے والا ڈسکاؤنٹ اگر فروخت کنندہ/دکاندار (vendor) کی طرف سے کارڈ ہولڈر کو دیا جارہا ہے تو یہ جائز ہے۔اس کی وجہ وہی ہے جو کریڈٹ کارڈ پر ملنے والے ڈسکاؤنٹ میں بیان ہو چکی ہے۔ یہ نفع خواہ سودی بینک کے ڈیبٹ کارڈ پر ملے یا غیر سودی بینک کے ڈیبٹ کارڈ پر، دونوں کا حکم یکساں ہے۔

۲-ڈیبٹ کارڈ پر اگر کارڈ ہولڈر کو بینک کی طرف سے ڈسکاؤنٹ دیا جارہا ہے تو اس میں سودی وغیر سودی بینکوں کے حکم میں تھوڑا فرق ہے جو کہ حسبِ ذیل ہے:

الف- سودی بینکوں کے تمام اکاؤنٹس کی فقہی حیثیت "قرض" کی ہے۔اس میں اکاؤنٹ ہولڈر قرض خواہ اور بینک مقروض ہوتا ہے۔اس لیے اس صورت میں بینک کی طرف سے ملنے والا ڈسکاؤنٹ در حقیقت قرض پر ملنے والا نفع ہے جو کہ سود کے زمرے میں آتا ہے، لہذا اس کا لینا جائز نہیں ہے۔اگرچہ قرض پر ملنے والا وہ نفع، سود ہوتا ہے جو باقاعدہ مشروط ہو، جبکہ یہ ممکن ہے کہ بینک نے ڈسکاؤنٹ کی کوئی شرط نہ لگائی ہو یا کوئی آفر نہ دی ہو، یا صرف ایک، دو بار ہی دی ہو، لیکن اس کے باوجود چونکہ یہ ڈسکاؤنٹ قرض کی بنیاد پر ملتا ہے، اس لیے اس کی اجازت نہیں ہے۔

ب- غیر سودی بینکوں کے اکاؤنٹس کی فقہی حیثیت، سودی بینکوں سے کچھ مختلف ہے۔ غیر سودی بینکوں کے کرنٹ اکاؤنٹ کی فقہی حیثیت تو قرض کی ہے، لیکن سیونگ اکاؤنٹ کی فقہی حیثیت مضاربہ یا مشارکہ ہے جس میں رقم، قرض نہیں ہوتی، بلکہ شرکت یا مضاربت کا سرمایہ (راس المال) ہوتا ہے۔

لہذا غیر سودی بینکوں کی طرف سے اگر ڈیبٹ کارڈ ہولڈر کو ڈسکاؤنٹ ملتا ہے اور کارڈ ہولڈر کا بینک میں سیونگ اکاؤنٹ ہے تو یہ ڈسکاؤنٹ لینا جائز ہے، کیونکہ یہ کسی قسم کے قرض پر ملنے والا نفع نہیں ہے۔اور اگر ڈیبٹ کارڈ ہولڈر کا غیر سودی بینک میں کرنٹ اکاؤنٹ ہے اور اس کو بینک کی طرف سے ڈسکاؤنٹ ملے تو بظاہر یہ بھی قرض پر ملنے والا نفع ہے جو کہ جائز نہیں ہونا چاہیے، لیکن معاصر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ یہ قرض پر ملنے والا نفع نہیں ہے، اس لیے یہ جائز ہے، اس کی مندرجہ ذیل وجوہات ہیں:

- یہ ڈسکاؤنٹ صرف کرنٹ اکاؤنٹ والے کو نہیں ملتا، بلکہ ہر قسم کے اکاؤنٹ ہولڈر کو ملتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرض کی بنیاد پر نہیں دیا جاتا، بلکہ کسٹمر ہونے کی حیثیت سے دیا جاتا ہے۔

- اس ڈسکاؤنٹ کے ملنے یا نہ ملنے اور اس کی مقدار کا تعلق کسٹمر کے اکاؤنٹ میں موجود رقم کے ساتھ نہیں ہوتا۔
- اکاؤنٹ کھولتے وقت اس قسم کے ڈسکاؤنٹ کے ملنے کی کوئی شرط نہیں لگائی جاتی، بلکہ یہ بینک کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے، بلکہ اگر بینک ڈسکاؤنٹ کا اعلان بھی کردے تو بھی اس کو ڈسکاؤنٹ نہ دینے کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔[1]

اس موضوع پر مزید تحقیق کے لیے مندرجہ ذیل کتب دیکھی جاسکتی ہیں:

۱-المعايير الشرعية، رقم المعيار:٢-و٦١

۲-قرارات وتوصيات مجمع الفقه الإسلامي الدولي (١-١٨٥=١٤٠٥-١٤٣٠هـ) (ص: ٢٧٧) قرار رقم: ١٣٩ (١٥/٥) بشأن بطاقات الائتمان

۳-مجلة مجمع الفقه الإسلامي، جلد:١٢- اس میں مختلف علماء کے اس موضوع پر چھ مقالے موجود ہیں۔

۴-البطاقات البنكية، دراسة فقهية قانونية اقتصادية تحليلية، دكتور عبد الوهاب

---

(۱) المعايير الشرعية، رقم المعيار:٢، و بحوث في قضايا فقهية معاصرة ١٦٣/٢

ایل سی: تعارفی وفقہی جائزہ
(Letter of Credit)

یہ مقالہ سہ ماہی مجلہ ''الصدیق'' (۲۰۱۷ء) اور میگزین ''شریعہ اینڈ بزنس'' (۲۰۱۷ء) میں شائع ہو چکا ہے۔

اس مقالہ کے بنیادی عنوانات ومباحث کا خاکہ حسبِ ذیل ہے:

- تعارف وطریقہ کار
- فقہی حیثیت
- ایل سی کے مراحل
- ایل سی پر فیس
- اطراف وفریق
- بذریعہ ایل سی بیع کا حکم
- ایل سی کی خصوصیات
- شرعی متبادل
- ایل سی کی اقسام

تعارف وطریقہ کار

روابط ومواصلات کے جدید ذرائع سے پہلے لوگ آمنے سامنے بیٹھ کر ہی معاملات کرتے تھے، یا اپنا کوئی وکیل اور نائب دوسری جگہ بھیج دیا کرتے تھے جو وہاں جاکر معاملہ کرلیتا تھا، لیکن جب سے روابط کے جدید وسائل وجود میں آگئے ہیں، اس وقت سے معاملہ کرنے والوں کے لیے ایک دوسرے کے سامنے ہونا ضروری نہیں ہوتا، بلکہ خط، ٹیلیفون، فیکس اور انٹرنیٹ کے ذریعے معاملہ ہو جاتا ہے، پھر بذریعہ ڈاک یا جہاز اور کشتی وغیرہ کے ذریعے خریدی ہوئی چیز اور قیمت وغیرہ ایک دوسرے کو بھیج دی جاتی ہے۔

جب کوئی شخص دوسری جگہ یا دوسرے ملک سے مال منگوانا چاہتا ہے تو اس کے لیے بسا اوقات، بلکہ اکثر بینکوں کو واسطہ بنانے کی ضرورت پیش آتی ہے، کیونکہ براہ راست مال منگوانا بہت مشکل ہوتا ہے، جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف خریدار کو یہ اندیشہ رہتا ہے کہ اگر اس نے پہلے قیمت بھیج دی تو اسے فروخت کنندہ کی طرف سے مطلوبہ چیز ملے گی یا نہیں؟ اسی طرح مال بھیجنے والا (exporter) یہ اطمینان حاصل کرنا چاہتا ہے کہ جب وہ مطلوبہ سامان خریدار (importer) کو بھیج دے تو اس سامان کی قیمت ملنا یقینی ہو۔ اس مقصد کے لیے وہ امپورٹر سے مطالبہ کرتا ہے کہ میرے لیے کسی بینک سے ضمانت نامہ حاصل کرلیا جائے جس میں اس بات کی گارنٹی ہو کہ یہ سامان فلاں شخص

(importer) کو فروخت کرلیا جائے، قیمت کی ادائیگی کا ذمہ دار بینک ہوگا۔اس ضمانت نامہ کو انگریزی میں لیٹر آف کریڈٹ (letter of credit) کہتے ہیں، آسانی کے لیے اسے ایل سی (L/C) کہہ دیا جاتا ہے، اور عربی میں اس کو "خطاب الاعتماد" یا "الاعتماد المستندي" کہتے ہیں۔ایل سی کھولنے کے عمل کو انگریزی میں "opening the L/C" اور عربی میں "فتح الاعتماد" کہتے ہیں۔[1]

اس کا طریقہ کار یوں ہوتا ہے کہ بینک ایل سی میں وہ تمام شرائط وصفات درج کرلیتا ہے جن کے مطابق ایکسپورٹر پر سامان بھیجنا لازم ہوتا ہے۔یہ شرائط وصفات عموماً پہلے سے ہی امپورٹر اور ایکسپورٹر کے درمیان طے ہو چکی ہوتی ہیں۔ اس کے بعد بینک ایل سی کو ایکسپورٹر یا اس کے بینک کو بھیج دیتا ہے۔ ایل سی پہنچنے کے بعد ایکسپورٹر کے ہاں مال کو بک کروا کر جہاز راں کمپنی کے حوالے کرلیا جاتا ہے اور جہاز راں کمپنی اس کے بدلے ایک رسید جاری کرتی ہے، جس کو عربی میں "بوليصة الشحن" اور انگریزی میں "bill of leading" کہتے ہیں۔یہ رسید اور دیگر متعلقہ کاغذات ایل سی کھولنے والے بینک کو بھیج دی جاتی ہیں۔ بینک یہ کاغذات وصول کرکے ایل سی کے ساتھ اس کی مطابقت کرتا ہے، اگر کسی قسم کی مخالفت نہ ہو تو امپورٹر کو کاغذات دے دیے جاتے ہیں جس کی بناء پر وہ بندرگاہ جاکر اپنا مال وصول کرلیتا ہے۔اگر کاغذات ان صفات کے مخالف ہوں جو ایل سی میں درج کی گئی تھیں تو امپورٹر کو مطلع کرلیا جاتا ہے، اگر وہ راضی ہے تو ٹھیک، ورنہ ایکسپورٹر یا اس کے بینک کو عیوب اور نقص کے بارے میں بتادیا جاتا ہے، جب ان کی طرف سے خرابیاں اور نقص دور ہو جائے تو آخر میں بینک ایکسپورٹر یا اس کے بینک کو قیمت بھیج دیتا ہے۔

---

[1] بین الاقوامی تجارت (Trade Financing) میں رقوم کی ادائیگی تین طریقوں سے ہوتی ہے:

۱-ایک طریقہ (Clean Payment) کہلاتا ہے جس میں تمام معاملات، ڈاکومنٹس وغیرہ فریقین خود ایک دوسرے کو حوالے کرتے ہیں، بینک کا کردار صرف ایک فریق کی رقم لے کر دوسرے تک پہنچانے تک ہی محدود ہوتا ہے۔اس میں سامان کی وصولی پر اگر رقم ادا کی جائے تو اسے (Open Account) کہتے ہیں اور اگر پہلے رقم ادا کرکے پھر سامان بھیجا جائے تو اسے (Advance Payment) کہتے ہیں۔

۲-دوسری قسم (Documentary Collection) کی ہے جس میں ایک فریق کمرشل اور فائنانشل ڈاکومنٹس (کاغذات) کا انتظام بینک کو سپرد کرکے اسے ہدایات دے دیتا ہے کہ دوسرے فریق سے رقم کی وصولی کرلے۔اس میں بینک رقم کی ضمانت نہیں لیتا، بلکہ صرف کاغذات کا انتظام کرتا ہے۔اس میں اگر رقم کی وصولی کے بعد امپورٹر (درآمد کنندہ) کو سامان کی وصولی کے لیے کاغذات دیے جائیں تو اس کو (D/P Documents Against Payment) کہتے ہیں اور اگر صرف امپورٹر کی طرف سے ڈرافٹ/بل کے قبول کرنے پر اسے کاغذات دیے جائیں تو اس کو (D/A Documents Against Accepience) کہتے ہیں۔

۳-تیسری قسم (L/C) کی ہے، جس کی تفصیلات کتاب میں موجود ہیں۔

معاییر شرعیہ میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

الاعتماد المستندي: هو تعهد مكتوب من بنك (يسمى المصدر) يسلم للبائع (المستفيد)، بناء على طلب المشتري (مقدم الطلب أو الآمر) مطابقا لتعليماته، أو يصدره البنك بالأصالة عن نفسه يهدف إلى القيام بالوفاء (أي بوفاء نقدي أو قبول كمبيالة أو خصمها) في حدود مبلغ محدد في أثناء فترة معينة شريطة تسليم مستندات البضاعة مطابقة للتعليمات. وبعبارة موجزة: "هو تعهد مصرفي بالوفاء مشروط بمطابقة المستندات للتعليمات".[1]

لیٹر آف کریڈٹ ایسی تحریری ضمانت ہوتی ہے جو بینک (جاری کنندہ) فروخت کنندہ (بینیفشری) کو خریدار (درخواست گزار) کی فرمائش پر اس کی ہدایت کے مطابق فراہم کرتا ہے یا بینک خود اپنے استعمال کے لیے جاری کرتا ہے، جس میں وہ ایک مخصوص رقم کی (نقدی کی صورت میں، ہنڈی کے قبول یا کٹوتی کی صورت میں) ایک مخصوص مدت میں ادائیگی کی ضمانت دیتا ہے، بشرطیکہ فروخت کنندہ طے شدہ شرائط کے موافق اشیاء کی دستاویز پیش کردے۔

مختصر الفاظ میں لیٹر آف کریڈٹ بینک کی طرف سے ادائیگی کی ضمانت ہے، بشرطیکہ دستاویزات طے شدہ ہدایات کے مطابق ہوں۔

ایل سی کے مراحل

درج بالا تعارف اور طریقہ کار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایل سی کے سلسلے میں چار مراحل آتے ہیں:

۱۔ مرحلہ عقد:

اس سے امپورٹر اور ایکسپورٹر کے درمیان ہونے والا عقد اور معاملہ مراد ہے، جس میں ایکسپورٹر، امپورٹر سے گارنٹی اور کفالت کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کو "مرحلة العقد الموثق بالاعتماد" (The Sale Contract) کہتے ہیں۔ یہ ایل سی کے اجراء سے پہلے کا مرحلہ ہے۔

۲۔ مرحلہ طلب:

پہلے مرحلہ کے بعد امپورٹر، بینک سے ایل سی کھلوانے کا مطالبہ کرتا ہے، تاکہ ایکسپورٹر کو اطلاع دی جاسکے، اس

[1] المعايير الشرعية ص: ١٢٩، رقم المعيار: ١٤

سے یہی مرحلہ مراد ہے، جس کو "مرحلة طلب فتح الاعتماد" (Application) کہتے ہیں۔

۳۔ مرحلہ اصدار:

اس مرحلہ میں بینک، ایل سی کھول کر ایکسپورٹر یا اس کے بینک کو بھیج دیتا ہے۔ اس کو "مرحلة إصدار الاعتماد وتبليغه" (Issuance of LC) کہتے ہیں۔

۴۔ مرحلہ تنفیذ:

اس مرحلہ میں بینک، ایکسپورٹر کی طرف سے بھیجے ہوئے کاغذات وصول کر کے ایل سی کے ساتھ اس کی مطابقت کرتا ہے، اس کے بعد کی مکمل کاروائی اسی مرحلہ میں آتی ہے، اس کو "مرحلة تنفيذ الاعتماد" کہتے ہیں۔[1]

اطراف و فریق

ایل سی کے سلسلے میں عموماً اور کم از کم تین فریق ہوتے ہیں، لیکن بسا اوقات تین سے زیادہ فریق بھی وجود میں آجاتے ہیں، جس کی مختصر سی وضاحت یہ ہے:

۱۔ درآمد کنندہ:

اس سے امپورٹر (importer) مراد ہے جو دوسرے ملک سے مال منگوانا چاہتا ہے اور ایکسپورٹر کے مطالبہ پر اس کے لیے بینک سے ضمانت نامہ (ایل سی) جاری کرنے کی درخواست کرتا ہے۔ اس کو عربی میں "طالب فتح الاعتماد" اور انگریزی میں (applicant) کہتے ہیں۔

۲۔ مصدِر:

اس سے وہ بینک مراد ہے جو ضمانت نامہ (L/C) جاری کرتا ہے، اس کو عربی میں "البنك المُصدِر" اور انگریزی میں (issuing bank) کہتے ہیں۔

۳۔ برآمد کنندہ:

اس سے ایکسپورٹر مراد ہے جو دوسری جگہ مال بھیجتا ہے۔ اس کو عربی میں "المستفيد" اور انگریزی میں (beneficiary) کہتے ہیں۔

۴۔ برآمد کنندہ کا بینک:

بعض اوقات ایل سی جاری کرنے والا بینک براہ راست ایکسپورٹر سے خود معاملہ کرنے کے بجائے، اس کے بینک

---

(۱) المعايير الشرعية ص:١٤٩، رقم المعيار:١٤

سے رابطہ کر کے اس کے ذریعے کاغذات کی ترسیل اور رقم کی ادائیگی وغیرہ کرتا ہے۔اس کو عربی میں "بنك المستفيد" کہہ سکتے ہیں اور انگریزی میں اس کو(seller's bank) کہتے ہیں۔

۵۔مراسل بینک:

ایل سی کھولنے والا بینک کبھی ایکسپورٹر کے ملک میں اپنے ہی کسی برانچ یا کسی دوسرے بینک سے رابطہ کر کے اس کو اپنا وکیل اور نائب بنالیتا ہے جو ایکسپورٹر کے ساتھ رابطہ رکھتا اور اس کو کاغذات بھیجتا ہے اور اس کے بھیجے ہوئے کاغذات وصول کر کے "مصدِر بینک" کو بھیجتا ہے اور مصدر بینک کی نیابت میں رقم اداء کرتا ہے۔اس کو عربی میں "البنك المراسل" اور انگریزی میں(corresponding bank / advising bank) کہتے ہیں۔

ایکسپورٹر کو عموماً یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ مراسل بینک سے رقم کا مطالبہ کرے، بلکہ وہ صرف مصدِر بینک سے ہی مطالبہ کر سکتا ہے، لیکن کبھی ایل سی کھولنے والا بینک، مراسل بینک سے تصدیق اور ایل سی کو کنفرم کرنے کا مطالبہ بھی کرتا ہے، جس کے بعد ایکسپورٹر کو اختیار حاصل ہوتا ہے کہ مصدِر بینک سے رقم کا مطالبہ کرے یا مراسل بینک سے،اس طرح کی تصدیق کے بعد مراسل بینک کو عربی میں "البنك المعزِز" اور انگریزی میں "confirming bank" کہتے ہیں۔اس تصدیقی عمل کو عربی میں "تعزيز الاعتماد" اور انگریزی میں "confirmation of the credit" کہتے ہیں۔

ایل سی کی خصوصیات

ایل سی کے سلسلے میں درج ذیل خصوصیات ذہن میں رکھنا اہم ہیں:

۱۔ایل سی جاری کرنے والے بینک کی ذمہ داری صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ ایکسپورٹر کی طرف سے بھیجے گئے کاغذات کی ایل سی کے ساتھ مطابقت کرے۔اگر موافقت پائی جائے تو بینک رقم کی ادائیگی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔بینک کے ذمہ یہ لازم نہیں ہوتا کہ وہ جاکر خود سامان چیک کرے،اس کے بعد اگر سامان میں کچھ خرابی ظاہر ہوئی تو امپورٹر خود ہی ایکسپورٹر سے رابطہ کرتا ہے، بینک کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

۲۔صرف ایل سی کھلوانے سے امپورٹر کا ذمہ بری نہیں ہوتا، بلکہ بینک کے ساتھ ساتھ اس سے بھی رقم کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے، تاہم جب تک ایل سی موجود ہو تو عموماً ایکسپورٹر صرف بینک سے ہی مطالبہ کرتا ہے اور جب کاغذات بھیجنے اور رقم وصول کرنے سے پہلے ہی ایل سی کا وقت ختم ہو جائے تو پھر ایکسپورٹر، امپورٹر سے مطالبہ کرتا ہے اور ایل سی کے وقت کے ختم ہونے سے عقد فسخ نہیں ہوتا۔

۳۔ جب ایل سی جاری کرنے والا بینک، ایکسپورٹر کی طرف سے ایسے کاغذات وصول کر لے جو ایل سی کی تمام شرائط وصفات پر پورے اترتے ہوں تو بینک پر قیمت کی ادائیگی لازم ہو جاتی ہے، الا یہ کہ کاغذات میں کوئی نقص ودھوکہ ہو یا کوئی قانونی آرڈر اور فیصلہ آ چکا ہو جس کی بناء پر عقد کو فسخ قرار دیا گیا ہو۔

۴۔ ایل سی میں دونوں فریقوں کے حقوق وذمہ داریوں کی وہی تشریح وتوضیح معتبر ہوتی ہے جو عالمی تجارتی اصطلاحات (incoterms) اور ایل سی کے متفقہ اصول اور طریقے (UCP500) کے مطابق ہو۔[1]

ایل سی کی اقسام

ایل سی کی کئی قسمیں ہیں، چند مشہور اقسام کو ہم درج ذیل تقسیمات کے تحت ذکر کرتے ہیں:

پہلی تقسیم: امپورٹر کے لحاظ سے:

۱۔ اگر امپورٹر ایل سی کھلواتے وقت سامان کی مکمل قیمت بینک کے حوالے کر دے تو اس قسم کو عربی میں "الاعتماد المغطى كليا" اور انگریزی میں "with full margin" کہتے ہیں۔

۲۔ دوسری قسم وہ ہے جس میں ضمانت نامہ (L/C) جاری کرتے وقت امپورٹر سے بالکل قیمت نہیں لی جاتی، بلکہ وہ بعد میں ادائیگی کرتا ہے۔ اس قسم کو عربی میں "الاعتماد غير المغطى" اور انگریزی میں "without margin" کہتے ہیں۔

۳۔ بعض اوقات ایل سی کھلواتے وقت کچھ قیمت بینک کو اداء کر دی جاتی ہے اور بقیہ قیمت بعد میں اداء کی جاتی ہے۔ اس کو عربی میں "الاعتماد المغطى جزئيا" اور انگریزی میں "with partial margin" کہتے ہیں۔

دوسری تقسیم: ایکسپورٹر کے لحاظ سے:

۱۔ جب خریدار (امپورٹر) اور فروخت کنندہ (ایکسپورٹر) کے درمیان ہونے والا معاملہ معجل اور نقد ہو تو ایسی صورت میں جیسے ہی بینک کو ایکسپورٹر کی طرف سے درست کاغذات موصول ہو جاتے ہیں تو بینک فوری ادائیگی کر دیتا ہے۔ اس قسم کو عربی میں "الاعتماد بالاطلاع" اور انگریزی میں "sight L/C" کہتے ہیں۔

۲۔ کبھی خریدار اور فروخت کنندہ کے درمیان معاملہ اُدھار ہوتا ہے اور صرف کاغذات کے موصول ہونے سے بینک پر ادائیگی لازم نہیں ہوتی، بلکہ ادائیگی کے لیے ایک تاریخ مقرر ہوتی ہے، جس کے آ جانے کے وقت بینک پر ادائیگی

[1] المعايير الشرعية ص:١٤٩، رقم المعيار:١٤ /Investopedia

لازم ہو جاتی ہے اس قسم کو عربی میں ''اعتماد دفع آجل'' یا ''الاعتماد المؤجل'' کہتے ہیں، جبکہ انگریزی میں اس کو "usance L/C" کہتے ہیں۔

تیسری تقسیم: قوت وضعف کے لحاظ سے:

۱۔ قابلِ نقض: اس سے مراد ایسی ایل سی ہے جس میں بینک کے لیے مستفید (ایکسپورٹر) کی اجازت کے بغیر تغیر وتبدل کرنے یا ایل سی کو ختم کر کے ضمانت سے رجوع کرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس کو عربی میں ''الاعتماد القابل للنقض أو للإلغاء'' اور انگریزی میں "revocable credit" کہتے ہیں۔

۲۔ غیر قابلِ نقض: اس سے ایسی ایل سی مراد ہے جس میں بینک کو خریدار (امپورٹر) اور فروخت کنندہ (ایکسپورٹر) کی اجازت کے بغیر تبدیلی یا رجوع کی گنجائش نہیں ہوتی، بلکہ بینک پر اپنی ضمانت اور عہد کے مطابق عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس قسم کو عربی زبان میں ''الاعتماد غیر القابل للنقض أو الإلغاء'' اور انگریزی میں "irrevocable credit" کہتے ہیں۔[1]

فقہی حیثیت

اس عنوان کے تحت ہم ایل سی کے سلسلے میں تین چیزوں کی فقہی حیثیت بیان کریں گے، جو ترتیب وار درج ذیل ہیں:

۱۔ ایل سی کے عقد کی فقہی حیثیت:

ایل سی کے تعارف، طریقہ کار اور مراحل کے تحت بیان کردہ تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ بینک بنیادی طور پر ایکسپورٹر کو رقم اداء کرنے کی ضمانت لیتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ بینک کئی دوسرے خدمات بھی سرانجام دیتا ہے، اس لیے ایل سی دراصل دو عقود کا مجموعہ ہے، ایک ''کفالہ'' اور دوسرا ''وکالہ''۔

یہ عقدِ کفالہ اس لیے ہے کہ بینک، خریدار کی طرف سے ادائیگی کی ضمانت لیتا ہے، اور عقدِ وکالت اس لیے ہے کہ بینک خریدار کا وکیل بن کر کئی خدمات سرانجام دیتا ہے، جیسے ایل سی تیار کر کے فروخت کنندہ کو بھیجنا، فروخت کنندہ کے بھیجے ہوئے کاغذات وصول کر کے ایل سی کے ساتھ مطابقت کرنا اور مخالفت کی صورت میں خریدار کو مطلع کرنا وغیرہ۔

معاییر شرعیہ میں ہے:

[1] ایل سی کی ان اقسام کے علاوہ بھی کئی اقسام ہیں، جن کی تفصیل کے لیے دیکھیں: المعايير الشرعية ص:۱٤۹، رقم المعيار:۱٤

۱/۱/۳ التعامل بالاعتماد المستندي يشتمل على وكالة بتقديم الخدمات الإجرائية ومن أهمها فحص المستندات، وعلى كفالة بضمان المؤسسة للمستورد، وكلاهما مشروع، فيكون الاعتماد المستندي مشروعا بالشروط المبنية في هذا المعيار.[۱]

ایل سی کا معاملہ وکالت پر مبنی ہے جس میں ایل سی کے انتظامی امور کی انجام دہی ہوتی ہے، ان میں اہم دستاویز کا جائزہ ہے۔ اور ایل سی (وکالت کے ساتھ ساتھ) بینک کی طرف سے کفالت پر مشتمل ہے۔ یہ دونوں عقود جائز ہیں، اس لیے ایل سی بھی جائز ہے، بشرطیکہ اس معیار میں ذکر کردہ شرائط کی رعایت کی جائے۔

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ اگرچہ ایل سی کا عقد ''کفالہ'' ہے، لیکن اس میں اور کفالہ کے عام عقد میں تھوڑا فرق ہے۔ وہ اس طرح کہ کفالہ کا عقد کسی مقروض و مدیون شخص کے دین پر مبنی ہوتا ہے، جب اصل مقروض دین ادا نہ کرے تو کفیل، دین کی ادائیگی کر دیتا ہے، جبکہ ایل سی کا عقد ایک الگ اور مستقل عقد ہوتا ہے، جس کا خریدار اور فروخت کنندہ کے درمیان ہونے والے عقد اور دین کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا، بلکہ جب بینک کو درست کاغذات موصول ہو جائے تو وہ ادائیگی کر دیتا ہے۔ لیکن محض اتنی سی بات سے یہ عقد کفالہ سے خارج نہیں ہوتا، کیونکہ یہاں کفالہ کا اصل عنصر پایا جاتا ہے کہ فروخت کنندہ کو قیمت ملنے کا اطمینان ہو، اور ایسا بھی نہیں ہوتا کہ بینک سے قیمت وصول کرنے کے بعد فروخت کنندہ، خریدار سے بھی قیمت کا مطالبہ کرے، یہی عقدِ کفالہ میں ہوتا ہے، اور بینک کا عقد کی باریکیوں میں نہ پڑنا ایک انتظامی امر ہے، لہذا یہ عقدِ کفالہ ہی ہے۔[۲]

درج بالا فقہی حیثیت کے ساتھ ساتھ کبھی قرض کا معاملہ بھی وجود میں آجاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ جب امپورٹر زیر دمار جن پر ایل سی کھلوائے اور اس کی طرف سے بینک ادائیگی کر دے تو یہ رقم امپورٹر پر قرض ہو جاتی ہے، جس پر بینک اُس سے سود وصول کرتا ہے۔ اس طرح کے قرض کو آج کل عربی میں ''تمویل الواردات'' اور انگریزی میں ''import financing'' کہتے ہیں۔

دوسری طرف اگر ایکسپورٹر (بائع) نے امپورٹر (مشتری) کے ساتھ اُدھار معاملہ کیا ہو، جس میں کاغذات بھیجنے

---

(۱) المعايير الشرعية ص: ۱۵۱، رقم المعيار: ۱٤

(۲) فقه البيوع ۱۱۰۱/۲

اور مال روانہ کرنے کے فوراً بعد ادائیگی نہیں ہوتی، بلکہ ایک مدت کے بعد ادائیگی ہوتی ہے تو ایکسپورٹر کا بینک اس کو فی الفور ادائیگی کر دیتا ہے جو کہ ایکسپورٹر پر قرض ہوتا ہے، جب بعد میں امپورٹر کے بینک کی طرف سے ادائیگی ہو جائے تو ایکسپورٹر کا بینک اس سے اپنا قرض وصول کر لیتا ہے، اس کے ساتھ وہ ایکسپورٹر سے قرض پر سود بھی لیتا ہے۔ کبھی ایکسپورٹر مال کو تیار کرنے سے پہلے ہی بینک سے قرض لے لیتا ہے۔ ایکسپورٹر کو قرض فراہم کرنے کو عربی میں "تمويل الصادرات" اور انگریزی میں "export financing" کہتے ہیں۔ اسی طرح اگر ادھار معاملہ ہو تو فروخت کنندہ (ایکسپورٹر) کے پاس جو بل (کمبیالہ) ہوتا ہے، وہ اسے بینک کو کم قیمت پر بیچ دیتا ہے اور بعد میں بینک، خریدار سے اس بل کی مکمل قیمت وصول کر لیتا ہے۔ اس کی مکمل تفصیل "ہنڈی" کے مضمون میں بیان ہو چکی ہے۔

ایل سی کی فقہی حیثیت کے بارے درج بالا رائے کے علاوہ معاصر فقہاء کی دیگر آراء بھی سامنے آئی ہیں۔ مثلاً شیخ صدیق الضریر کی رائے یہ ہے کہ یہ صرف عقدِ کفالہ ہی ہے، اس میں کسی اور عقد کا کوئی عنصر شامل نہیں ہے۔ بعض علماء کی رائے میں یہ "الخراج بالضمان" ہی کی ایک صورت اور اس پر متفرع ایک تفریع ہے۔ بعض حضرات اسے صرف عقدِ وکالہ قرار دیتے ہیں۔[1]

اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ نے ایل سی کی فقہی حیثیت کے بارے لکھا ہے کہ اگر ایل سی زیر و مار جن پر ہو تو یہ عقدِ کفالہ ہے اور اگر فل مار جن پر ہے تو یہ عقدِ وکالہ ہے۔ چنانچہ ایل سی سے متعلق قرارداد میں ہے کہ:

أولاً: أن خطاب الضمان بأنواعه الابتدائي والانتهائي لا يخلو إما أن يكون بغطاء أو بدونه، فإن كان بدون غطاء، فهو: ضم ذمة الضامن إلى ذمة غيره فيما يلزم حالاً أو مآلاً، وهذه هي حقيقة ما يعنى في الفقه الإسلامي باسم: الضمان أو الكفالة.

وإن كان خطاب الضمان بغطاء، فالعلاقة بين طالب خطاب الضمان وبين مصدره هي: الوكالة، والوكالة تصح بأجر أو بدونه مع بقاء علاقة الكفالة لصالح المستفيد (المكفول له).[2]

اولاً- ایل سی کی تمام صورتوں میں ایل سی کھلواتے وقت رقم کو جمع کیا گیا ہو گا یا نہیں؟ اگر جمع نہیں

---

[1] فقه المعاملات المالية المعاصرة. دكتور شبير احمد، ص: ۳۰۰

[2] قرارات وتوصيات مجمع الفقه الاسلامي، تابع لمنظمة الموتمر الاسلامى، ۱ - ۱۷٤ (ص: ۱۳) قرار: ۱۲ (۲/۱۲) خطاب الضمان، ومجلة مجمع الفقه الاسلامى - ع ۲، ج ۲/ص ۱۰۳۵

کیا گیا تو اس کی حقیقت یہ ہوگی کہ ایل سی کھلوانے والے پر حال یا مستقبل میں جو ذمہ داری آنے والی ہے اس میں ضامن (بینک) بھی اپنی ذمہ داری شامل کر لیتا ہے۔ اس صورت کا نام فقہ اسلامی میں ضمان یا کفالہ ہے۔ اور اگر زر ثمن جمع کیا گیا ہے تو ایل سی کھلوانے والے شخص اور ایل سی کھولنے والے (بینک) کے درمیان کے تعلق کو وکالت کہا جائے گا اور وکالت اجرت کے ساتھ بھی درست ہے اور بغیر اجرت کے بھی جائز ہے، وکالت کے ساتھ ایل سی کھلوانے والے کے لیے کفالہ بھی برقرار رہے گا۔

۲۔ امپورٹر سے لی جانے والی رقم (مارجن) کی حیثیت:

بینک ایل سی کھلواتے وقت کبھی خریدار (امپورٹر) سے سامان کی مکمل قیمت اور کبھی کچھ قیمت ابتداء میں وصول کرتا ہے، جیسا کہ ایل سی کی اقسام کے تحت بیان ہو چکا ہے۔ ایسی صورت میں یہ سوال ہوتا ہے کہ اس طرح کے رقم کی کیا حیثیت ہوگی؟ کیا یہ بینک کے پاس امانت ہے یا قرض وغیرہ؟

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اس قیمت کو وصول کرنے کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ اگر بینک نے یہ قیمت ''علی وجہ الاقتضاء'' وصول کی ہے تو بینک اس قیمت کا مالک ہو گیا، البتہ بعد میں ایکسپورٹر کو ادائیگی کرے گا۔ بطورِ اقتضاء وصول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بینک نے اس رقم کو اپنا حق سمجھ کر وصول کر لیا جو بعد میں ایکسپورٹر کو ادائیگی کرنے سے امپورٹر (خریدار) پر واجب ہوگا۔ آج کل عموماً یہی صورت ہی پیش آتی ہے۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ بینک اس رقم کو ''علی وجہ الرسالہ'' وصول کرلے، یعنی امپورٹر (خریدار) نے بینک کو اس بات کا وکیل بنادیا کہ وہ اس کی یہ رقم ایکسپورٹر کو پہنچادے۔ اس صورت میں یہ رقم بینک کے پاس امانت ہوگی۔ اگر بینک نے اس رقم کو دینے والے کی اجازت سے دوسرے اموال کے ساتھ ملادیا تو خریدار، بینک کے ساتھ شریک ہو جائے گا۔ اگر رقم کو اس کی اجازت کے بغیر دوسری رقوم کے ساتھ ملادیا تو یہ رقم بینک پر مضمون ہو جائے گی۔[1]

۳۔ مراسل بینک کی حیثیت:

اگر فروخت کنندہ خود ہی اپنا کوئی بینک مقرر کر کے یہ کہہ دے کہ اسی کو ایل سی اور قیمت وغیرہ بھیج دی جائے تو وہ بینک، فروخت کنندہ کا وکیل ہوگا۔

---

(۱) فقہ البیوع ۱۱۱۳/۲

ایل سی جاری کرنے والے بینک کے لیے براہ راست فروخت کنندہ (ایکسپورٹر) کے ساتھ رابطہ کرنا عموماً دشوار ہوتا ہے، اس لیے وہ فروخت کنندہ کے شہر یا ملک میں کسی بینک کو اپنا نائب بنالیتا ہے، جس کو مراسل بینک کہتے ہیں۔ اگر اس بینک کا کام صرف فروخت کنندہ کے ساتھ رابطہ کرنا اور کاغذات وغیرہ کی ترسیل ہو تو یہ ایل سی جاری کرنے والے بینک (مصدرِ بینک) کا وکیل کہلائے گا اور اگر اس نے مصدرِ بینک کی اجازت سے ایل سی کی تصدیق وتوثیق کر کے خود بھی ادائیگی کی ذمہ داری لی تو یہ وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ مصدرِ بینک کا کفیل بھی ہو جائے گا۔[1]

ایل سی پر فیس

اس بحث کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

پہلا حصہ: کفالہ پر فیس لینا:

پہلی بات یہ ہے کہ بینک جو گارنٹی اور ضمانت فراہم کرتا ہے، کیا اس کے بدلے امپورٹر سے فیس لینا جائز ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں معاصر علماء کی تین آراء ہیں:

۱۔ پہلی رائے:

اکثر حضرات کی رائے یہ ہے کہ صرف ایل سی جاری کرنے پر فیس لینا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ کفالہ ہے اور کفالہ ایک عقدِ تبرع ہے، عقدِ معاوضہ نہیں ہے، اس بات پر تقریباً ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے۔

البتہ یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ ایل سی جاری کرنے پر اجرت لینے کو بعض علماء نے ربا/سود قرار دیا ہے، لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ "ربا" اور سود نہیں ہے، بلکہ یہ رشوت کے زمرے میں آتا ہے، کیونکہ یہ فیس یا اجرت اس قرض کی وجہ سے نہیں لی جاتی جو بعد میں امپورٹر کی طرف سے ادائیگی کرنے کی وجہ سے اس پر لازم ہوتا ہے، بلکہ اس پر الگ سے سود وصول کیا جاتا ہے، اس لیے یہ فیس صرف ضمانت اور گارنٹی دینے کے بدلے لی جاتی ہے، لہٰذا یہ رشوت کے زمرے میں آتی ہے اور حرام ہے۔[2]

۲۔ دوسری رائے:

بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ آج کل کفالہ پر اجرت اور فیس لینا جائز ہے۔ ان حضرات کے دلائل کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے:

---

(۱) المعايير الشرعية ص: ۱۵۷، رقم المعيار: ۱۴

(۲) فقه البيوع ۲/۱۱۰۲

الف-اگرچہ کفالہ پہلے دور میں عقدِ تبرع تھا، لیکن موجودہ دور میں یہ تجارت کا لازمی جزء بن چکا ہے، جس کے لیے بہت سے ادارے وجود میں آچکے ہیں اور یہ ایک منظم پیشہ بن چکا ہے، لہذا اب یہ عقدِ تبرع نہیں رہا، اس لیے اس پر اجرت لینا جائز ہے۔[1]

ب-پہلے دور میں فقہاء نے امامت، اذان اور تعلیم قرآن وغیرہ جیسی طاعات پر اجرت لینے کو ناجائز فرمایا تھا، لیکن متاخرین فقہاء نے ضرورت کی وجہ سے اس کو جائز قرار دیا ہے، اسی طرح عقدِ کفالہ بھی ہے کہ آج کل اس کی سخت ضرورت ہے، دوسرے ممالک سے اس کے بغیر مال نہیں منگوایا جاسکتا، لہذا اگرچہ یہ عقدِ تبرع ہے، پھر بھی اس پر ضرورت وحاجت کی وجہ سے اجرت لینا جائز ہے۔

شیخ وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

إن شرط الكفيل تقديم مقابل أو أجر على كفالته، وتعذر على المكفول عنه تحقيق مصلحته من طريق المحسنين المتبرعين، جاز دفع الأجر للضرورة أو الحاجة العامة، لما يترتب على عدم الدفع من تعطيل المصالح كالسفر للخارج للدراسة أو للارتزاق، أو لتأجيل الجندية ونحوها، وأساس القول بالجواز فيه: أن الفقهاء أجازوا دفع الأجر للحاجة لأداء القربات والطاعة من تعليم قرآن وممارسة الشعائر الدينية.[2]

اگر کفیل اپنی کفالت پر کسی عوض اور اجرت کی شرط لگادیتا ہے اور مکفول عنہ کے لیے کسی دوسرے مفت میں کفالت فراہم کرنے والوں کے ذریعے اپنی مصلحت پوری کرنا دشوار ہو جائے تو ضرورت اور حاجتِ عامہ کی وجہ سے یہ اجرت دینا جائز ہے، کیونکہ ایسی اجرت نہ دینے میں کئی مصالح فوت ہو جاتے ہیں جیسے پڑھنے یا کمانے کے لیے باہر ممالک کے لیے سفر کرنا وغیرہ۔ اس اجرت کے جواز کی بنیاد یہ ہے کہ فقہاء نے حاجت کی وجہ سے قربت وطاعت جیسے تعلیم قرآن اور دینی شعائر (جیسے نماز پڑھانے، اذان دینے وغیرہ) پر اجرت دینے کو جائز فرمایا ہے۔

جوابات:

۱۔ پہلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ کوئی بھی عقدِ تبرع محض منظم پیشہ بن جانے اور تجارت کا لازمی جزء بن جانے کی

[1] مجلة مجمع الفقه الإسلامي ٢/ ٩٤٦

[2] الفقه الإسلامي وأدلته ٦/ ٣٥

وجہ سے عقدِ معاوضہ نہیں بن جاتا، ورنہ یہ بات آج کل قرض پر بھی صادق آتی ہے۔ قرض بھی اصل میں عقد تبرع ہے۔ لیکن یہ بھی آج کل تجارت کا لازمی جزء بن چکا ہے، اس کے لیے ادارے وجود میں آچکے ہیں، لیکن اس کے باوجود اس پر اجرت لینا سود ہی ہے۔

۲۔ جہاں تک امامت، اذان اور معلم کی اجرت کا تعلق ہے تو وہ ایک مجتہد فیہ مسئلہ تھا، کئی فقہاء نے اس کو پہلے سے ہی جائز قرار دیا تھا، ان کے پاس احادیث اور دوسرے دلائل بھی تھے، جبکہ کفالہ پر اجرت کا عدم جواز ایک متفقہ مسئلہ ہے، اس میں کسی فقیہ کا اختلاف نہیں ہے۔(۱)

اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ نے بھی محض کفالہ پر اجرت لینے کو ناجائز قرار دیا ہے۔ قرارداد میں ہے کہ:

إن خطاب الضمان لا يجوز أخذ الأجر عليه لقاء عملية الضمان - والتي يراعي فيها عادة مبلغ الضمان ومدته - سواء أكان بغطاء أم بدونه.

ایل سی جاری کرنے کی صورت میں عملِ ضمانت کے بدلے اجرت لینا جائز نہیں ہے، جس میں عموما ضمانت کی رقم اور اس کی ادائیگی کی مدت کو مد نظر رکھا جاتا ہے، خواہ اس کا زر ثمن جمع کرایا گیا ہو یا نہیں۔(۲)

۳۔ تیسری رائے:

آج کل بینک صرف زبانی طور پر ضمانت اور گارنٹی نہیں دیتا، بلکہ اس کے لیے کاغذی کاروائی کرنی پڑتی ہے، ایل سی تیار کر کے اُسے ایکسپورٹر کو بھیجا جاتا ہے، لہذا گارنٹی اور کفالہ پر اجرت لینا تو جائز نہیں ہے، البتہ ایل سی کی تیاری کے سلسلے میں جو ادارتی اعمال اور خدمات اداء کی جاتی ہیں، ان کی اجرتِ مثل لینا جائز ہے، یعنی ان کے بدلے اتنی فیس لی جائے جو عموما عرف میں اس جیسی خدمات پر لی جاتی ہے، جیسا کہ فقہاء نے فرمایا ہے کہ قضاء اور افتاء پر اجرت لینا جائز نہیں ہے، لیکن کسی فیصلے یا فتوی کی کتابت پر اجرتِ مثل لینا جائز ہے۔

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے اس رائے کو اختیار فرمایا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

ولكن الذي لايجوز أخذ العمولة عليه هو الضمان نفسه، وهو الذي يجب أن يكون تبرعا، أما إصدار خطاب الضمان، فليس من واجبات الكفيل، ولا أن يقوم

---

(۱) بحوث في قضايا فقهية معاصرة ۲۲۲/۱

(۲) قرارات وتوصيات مجمع الفقه الإسلامي، تابع لمنظمة المؤتمر الاسلامي، ۱ – ۱۷٤، رقم القرار: ۱۲، (ص: ۱۳)

بكتابته وإصداره تبرعا، فيجوز أن يتقاضى على ذلك أجرة. والأصل أن لايتجاوز أجر مثل الكتابة، فلاينبغي أن تكون العمولة مرتبطة بمبلغ الضمان.[1]

دوسرا حصہ: وکالت پر فیس لینا:

ایل سی جاری کرنے والا بینک صرف ادائیگی کی گارنٹی نہیں لیتا، بلکہ اس کے ساتھ وہ کئی دیگر خدمات بھی انجام دیتا ہے، جس میں وہ امپورٹر کا وکیل ہوتا ہے، جیسے امپورٹر کی بتائی ہوئی شرائط وصفات کے مطابق ایل سی تیار کرنا، اُسے ایکسپورٹر یا اس کے بینک کو بھیجنا، ایکسپورٹر کی طرف سے بھیجے گئے کاغذات وصول کرکے ایل سی کے ساتھ ان کی مطابقت کرنا، امپورٹر کو مطلع کرنا وغیرہ، لہٰذا ان خدمات کے بدلے بینک، امپورٹر سے اجرت اور فیس وصول کرسکتا ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ بینک، امپورٹر سے دو قسم کی اجرت وصول کرسکتا ہے، ایک ایل سی جاری کرنے پر بینک جو دفتری امور انجام دیتا ہے، اُن کی اجرتِ مثل اور دوسرے امپورٹر کا وکیل بن کر دیگر خدمات انجام دینے پر اجرت وصول کی جاسکتی ہے۔

معاییر شرعیہ میں ہے:

١/٣/٣ يجوز للمؤسسة أن تأخذ قيمة التكاليف الفعلية على الاعتمادات المستندية ويجوز لها أن تأخذ أجرة على القيام بالخدمات المطلوبة سواء كانت مبلغا مقطوعا أم نسبة من مبلغ الاعتماد، ويشمل ذلك الاعتمادات المستندية الصادرة والواردة.

وعلى المؤسسة أن تراعى ما يأتي:

(أ) ألا يؤخذ في الاعتبار جانب الضمان عند تقدير الأجرة في الاعتمادات المستندية.

(ب) ألا يترتب على ذلك فائدة ربوية أو يكون ذريعة إليها.

(ج) ألا يتخذ اجتماع العقود في الاعتماد المستندي ذريعة إلى ما هو محرم شرعا، كأخذ عائد على الضمان، أو القرض.[2]

ادارے کے لیے جائز ہے کہ ایل سی پر آنے والے حقیقی اخراجات کی لاگت وصول کرے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ادارہ اس خدمت کی انجام دہی کی فیس لے، چاہے وہ ایک مخصوص متعین یکمشت رقم

---

[1] فقه البيوع ١١١٤/٢

[2] المعايير الشرعية ص: ١٥٣، رقم المعيار: ١٤

ہو، یا ایل سی کی مقدار کے تناسب سے کوئی رقم ہو۔ یہ اجازت درآمدی اور برآمدی دونوں ایل سی کو شامل ہے۔ درج ذیل امور کی رعایت رکھنا ادارے پر لازم ہے:

الف-ایل سی کی اجرت متعین کرنے میں ضمانت دینے کے پہلو کو مد نظر نہ رکھے۔

ب-یہ معاملہ سود پر مشتمل نہ ہو اور نہ ہی اس کا ذریعہ بن رہا ہو۔

ج-ایل سی میں متعدد معاہدے اکٹھے کرنے کو کسی حرام کا ذریعہ نہ بنایا جائے، جیسے ضمانت کی فیس لینا، یا قرض پر سود لینا۔

تیسرا حصہ: مراسل بینک کی فیس:

ایل سی کی فقہی تکییف کے تحت مراسل بینک کے بارے میں یہ بات گزر چکی ہے کہ اگر وہ صرف کاغذات وغیرہ کی ترسیل اور رابطہ کرنے کا کام کرتا ہے تو وہ ایل سی جاری کرنے والے بینک کا "وکیل" سمجھا جائے گا، اس پر یہ مصدِر بینک سے اجرت کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ اگر اس کے ساتھ ساتھ وہ "تعزیز" کا کام بھی کرے، یعنی ایل سی جاری کرنے والے بینک کے مطالبہ پر ایل سی کی تصدیق و توثیق کر کے کاغذات وغیرہ کی ایل سی کے ساتھ مطابقت کرتا اور ادائیگی اپنے ذمہ لے لیتا ہے تو وہ وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ مصدِر بینک کا کفیل بھی ہو جائے گا۔ اس کا بھی وہی حکم ہو گا جو مصدِر بینک کے بارے میں بتا دیا گیا ہے کہ نفسِ ضمانت پر فیس لینا جائز نہیں ہے، لیکن دفتری امور کی اجرتِ مثل اور وکالت کی اجرت لینا جائز ہے۔[1] معاییرِ شرعیہ میں بھی ایل سی جاری کرنے والے اور مراسل بینک کے بارے میں یہی رائے اختیار کی گئی ہے۔[2]

بذریعہ ایل سی بیع کا حکم

ایکسپورٹر (بائع) کی طرف سے ایل سی کھلوانے کا مطالبہ کرنا شرعاً جائز ہے، کیونکہ وہ امپورٹر (مشتری) سے کفیل فراہم کرنے کا مطالبہ کر رہا ہے اور بیوعات میں اس طرح کی شرط لگانا جائز ہے۔ اگر ابھی تک امپورٹر اور ایکسپورٹر کے درمیان بیع کا معاملہ ہی نہیں ہوا تو ایکسپورٹر کی طرف سے ایل سی کا مطالبہ "کفالہ بالدرک" کا مطالبہ ہے اور یہ بھی شرعاً جائز ہے۔[3]

(۱) فقه البیوع ۱۱۱۷/۲

(۲) المعاییر الشرعیة ص: ۱۵۳، رقم المعیار: ۱٤

(۳) مجلة الأحکام العدلیة، ص: ۳۹ (المَادَّةُ ۱۸۷)

اسی طرح ایکسپورٹر (فروخت کنندہ) کے لیے امپورٹر (خریدار) کے بجائے ایل سی جاری کرنے والے بینک سے اپنی قیمت وصول کرنا بھی جائز ہے۔ اگر امپورٹر اور بینک کے درمیان کوئی خلافِ شرع امر پایا جائے، جیسے سود کا لین دین وغیرہ تو اس کی ذمہ داری امپورٹر پر آئیگی، ایکسپورٹر کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، اُسے صرف اپنی قیمت کی وصولی کے لیے اطمینان چاہیے۔

جہاں تک امپورٹر (خریدار) کی طرف سے ایل سی کھلوانے کی بات ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ ایک یہ کہ وہ بینک کو مکمل ادائیگی کر کے ایل سی کھلواتا ہے، بینک اپنی طرف سے ادائیگی نہیں کرتا اور نہ ہی امپورٹر کو قرض فراہم کرتا ہے تو یہ جائز ہے، البتہ بینک کو اس کی خدمات کا معاوضہ دیا جاسکتا ہے اور یہ معاوضہ لینا جائز ہے۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ امپورٹر ایل سی کھلواتے وقت مکمل ادائیگی نہیں کرتا، بلکہ بینک اپنی طرف سے مکمل قیمت یا اس کا کچھ حصہ اداء کر دیتا ہے، جو امپورٹر کے ذمہ قرض سمجھا جاتا ہے تو اس طرح کے قرض پر آج کل عموماً بینک سود وصول کرتا ہے، اس لیے اس طرح کی ایل سی کھلوانا شرعاً جائز نہیں ہوگا، کیونکہ یہ سودی معاملہ میں ملوث ہونا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اگر بینک اس طرح کے قرض پر کسی بھی قسم کا نفع اور سود وصول نہ کرے تو پھر یہ صورت شرعاً جائز ہو سکتی ہے۔[1]

شرعی متبادل

اس بحث کو ہم دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں:

۱۔ درآمد کنندہ کے لیے شرعی متبادل

۲۔ برآمد کنندہ کے لیے شرعی متبادل

ذیل میں دونوں کی تفصیل عرض کی جاتی ہے:

۱۔ درآمد کنندہ کے لیے شرعی متبادل:

الف۔ شرکت:

اگر درآمد کنندہ (امپورٹر) ایل سی کھواتے وقت کچھ ادائیگی کر دے تو اس صورت میں بینک اس کے ساتھ شرکت کا معاملہ کر سکتا ہے، بقیہ قیمت بینک اپنی طرف سے اداء کر دے گا اور جو چیز باہر سے منگوائی جائے گی اس میں بینک

---

[1] فقہ البیوع ۱۱۱۹/۲

اور درآمد کنندہ دونوں شریک ہو جائیں گے۔ درآمد کنندہ اس مال کو فروخت کرلے اور حاصل ہونے والا نفع دونوں آپس میں طے شدہ تناسب (مثلاً نصف نصف) سے تقسیم کرلے۔

ب۔مضاربت:

اگر درآمد کنندہ (امپورٹر) زیرو مارجن پر ایل سی کھلوائے، یعنی ایل سی کھلواتے وقت بینک کو بالکل ادائیگی نہ کرے تو ایسی صورت میں بینک اس کے ساتھ مضاربت کا معاملہ کر سکتا ہے۔ قیمت کی مکمل ادائیگی بینک کرکے "رب المال" ہو جائے گا اور درآمد کنندہ (امپورٹر) سامان منگوا کر مارکیٹ میں فروخت کرے گا، اس لیے وہ "مضارب" کہلائے گا۔ اس صورت میں بھی حاصل ہونے والا نفع دونوں آپس میں طے شدہ تناسب سے تقسیم کرلے۔

ج۔مرابحہ:

آج کل کئی اسلامی بینک درآمد کنندہ کے ساتھ مرابحہ بھی کرتے ہیں، جس کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ جب امپورٹر ایل سی کھلوانے کے لیے آتا ہے تو بینک یہ چاہتا ہے کہ باہر سے آنے والا مال ہم اپنے لیے خرید کر پھر ایل سی کھلوانے والے کو نفع کے ساتھ فروخت کردے۔ اس کے لیے بینک، درآمد کنندہ کو اپنا وکیل بنادیتا ہے اور وہ بینک کے ایجنٹ ہونے کی حیثیت سے خریداری کرتا ہے۔ سامان کا اصل خریدار اور قیمت کی ادائیگی کرنے والا بینک ہوتا ہے۔ پھر جب کاغذات وصول ہو جاتے ہیں اور مال پورٹ پر آجاتا ہے تو اس وقت بینک وہ سامان درآمد کنندہ کو نفع کے ساتھ اُدھار فروخت کردیتا ہے۔ یہ معاملہ مرابحہ کہلاتا ہے۔

مذکورہ صورت میں عقدِ مرابحہ کے درست ہونے کے لیے کئی شرائط ہیں، جن میں اہم شرائط کو بطورِ خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ پہلی بنیادی شرط یہ ہے کہ ایل سی کھلوانے سے پہلے امپورٹر (خریدار) اور ایکسپورٹر (بائع) کے درمیان باقاعدہ بیع کا معاملہ نہ ہوا ہو، کیونکہ اگر ان دونوں کے درمیان بیع ہو چکی ہے تو پھر درمیان میں بینک آکر اس سامان کو ایکسپورٹر سے اپنے لیے نہیں خرید سکتا، البتہ اگر امپورٹر اور ایکسپورٹر کے درمیان صرف وعدہ ہوا ہو یا صرف سامان کی قیمت اور بھاؤ طے ہوا ہو تو پھر مرابحہ کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ مرابحہ کی صورت میں بینک، درآمد کنندہ سے ایل سی کھلوانے کی فیس وصول نہیں کر سکتا، کیونکہ اس صورت میں بینک اپنے لیے خریداری کرنے کی وجہ سے اپنے لیے ہی ایل سی کھلوا رہا ہے، لہٰذا ایل سی کی فیس بھی بینک ہی برداشت کرے گا۔

۳۔ ایکسپورٹر کی طرف سے بھیجے ہوئے کاغذات کی وصولی اور سامان کے پہنچنے سے پہلے سامان بینک کی ملکیت میں رہے گا۔ اگر راستے میں یا امپورٹر کو بیچنے سے پہلے سامان ضائع ہو جائے تو وہ بینک کا نقصان سمجھا جائے گا۔

۴۔ مرابحہ مؤجلہ کی تمام شرائط کا لحاظ رکھا جائے، مثلاً بینک کے ضمان اور قبضہ میں آجانے سے پہلے سامان کو امپورٹر پر بیچنا جائز نہیں ہوگا، بلکہ قبضہ کے بعد سامان امپورٹر کو فروخت کیا جائے۔ اسی طرح قسطوں کی مقدار اور وقت معلوم ہو وغیرہ۔(۱)

د۔ اجارہ:

مرابحہ کی طرح یہاں بھی بینک پہلے امپورٹر کو وکیل بنا کر سامان اپنے لیے خریدے اور پھر وہ امپورٹر کو کرایہ پر دے دے۔ آخر میں امپورٹر کو فروخت بھی کیا جاسکتا ہے۔ اجارہ کا معاملہ عموماً مشینری میں کیا جاتا ہے، کیونکہ خام مال کو کرایہ پر نہیں دیا جاسکتا۔

۲۔ برآمد کنندہ کے لیے شرعی متبادل:

الف۔ شپمنٹ سے پہلے:

اگر ایکسپورٹر کو سامان کی تیاری کے لیے رقم کی ضرورت ہے، اس کے لیے بینک سے جو قرض لیا جاتا ہے، اس کو عربی میں "تمویل قبل الشحن" اور انگریزی میں "pre-shipment finance" کہتے ہیں۔ اس طرح کی صورتحال میں ایکسپورٹر بینک کے ساتھ شرکت یا مضاربت کا معاملہ کرسکتا ہے۔ اگر مکمل سرمایہ بینک فراہم کرے اور ایکسپورٹر مال تیار کرے تو مضاربت کا عقد منعقد ہو جائے گا، بینک "رب المال" اور ایکسپورٹر "مضارب" ہوگا۔ اگر کچھ سرمایہ بینک فراہم کرے اور کچھ سرمایہ ایکسپورٹر کی طرف سے ہو تو شرکت کا عقد وجود میں آجائے گا۔ دونوں صورتوں میں جب سامان امپورٹر کو فروخت کردیا جائے تو حاصل ہونے والا نفع آپس میں طے شدہ تناسب سے تقسیم کرلیں۔

اس صورت میں بینک، ایکسپورٹر کے ساتھ مرابحہ بھی کرسکتا ہے، وہ اس طرح کہ بینک مکمل سرمایہ دے کر ایکسپورٹر سے سامان اپنے لیے خرید لے، اس کے بعد نفع رکھ کر امپورٹر کو فروخت کردے۔ یہاں بھی مرابحہ کی تمام شرائط کا لحاظ رکھنا ضروری ہوگا۔

ب۔شپمنٹ کے بعد:

اگر ایکسپورٹر نے مال تیار کر کے بھیج دیا ہے، لیکن امپورٹر کی طرف سے کچھ عرصہ بعد ادائیگی ہوگی، جبکہ ایکسپورٹر یہ چاہتا ہے کہ اُسے قیمت فی الحال مل جائے تو اس کے لیے آج کل ''بل آف ایکسچینج'' کی ڈسکاؤنٹنگ کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر امپورٹر پر ایک لاکھ روپے لازم ہو جائے، جس کی اس نے رسید بنا کر ایکسپورٹر کو دے دی ہے۔ ایکسپورٹر یہ رسید بینک کو دے کر اُس سے ننانوے ہزار روپے فی الفور وصول کر لیتا ہے اور بعد میں بینک امپورٹر سے اپنے لیے مکمل ایک لاکھ روپے وصول کر لیتا ہے۔ اس طرح کے قرض کو عربی میں ''تمويل بعد الشحن'' اور انگریزی میں اس کو''post-shipment finance'' کہتے ہیں۔

چونکہ بل آف ایکسچینج کی ڈسکاؤنٹنگ کا طریقہ شرعاً جائز نہیں ہے، اس لیے اس کا جائز متبادل یہ ہے کہ ایکسپورٹر، بینک سے قرض لینے کے بجائے اس کو امپورٹر سے اپنا قرض وصول کرنے کا وکیل بنا دے اور اس پر بینک کے لیے اجرت مقرر کر دے۔ پھر بینک سے بل پر لکھی ہوئی قیمت کے بقدر رقم قرض لے لے۔ جب بینک بطورِ وکیل امپورٹر سے قیمت وصول کر لے تو اس سے اپنا قرض اور اپنی اجرت وصول کر لے، لیکن اس طریقہ کار کے لیے درج شرائط کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:

۱۔ درج بالا صورت میں وکالت اور قرض دونوں معاملات الگ الگ ہوں، کوئی معاملہ دوسرے معاملے کے ساتھ مشروط نہ ہو۔

۲۔ بینک کی اجرت کو بل کی ادائیگی کی مدت کے ساتھ اس طرح منسلک نہ کیا جائے کہ اگر ادائیگی کی مدت کم ہے تو اجرت بھی کم ہوگی، اگر ادائیگی کی مدت زیادہ ہے تو اجرت بھی زیادہ ہوگی۔

۳۔ ایکسپورٹر کو قرض دینے کی وجہ سے وکالت کی فیس (اجرت) میں اضافہ نہ کیا جائے۔[1]

---

[1] بحوث في قضايا فقهية معاصرة ۱۲۲/۲

تنبیہ! واضح رہے کہ بینکوں میں ضمانت کی ایک قسم بھی رائج ہے جس کو انگریزی میں (Bank Guarantee) اور عربی میں (خطاب الضمان) کہتے ہیں۔ یہ ایل سی سے مختلف چیز ہے اور اس کی کئی ساری قسمیں بھی ہیں۔ تفصیل کے لیے انٹرنیٹ پر انوسٹوپیڈیا ملاحظہ فرمائیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اسلامک بینکنگ میں ایل سی کی متبادل جائز صورتوں پر عمل ہو رہا ہے اور کبھی بینک صرف سروسز فراہم کرتا ہے، اور کبھی کسٹمر کے ساتھ باقاعدہ عقد کر کے ایل سی کھولتا ہے، پہلی قسم کو (Non-Funded LC) جبکہ دوسری قسم کو (Funded LC) کہتے ہیں۔ اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔

رسک مینجمنٹ: تعارف، شرعی حیثیت، اصول

(Risk Management)

یہ مضمون میگزین "شریعہ اینڈ بزنس" (۲۰۱۲ء) میں اور daleel.pk ویب سائٹ پر شائع ہو چکا ہے۔

رسک مینجمنٹ کی شرعی حیثیت اور بنیادی اصولوں سے پہلے رسک مینجمنٹ کا تعارف اور مقصد سمجھنا ضروری ہے۔ اس کے بعد رسک مینجمنٹ کی شرعی حیثیت اور اصولوں کا خلاصہ بیان کیا جائے گا۔ اس مضمون کے بنیادی عنوانات مندرجہ ذیل ہیں:

- رسک اور رسک مینجمنٹ کا تعارف
- رسک مینجمنٹ کے مقاصد
- رسک مینجمنٹ کی شرعی حیثیت
- رسک مینجمنٹ کے شرعی اصول

رسک اور رسک مینجمنٹ کا تعارف

ا۔ رسک:

کسی بھی متوقع خطرے کو رسک (risk) کہتے ہیں۔ اس کو عربی میں "خطر" یا "مخاطرۃ" کہا جاتا ہے، لیکن تاجروں کے عرف میں اور مالی معاملات میں جس رسک کو مینج کیا جاتا ہے اس سے مراد وہ نامعلوم واقعات ہوتے ہیں جو مستقبل میں مالی اثرات اور نقصانات میں کافی اور قابل توجہ اثر ڈال سکتے ہیں۔

"پرنسپل آف انشورنس لوما" میں "رسک" کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

Risks are uncertain events, which cause some material/significant change/impact in the financial[1]

رسک اُن نامعلوم حوادث کا نام ہے جو ایک معتد بہ مقدار میں مادی و مالی اثرات اور تبدیلی کا سبب بنے۔

[1] Principles of insurance LOMA.

ایک اور قاموس (فرنچ، عربی، انگلش) میں رسک کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

Possibility of meeting danger or suffering harm, loss, etc.[1]

کسی خطرے، بیماری اور نقصان کے امکان کو رسک کہتے ہیں۔

اس کو ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے، مثلاً میں نے شیئرز خریدے۔ اب مستقبل میں کئی قسم کے نامعلوم واقعات یا حالات پیش آسکتے ہیں، جیسے شیئرز کی قیمت میں اضافہ ہو، یا شیئرز کی قیمت بحال رہے یا شیئرز کی قیمت کم ہو جائے۔ پہلی صورت میں مجھے نفع ہوگا، دوسری صورت میں مجھے نہ نفع ہوگا نہ نقصان اور تیسری صورت میں مجھے نقصان ہوگا۔ اس قسم کے خطرات کو "رسک" کہتے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ جس "رسک" میں نقصان کے پہلو کے ساتھ ساتھ نفع کی امید بھی ہوتی ہے، اس کو "تخمینی رسک" (speculative risk) کہتے ہیں، جس کی تعریف ماہرین نے ان الفاظ میں کی ہے کہ: "a probability of a loss or gain" (یعنی نقصان یا نفع کا امکان)۔ کچھ رسک ایسے ہوتے ہیں، جن میں نفع کی امید نہیں ہوتی، بلکہ صرف نقصان کا احتمال ہوتا ہے، جیسے آگ، سیلاب اور زلزلہ وغیرہ کے واقعات۔ اس قسم کے رسک کو "خالص رسک" (pure risks) کہتے ہیں۔[٢]

٢۔ رسک مینجمنٹ:

رسک مینجمنٹ (risk management) کو اُردو میں "خطرات کی تدبیر وانتظام کرنا" اور عربی میں "إدارة المخاطر" کہتے ہیں۔ رسک مینجمنٹ ایسے سسٹم اور نظام کو کہتے ہیں جس کے ذریعے متوقع خطرات سے بچا جاتا ہے یا واقع ہونے والے خطرات کو ختم یا کم کیا جاتا ہے۔

"لانگ مین ڈکشنری" میں رسک مینجمنٹ کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

A system to prevent or reduce dangerous accidents or mistakes.[3]

ایسا نظام جس کے ذریعے خطرناک حوادث یا غلطیوں سے بچا جائے یا اُنہیں کم کیا جائے۔

---

(١) قاموس فرنسي، عربي، إنجليزي ١/ ٢٥٢٥

(٢) مجلة مجمع الفقه الإسلامي ٢/ ٢٥٤٢٢

(٣) Longman Dictionary of contemporary English.

عربی کے ایک رسالے میں رسک مینجمنٹ کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

إدارة المخاطر: هي عملية تحديد وتحليل والاستجابة للمخاطر وتتبعها ورفع تقارير عنها۔[1]

ایسا طریقہ کار جس میں رسک کی شناخت اور تجزیہ کیا جاتا ہے اور رسک کے حل کا جواب اور اس سے متعلق رپورٹ پیش کی جاتی ہے۔

رسک مینجمنٹ کے کچھ طریقے(techniques)ہیں، مثلاً:

1-Avoiding Risks

2-Controlling Risks

3-Accepting Risks

4-Transferring Risks

5-Risk Share

تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے، البتہ اتنا ذہن میں رہنا کافی ہے کہ پہلی قسم(risks avoiding)میں کسی ایسی سرگرمی میں ملوث ہونے سے ہی احتراز کیا جاتا ہے جس میں رسک اور خطرہ ہو۔ دوسری قسم(controlling risks)میں ادارہ خود اس طرح کی سرگرمی میں ملوث ہو کر رسک معلوم کر کے اس سے بچنے اور اُسے کم کرنے کے لیے طریقہ کار طے کرتا ہے۔ تیسری قسم(accepting risks)میں ادارہ رسک اور مالی خطرات کی ذمہ داری خود قبول کرلیتا ہے۔ چوتھی قسم (transferring risks)میں رسک کسی دوسرے ادارے کی طرف منتقل کر دیا جاتا ہے، جیسا کہ انشورنس میں ہوتا ہے۔ پانچویں قسم(risk share)میں کسی ادارے کے افراد رسک اور مالی خطرات کو آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں۔

رسک مینجمنٹ کے مقاصد

رسک مینجمنٹ کا مقصد صرف مالی نقصانات سے بچنا نہیں ہے، بلکہ اس کے ذریعے کوئی بھی شخص، ادارہ یا بینک اپنا فائنانشل ٹارگٹ حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے اور ترقی کے ساتھ ساتھ اپنے ادارے کو کسٹمرز اور عوام کی نظروں میں قابل اعتماد بنا سکتا ہے۔

[1] خطة إدارة المخاطر ص:۳

رسک مینجمنٹ کے نظام کی سرگرمیاں یہ ہیں:

۱۔تحدید المخاطر: یعنی رسک کی شناخت و پہچان کرنا تاکہ مالی نقصان، خطرات اور اندیشوں کو پیش آنے سے پہلے ہی معلوم کر کے ان کا حل نکالا جائے۔

۲۔التصنیف: یعنی درجہ بندی، رسک مینجمنٹ میں رسک کی درجہ بندی کی جاتی ہے، تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کونسا رسک مینج کیا جا سکتا ہے اور کس حد تک مینج کیا جا سکتا ہے اور کس رسک کو فوری مینج کیا جائے۔

۳۔التحلیل: رسک و خطرات کو معلوم کر کے ان کا تجزیہ کرنا۔

۴۔الاختیار: یہ رسک مینجمنٹ کا سب سے اہم ہدف و مقصد ہے جس میں انتظامیہ خطرات سے نمٹنے کے لیے منصوبہ بندی کرتی ہے اور پالیسی بناتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو رسک یا مالی خطرہ ابھی تک وجود میں نہیں آیا، اسے پہلے سے معلوم کر کے اس کے لیے کوئی حل تجویز کرنا۔ جو رسک اور خطرہ پیش آچکا ہے، اس سے بچنے، یا اس کو کم کرنے کا حل نکالنا، تاکہ نقصان نہ ہو یا کم سے کم ہو۔ رسک مینجمنٹ سے تجارتی ترقی کو حاصل اور اس راہ میں آنے والی رکاوٹوں کو دور کرنا اور عوام و کسٹمرز کی نظروں میں کمپنی اور ادارے کو قابلِ اعتماد بنانا اس سسٹم کے مقاصد ہیں۔

رسک مینجمنٹ کی شرعی حیثیت

رسک مینجمنٹ، بالفاظِ دیگر مالی خطرات و نقصانات کو ختم یا کم کرنے کو شریعت نے بھی تسلیم کیا ہے، بشرطیکہ مینجمنٹ کا طریقہ کار جائز ہو اور شرعی اصولوں کے خلاف نہ ہو۔ باری تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ اہم ہدایت دی ہے کہ اگر کوئی اُدھار کسی کے ذمے واجب ہو رہا ہو تو اُسے ایسی تحریر لکھنی یا لکھوانی چاہیے جو معاملے کی نوعیت کو واضح کردے۔[1] اس ہدایت کا اصل مقصد یہ ہے کہ مقروض شخص قرض کی ادائیگی سے انکار نہ کر سکے اور قرض خواہ متوقع خطرے اور قرض کے ضائع ہونے کے رسک سے محفوظ رہے۔

امام ترمذیؒ نے ایک حدیث نقل کی ہے، جس میں ایک شخص رسول اللہ ﷺ سے پوچھتا ہے کہ یا رسول اللہ! میں اپنا اونٹ باندھ کر اللہ پر توکل کروں یا اُسے کھلا چھوڑ کر اللہ پر بھروسہ رکھوں؟ آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ:

---

(۱) البقرة: ۲۸۲

اونٹ کو باندھ کر اللہ پر بھروسہ رکھو۔[۱]

اس حدیث سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ خطرات سے بچنے کے لیے کوئی تدبیر کرنا نہ توکل کے خلاف ہے اور نہ ہی شرعاً ناجائز ہے، بلکہ یہی توکل کی حقیقت ہے کہ انسان خطرات سے بچنے کے لیے وسائل واسباب اختیار کرنے کے بعد اللہ پر بھروسہ رکھے۔

اسی طرح فقہ اسلامی میں بھی ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جن میں رسک کو مینج کیا جاتا ہے:

۱۔ضمان خطر الطریق:

یہ ٹرانسفرنگ رسک کی مثال ہے۔اس کی صورت فقہاء نے یہ لکھی ہے کہ ایک شخص دوسرے سے کہتا ہے کہ اس راستے پر چلو، یہ محفوظ ہے، اگر تمہارا مال چھین لیا گیا تو میں ذمہ دار ہوں۔ وہ شخص اس کی ضمانت کی بنیاد پر اس راستے پر چلا، لیکن آگے جا کر اس کو مالی نقصان لاحق ہو گیا، اس کا مال چھین لیا گیا تو رسک قبول کرنے والا شخص شرعاً ضامن ہو گا۔[۲]

۲۔ضمان الدرک:

''ضمان الدرک'' کی صورت کتبِ فقہ میں یہ مذکور ہے کہ مثلاً زید، عمر سے زمین خریدنا چاہتا ہے، لیکن اُسے یہ ڈر ہے کہ کہیں اس زمین میں عمر کے علاوہ کسی اور کا حصہ نہ ہو تو خالد، زید کو یہ اطمینان دلاتا ہے کہ یہ زمین جو تم عمر سے خرید رہے ہو، اگر اس میں کوئی مستحق نکل آیا تو اس کی قیمت لوٹانے کا میں ضامن ہوں گا۔ایسی صورت میں اگر زمین میں کوئی مستحق نکل آتا ہے تو گارنٹی دینے والا (خالد) ذمہ دار ہو گا۔ یہاں بھی رسک کو ٹرانسفر کیا گیا۔[۳]

۳۔عاقلہ:

اگر کوئی شخص کسی کو قتل کر دے اور اس کی وجہ سے قاتل پر دیت واجب ہو جائے تو بعض صورتوں میں قاتل خود دیت ادا نہیں کرتا، بلکہ اس کی عاقلہ یعنی برادری دیت ادا کرتی ہے۔اس کی تفصیلات کتبِ فقہ میں موجود ہیں۔ اس صورت میں بھی مالی نقصان کے بوجھ کو عاقلہ پر تقسیم کر کے کم کیا گیا ہے۔[۴]

---

(۱) سننِ ترمذی ٤/٦٦٨، حديث نمبر: ٢٥١٧

(۲) ردالمحتار ٥/٢٩١

(۳) قواعد الفقه، ضمان الدرك ١ / ٣٥٩

(۴) صحيح البخاري، حديث نمبر: ٦٤٣٠

۴۔ عقدِ موالات:

اس سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص کسی کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا اور اُسی شخص سے یا کسی اور سے یہ عقد کر لیا کہ میرے مرنے کے بعد میری میراث تمہاری ہوگی اور اگر مجھ سے کوئی جنایت / جرم ہو گیا تو اس کی دیت تم اور تمہاری عاقلہ اداء کرے گی۔ ایسی صورت میں اگر اس شخص نے زندگی میں کوئی جرم کیا تو اس کا ضمان عقد کرنے والے شخص پر لازم ہوگا۔[1]

۵۔ حوالہ و کفالہ:

حوالہ اور کفالہ دو ایسے عقود ہیں جن کے ذریعے قرض خواہ کا رسک کم ہو جاتا ہے۔ اگر قرض خواہ چاہے تو اپنا قرض اصل مقروض سے کسی دوسرے شخص کی طرف منتقل کر دے، جس سے قرض وصول کرنا آسان ہو، اس کو ''حوالہ'' کہتے ہیں، یا مقروض کے ساتھ ساتھ کسی دوسرے شخص کو بھی ضامن بنا دے، پھر چاہے تو اصل مقروض سے قرض کا مطالبہ کرے یا ضامن (کفیل) سے مطالبہ کرے، یہ ''کفالہ'' ہے۔ یہ دونوں معاملات شریعت نے رسک کم کرنے کے لیے مشروع کیے ہیں۔[2]

۶۔ رہن:

رہن کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کا دوسرے کے ذمہ کوئی مالی حق واجب ہو تو صاحبِ حق اس شخص کی کوئی چیز اپنے پاس رکھ سکتا ہے، تاکہ اگر وہ شخص حق کی ادائیگی سے انکار کر دے، یا ادائیگی میں ٹال مٹول کرے تو صاحبِ حق اس کی چیز سے اپنا حق وصول کر سکے۔ رہن کے ذریعے صاحبِ حق کا رسک کم ہو جاتا ہے۔ اس عقد کی مشروعیت قرآن مجید سے ثابت ہے۔ اللہ رب العزت نے فرمایا:

﴿وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَى سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهَانٌ مَقْبُوضَةٌ﴾[3]

اگر تم سفر میں ہو اور کوئی لکھنے والا نہ ملے تو کوئی چیز بطورِ رہن قبضہ میں دے دو۔

درج بالا تفصیل سے یہ معلوم ہو گیا کہ شریعت نے رسک مینجمنٹ کو تسلیم کیا ہے، لیکن اس کے لیے بنیادی شرط

---

(۱) الفتاوى الهندية ٦/ ٢٧١

(۲) تحفة الفقهاء ٣/ ٢٣٧ و ٢٣٧

(۳) البقرة: ٢٨٣

یہ ہے کہ کسی بھی رسک مینجمنٹ کے ٹول کو اپلائی کرنے میں کوئی شرعی خرابی لازم نہ آئے، ورنہ رسک مینجمنٹ کا وہ طریقہ شرعاً درست نہ ہوگا۔

رسک مینجمنٹ کے شرعی اصول

۱۔ شرعی حدود کی رعایت:

شریعت نے ہر عقد یا معاملے میں معاملہ کرنے والوں (parties) کی کچھ ذمہ داریاں اور کچھ حقوق مقرر کیے ہیں۔ معاملہ کرنے والے ہر فریق کی کچھ ذمہ داریاں ہوتی ہیں اور کچھ اس کے حقوق ہوتے ہیں، لہذا رسک کو مینج کرنے کے دوران اس بات کو مد نظر رکھنا ضروری ہے کہ شریعت کی بیان کردہ ذمہ داریوں (responsibilities) اور حقوق (rights) میں خلل واقع نہ ہو۔ اسی طرح ہر عقد اور معاملہ کے لیے شریعت کی طے کردہ شرائط کا لحاظ رکھنا ضروری ہوگا۔

مثلاً شرکت کے عقد میں تمام شرکاء کی ذمہ داریوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہر شریک اپنے لگائے ہوئے سرمایہ کی حد تک نقصان میں بھی شریک ہوگا۔ مضاربت میں اگر مضارب کی غفلت و کوتاہی کے بغیر نقصان ہو جائے تو اس کی ذمہ داری رب المال (سرمایہ فراہم کرنے والے) پر عائد ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی شریک نقصان کسی دوسرے شریک پر ڈال کر خود اس رسک سے نکل جاتا ہے تو یہ جائز نہ ہوگا۔ اسی طرح رب المال کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ نقصان کی ذمہ داری بہر صورت مضارب پر ڈال دے، کیونکہ اس سے شریعت کی بیان کردہ ذمہ داری متاثر ہوتی ہے۔

استصناع اور سلم کے علاوہ ہر قسم کے خرید و فروخت کے معاملے میں شریعت نے خریدار کو یہ حق دیا ہے کہ وہ خریدی ہوئی چیز پر فی الفور قبضہ کرے۔ اب اگر معاملہ ہو جانے کے بعد فروخت کنندہ اُس کا یہ حق سلب کر کے کہتا ہے کہ میں کچھ عرصہ بعد چیز فراہم کروں گا تو یہ جائز نہ ہوگا، جس کو "بیع مضاف الی المستقبل" (forward sale) کہتے ہیں۔

۲۔ نفع، ذمہ داری کے ساتھ:

فقہاء نے ایک قاعدہ بیان کیا ہے:

الخراج بالضمان۔ [1]

---

[1] الأشباه والنظائر ص: ۱۵۱

نفع، ذمہ داری کے بدلے ملتا ہے۔

یعنی جو چیز انسان کے ضمان میں اس طرح آجائے کہ اس چیز کی ہلاکت یا نقصان کی ذمہ داری وہ شخص برداشت کرے تو اس چیز کا نفع بھی اُسی شخص کو ملے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر نفع (benefit) کے مقابلے میں شریعت نے کچھ ذمہ داریاں (responsibilities) مقرر کی ہیں۔ اگر وہ ذمہ داریاں پوری کی جائیں گی تو نفع بھی ملے گا، ورنہ نہیں۔ اسی طرح یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ کسی چیز کی ذمہ داری یا رسک ایک آدمی برداشت کرے اور اس کا نفع کسی دوسرے شخص کو ملے۔

اس کی مشہور مثال یہ ہے کہ اجارہ (کرایہ داری) کا اصول ہے کہ اگر کرایہ پر لی ہوئی چیز/مکان وغیرہ کرایہ دار کی کوتاہی، تعدی اور غفلت کے بغیر ضائع ہو جائے یا اسے کوئی نقصان ہو جائے تو اس کا نقصان اصل مالک برداشت کرے گا، کیونکہ وہ چیز/مکان مالک کے ضمان میں ہے، وہی اس کا نفع بھی اٹھا رہا ہے۔ لہٰذا اصل مالک کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنا رسک ٹرانسفر کر کے کرایہ دار پر لازم کر دے، کیونکہ ایسی صورت میں نفع مالک اٹھا رہا ہوگا اور نقصان/ضمان کرایہ دار پر ہوگا کہ درج بالا اصول کے خلاف ہے۔۔

۳۔ تین ناگزیر چیزیں:

اسی طرح فقہاء نے نفع کے استحقاق کے لیے ایک اور ضابطہ ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ:

يستحق الربح إما بالمال، وإما بالعمل، وإما بالضمان.[1]

یعنی انسان اپنا مال خرچ کر کے یا عمل کر کے یا ذمہ داری وضمانت برداشت کر کے ہی نفع کا مستحق بنتا ہے۔

لہٰذا یہ تین قسم کے رسک ہیں، اگر کوئی شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ ان میں سے کوئی ایک رسک بھی خود برداشت نہ کرے، تینوں قسم کے رسک مینج کر کے کسی دوسرے پر ڈال دے تو وہ نفع کا مستحق بھی نہ ہوگا۔

۴۔ غرر (Uncertainty) سے اجتناب:

کسی بھی ایسے رسک میں ملوث ہونا یا رسک مینجمنٹ کے لیے کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا جس کی وجہ سے غررِ کثیر لازم آئے، یہ جائز نہیں ہے۔ غرر (uncertainty) ایسی جہالت کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے معاملے کا انجام نامعلوم

---

[1] بدائع الصنائع ٦/ ٦٢

ہو جائے اور غررِ کثیر اتنی زیادہ جہالت کو کہتے ہیں جو عموماً نزاع اور جھگڑے کا ذریعہ بنے۔[1]

ذیل میں چند ایسے رسک کی مثالیں دی جاتی ہیں جن میں غررِ کثیر ہے:

- risk in existence (بیع معدوم) کسی چیز کو وجود میں آنے سے پہلے فروخت کرنا۔
- risk in ownership (بیع غیر مملوک) کسی چیز کو ملکیت میں آنے سے پہلے فروخت کرنا۔
- risk in taking possession (بیع قبل القبض) کسی چیز کو خریدنے کے بعد قبضہ میں آنے سے پہلے آگے فروخت کرنا۔
- risk in quantity جس چیز کی خرید و فروخت ہو رہی ہے، اس کی مقدار معلوم نہ ہو۔
- risk in quality بیچی جانے والی چیز کی کوالٹی اور صفات مجہول ہوں۔
- risk in time of payment اُدھار کے معاملے میں ادائیگی کا وقت متعین نہ ہو۔
- risk in delivery بیچی ہوئی چیز کو خریدار کے قبضہ میں دینا ممکن نہ ہو۔
- insurance مروجہ انشورنس، جس میں رسک کسی ادارے کی طرف ٹرانسفر کیا جاتا ہے، لیکن اس کے لیے جو طریقہ کار اپنایا گیا ہے اس میں سود کے ساتھ ساتھ غررِ کثیر بھی پایا جاتا ہے کہ پریمیم (قسط) ادا کرنے والے کو کوئی حادثہ لاحق ہو گا یا نہیں؟ اس کو اضافی رقم ملے گی یا خود اس کی رقم ہی ڈوب جائے گی وغیرہ۔ رسک مینجمنٹ کی یہ ساری صورتیں شرعاً ناجائز ہیں۔

اس موضوع پر عربی اور انگریزی میں کئی کتب لکھی جا چکی ہیں، جن میں سے اکثر (إدارة المخاطر) یا (إدارة المخاطر المصرفية) وغیرہ کے نام سے انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں۔ انگریزی زبان کی اہم کتب مندرجہ ذیل ہیں:

۱- خدیجہ اسکندر کی کتاب (Risk Management in Islamic Financial Institutions)

۲- چار مؤلفین کا اجتماعی مجموعہ (Risk Management for Islamic Banks)

---

[1] غرر کی صورتیں ص: ۵۲

قرضوں کی خرید وفروخت

(Trading of Debt)

آج کل معاملات اور خرید وفروخت کی جدید اور نت نئی صورتوں میں قرضوں اور دیون کی خرید وفروخت کی بھی کئی صورتیں شامل ہیں اور مارکیٹ میں بل آف ایکسچینج اور بانڈز وغیرہ جیسے ناموں کے ساتھ رائج ہیں۔ ہر صورت کا انفرادی حکم جاننے کے لیے قرضوں کی خرید وفروخت کی بنیادی صورتیں اور ان کے احکام کا جاننا ضروری ہے، جن کی روشنی میں جدید صورتوں کو حل کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

اس مختصر مضمون کو درج ذیل عنوانات میں سمیٹا گیا ہے:

- دین کا تعارف
- دیون کی خرید وفروخت کی صورتیں
- فقہاء کی آراء
- حوالہ اور بیع میں فرق
- خلاصہ
- جدید صورتیں

دین کا تعارف

ا۔ دین کی تعریف:

جو چیز انسان کے ذمہ کسی بھی وجہ سے ثابت ہو جائے، خواہ نقود ہوں، کرنسی ہو یا کوئی مثلی چیز ہو، اسے دین کہتے ہیں۔ مجلہ الاحکام العدلیہ میں دین کی تعریف یوں کی گئی ہے:

الدَّيْنُ: مَا يَثْبُتُ فِي الذِّمَّةِ كَمِقْدَارٍ مِنَ الدَّرَاهِمِ فِي ذِمَّةِ رَجُلٍ وَمِقْدَارٍ مِنْهَا لَيْسَ بِحَاضِرٍ وَالْمِقْدَارُ الْمُعَيَّنُ مِنَ الدَّرَاهِمِ أَوْ مِنْ صُبْرَةِ الْحِنْطَةِ الْحَاضِرَتَيْنِ قَبْلَ الْإِفْرَازِ فَكُلُّهَا مِنْ قَبِيلِ الدَّيْنِ.[1]

[1] مجلة الأحكام العدلية ص: ٣٣ (المادة ١٥٨)

دین وہ چیز ہے جو ذمہ میں لازم ہو جائے، جیسے کسی آدمی کے ذمہ دراہم کی کوئی مقدار لازم ہو گئی جس کا کچھ حصہ حاضر نہ ہو، اور دراہم کی وہ متعین مقدار یا گندم کا وہ ڈھیر جو حاضر تو ہو، لیکن ابھی اسے الگ کر کے جدا نہ کیا ہو، یہ سب دین ہیں۔

علامہ علی حیدر نے دین کی تین اقسام بیان کی ہیں:

۱۔ وہ چیز (نقود ہوں یا مثلی اشیاء) جو مدیون کے ذمہ کسی بھی وجہ (مثلاً عقد یا غصب وغیرہ) سے لازم ہو جائے۔

۲۔ وہ چیز جو ذمہ میں لازم نہ ہو سکتی ہو، لیکن وہ فی الحال موجود نہ ہو، یا موجود ہو، لیکن اس کی طرف اشارہ نہ کیا جائے۔

۳۔ وہ چیز جو اگرچہ موجود بھی ہے اور اس کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے، لیکن وہ مدیون کے مال سے الگ/جدا نہیں ہے۔[1]

۲۔ دین اور قرض میں فرق:

قرضوں کی خرید وفروخت کی صورتوں سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ فقہی اصطلاح میں ''دَین'' اور ''قرض'' کے درمیان فرق کیا جاتا ہے:

''قرض'' کا مفہوم یہ ہے کہ کسی کو بطورِ احسان اور تبرع ایسی مثلی چیز دینا جو مقروض کے ذمہ واجب الاداء ہو۔ مقروض اس کو استعمال کر کے اس کی مثل واپس کرتا ہے اور اس کی واپسی کے لیے کوئی مدت مقرر نہیں کی جا سکتی، بلکہ قرض خواہ کسی بھی وقت اس کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ جیسے کسی کو کچھ وقت کے لیے نقود/کرنسی یا گندم وغیرہ دے دی۔

جہاں تک **''دین''** کی بات ہے تو اس کا مفہوم قرض سے وسیع ہے، اس میں قرض کی صورت بھی شامل ہے اور انسان کا وہ مالی حق بھی اس میں شامل ہے جو کسی معاملہ (بیع یا اجارہ وغیرہ) کی وجہ سے یا مالی تاوان (غصب یا تلف وغیرہ) کی وجہ سے کسی دوسرے پر لازم ہوتا ہے۔ اس کی وصولی کے لیے مدت مقرر کی جا سکتی ہے۔

علامہ علی حیدر نے قرض کی تعریف کر کے دونوں میں فرق کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

أما القرض: فإنما يطلق على المثلي الذي يدفعه المقرض للمستقرض. يوجد بين الدين والقرض عموم وخصوص مطلق، والقرض هو المطلق الأخص.[2]

---

(۱) درر الحكام في شرح مجلة الأحكام ۱/۱۲۸

(۲) حواله بالا ۱/۱۲۸

رہی بات قرض کی تو اس لفظ کو ان مثلی اشیاء پر بولا جاتا ہے جو قرض خواہ، مقروض کو دیتا ہے۔ قرض اور دین میں عموم و خصوص مطلق کی نسبت پائی جاتی ہے، قرض اخص مطلق ہے۔ (یعنی ہر قرض، دین ہے، لیکن ہر دین، قرض نہیں ہے۔)

معاییر شرعیہ میں بھی یہی فرق بیان کیا گیا ہے:

الدين والقرض:

الدين هو ما يثبت في الذمة - من غير أن يكون معينا مشخصا - بأي سبب يقتضي ثبوته، سواء أكان نقدا أم سلعة أم منفعة موصوفة من منافع الأشياء أو الأشخاص، مثل الثمن في بيع الأجل، وبدل القرض.

والعلاقة بين القرض والدين: أن الدين أعم من القرض، فكل قرض دين، وليس كل دين قرضا وحينئذ يكون القرض أحد أسباب الدين.[1]

دین وہ ہے جو کسی بھی ایسے سبب کی وجہ سے ذمہ میں لازم ہو جائے جو اس کے ثبوت کا تقاضا کرے، بشرطیکہ وہ متعین و مشخص نہ ہو، خواہ وہ نقدی کی شکل میں ہو، سامان کی شکل میں ہو، یا اشیاء و اشخاص کے طے کردہ منافع کی شکل میں ہو، جیسے ادھار بیع میں قیمت اور قرض کا بدل۔

قرض اور دین کے درمیان تعلق یہ ہے کہ دین، قرض سے عام ہے، لہذا ہر قرض، دین ہے، لیکن ہر دین، قرض نہیں ہے۔ لہذا قرض بھی دین کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔

یہ فقہی اصطلاح کی بات ہے، لیکن آج کل عرف میں لوگ دین اور قرض میں زیادہ فرق نہیں کرتے اور دونوں پر قرض کا لفظ ہی بولا جاتا ہے اور ہمارے مضمون کی صورتوں میں بھی قرض و دین دونوں کی خرید و فروخت شامل ہے۔

۳۔ دین کے اسباب:

انسان پر کسی کے دین کے لازم ہونے کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں، مثلاً:

۱۔ قرض: یعنی کسی شخص نے دوسرے سے کچھ رقم قرض لے لی تو وہ اس کے ذمہ دین ہے۔

۲۔ التزام: اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کے ساتھ کوئی عقد یا معاملہ کرے جس کے نتیجے میں اس پر دوسرے کا دین لازم ہو جائے، مثلاً کوئی چیز خریدی ہے، اس کی قیمت ابھی ادا نہیں کی، یا بیع سلم میں فروخت کنندہ کے ذمہ

---

[1] المعايير الشرعية ص: ٢٤، رقم المعيار: ٤

خریدار کی چیز (مبیع) بھی دین ہے۔

۳۔اتلاف: یعنی کسی شخص نے دوسرے کی کوئی چیز تلف، ضائع اور خراب کردی جس کی وجہ سے اس پر اسی چیز کی مثل یا قیمت لازم ہوگئی تو یہ بھی دین ہے۔

۴۔ایجابِ شارع: یعنی شریعت نے کسی شخص پر دوسرے کے لیے کوئی مالی حق لازم کیا ہے تو وہ بھی ایسے شخص پر دین ہوتا ہے۔ مثلاً زکوۃ یا بیوی بچوں کا نفقہ۔

۴۔دین کی خصوصیات:

سابقہ تفصیلات کو سامنے رکھنے سے دین کی مندرجہ ذیل خصوصیات معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ دین ایک اعتباری چیز ہے، جس کا کوئی خارجی وجود نہیں ہوتا، بلکہ یہ انسان کے ذمہ میں لازم ہوتا ہے۔

۲۔ دین کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ مالِ مثلی ہو، جیسے گندم وغیرہ یا نقود ہوں۔ قیمی اشیاء (جیسے بکری وغیرہ) دین نہیں بن سکتیں، البتہ ان کی قیمت کا ضمان لازم کر کے ان کو دین بنایا جاسکتا ہے۔

۳۔ کسی کے ذمہ جو دین لازم ہو جائے وہ تقسیم ہونے کو قبول نہیں کرتا، کیونکہ تقسیم کا مطلب یہ ہے کہ حق الگ اور ممتاز ہو جائے، جبکہ ذمہ میں لازم شدہ دین اس بات کو قبول نہیں کرتا۔

۴۔ دین کو معاوضات مالیہ میں محل بنانا درست نہیں ہے۔ یعنی دین کی خرید وفروخت درست نہیں ہے، تاہم اس میں تفصیل ہے جو آگے بیان کی جائے گی۔

۵۔ دین کا عقدِ حوالہ کرنا درست ہے۔ مثلاً عمر کے ذمہ زید کا ایک لاکھ قرض/دین ہے۔ اس دین کی ذمہ داری خالد قبول کر کے حوالہ کر لے تو یہ درست ہے۔

۶۔ دین میں مقاصہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً عمر کے ذمہ زید کا ایک لاکھ روپے قرض/دین ہے۔ کسی اور معاملہ میں زید کے ذمہ عمر کا ایک لاکھ قرض/دین لازم ہو گیا تو دونوں دیون میں مقاصہ / برابری ہو جائے گی۔

۷۔ دین میں ہمیشہ مثل کی ادائیگی یا واپسی ہوتی ہے، بعینہ اسی چیز کی واپس ادائیگی نہیں ہوتی جس کو بطورِ دین یا قرض دیا تھا۔

۸۔ دین براءت کو قبول کرتا ہے۔ یعنی اگر کسی کے ذمہ دوسرے کا دین/قرض ہو تو قرض خواہ اس دین کو معاف کر سکتا ہے۔[1]

---

[1] بیع الدین وتطبیقاتہ المعاصرۃ فی الفقہ الإسلامی ص:۷۷

۵۔ دین کی اقسام:

فقہاء نے مختلف اعتبارات سے دین کی مختلف اقسام ذکر فرمائی ہیں، جن کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ دین اللہ:

یہ ایسے دین/قرض کو کہتے ہیں جس کا مطالبہ بندوں میں سے کوئی نہ کر سکے، بلکہ یہ اللہ کا حق ہوتا ہے اور اس کا مطالبہ بھی شریعت ہی کرتی ہے۔ مثلاً کسی پر زکوۃ لازم ہے جو اس نے ابھی تک اداء نہیں کی، یا کفارہ یا نذر یا عشر وغیرہ۔

۲۔ دین العبد:

یعنی بندے کا دین/قرض، جس کا مطالبہ بھی بندہ کر سکتا ہے۔ جیسے کسی انسان سے قرض لے لیا، یا کوئی چیز خریدی جس کی قیمت ابھی تک ادا نہیں کی، یا کسی گھر کا کرایہ، یا بیوی کا مہر وغیرہ۔

۳۔ دین حال:

وہ دین/قرض جس کی ادائیگی فوری طور پر لازم ہو۔ یا تو اس کی ادائیگی کا وقت آچکا ہو یا اس کی ادائیگی کے لیے یہی طے ہوا تھا کہ جب بھی قرض خواہ طلب کرے گا تو اس کی ادائیگی لازم ہو گی۔ اس کو دین حال کہتے ہیں۔

۴۔ دین مؤجل:

وہ دین جس کی ادائیگی فوری طور پر ضروری نہ ہو، بلکہ اس کی ادائیگی کے لیے مستقبل کا کوئی وقت/تاریخ طے کی گئی ہو اور وہ متعین تاریخ ابھی تک نہ آئی ہو۔[1]

۵۔ دین قوی:

یہ وہ دین ہے جو کسی شخص پر قرض لینے کی وجہ سے لازم ہوا ہو، یا کسی نے دوسرے سے مالِ تجارت خریدا ہو جس کی قیمت ابھی تک ادا نہیں کی گئی تو یہ "دین قوی" ہے۔ اس پر زکوۃ واجب ہوتی ہے۔

۶۔ دین متوسط:

یہ وہ دین ہے جو انسان پر اس لیے لازم ہوا ہو کہ اس نے کسی سے کوئی ایسی چیز خریدی ہے جو مالِ تجارت نہیں ہے اور ابھی تک اس کی قیمت ادا نہیں کی، مثلاً کسی نے اپنے پہننے کے کپڑے یا گھر کے استعمال کا سامان کسی کو بیچ دیا، جس کی قیمت ابھی ادا نہیں کی گئی تو یہ "دین متوسط" ہے۔

---

(۱) درر الحكام في شرح مجلة الأحكام ١/ ١٢٧

۷۔دین ضعیف:

یہ وہ دین ہے جو کسی پر کسی ایسے سبب کی وجہ سے لازم ہو جائے جو سبب حقیقت میں مال ہی نہ ہو، جیسے مہر، دیت اور بدلِ خلع وغیرہ۔[1] دیون کی آخری تین صورتوں (دین قوی، دین متوسط، دین ضعیف) کا تذکرہ عموماً فقہاء زکوۃ کے باب میں کرتے ہیں کہ کس دین پر زکوۃ واجب ہے اور کس پر نہیں۔

دیون کی خرید و فروخت کی صورتیں

دیون کی خرید و فروخت کی بنیادی طور پر دو صورتیں ہیں:

۱۔بیع الدین بالدین

۲۔بیع الدین بالنقد

پہلی صورت کا مطلب یہ ہے کہ دونوں جانب سے قرض یا دین ادھار ہو، یعنی ادھار کے بدلے ادھار بیچنا اور دوسری صورت کا مطلب یہ ہے کہ ایک طرف دین یعنی ادھار ہو اور دوسری طرف سے نقد ہو۔

سابقہ دونوں صورتوں میں سے ہر صورت کی پھر دو، دو صورتیں ہیں:

۱۔بیع الدین ممن علیہ الدین

۲۔بیع الدین مِن غیر من علیہ الدین

ان میں پہلی صورت کا مطلب یہ ہے کہ دین یا قرض کسی ایسے شخص کو بیچا جائے جس پر قرض لازم ہے، یعنی مقروض کو ہی اپنا قرض بیچنا۔ دوسری صورت کا مطلب یہ ہے کہ مقروض پر جو قرض لازم ہے، وہ اس کے بجائے کسی تیسرے شخص کو بیچا جائے۔

اس خاکہ سے ہمیں چار صورتیں معلوم ہوئیں:

۱۔بیع الدین بالدین ممن علیہ الدین (مقروض کو ادھار دین بیچنا)
۲۔بیع الدین بالدین من غیر من علیہ الدین (کسی تیسرے شخص کو ادھار دین بیچنا)
۳۔بیع الدین بالنقد ممن علیہ الدین (مقروض کو نقد کے بدلے دین بیچنا)
۴۔بیع الدین بالنقد من غیر من علیہ الدین (کسی تیسرے شخص کو نقد کے بدلے دین بیچنا)

---

[1] بدائع الصنائع ۱۰/۲

فقہاء کی آراء

ذیل میں ہر صورت کی مثال اور اس میں ائمہ کی آراء کو بیان کیا جاتا ہے:

پہلی صورت: بيع الدين بالدين ممن عليه الدين

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص پر قرض واجب ہے، اسی کو وہ قرض ادھار کے بدلے بیچا جائے۔ مثلاً عمر نے زید کی گھڑی توڑ دی، جس کی وجہ سے عمر کے ذمہ زید کے ایک ہزار روپے لازم ہو گئے۔ یہ دین ہے۔ زید، عمر کو کہتا ہے کہ میرے ایک ہزار روپے (جو گھڑی کی وجہ سے آپ پر لازم ہے) کے بدلے مجھے ایک مہینہ بعد ایک کلو شہد دے دینا یا ان ایک ہزار روپے کے بدلے ایک مہینہ بعد مجھے سوڈالرز دے دینا۔ اس صورت میں زید نے اپنا دین مقروض (عمر) کو ہی بیچ دیا، لیکن دونوں طرف کی چیزیں دین/ادھار ہیں، عمر پر زید کے ہزار روپے بھی دین تھے اور اس کے بدلے جو شہد یا ڈالرز لیے جا رہے ہیں وہ بھی دین ہے۔

دوسری صورت: بيع الدين بالدين من غير من عليه الدين

اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں طرف کی چیزیں دین وادھار ہیں، لیکن قرض خواہ اپنا قرض، مقروض کے بجائے کسی تیسرے شخص کو فروخت کر دے۔ مثلاً زید نے عمر سے دس کلو گندم بیع سلم کے طور پر خریدی اور اس کو قیمت بھی فی الفور دے دی، جبکہ عمر اس کو ایک مہینہ کے بعد گندم دے گا۔ عمر کے ذمہ زید کی دس کلو گندم دین ہے۔ زید نے کسی تیسرے شخص (مثلاً خالد) سے کہا کہ عمر کے ذمہ میری جو دس کلو گندم لازم ہے، وہ میں آپ کو بارہ سو روپے میں بیچتا ہوں اور بارہ سو روپے مجھے ایک مہینہ بعد دے دینا۔ اس صورت میں زید اپنا دین (دس کلو گندم) تیسرے شخص (خالد) کو بیچ رہا ہے اور اس کی قیمت بھی دین/ادھار ہے، لہذا یہ "بيع الدين بالدين من غير من عليه الدين" ہے۔

دونوں صورتوں کا حکم:

پہلی اور دوسری صورت کو "بيع الدين بالدين" اور "بيع الكالئ بالكالئ" کہتے ہیں۔ یہ دونوں صورتیں تمام فقہاء کے ہاں ناجائز ہیں۔ ان کی ممانعت پر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے کہ آپ ﷺ نے دین کے بدلے دین کی بیع سے منع فرمایا ہے۔

أن النبي صلى الله عليه و سلم نهى عن بيع الكالئ بالكالئ. [1]

[1] سنن الدارقطني ۳/ ۷۱، حديث نمبر: ۲۶۹

معاصر علماء میں سے شیخ صدیق الضریر نے اپنی کتاب "الغرر و أثره في العقود" میں بیع الدین بالدین کی گنجائش دی ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث پر جرح کی ہے۔ آپ احادیث کا تذکرہ کرنے اور فقہاء کی آراء کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وأرى جواز بيع الدين مطلقا، أعني سواء بيع للمدين أو لغيره بنقد أو بدين، مادام خاليا عن الربا؛ لأنه لم يرد نص يعتمد عليه في منع أي صورة من هذه الصور[۱].

لیکن اکثر معاصرین نے ان کی رائے کو کمزور قرار دیا ہے اور استاد محترم مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے "بحوث في قضايا فقهية معاصرة" میں ان دونوں صورتوں کی ممانعت پر تفصیلی کلام کیا ہے اور شیخ صدیق الضریر کی رائے پر رد کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ اگرچہ خاص ان صورتوں کی ممانعت سے متعلق احادیث سند کے اعتبار سے کمزور ہیں، لیکن جمہور علماء نے ان احادیث کے مضمون پر عمل کیا ہے اور محدثین کے ہاں اصول ہے کہ جس حدیث کو "تلقی بالقبول" حاصل ہو جائے، اس کے ضعف و کمزوری کی تلافی ہو جاتی ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

ثم إن جمهور علماء الأمة عملوا بمضمون هذا الحديث وحرموا بيع الدين بالدين، وقد ذكر غير واحد من المحدثين أن ما تلقاه أهل العلم بالقبول، ينجبر به ضعف إسناده.[۲]

تیسری صورت: بيع الدين بالنقد ممن عليه الدين

اس کا مطلب یہ ہے کہ نقد کے بدلے مقروض ہی کو اپنا قرض/دین بیچا جائے۔ اس میں دونوں جانب کی چیزیں ادھار نہیں ہوتیں، بلکہ ایک جانب دین ہوتا ہے اور دوسری جانب کی چیز فوری و نقد ہوتی ہے۔ اس میں دو صورتیں شامل ہیں:

الف- بيع الدين بالعين:

اس کا مطلب یہ ہے کہ مقروض سے اپنے قرض کے بدلے میں کوئی عین/سامان وغیرہ خرید لینا۔ مثلا زید نے عمر کو کہا کہ آپ کے ذمہ میرے جو ایک ہزار روپے دین/قرض ہے، ان کے بدلے مجھے اپنی یہ کتاب دے دو اور مجلس عقد

---

(۱) الغرر وأثره في العقود في الفقه الإسلامي ص: ۳۳٤

(۲) بحوث في قضايا فقهية معاصرة ۱/ ۱۰۰

میں ہی کتاب وصول کرلی۔

ب- بيع الدين بالنقد:

اس کا مطلب ہے کہ مقروض سے اپنے قرض کے بدلے میں نقد رقم/کرنسی وصول کرنا۔ مثلاً زید نے عمر سے کہا کہ آپ کے ذمہ میرے جو ایک ہزار روپے دین/قرض ہے، ان کے بدلے مجھے ایک سو ڈالر زدے دو، اور مجلس عقد میں ہی اس پر قبضہ کرلے۔

تیسری صورت کا حکم:

تیسری صورت (الف/ب) تقریباً تمام فقہاء کے ہاں جائز ہے، لیکن اس کے جائز ہونے کے لیے بیوع اور ربا کی دیگر شرائط کا پایا جانا ضروری ہے، تاکہ بیع بھی درست ہو اور سود بھی لازم نہ آئے، مثلاً:

۱۔ بیع کی تمام شرائط موجود ہوں، مثلاً عقد کرنے والوں میں اہلیت ہو، مبیع کو حوالے کرنا بائع کی قدرت میں ہو، جہالت نہ ہو وغیرہ۔

۲۔ اگر دونوں طرف ایک ہی ملک کی کرنسی ہے تو برابری بھی ضروری ہے۔

۳۔ ضع وتعجل سے بچا جائے، یعنی قرض خواہ اپنے مقروض کو یوں نہ کہے کہ تم وقت سے پہلے میرا دین/قرض ادا کرلو، میں اس میں کمی کرلوں گا۔

۴۔ اسی طرح مقروض کو مزید وقت دینے پر دین میں اضافہ نہ کیا جائے وغیرہ۔

معاییر شرعیہ میں اس صورت کے جواز کے لیے تین ضابطے ذکر کیے گئے ہیں:

۱۔ پہلا ضابطہ: اس قسم کے دین کی خرید وفروخت میں سود لازم نہ آئے۔ مثلاً ایک جنس کی کرنسی ہو تو برابری ضروری ہے وغیرہ۔

۲۔ دوسرا ضابطہ: اس معاملہ کو سود کے لیے بطورِ حیلہ اختیار نہ کیا جائے۔ مثلاً زید نے عمر کو ایک لاکھ روپے دے کر اس سے ادھار گندم خرید لی (بیع سلم کرلی)، پھر جب گندم کی وصولی کا دن آیا تو اسی گندم کو عمر پر مہنگے داموں، مثلاً ایک لاکھ دس ہزار روپے میں بیچ دیا۔ تو یہ جائز نہیں ہے۔

۳۔ تیسرا ضابطہ: اس معاملہ کی وجہ سے مدیون/مقروض پر کوئی نیا قرض/دین مع اضافہ لازم نہ کیا جائے۔[1]

---

[1] المعايير الشرعية ص:١٣٨٧، رقم المعيار:٥٩

چوتھی صورت: بيع الدين بالنقد من غير من عليه الدين

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرض خواہ اپنا قرض یا دین کسی تیسرے شخص کو نقد فروخت کردے۔ اس کی بھی دو صورتیں ہیں:

الف- بيع الدين بالعين:

کسی تیسرے شخص کو سامان/عین کے بدلے اپنا قرض بیچنا۔ مثلاً عمر پر زید کا ایک ہزار روپے دین/قرض ہے۔ زید نے خالد سے گھڑی خریدی کر وصول کرلی اور اسے کہا کہ اس کی قیمت عمر سے وصول کرلینا، کیونکہ اس پر میرا ایک ہزار کا قرض ہے۔

ب- بيع الدين بالنقد:

کسی تیسرے شخص کو قیمت/کرنسی کے بدلے میں اپنا قرض بیچنا۔ مثلاً زید نے خالد سے ان ایک ہزار روپے کے بدلے سو ڈالرز خرید لیے جو عمر کے ذمہ ہے اور ڈالرز پر فی الفور قبضہ کرلیا۔ ان دونوں صورتوں میں ایک طرف دین ہے اور دوسری طرف سامان یا نقد کرنسی ہے، لیکن معاملہ اصل مقروض کے بجائے تیسرے شخص کے ساتھ ہو رہا ہے۔

چوتھی صورت کا حکم:

چوتھی صورت (الف/ب) کے جواز میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ **فقہاء حنفیہ** اور **فقہاء حنابلہ** کے ہاں یہ صورت جائز نہیں ہے۔ وہ اس کی دو وجوہات بیان کرتے ہیں:

۱۔ اس صورت میں مبیع (بیچا ہوا دین) مقدور التسلیم نہیں ہے۔ یعنی عمر کے ذمے زید کا جو قرض ہے، زید نے وہ قرض خالد کو بیچا تو اب بائع (زید) اس قرض کو خالد کے حوالے کرنے پر قادر نہیں ہے، کیونکہ یہ قرض زید کے ہاتھ میں نہیں ہے اور ممکن ہے عمر ادائیگی سے انکار کردے۔ اس لیے یہ درست نہیں ہے۔

۲۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ خریدار کو خریدی ہوئی چیز دینا بائع کی ذمہ داری ہوتی ہے اور یہاں زید (بائع) اپنا بیچا ہوا قرض خود خالد کو دینے کے بجائے یہ ذمہ داری عمر کو منتقل کر رہا ہے، اس لیے یہ درست نہیں ہے۔[1]

فقہاء مالکیہ کے ہاں یہ صورت درج ذیل شرائط کے ساتھ جائز ہے:

۱۔ اصل مدیون/مقروض (مثال میں عمر) شہر میں موجود ہو، تاکہ اس کے فقر یا مالداری کا علم ہوسکے۔

---

[1] بدائع الصنائع ٥/١٤٨، المغني لابن قدامة ٢/١٢٠

۲۔ اصل مقروض، قرض کا اقرار بھی کرتا ہو۔

۳۔ دین ایسی چیز ہو جس کو قبضہ سے پہلے بیچنا جائز ہو۔ (مالکیہ کے ہاں کھانے، پینے کی چیزوں کے علاوہ سب چیزوں میں بیع قبل القبض جائز ہے۔)

۴۔ دین کو خلافِ جنس چیز کے بدلے بیچا جائے۔

۵۔ تبادلہ میں دونوں عوضین (دین اور اس کا بدل) سونا یا چاندی نہ ہو۔[1]

فقہاء شافعیہ کے ہاں اکثر علماء نے چوتھی صورت میں تین صورتیں بیان کی ہیں:

۱۔ دین مستقر ہو، یعنی مدیون کے ذمہ دین ثابت ہو چکا ہو اور وہ اس کا انکار نہ کر سکے۔

۲۔ دین، مبیع کا ثمن ہو، مثلاً زید نے عمر کو ایک ہزار روپے ادھار پر گھڑی بیچی، تو عمر پر زید کا جو دین ہے یہ گھڑی کا ثمن ہے۔

شافعیہ کے ہاں ان دونوں قسم کے دیون کی بیع چوتھی صورت میں بھی جائز ہے۔

۳۔ دین غیر مستقر ہو، یعنی کسی بھی وقت ختم ہو سکتا ہو، جیسے بیع سلم میں ہوتا ہے کہ فروخت کنندہ (مسلم الیہ) کے ذمہ مبیع (بیچی ہوئی چیز) دین وادھار ہوتی ہے، لیکن وصولی کا وقت آنے سے پہلے وہ غیر مستقر ہے، ممکن ہے بیع سلم ختم ہو جائے تو وہ دین ساقط ہو جائے گا۔ شافعیہ کے ہاں اس دین کو بیچنا جائز نہیں ہے۔[2]

استاد محترم مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے "بحوث في قضايا فقهية معاصرة" میں لکھا ہے کہ شافعیہ کے ہاں چوتھی صورت جائز نہیں ہے۔ ان کے ہاں بعض حضرات نے اس شرط پر چوتھی صورت کی گنجائش دی ہے کہ دین کو مجلس میں ہی وصول کر کے آگے بیچا جائے، لیکن دین کی وصولی کے بعد بیچنا حقیقت میں بیع الدین میں آتا ہی نہیں ہے۔

معاییر شرعیہ میں دین/قرض کو کسی تیسرے شخص پر بیچنے سے متعلق پانچ نکات بیان کیے گئے ہیں:

۱۔ اگر دین کسی کرنسی/نقود کی شکل میں ہے اور اسے کسی تیسرے شخص کو بھی کرنسی/نقود کے بدلے ہی بیچا جا رہا ہے تو یہ جائز نہیں ہے، خواہ نقد ہو یا ادھار۔

۲۔ اگر قرض/دین کسی کرنسی یا نقود کی شکل میں ہے اور اسے کسی تیسرے شخص کو کسی سامان یا معلوم خدمات د

---

[1] الدسوقي على الشرح الكبير ۵۵/۳

[2] المهذب ۲٦۲/۱

منفعت کے بدلے بیچا جا رہا ہے تو یہ دو شرائط کے ساتھ جائز ہیں:

الف- وہ سامان، یا معلوم خدمات و منفعت ادھار نہ ہو، بلکہ فوری وصول کیے جائیں۔

ب- وہ سامان یا خدمات معلوم ہوں اور ان کا محل استیفاء بھی معلوم ہو۔

۳۔ اگر دین/قرض کسی سامان (مثلاً گندم وغیرہ) کی شکل میں ہے تو اسے وصول کرنے سے قبل کسی تیسرے شخص کو بیچنا جائز نہیں ہے۔

۴۔ اگر دین/قرض کسی خدمت و منفعت/سروسز کی شکل میں ہے اور اس کا محل استیفاء معلوم نہیں ہے تو اسے بھی کسی تیسرے شخص کو بیچنا جائز نہیں ہے، خواہ نقد ہو یا ادھار۔

۵۔ اگر کسی تیسرے شخص کو دین بیچنے میں غرر ہو تو بھی یہ جائز نہیں ہے۔ مثلاً جس پر دین لازم ہے وہ انکار کرے اور اقرار یا گواہوں سے دین ثابت نہ ہو سکے۔ یا دین کی مقدار معلوم نہ ہو۔[1]

حوالہ اور بیع میں فرق

یہاں ایک نکتہ سمجھنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ حنفیہ اور حنابلہ کے ہاں چوتھی صورت اس وقت ناجائز ہے جب یہ بیع کے زمرے میں آتی ہو اور باقاعدہ دین کو بیچا اور فروخت کیا جائے۔ اگر چوتھی صورت کو بیع کے بجائے حوالہ میں اختیار کیا جائے تو یہ جائز ہے۔ حوالہ کی مثال یہ ہو سکتی ہے کہ عمر پر زید کے ایک ہزار روپے کا قرض ہے، زید کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ یہ قرض کسی تیسرے شخص کو فروخت کر دے، لیکن یہ جائز ہے کہ زید (قرض خواہ) اور عمر (مقروض) حوالہ کر لیں کہ عمر پر جو دین/قرض لازم ہے وہ عمر کے بجائے خالد سے وصول کیا جائے گا اور خالد بھی اس پر راضی ہو جائے تو یہ درست ہے۔

بیع اور حوالہ میں یہ فرق ہے کہ اگر زید اپنا دین/قرض (جو عمر کے ذمہ ہے) خالد کو بیچتا ہے اور خالد کو عمر کی طرف سے دین نہیں ملتا تو وہ زید (بائع) سے مطالبہ نہیں کر سکتا، لیکن حوالہ کی صورت میں اگر زید کو خالد سے اپنا دین نہیں ملتا تو وہ اس دین کا مطالبہ عمر سے کر سکتا ہے۔ اس کو فقہی اصطلاح میں ''توىٰ الدین'' کہا جاتا ہے۔

اس صورت میں حوالہ کے جواز کی وجہ حنفیہ نے یہی بیان کی ہے کہ اگر دین کسی تیسرے شخص کو بیچا جائے تو اس کی وجہ سے فروخت کنندہ مکمل بری ہو جاتا ہے اور تمام ذمہ داری مدیون کی طرف منتقل ہو جاتی ہے، اب ممکن ہے کہ خریدار کو مدیون کی طرف سے دین نہ ملے اور خریدار، فروخت کنندہ سے مطالبہ بھی نہیں کر سکتا تو اس میں غرر ہے کہ مبیع

---

[1] المعايير الشرعية ص: ١٣٩، رقم المعيار: ٥٩

مقدور التسلیم نہیں ہے، لیکن حوالہ کی صورت میں اگر محتال علیہ (تیسرا شخص، جس نے دین کی ادائیگی کی ضمانت لی ہے) کی طرف سے قرض خواہ کو دین نہ ملے تو وہ اصل مقروض سے دوبارہ مطالبہ کر سکتا ہے، لہذا اس میں غرر نہیں ہے۔

حنابلہ کے ہاں بھی حوالہ درست ہے، انہوں نے جو وجہ بیان کی ہے وہ بھی تقریباً حنفیہ کی بیان کردہ وجہ کے قریب ہے، تاہم انہوں نے یہ نکتہ بھی بیان کیا ہے کہ بیع کی صورت میں خریدار کو دین نہ ملنے کہ وجہ سے ضرر لاحق ہو سکتا ہے، جبکہ حوالہ کی صورت میں ایسا کوئی ضرر لاحق نہیں ہوتا۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ دیون اور قرضوں کی خرید و فروخت کی درج ذیل صورتیں ہیں:

۱۔ بیع الدین بالدین: اس کی تمام صورتیں تمام فقہاء کے ہاں ناجائز ہیں، خواہ دین، اصل مقروض کو بیچا جائے یا کسی تیسرے شخص کو، سامان کے بدلے بیچا جائے یا رقم وغیرہ کے بدلے۔

۲۔ بیع الدین بالنقد: اگر اصل مقروض کو نقد/یا سامان کے بدلے اپنا دین بیچا جائے اور نقد یا سامان پر فی الفور قبضہ کیا جائے تو یہ سب کے ہاں جائز ہے۔ اس کو "بیع الدین ممن علیه الدین" کہتے ہیں۔ اور اگر اصل مقروض کے بجائے کسی تیسرے شخص کو اپنا دین بیچا جائے (جس کو "بیع الدین من غیر من علیه الدین" کہتے ہیں) تو یہ صورت حنفیہ و حنابلہ کے ہاں درست نہیں ہے، البتہ بذریعہ حوالہ اس کی منتقلی جائز ہے، جبکہ مالکیہ کے ہاں یہ صورت چھ شرائط کے ساتھ جائز ہے اور شافعیہ کے ہاں بھی راجح یہ ہے کہ یہ صورت درست نہیں ہے، الا یہ کہ دین پر اسی مجلس میں قبضہ کر کے پھر اس کو بیچا جائے۔ بندہ کی نظر میں اس سلسلے میں معاییر شرعیہ میں جو رائے اختیار کی گئی ہے، وہ مناسب ہے اور قابل عمل بھی ہے۔ لہذا اس پر عمل کرنے کی گنجائش ہے۔

جدید صورتیں

قرضوں اور دیون کی خرید و فروخت اور تبادلہ کی آج کل مختلف صورتیں رائج ہیں، چند مشہور یہ ہیں:

۱۔ بانڈز (Bonds)

بانڈز کی خرید و فروخت در حقیقت دین کی خرید و فروخت ہے، کیونکہ بانڈز اس قرض/دین کی نمائندگی کرتے ہیں جو حامل بانڈز نے حکومت کو یا کسی اور بانڈز جاری کرنے والے ادارے کو دے کر بانڈز لیے ہوتے ہیں۔ اگر بانڈز لینے والا بانڈز کو کسی تیسرے شخص پر بیچتا ہے تو یہ دین کی خرید و فروخت ہے جو کہ اصل رقم سے کم یا زیادہ پر جائز نہیں ہے۔ اس کی مزید تفصیل الگ اور مستقل مضمون میں بیان کر دی گئی ہے۔

۲۔بل آف ایکسچینج(Bill of Exchange)

جب کوئی تاجر اپنا مال کسی کو ادھار فروخت کرتا ہے تو اس کے نام ایک بل بناتا ہے جس میں مال اور قیمت کی مکمل تفصیل لکھی ہوتی ہے۔ بسا اوقات اس بل کی ادائیگی مستقبل کی کسی تاریخ میں طے ہوتی ہے۔ یہ بھی در حقیقت تاجر کا خریدار کے ذمہ دین ہے۔ اگر تاجر اس بل/دستاویز کو کسی تیسرے شخص پر فروخت کرتا ہے تو یہ بھی دین کی خرید و فروخت ہے، لہذا اس کو بل پر لکھی ہوئی قیمت سے کم یا زیادہ پر بیچنا جائز نہ ہوگا۔ اس پر بھی ایک مستقل مضمون کتاب میں موجود ہے۔

۳۔چیک(Cheque)

کسی شخص کا بینک میں اکاؤنٹ ہے تو اس اکاؤنٹ کی رقم اکاؤنٹ ہولڈر کا بینک کے ذمہ دین/قرض ہے۔ اگر اکاؤنٹ ہولڈر چیک لکھ کر کسی کو بیچتا ہے تو یہ دین کی خرید و فروخت ہوگی، البتہ صرف چیک لکھ کر کسی کو بینک سے رقم نکالنے کے لیے وکیل بنانا جائز ہے، یا اگر اکاؤنٹ ہولڈر اپنے کسی قرض خواہ کو چیک لکھ کر دیتا ہے تو یہ بھی حوالہ ہے، یہ دین کی خرید و فروخت میں نہیں آئے گا۔ اس کی تفصیل الگ مضمون میں بیان کر دی گئی ہے۔

۴۔پرامیسری نوٹ(Promissory Note)

یہ در حقیقت دین/قرض کا اقرار نامہ ہوتا ہے، جس میں کوئی شخص اپنے دستخط کے ساتھ دوسرے شخص کے لیے غیر مشروط پر تحریری وعدہ کرتا ہے کہ جب بھی مجھ سے اتنی رقم کا مطالبہ کیا جائے گا یا مستقبل کی کسی متعین تاریخ کو میں اس اقرار نامہ کے مطابق فلاں شخص کو اتنی رقم دینے کا پابند ہوں۔

پرامیسری نوٹ بھی دین/قرض کی ایک رسید اور سند ہے، اس لیے اس کو کسی اور پر فروخت کرنا دین کی خرید و فروخت ہے جو کہ کم یا زیادہ پر بیچنا درست نہیں ہے اور کسی تیسرے پر بیچنا "بیع الدين من غير من عليه الدين" کے زمرے میں آئے گا۔

۵۔کریڈٹ کارڈز(Credit Cards)

اس کا تعارف، اقسام اور احکام کی مکمل تفصیل پر کتاب میں مقالہ موجود ہے۔

۶۔انوائسز (Invoices)

انوائس کو عربی میں "فاتورة" کہتے ہیں۔ اس کی حقیقت بھی بل آف ایکسچینج کی طرح ہوتی ہے۔ مثلاً کسی نے اپنا مال کسی دوسرے کو فروخت کر کے اس کی تفصیلات کا ایک بل بنا دیا، جس کو انوائس کہتے ہیں۔ کبھی کبھی اس بل میں موجود

قیمت کی ادائیگی فوری نہیں ہوتی تو تاجر اس انوائس کو کسی تیسرے شخص پر کم قیمت میں بیچ دیتا ہے۔ یہ بھی دین کی خرید و فروخت ہے جو کہ جائز نہیں ہے۔

۷۔ مستقبل کے سودے (Future Contracts)

آج کل شئیرز (shares) اور دیگر اشیاء میں مستقبل کے سودے بھی ہوتے ہیں، جن میں کوئی شخص دوسرے سے کسی خاص کمپنی کے شئیرز یا مال خریدتا ہے اور ان شئیرز یا مال کی وصولی اور اس کی قیمت دونوں کو مستقبل کی کسی متعین تاریخ تک مؤخر کر دیتے ہیں کہ فلاں تاریخ کو شئیرز/مال مہیا کیا جائے گا اور قیمت کی ادائیگی بھی اسی تاریخ کو ہوگی۔ یہ صورت شرعی اعتبار سے درست نہیں ہے، کیونکہ یہ "بيع الدين بالدين" کے تحت آتی ہے کہ دونوں طرف کی چیزیں (مال/قیمت) ادھار و مؤجل ہیں۔

مزید تفصیلات، ائمہ کرام کی آراء اور حوالہ جات کے لیے درج ذیل کتابوں کی طرف رجوع فرمائیں:

۱۔ **بحوث في قضايا فقهية معاصرة**، جلد:۲، للشيخ مفتي محمد تقي عثماني مد ظلهم

۲۔ **الغرر وأثره في العقود**، للشيخ صديق الضرير

۳۔ **غرر کی صورتیں**، مولانا اعجاز صمدانی صاحب

۴۔ **مجلة مجمع الفقه الإسلامي**، جلد:۱۱۔ اس میں معاصر علماء کے تقریباً چھ مقالے اس موضوع پر موجود ہیں۔

۵۔ **المعايير الشرعية**، رقم المعيار: ۵۹، بيع الدين

۶۔ **بيع الدين وتطبيقاته المعاصرة في الفقه الإسلامي**، الدكتور أسامة بن محمود

۷۔ **قرارات وتوصيات**، مجمع الفقه الإسلامي التابع لمنظمة المؤتمر الإسلامي ۱ - ۱۷۴ (ص: ۳۰۰) قرار رقم: ۱۵۸ (۱۷/۷) بشأن بيع الدين

بانڈز: تعارف اور شرعی جائزہ

(Bonds)

یہ مضمون میگزین "شریعہ اینڈ بزنس" (۲۰۱۷ء) میں اور ویب سائٹس (mazameen.com اور daleel.pk) پر نشر ہو چکا ہے۔ اس مختصر مضمون کے بنیادی عنوانات حسبِ ذیل ہیں:

- بانڈز کا تعارف
- بانڈز کی اقسام
- بانڈز اور شیئرز میں فرق
- بانڈز کا شرعی حکم
- حاملِ بانڈز کے لیے شرعی راہنمائی
- شرعی متبادل

بانڈز کا تعارف

موجودہ دور میں مالیاتی دستاویزات (monetary papers) کے اندر بانڈز (bonds) کو بڑی شہرت حاصل ہے۔ بانڈ کو عربی میں "سند" کہتے ہیں۔ بانڈ ایسے دستاویز کو کہتے ہیں جو مقروض کی طرف سے قرض دینے والے کے لیے جاری کیا جاتا ہے، جس میں مقروض کی طرف سے یہ اقرار ہوتا ہے کہ میں نے فلاں شخص سے اتنی رقم لی ہے اور میں یہ رقم فلاں وقت میں واپس کرنے کا پابند ہوں۔ اس میں بانڈز جاری کرنے والا مقروض اور رقم دے کر بانڈز لینے والا قرض خواہ کہلائے گا۔

معاییر شرعیہ میں بانڈ کی تعریف یوں کی گئی ہے:

السند: هو ورقة مالية تصدرها المنشآت التجارية والحكومات، لتقرض بموجبها أموالا لآجال طويلة مقابل فائد ة ربوية لحاملها بصفة دورية، وقد تصدر بخصم من قيمتها الاسمية.[1]

[1] المعايير الشرعية ص:۵۸۸، رقم المعيار:۲۱

بانڈ ایسا مالیاتی دستاویز ہے جسے تجارتی ادارے یا حکومت جاری کرتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ ادارہ یا حکومت اس کے ذریعے طویل مدت کے لیے سودی قرض حاصل کرے۔ ادارہ/حکومت یہ سودی نفع بانڈز کے مالک کو ایک مخصوص مدت کے بعد ادا کرتا ہے۔ بعض اوقات یہ بانڈز ان پر لکھی ہوئی قیمت سے کم قیمت پر بھی جاری کیے جاتے ہیں۔

انوسٹوپیڈیا میں بانڈز کی تعریف یوں کی گئی ہے:

A bond is a fixed income instrument that represents a loan made by an investor to a borrower (typically corporate or governmental). Owners of bonds are debtholders, or creditors, of the issuer. Bond details include the end date when the principal of the loan is due to be paid to the bond owner and usually includes the terms for variable or fixed interest payments made by the borrower.[1]

بانڈ ایک متعین آمدنی کا آلہ ہے جو ایسے قرض کی نمائندگی کرتا ہے جو سرمایہ کار کسی قرض لینے والے (عام طور پر کارپوریٹ یا سرکاری) کو دیتا ہے۔ بانڈز کے مالک/حاملین ان کے لیے قرض خواہ کی حیثیت رکھتے ہیں، جنہوں نے بانڈ جاری کیا ہوتا ہے۔ بانڈ کی تفصیلات میں وہ اختتامی تاریخ بھی شامل ہوتی ہے جب اصل قرض کی رقم بانڈ کے مالک کو ادا کرنی ہوتی ہے اور اس میں عام طور پر ادھار کی طرف سے متغیر یا مقررہ سود کی ادائیگی کی شرائط شامل ہوتی ہیں۔

بانڈز کبھی حکومت اپنے بجٹ کے خسارے کو پورا کرنے کے لیے جاری کرتی ہے اور کبھی کوئی کمپنی سیال اثاثے کے حصول کے لیے جاری کرتی ہے، جبکہ بانڈز لینے والے عموماً عام لوگ اور عوام ہوتی ہے۔ آج کل ہر قسم کے بانڈ پر قرض خواہ (حاملِ بانڈز) کو نفع یا سود بھی ملتا ہے اور بانڈز ایک قسم کی قابلِ تبادلہ چیز سمجھی جاتی ہے، کیونکہ سیکنڈری مارکیٹ (secondary market) میں بانڈز کی کم یا زیادہ قیمت پر خرید وفروخت بھی ہوتی ہے۔ بانڈز کے اس مختصر تعارف کے بعد اس کی اقسام اور شرعی حکم بیان کیا جائے گا۔

---

(1) https://www.investopedia.com/terms/b/bond.asp

بانڈز کی اقسام

آج کل مختلف نام اور مختلف قسم کے بانڈز جاری کیے جاتے ہیں، بعض میں سود دینے کا طریقہ ایک طرح کا ہوتا ہے اور بعض میں سود کی ادائیگی کا طریقہ الگ ہوتا ہے، بعض قابلِ تحویل ہوتے ہیں اور بعض ناقابلِ تحویل۔ ان کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ کوپن بانڈز (Coupon Bonds)

اس کو عربی میں "سندات ذات کوبون" کہتے ہیں۔ اس قسم کے بانڈز میں بانڈز ہولڈر کے لیے متعین نفع طے کرلیا جاتا ہے۔ اگر ایک سال کے لیے بانڈز لیے ہیں تو ہر مہینے، یا چھ مہینے بعد یا بالکل آخر میں متعین نفع بانڈز ہولڈر کو دے دیا جاتا ہے۔ مثلاً بانڈ پر ایک لاکھ روپے کی قیمت لکھی ہے تو بانڈ حاصل کرنے والا ایک لاکھ روپے دے کر بانڈ لیتا ہے اور بعد اپنی اصل رقم کے ساتھ نفع اور سود بھی وصول کرتا ہے۔

۲۔ زیرو کوپن بانڈز (Zero Coupon Bonds)

اس کو عربی میں "سندات ذات الكوبون الصفري" کہتے ہیں۔ اس قسم کے بانڈز میں سود دینے کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ بانڈ لینے والا بانڈ کو اپنی اصلی قیمت (face value) سے کم میں لے کر آخر میں پوری قیمت وصول کرلیتا ہے۔ مثلاً اگر بانڈ کی قیمت ایک لاکھ روپے ہے تو اُسے نوے ہزار میں خرید لیا جاتا ہے اور آخر میں بانڈ ہولڈر نوے ہزار کے بجائے ایک لاکھ روپے وصول کرلیتا ہے۔[1]

۳۔ قابلِ تحویل بانڈز (Convertible Bonds)

اس سے وہ بانڈز مراد ہے جن کو بانڈ ہولڈر ایک مخصوص مدت کے اندر شیئرز یا دوسرے مالیاتی دستاویزات میں تبدیل کرسکتا ہے۔

۴۔ ناقابلِ تحویل بانڈز (Non-Convertible Bonds)

ناقابلِ تحویل بانڈز میں بانڈ ہولڈر کو یہ اختیار حاصل نہیں ہوتا کہ وہ بانڈز کو شیئرز یا دوسرے دستاویزات میں تبدیل کرسکے۔

۵۔ انعامی بانڈز (Prize Bonds)

اس قسم کے بانڈز میں بانڈز ہولڈر کو سود دینے کا طریقہ کار یوں ہوتا ہے کہ بانڈز جاری کرنے والا، مثلاً حکومت،

[1] فقه البيوع ١/٣٥٤

انعامی بانڈز لینے والے ہر شخص سے انفرادی طور پر سود (انعام) دینے کا معاہدہ نہیں کرتا، لیکن انعامی بانڈز لینے والے تمام افراد کے ساتھ بحیثیت مجموعی یہ بات طے ہوتی ہے کہ حکومت ان میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام تقسیم کرے گی اور بانڈز ہولڈر بذریعہ عدالت بانڈز جاری کرنے والے کو انعام دینے پر مجبور بھی کر سکتا ہے۔[1]

بانڈز اور شیئرز میں فرق

بانڈز اور شیئرز میں مندرجہ ذیل فروق ہیں:

۱۔ بانڈز قرض کی نمائندگی کرتے ہیں، لہذا بانڈز لینے والا قرض خواہ اور بانڈز جاری کرنے والا مقروض کہلاتا ہے، جبکہ شئیرز کمپنی کے جامد اور سیال اثاثوں میں ایک متناسب حصے کی نمائندگی کرتے ہیں، اس لیے شیئرز لینے والے قرض خواہ نہیں ہوتے، بلکہ کمپنی کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔

۲۔ بانڈز پر بہر صورت نفع ملتا ہے، خواہ بانڈز جاری کرنے والے کو نفع ہو یا خسارہ، جبکہ شیئرز پر صرف اس وقت نفع ملتا ہے جب کمپنی کو بھی نفع حاصل ہو چکا ہو، ورنہ نہیں۔

۳۔ بانڈز ہولڈرز کو کمپنی کے سالانہ اجلاس (annual general meeting) میں شرکت کا حق حاصل نہیں ہوتا، جبکہ شیئرز ہولڈرز کو یہ حق حاصل ہوتا ہے۔

۴۔ جب کمپنی تحلیل ہو جائے تو شیئرز ہولڈرز سے پہلے بانڈز ہولڈرز کو ان کی رقم دی جاتی ہے اس کے بعد بقیہ قرض و دیون ادا کر کے پھر شیئرز ہولڈرز کو ان کا حصہ دے دیا جاتا ہے۔

۵۔ بانڈز کے اختتام کی ایک مقررہ تاریخ ہوتی ہے جب وہ تاریخ آتی ہے تو بانڈز ہولڈر بانڈز واپس کر کے اپنی رقم وصول کر لیتا ہے، جبکہ شیئرز میں ایسا نہیں ہوتا۔ جب ایک مرتبہ شیئرز خرید لیے جائیں تو اس کے بعد شیئرز واپس کر کے کمپنی سے اپنی رقم واپس نہیں لی جا سکتی، البتہ اسٹاک ایکسچینج میں شیئرز کو فروخت کیا جا سکتا ہے۔[2]

بانڈز کا شرعی حکم

بانڈز خریدنا، اس پر نفع حاصل کرنا یا اس کو بیچنا سب ناجائز ہے، کیونکہ بانڈز لینا کوئی خرید و فروخت کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ یہ قرض کا معاملہ ہے اور قرض دے کر اس پر نفع حاصل کرنا حدیث کی رُو سے سود کے زمرے میں آتا ہے۔

---

[1] https://www.investopedia.com/terms/b/bond.asp

[2] المعاملات المالية المعاصرة في الفقه الإسلامي، الدكتور شبير احمد، ص: ٢١٤

اسی طرح بانڈز کو کم یا زیادہ قیمت پر آگے کسی اور کو فروخت کرنا بھی جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ قرض (دین) کی بیع ہے جو کمی زیادتی کے ساتھ فروخت کرنا تو جائز نہیں ہے اور کمی، زیادتی کے بغیر اصل رقم کے عوض ایسے شخص کو فروخت کرنا بھی جائز نہیں ہے جو بانڈز ہولڈر کا مقروض نہ ہو، جس کو فقہی اصطلاح میں ''بيع الدين من غير من عليه الدين'' کہتے ہیں۔[1]

اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ نے بھی اپنی ایک قرارداد میں تمام بانڈز کو قرض قرار دے کر ان کے جاری کرنے، خریدنے اور تبادلہ کو ناجائز قرار دیا ہے۔ فائدہ کے لیے اس قرارداد کو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

أولاً: إن السندات التي تمثل التزاماً بدفع مبلغاً مع فائدة منسوبة إليه أو نفع مشروط محرمة شرعاً من حيث الإصدار أو الشراء أو التداول، لأنها قروض ربوية سواء أكانت الجهة المصدرة لها خاصة أو عامة ترتبط بالدولة. ولا أثر لتسميتها شهادات أو صكوكاً استثمارية أو ادخارية أو تسمية الفائدة الربوية الملتزم بها ربحاً أو ريعاً أو عمولة أو عائداً.

ثانياً: تحرم أيضاً السندات ذات الكوبون الصفري باعتبارها قروضاً يجري بيعها بأقل من قيمتها الاسمية، ويستفيد أصحابها من الفروق باعتبارها حسماً لهذه السندات.

ثالثاً: كما تحرم أيضاً السندات ذات الجوائز باعتبارها قروضاً أُشترط فيها نفع أو زيادة بالنسبة لمجموع المقرضين، أو لبعضهم لا على التعيين، فضلاً عن شبهة القمار.

رابعاً: من البدائل للسندات المحرمة - إصداراً أو شراءً أو تداولاً - السندات أو الصكوك القائمة على أساس المضاربة لمشروع أو نشاط استثماري معين، بحيث لا يكون لمالكيها فائدة أو نفع مقطوع، وإنما تكون لهم نسبة من ربح هذا المشروع بقدر ما يملكون من هذه السندات أو الصكوك ولا ينالون هذا الربح إلا إذا تحقق فعلاً.[2]

---

[1] بدائع الصنائع ٥/ ١٤٨

[2] قرارات وتوصيات مجمع الفقه الإسلامي التابع لمنظمة المؤتمر الإسلامي ١ - ١٧٤ (ص: ٩٠) قرار رقم: ٦٠ (٦/١١) بشأن السندات.

اولا- ایسے بانڈز جن میں اس بات کا التزام ہو کہ بانڈز ہولڈر کو ان کی اصلی قیمت اور اس کے ساتھ کوئی متناسب نفع یا کسی اور قسم کا طے شدہ نفع دیا جائے گا وہ شرعاً حرام ہے۔ان کا اجراء، خریدنا اور لین دین سب حرام ہیں، کیونکہ یہ سودی قرضے ہیں، خواہ اسے کسی مخصوص ادارے نے جاری کیا ہو یا حکومت سے وابستہ کسی عام ادارے نے، خواہ ان کا نام سرٹیفکیٹس رکھا جائے یا سرمایہ کاری وثیقہ یا بچت اسکیم یا اس پر لازمی ملنے والے سود کو نفع یا آمدنی یا سروس چارج یا کمیشن یا کچھ اور نام دیا جائے، اس سے بانڈز کی حقیقت (قرض پر سود) پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ثانیا- صفر کوپن والے بانڈز بھی حرام ہیں، کیونکہ وہ ایسے قرض ہیں جن کی فروختگی ان کی اصل قیمت سے کم میں ہوتی ہے اور بانڈز کے مالک قیمتوں کے فرق سے بطورِ ڈسکاؤنٹ فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ثالثا- انعامی بانڈز بھی حرام ہیں، کیونکہ ان کی حیثیت ایسے قرض کی ہے جس میں مجموعی طور پر قرض خواہوں کے لیے یا ان میں سے غیر متعین طور پر بعض کے لیے نفع یا زیادتی مشروط ہوتی ہے اور اس میں قمار (جوئے) کا شبہ بھی پایا جاتا ہے۔

رابعا- جن بانڈز کا اجراء، خریدنا اور لین دین حرام ہے، ان کے متبادل ایسے بانڈز یا دستاویزات ہو سکتے ہیں جو کسی متعین سرمایہ کارانہ عمل یا پروجیکٹ کے لیے مضاربہ کی بنیاد پر جاری کیے جائیں، جن میں مالکانِ دستاویز کے لیے کوئی نفع یا اضافہ قطعی و متعین نہیں ہوتا، بلکہ بانڈز یا دستاویز میں ان کی ملکیت کے تناسب سے پروجیکٹ کی آمدنی کی ایک شرح ان کے لیے مقرر ہوتی ہے اور یہ آمدنی بھی اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب واقعی اس پروجیکٹ میں نفع ہوا ہو۔

بعض حضرات کو یہ شبہ ہے کہ پرائز بانڈز میں ہر بانڈ ہولڈر کو انعام دینے کی شرط نہیں ہوتی، لہذا یہ جائز ہونا چاہیے، کیونکہ یہ مشروط نفع نہیں ہے، لیکن یہ خیال درست نہیں ہے، کیونکہ اگرچہ ہر بانڈ ہولڈر کے ساتھ یہ شرط اور معاہدہ نہیں ہوتا، لیکن بحیثیت مجموعی سب کے ساتھ یہ معاہدہ ہوتا ہے اور جس کا نام نکل آئے وہ بانڈ جاری کرنے والے کو انعام دینے پر مجبور بھی کر سکتا ہے، لہذا یہ مشروط نفع ہی ہے جو کہ حرام ہے۔

معاییر شرعیہ میں ہے:

يحرم إصدار جميع أنواع السندات الربوية، وهي التي تتضمن اشتراط رد المبلغ المقترض وزيادة على أي وجه كان، سواء أ دفعت هذه الزيادة عند سداد أصل القرض، أم دفعت على أقساط شهرية، أم سنوية، أم غير ذلك، وسواء أكانت

هذه الزيادة تمثل نسبة ممن قيمة السند، كما في أغلب أنواع السندات، أم خصما منها، كما في السندات ذات الكوبون(العائد) الصفري، وتحرم كذلك السندات ذات الجوائز، سواء أكانت السندات خاصة أم عامة أم حكومية.[1]

تمام اقسام کے سودی بانڈز کا اجراء حرام ہے۔یہ وہ بانڈز ہیں جن میں قرض کی رقم کے ساتھ کسی نہ کسی شکل میں کچھ اضافی رقم کی واپسی بھی مشروط ہوتی ہے، چاہے یہ اضافی رقم قرض کی اصل رقم کی واپسی کے وقت ادا کی جائے یا ماہانہ، یا سالانہ قسطوں کی شکل میں ادا کی جائے یا کسی اور صورت میں ادا کی جائے۔اور چاہے یہ اضافی رقم بانڈز کی قیمت کے ایک مخصوص تناسب سے طے کی جائے، جیسا کہ بانڈز کی زیادہ تر اقسام میں ہوتا ہے، یا ڈسکاؤنٹ کی صورت میں ادا کی جائے، جیسا کہ صفر کوپن والے بانڈ میں ہوتا ہے۔اسی طرح انعامی بانڈز بھی حرام ہیں، خواہ ایسے بانڈز خاص ہوں، یا عام ہوں یا حکومتی ہوں۔

حاملِ بانڈز کے لیے شرعی راہنمائی

اگر کسی شخص نے لاعلمی میں بانڈز خرید لیے یا جان بوجھ کر بانڈز خریدے تھے، لیکن اب اللہ تعالیٰ نے اُسے سود سے توبہ کی توفیق نصیب فرمائی تو ایسا شخص ان بانڈز کا کیا کرے جو اس نے خریدے ہیں؟ ایسے شخص کے لیے درج ذیل اختیارات/آپشنز ہیں:

۱۔اس کو چاہیے کہ بانڈز کی مدت کے ختم ہونے کا انتظار کرے، جب مدت ختم ہو جائے تو بانڈز جاری کرنے والے سے صرف اپنی اصل رقم واپس وصول کرے، اضافی سود ہرگز وصول نہ کرے۔

۲۔اگر اُسے فی الفور رقم کی سخت ضرورت ہے تو اُسے چاہیے کہ بانڈز جاری کرنے والے ادارے سے صلح کرنے کی کوشش کرے کہ میں بانڈز پر سود وصول نہیں کرتا، البتہ مجھے بانڈز کی مدت مکمل ہونے سے پہلے میری اصل رقم واپس کردی جائے۔ ممکن ہے بانڈز جاری کرنے والا ادارہ اس بات پر راضی ہو جائے۔

۳۔ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ بانڈز ہولڈر کسی اور سے قرض لے اور اس کے ساتھ عقدِ حوالہ کر کے بانڈز اپنے قرض خواہ کو دے کر یوں کہہ دے کہ: آپ کا میرے ذمہ جو قرض ہے وہ آپ فلاں تاریخ کو جا کر بانڈز جاری کرنے والے سے وصول کر لے۔ البتہ اس صورت میں ایک تو دونوں قرض برابر ہونا ضروری ہیں، دوسرا اگر قرض خواہ کو

[1] المعايير الشرعية ص: ٥٧٤، رقم المعيار:٢١

بانڈز جاری کرنے والے سے اپنا قرض نہ ملے تو وہ دوبارہ اصل بانڈ ہولڈر سے اپنے قرض کا مطالبہ کر سکتا ہے۔[1]

۴۔ اگر درج بالا صورتیں ممکن نہیں ہیں اور بانڈ ہولڈر کو فی الحال رقم کی سخت ضرورت ہے تو وہ اپنے بانڈز کسی تیسرے شخص کو اُتنی رقم کے عوض فروخت کرلے جو اُس نے بانڈز جاری کرنے والے ادارے کو دے کر بانڈز خریدے تھے، اس سے زیادہ یا کم قیمت پر نہ بیچے۔

اس چوتھے آپشن پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ بانڈز کسی تیسرے شخص کو بیچنا فقہی اعتبار سے "بيع الدين من غير من عليه الدين" ہے جو کہ ائمہ ثلاثہ (امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ) کے نزدیک جائز نہیں ہے، لیکن چونکہ امام مالکؒ اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ مقروض کے علاوہ کسی اور شخص کو قرض فروخت کرنا جائز ہے، بشرطیکہ تساوی اور برابری ہو، یعنی جتنا قرض ہے اُتنے میں ہی فروخت کیا جائے، کم یا زیادہ میں نہیں۔[2] اس لیے ضرورت کے وقت مالکیہ کے قول پر اس شرط کے ساتھ عمل کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

شرعی متبادل

چونکہ بانڈز جاری کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، اس لیے ذیل میں بانڈز کا شرعی و جائز متبادل بیان کیا جاتا ہے:

ا۔ شیئرز کا اجراء:

اگر کمپنی کو مزید سرمایہ کی ضرورت ہے اور منظور شدہ سرمایہ (authorized capital) میں گنجائش بھی موجود ہے تو اُسے چاہیے کہ بانڈز کے بجائے، مزید شیئرز جاری کر کے لوگوں سے رقم وصول کرلے۔ اس میں اگر پرانے شیئرز ہولڈرز کو ترجیحی حق دیا جائے تو اس میں بھی شرعاً کوئی برائی نہیں ہے۔ البتہ بسا اوقات کمپنی مزید شیئرز جاری کر کے حصہ داران میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی، کبھی منظور شدہ سرمایہ میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی اور کبھی عوام کو شیئرز میں رغبت ہی نہیں ہوتی، اس صورتحال میں درج ذیل طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں۔

۲۔ مشارکہ سرٹیفکیٹ:

مزید سرمایہ کے حصول کے لیے ایک بہتر طریقہ یہ ہے کہ کمپنی مشارکہ سرٹیفکیٹ جاری کرے، جو لوگ یہ سرٹیفکیٹ خریدیں گے ان کے اور کمپنی کے درمیان مشارکہ کا عقد منعقد ہو جائے گا۔ یہ سرٹیفکیٹ، شیئرز کی طرح کمپنی

---

[1] بدائع الصنائع ٦/ ١٨

[2] مجلة مجمع الفقه الإسلامي ٢/ ٨٦، ٢١، بيع الدين والأوراق المالية، للشيخ تقي عثماني

کے اثاثہ جات میں ایک متناسب حصے کی نمائندگی کرتے ہیں، اس لیے ان کو سیکنڈری مارکیٹ (secondary market) میں فروخت کرنا بھی جائز ہوگا۔ حکومت بھی اپنے کسی خاص پراجیکٹ کے لیے یہ طریقہ اختیار کر سکتی ہے۔

۳۔ صکوک کا اجراء:

سرمایہ حاصل کرنے کا ایک مشہور طریقہ یہ ہے کہ کمپنی یا حکومت صکوک جاری کرے۔ یہ بھی مشارکہ سرٹیفکیٹ کی طرح ایک مالی دستاویز ہے، لیکن مشارکہ سرٹیفکیٹ میں صرف مشارکہ کا عقد ہوتا ہے، جبکہ صکوک کی بنیاد مشارکہ، مضاربہ، اجارہ، استصناع اور شرکتِ متناقصہ وغیرہ جیسے عقود میں سے کوئی عقد ہوتا ہے۔ ان طریقوں پر عمل کرنے کے لیے اور تفصیل کے لیے علماء سے رجوع کیا جائے۔

بانڈز کے موضوع پر مزید تحقیق کے لیے مندرجہ ذیل کتب کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے:

۱. الأسهم والسندات وأحكامها في الفقه الإسلامي، أحمد بن محمد الخليل
۲. بحوث في قضايا فقهية معاصرة، بيع الدين والأوراق المالية، للشيخ المفتي محمد تقي العثماني
۳. أحكام الأوراق التجارية في الفقه الإسلامي، دكتور سعد بن تركي
۴. قرارات وتوصيات مجمع الفقه الإسلامي التابع لمنظمة المؤتمر الإسلامي ١ - ١٧٤ (ص: ٩٠) قرار رقم: ٦٠ (٦/١١) بشأن السندات.

بل آف ایکسچینج: تعارف وشرعی حیثیت
(B ill of Exchange)

اس مضمون کے بنیادی نکات مندرجہ ذیل ہیں:

- بل آف ایکسچینج کا تعارف
  - ا۔ تعارف
  - ۲۔ بل آف ایکسچینج کی شرائط
  - ۳۔ بل آف ایکسچینج کے فوائد
  - ۴۔ بل آف ایکسچینج کی اقسام
- بل آف ایکسچینج کی فقہی حیثیت
- بل آف ایکسچینج کے تبادلہ کا شرعی حکم
- تبادلہ کا متبادل

بل آف ایکسچینج کا تعارف

ا۔ تعارف:

بسا اوقات جب کوئی تاجر کسی پر کوئی چیز بیچتا ہے تو وہ خریدار کے لیے ایک بل بناتا ہے، کبھی اس بل کی ادائیگی فوری نہیں کی جاتی، بلکہ کچھ مدت بعد اس کی ادائیگی واجب ہوتی ہے۔ اس طرح کے بل کو خریدار منظور کرتا ہے اور اس کی پشت پہ دستخط کرکے یہ اقرار کرتا ہے کہ میں فلاں تاریخ کو تاجر کو اتنی رقم دینے کا پابند ہوں۔ اس طرح کے بل کو انگریزی میں ''بل آف ایکسچینج''(bill of exchange) کہا جاتا ہے اور عربی میں اس کو '' كمبيالة''اور اردو میں اس کو ''ہنڈی'' یا ''مبادلاتی بل'' کہا جاتا ہے۔ اس بل پر ایک ٹکٹ چپکا دیا جاتا ہے تاکہ اس کو قانونی شکل دے دی جائے، کیونکہ اس کا باقاعدہ ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ بل پر تاجر کا نام، دستخط، پتہ، ادائیگی کی تاریخ وغیرہ پوری تفصیل لکھی ہوتی ہے۔

یہاں چند اصطلاحات سمجھنا ضروری ہیں، مثلاً: جس تاریخ کو ادائیگی ہوتی ہے اس تاریخ کو عربی میں ''نضج الكمبيالة'' کہا جاتا ہے، اور انگلش میں اس کو ''میچورٹی ڈیٹ''(maturity date) کہتے ہیں۔ خریدار، جس کے

ذمہ قیمت کی ادائیگی لازم ہوتی اور جو بل پر دستخط کر کے منظور کرتا ہے اس کو عربی میں "ساحب" اور انگریزی میں (drawer) کہتے ہیں۔ تاجر، جس کی قیمت دوسرے پر لازم ہوتی ہے، اس کو عربی میں "مسحوب عليه" اور انگریزی میں (drawee) کہتے ہیں۔ بسا اوقات تاجر اس بل کو کسی تیسرے فریق/بینک کو بیچ دیتا ہے اور وہی تیسرا فریق/بینک بعد میں مقروض (خریدار) سے رقم کی وصولی کرتا ہے، اس تیسرے فریق یا بینک کو عربی میں "المستفيد" اور انگریزی میں (payee) کہتے ہیں۔

جب اس طرح کا بل تیار ہو جاتا ہے تو تاجر، خریدار سے ادائیگی کے وقت سے پہلے اپنی رقم کا مطالبہ نہیں کر سکتا، اس لیے جب کبھی تاجر کو رقم کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ اپنا قرض جلدی وصول کرنا چاہے تو وہ کسی تیسرے شخص/بینک کے پاس چلا جاتا ہے اور اپنا یہ بل اس تیسرے شخص/بینک کو فروخت کر دیتا ہے اور اس سے اپنی رقم وصول کر لیتا ہے اور بل کی پشت پر دستخط کر کے اس کے تمام حقوق تیسرے شخص/بینک کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ یہ فروختگی عموماً اس قیمت سے کم قیمت پر ہوتی ہے جو رقم بل میں لکھی ہوئی ہوتی ہے، مثلاً بل میں اگر ایک لاکھ روپے کی رقم لکھی ہوئی ہے تو اس بل کو پچانوے یا اٹھانوے ہزار روپے پر فروخت کیا جاتا ہے۔ یہ کٹوتی مدتِ وصولی کے کم یا زیادہ ہونے سے مختلف ہوتی ہے، مثلاً اگر بل کی وصولی میں زیادہ وقت ہو تو کٹوتی بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بل کی ادائیگی کی مدت آنے تک یہ بل کئی ہاتھوں میں فروخت ہو چکا ہوتا ہے، جتنی مدت قریب آتی ہے اتنی کٹوتی کم ہوتی ہے۔

اس کاٹوتی کے عمل کو عربی میں "خصم الكمبيالة" یا "حسم الكمبيالية" یا "قطع الكمبيالة" کہا جاتا ہے، انگلش میں اس کو ڈسکاؤنٹنگ (discounting) اور اردو میں اس کو "بٹہ لگانا" کہتے ہیں۔ تاجر اپنے حقوق کو منتقل کرتے وقت بل پر جو دستخط کرتا ہے اس کو عربی میں "التظهير" کہتے ہیں اور انگلش میں اس کو انڈورسمنٹ (endorsement) کہتے ہیں، جبکہ اردو میں اس کو "عبارت ظہری لکھنا" کہتے ہیں۔

بل آف ایکسچینج کی خرید و فروخت کو کثیر المیعاد قرضوں میں شمار کیا جاتا ہے، گویا بینک نے اصل دائن (تاجر) کو قرض فراہم کر دیا اور مدیون (خریدار) سے وہ قرض مع نفع خود وصول کر لے گا۔[1]

معاییر شرعیہ میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

الكمبيالة: صك يحرر وفقا لشكل قانوني معين، ويتضمن أمرا صادرا من شخص (يسمى الساحب) موجها إلى شخص آخر (يسمى المسحوب عليه) بأن يدفع

[1] https://www.investopedia.com/terms/b/billofexchange.asp

مبلغا معينا لدى الاطلاع، أو في تاريخ معين، أو قابل للتعيين إلى شخص ثالث (يسمى المستفيد).[1]

ہنڈی: یہ ایک ایسی دستاویز ہے جسے خاص قانونی شکل میں جاری کیا جاتا ہے۔اس میں فریق اول (جاری کرنے والے) کی طرف سے فریق دوم (مقروض/مسحوب علیہ) کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ وہ فریق ثالث (مستفید) کو مطالبہ پر، یا ایک مخصوص مدت کے اندر اندر، یا کسی متعین، یا قابل تعین تاریخ پر ایک مخصوص رقم ادا کردے۔

انوسٹوپیڈیا میں بل آف ایکسچینج کی تعریف یوں کی گئی ہے:

A billofexchange is a written orderused primarily in international trade that binds one party to pay a fixed sum of money to another party on demand or at a predetermined date. Bills of exchange are similar to checks and promissory notes—they can be drawn by individuals or banks and are generally transferable by endorsements.[2]

بل آف ایکسچینج ایک تحریری آرڈر ہے جو بنیادی طور پر بین الاقوامی تجارت میں استعمال ہوتا ہے جو ایک فریق کو پابند کرتا ہے کہ وہ دوسرے فریق کو مانگنے پر یا پہلے سے طے شدہ تاریخ میں مقررہ رقم ادا کردے۔ بل آف ایکسچینج بھی چیک اور پرامیسری نوٹ کی طرح ہوتے ہیں، جو انفرادی طور پر بھی کیش کرائے جاسکتے ہیں اور بذریعہ بینک بھی۔اور یہ عام طور پر توثیق (انڈورسمنٹ) کے ذریعہ قابل منتقلی ہوتے ہیں۔

۲۔بل آف ایکسچینج کی شرائط:

تعارف کے ضمن میں یہ بات بھی سمجھنی چاہیے کہ اس طرح کے بل کی شرائط کیا ہیں؟ بالفاظِ دیگر کونسے بل کو "بل آف ایکسچینج" قرار دیا جائے گا؟اس کے لیے مختلف شرائط ذکر کی جاتی ہیں، مثلا:

۱۔اس کو حکم نامہ کی شکل میں لکھا جائے، درخواست اور گزارش کی شکل میں نہ لکھا جائے۔

۲۔دوسری شرط یہ ہے کہ یہ تحریری شکل میں ہونا ضروری ہے۔

(۱) المعايير الشرعية ص: ۱۷۸، رقم المعيار:۱٦

(2) https://www.investopedia.com/terms/b/billofexchange.asp

۳۔ تیسری شرط یہ ہے کہ یہ غیر مشروط ہو، اس میں کسی قسم کی شرط نہ لگائی جائے۔

۴۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ اس میں کم از کم دو فریق ہوں، تاجر اور خریدار دونوں کے نام اور دستخط ہوں۔ ساحب یعنی خریدار کی طرف سے منظوری کے دستخط اور تاجر کی طرف سے قبولیت کے دستخط ہوں۔

۵۔ پانچویں شرط یہ ہے کہ رقم اور تاریخ کا اندراج ہو۔ ان شرائط کے بعد اس بل کو بل آف ایکسچینج کی شکل حاصل ہو جاتی ہے۔[1]

۳۔ بل آف ایکسچینج کے فوائد:

تعارف کے سلسلے میں بل آف ایکسچینج کے تجارتی فوائد کو بھی سمجھنا چاہیے۔ اس بل کے کئی فوائد ہیں، مثلاً:

۱۔ پہلا فائدہ: یہ بطور وسیلہ اور آلہ تبادلہ استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے یہ ملکی اور غیر ملکی ادائیگیوں کے لیے ایک مؤثر ذریعہ ہے۔

۲۔ دوسرا فائدہ: اس میں فریقین کا فائدہ ہوتا ہے۔ تاجر کا فائدہ یہ ہے کہ اس کو اپنی رقم کی عدم وصولی کے خطرات کم سے کم ہو جاتے ہیں اور خریدار کا فائدہ یہ ہے کہ اس کو فی الفور ادائیگی نہیں کرنی پڑتی، بلکہ مستقبل کی ادائیگی اور ادھار پر اس کو مطلوبہ چیز مل جاتی ہے۔

۳۔ تیسرا فائدہ: یہ ادائیگی کا ایک محفوظ ذریعہ ہے، کیونکہ اگر خریدار مطلوبہ وقت پر ادائیگی نہیں کرتا تو تاجر بل آف ایکسچینج کے ذریعہ قانونی چارہ جوئی کر سکتا ہے، کہ اس کے پاس تحریری ثبوت موجود ہوتا ہے۔

۴۔ چوتھا فائدہ: اس میں کٹوتی کا بھی فائدہ ہے جس کو ''خصم الكمبيالة'' کہا جاتا ہے، جو اگرچہ شرعی اعتبار سے جائز نہیں ہے۔ اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

۴۔ بل آف ایکسچینج کی اقسام:

بل آف ایکسچینج کی مختلف اقسام ہیں، کچھ ملکی لحاظ سے، کچھ مقاصد کے لحاظ سے، کچھ ادائیگی کے لحاظ سے۔ چند اہم اقسام یہ ہیں:

۱۔ پہلی قسم: (inland bill) جو صرف ملکی تجارت کی صورت میں وجود میں آتے ہیں۔ تبادلہ بھی ملکی سطح پر ہوتا ہے اور تاجر اور خریدار دونوں ایک ہی ملک کے ہوتے ہیں۔

۲۔ دوسری قسم: (foreign bill) جس بل میں ملکی فریق کے علاوہ غیر ملکی فریق بھی شامل ہو سکتا ہو۔ مثلاً

(1) https://legal-dictionary.thefreedictionary.com/bill+of+exchange

تاجر پاکستان کا،اور خریدار سنگاپور کا ہو۔

۳۔تیسری قسم:(commercial bill) یہ تجارتی بل ہوتے ہیں جو صرف تجارتی معاملات اور لین دین کے سلسلے میں وجود میں آتے ہیں۔

۴۔چوتھی قسم:(accommodation bill)اس قسم کو ''اعانتی بل'' کہہ سکتے ہیں۔جو کسی قرض وغیرہ کے سلسلے میں وجود میں آتے ہیں۔

۵۔پانچویں قسم: بعض بلوں کی ادائیگی عند الطلب واجب ہوتی ہے ،ان کو انگریزی میں(sight demand On /draft)کہتے ہیں اور بعض بلوں میں مدت لکھی جاتی ہے کہ اتنی مدت بعد رقم کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے،ان کو(time draft/time bill)کہتے ہیں۔[1]

بل آف ایکسچینج کی فقہی حیثیت

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ بل آف ایکسچینج کی فقہی حیثیت یا''فقہی تکییف''کیا ہے؟ جہاں تک صرف حامل بل اور بل جاری کرنے والے کے درمیان کے تعلق کی بات ہے تو یہ درحقیقت ''دین'' کا تعلق ہے، جس میں حامل بل، دائن یعنی قرض خواہ ہے اور جس نے بل جاری کیا ہے وہ مدیون یعنی مقروض ہے، لیکن جب حامل بل کسی بینک وغیرہ کے ساتھ معاملہ کر کے اس کو بل دے کر اس سے رقم لیتا ہے تو ایک تیسرا فریق (بینک) بھی درمیان میں آجاتا ہے جس کی وجہ سے اب اس معاملہ کی حیثیت میں کچھ تبدیلی ہو جاتی ہے۔ بل آف ایکسچینج کی فقہی حیثیت میں معاصر علماء کی آراء مختلف ہیں، بعض نے اسے ''قرض''قرار دیا ہے، بعض نے اسے صرف ''امر اداء'' کہہ دیا ہے، لیکن اس سلسلے میں معاصر علماء کی تین بنیادی اور قابل توجہ آراء سامنے آئی ہیں کہ اس بل کی فقہی حیثیت کیا ہے اور یہ کس قسم کے عقد میں داخل ہے؟

۱۔پہلی رائے:

بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ ہنڈی کا معاملہ در حقیقت ''سفتجہ''ہے۔ سفتجہ کی حقیقت یہ ہے کہ اس میں ایک شخص دوسرے کو قرض دے کر یہ شرط عائد کرتا ہے کہ قرض لینے والا کسی دوسرے شہر میں قرض خواہ کو یا اس کے نائب کو لیا ہوا قرض واپس کر دے گا۔ ہنڈی میں بھی ایک شخص دوسرے کا مقروض ہوتا ہے جو اس کے نائب (بینک) کو بعد میں قرض اداء کرتا ہے۔[2]

---

[1] https://www.marketing91.com/types-of-bill-of-exchange/

[2] أحكام الأوراق التجارية في الفقه الإسلامي ص:۱۱٦ . الدكتور سعد بن تركي الخثلان

سفتجہ کی فقہی حیثیت کیا ہے؟ سفتجہ کا شرعی حکم کیا ہے؟ ان دونوں نکات میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں، جو ہم نے "بیع صرف" کے تحت ذکر کیا ہے، لیکن بل آف ایکسچینج میں غور کیا جائے تو یہ رائے کمزور معلوم ہوتی ہے، کیونکہ سفتجہ کا بنیادی مقصد راستے کا خطرہ دور کرنا ہوتا ہے، جبکہ ہنڈی کا یہ مقصد نہیں ہوتا۔ دوسرا یہ کہ سفتجہ میں قرض لینے والا کسی دوسرے شہر میں قرض کی ادائیگی کرتا ہے، جبکہ ہنڈی میں ایسا ضروری نہیں ہے۔

۲۔ دوسری رائے:

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ در حقیقت اپنا قرض کسی تیسرے فریق کو بیچنا ہے، جس کو فقہی اصطلاح میں "بيع الدين من غير من عليه الدين" کہتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ اس بل میں "تاجر" دائن یعنی قرض خواہ ہوتا ہے اور "خریدار" مدیون یعنی مقروض ہوتا ہے۔ جب تاجر نے یہ بل کسی تیسرے فریق (مثلاً بینک وغیرہ) کو فروخت کر دیا تو گویا اس نے اپنا دین/قرض، مقروض کے بجائے کسی شخص ثالث کو فروخت کر دیا اور یہی حقیقت میں "بيع الدين من غير من عليه الدين" ہے۔[۱]

۳۔ تیسری رائے:

شیخ الاسلام مفتی تقی صاحب دامت برکاتہم کی رائے یہ ہے کہ یہ "بيع الدين من غير من عليه الدين" نہیں ہے، بلکہ یہ "عقدِ حوالہ" ہے۔ اس میں تاجر "محال لہ" ہے، خریدار "محیل" ہے اور بینک یا تیسرا شخص "محال علیہ" ہے۔ اگر مدیون (خریدار) کا اکاونٹ اس بینک (محال علیہ) میں موجود ہے تو یہ "حوالہ مقیدہ" ہو جائے گا اور اگر اس کا اکاونٹ نہیں ہے تو یہ "حوالہ مطلقہ" ہوگا۔

اس کے حوالہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جب "تاجر" بل کو فروخت کر دیتا ہے اور ادائیگی کا وقت آجانے پر اصل مقروض (خریدار) سے رقم وصول نہ ہو سکے تو بینک دوبارہ تاجر کی طرف رجوع کر کے اپنی رقم اس سے واپس لے لیتا ہے، یہی حوالہ کی حقیقت ہے، ورنہ بیع کے اندر ایسا نہیں ہوتا کہ قرض خریدنے والا (بینک) دوبارہ بائع (تاجر) سے اپنی رقم کا مطالبہ کرے۔ اگر یہ بیع ہوتی تو تاجر بل فروخت کر کے بری ہو جاتا اور بینک کو اس سے رجوع کا اختیار نہ تا، کیونکہ بیع میں سارے حقوق خریدار کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں، البتہ حوالہ میں ایسا ہوتا ہے اگر محال علیہ کو محیل سے رقم نہ ملے تو وہ محال لہ سے رجوع کر سکتا ہے، جس کو فقہی اصطلاح میں "توی" کہتے ہیں۔[۲]

---

(۱) مجلة مجمع الفقه الإسلامي ۱۱/۱۷۳

(۲) تكملة فتح الملهم ۱/۵۱۵

یہی رائے معاییر شرعیہ میں بھی اختیار کی گئی ہے، تاہم اس میں یہ اضافہ ہے کہ اگر بل منظور کرنے والے پر کسی قسم کا دین/قرض نہ ہو، اس کے باوجود وہ بل منظور کر کے اس پر دستخط کرتا ہے اور کسی شخص کو یہ اجازت دیتا ہے کہ وہ جا کر بل منظور کرنے والے کے اکاؤنٹ سے کچھ خاص مقدار کی رقم بینک سے وصول کرے تو یہ عقدِ وکالہ ہو گا اور حاملِ دستاویز کو وکیل قرار دیا جائے گا۔

٤/١٢ الكمبيالة:

١/٤/١٢ تعتبر الكمبيالة من قبيل الحوالة إذا كان الشخص المستفيد الذي سحبت لأمره دائنا للساحب، ويكون الساحب هو المحيل الذي يصدر أمرا للمسحوب عليه بدفع مبلغ معين من النقود في تاريخ معين للمستفيد المحدد. أما الجهة الملتزمة بدفع المبلغ المعين (المسحوب عليه) فيه المحال عليه، والمستفيد حامل الكمبيالة هو المحال فإن لم يكن المستفيد دائنا للساحب كان إصدار الكمبيالة توكيلا من الساحب للشخص في قبض واستيفاء مبلغ الكمبيالة.

٢/٤/١٢ تعتبر الكمبيالة في حال عدم وجود مديونية بين الساحب والمسحوب عليه من قبيل الحوالة المطلقة.[1]

جس شخص کے لیے ہنڈی کا بل جاری کیا جائے، اگر وہ ہنڈی جاری کرنے والے کا دائن ہو تو اس ہنڈی کو ''حوالہ'' قرار دیا جائے گا اور ہنڈی جاری کرنے والا محیل ہو گا، جو ہنڈی کی رقم دینے والے کو حکم دیتا ہے کہ وہ متعین تاریخ میں ایک خاص شخص کو ایک متعین رقم اداء کر دے۔ رہی بات متعین رقم کی ادائیگی کا التزام کرنے والے ادارے کی تو وہ محال علیہ ہوتا ہے اور ہنڈی کا حامل اور اس سے استفادہ کرنے والا شخص محال ہوتا ہے۔ اگر ہنڈی سے استفادہ کرنے والا شخص، ہنڈی جاری کرنے والے کا دائن نہ ہو تو اس صورت میں ہنڈی کا اجراء گویا ہنڈی جاری کرنے والے کی طرف سے اگلے شخص کو قبضہ اور ہنڈی کی رقم کی وصولی کا وکیل مقرر کرنا ہے۔

ہنڈی جاری کرنے والے اور ہنڈی کی رقم دینے والے کے درمیان قرض کے تعلق نہ ہونے کی صورت میں ہنڈی کو ''حوالہ مطلقہ'' سمجھا جائے گا۔

---

[1] المعايير الشرعية ص: ٥٤، رقم المعيار:٧

بل آف ایکسچینج کے تبادلہ کا شرعی حکم

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ بل آف ایکسچینج کو اکثر کسی تیسرے فریق کو بیچا جاتا ہے اور اس میں کٹوتی بھی کی جاتی ہے، اس سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس طرح کسی تیسرے کو بل بیچنا شرعاً کیسا ہے اور اس کٹوتی/ڈسکاؤنٹنگ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس بحث کو بھی ہم دو صورتوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱۔ برابری کے ساتھ تبادلہ

۲۔ کٹوتی کے ساتھ تبادلہ

۱۔ برابری کے ساتھ تبادلہ:

پہلی صورت یہ ہے کہ تاجر، بینک کو برابر سرابر رقم پر بل فروخت کر دیتا ہے۔ مثلاً بل پر ایک لاکھ روپے کی رقم لکھی ہوئی ہے اور تاجر بینک کو ایک لاکھ روپے پر ہی بل فروخت کر دے۔ یہ صورت قابل عمل نہیں ہے، کیونکہ کوئی بھی بینک بغیر نفع کے ایسا بل نہیں خریدتا، اس کے باوجود اگر ایسا معاملہ وجود میں آجائے تو اس بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس کو "بیع الدین من غیر من علیہ الدین" قرار دیا جائے تو یہ حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک جائز نہیں ہے، جبکہ فقہاء مالکیہ نے کچھ شرائط کے ساتھ اس کی اجازت دی ہے۔ اور اگر اس عقد کو "حوالہ" قرار دیا جائے تو حنفیہ اور حنابلہ کے نزدیک اس کی گنجائش ہے، بشرطیکہ کسی قسم کی کٹوتی نہ ہو، کیونکہ بذریعہ حوالہ دین منتقل کرنا جائز ہے۔

اس کی طرح ایک اور صورت فقہاء نے "جامکیہ" کے نام سے ذکر کی ہے۔ جامکیہ کا لفظ جامہ سے بنا ہے۔ جامہ کپڑے کو کہتے ہیں۔ پرانے زمانے میں کپڑے دھونے والے کو جو اجرت دی جاتی تھی اس کو "جامکیہ" کہتے تھے، لیکن بعد میں ہر قسم کی اجرت کو "جامکیہ" کہا جانے لگا۔ جامکیہ ایک ورقہ ہوتا تھا جو حکومت مستحقین کے لیے بیت المال سے جاری کرتی تھی کہ فلاں کا بیت المال میں اتنا حصہ ہے یا وقف کے لیے اس طرح جاری کرتی تھی کہ فلاں کا وقف میں اس اتنا حصہ ہے۔ لوگ اس طرح کی رسید کو آگے فروخت کرتے تھے۔ اس کو علماء نے "بیع الدین من غیر من علیہ الدین" قرار دے کر ناجائز کہا ہے۔[۱]

۲۔ کٹوتی کے ساتھ تبادلہ:

دوسری صورت یہ ہے کہ بل کو کٹوتی اور ڈسکاؤنٹنگ کے ساتھ کسی تیسرے شخص/بینک کو بیچا جائے۔ یہ صورت تمام ائمہ کے نزدیک ناجائز ہے، کیونکہ اگر یہ "بیع الدین من غیر من علیہ الدین" ہے تو یہ اکثر فقہاء کے

---

(۱) الدر المختار وحاشیۃ ابن عابدین ٤/ ٥١٧

ہاں ویسے بھی ناجائز ہے اور کمی بیشی کے ساتھ تو بطریق اولی ناجائز ہے۔ اور اگر یہ "حوالہ" ہے تو بھی یہ ناجائز ہے، کیونکہ حوالہ میں "تساوي دينين" ضروری ہے، یعنی محال علیہ (بینک) محال (تاجر) کو جتنی رقم دے کر بل خریدے گا، اتنی ہی رقم وہ محال لہ (خریدار) سے وصول کر سکتا ہے، کمی، بیشی جائز نہیں ہے، جبکہ یہاں کمی بیشی ہو رہی ہے جو کہ "حوالة بأنقص من الدين" ہے اور جائز نہیں ہے۔

آج کل باقاعدہ ایسے ادارے قائم ہو چکے ہیں جو مختلف کمپنیوں کے دیون اور قرضے کچھ کٹوتی کے ساتھ خریدتے ہیں اور پھر ان قرضوں کو وصول کر کے یا آگے بیچ کر اس پر نفع کماتے ہیں، جس کو آج کل (factoring companies) یا (forfeiting) کہتے ہیں۔ یہ سب قرضوں کی کمی بیشی کے ساتھ خرید و فروخت کے معاملات کرتے ہیں جو کہ جائز نہیں ہیں۔[1]

معاییر شرعیہ میں ہے:

١٢/٥/٤ لا يجوز حسم (خصم) الأوراق التجارية بقيام حاملها بنقل ملكيتها وملكية الحق الثابت فيها عن طريق التظهير إلى المؤسسة أو غيرها قبل تاريخ الاستحقاق، مقابل حصول المظهر على قيمتها مخصوما منها مبلغ معين: ويعتبر من صور الربا.[2]

تجارتی دستاویزات کا بٹہ لگانا جائز نہیں ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ دستاویزات کا حامل مقررہ تاریخ کی آمد سے قبل ہی دستاویزات میں ثابت شدہ ملکیت کو توثیق کے ذریعے اصل قیمت سے کچھ کم قیمت کے بدلے میں بینک وغیرہ کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ اسے سود کی ایک قسم شمار کیا جائے گا۔

تبادلہ کا متبادل

بل آف ایکسچینج کی کمی، بیشی کے ساتھ تبادلہ کرنا جائز نہیں ہے، لیکن اس کی ایک جائز متبادل صورت موجود ہے جو استاذ محترم مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے ذکر کی ہے۔ وہ صورت یہ ہے کہ جس شخص کے پاس یہ بل موجود ہے (تاجر) وہ بل، بینک کو فروخت نہ کرے، بلکہ بینک کو اس کام کے لیے اپنا وکیل بنادے کہ بینک اس کے خریدار (مقروض)

[1] فقه البيوع ٣٢٥/١

[2] المعايير الشرعية ص: ٥٤، رقم المعيار:٧

سے تاجر کے لیے اس کا قرض وصول کرے گا اور اس وکالت کے عقد کے بدلے بینک کے لیے ایک متعین اجرت مقرر کردے۔ مثلاً اگر ایک لاکھ کا قرض وصول کرنا ہے تو اس پر پانچ ہزار روپے بینک کے لیے اجرت مقرر کردے۔ اس کے بعد الگ عقد میں تاجر، بینک سے قرض لے لے۔ بعد میں بینک، خریدار سے ایک لاکھ روپے وصول کرکے اس میں سے پانچ ہزار روپے اپنی اجرت کے طور پر رکھ لے اور باقی پچانوے ہزار کا مقاصہ کرلے۔ یعنی بینک نے تاجر کو جو پچانوے ہزار کا قرض دیا تھا، تاجر کو بتا کر اپنا وہ قرض اس رقم سے وصول کرلے۔

واضح رہے کہ یہاں شرعاً تین عقود جمع ہوجائیں گے:

۱۔ وکالہ بالاجرۃ: یعنی تاجر نے بینک کو اپنا قرض وصول کرنے کے لیے وکیل مقرر کرکے اس کے لیے اجرت طے کردی۔

۲۔ قرض: یعنی تاجر نے بینک سے ایک خاص مقدار میں قرض لے لیا۔

۳۔ مقاصہ: یعنی بینک جب تاجر کا قرض وصول کرے گا تو اسی سے اپنا قرض اور اپنی اجرت بھی وصول کرلے گا۔

اس متبادل صورت کے درست ہونے کے لیے تین شرائط ضروری ہیں:

پہلی شرط: تمام معاملات (وکالہ، قرض، مقاصہ) سب الگ الگ ہوں۔ کوئی بھی عقد دوسرے عقد کے ساتھ مشروط نہ ہو۔ سب کے ایگریمنٹ پیپرز بھی الگ الگ ہونے چاہیے۔

دوسری شرط: وکالت کی فیس کو مدت کے ساتھ مربوط نہ کیا جائے، مثلاً قرض کی وصولی کی مدت زیادہ ہو تو اجرت زیادہ رکھنا اور اگر وصولی کی مدت کم ہو تو اجرت کم رکھنا درست نہیں ہے۔ البتہ اگر قرض بہت زیادہ ہے جس کی وصولی کے لیے بینک کو وکیل بنایا جارہا ہے تو بینک کی اجرت زیادہ مقرر کی جاسکتی ہے، اگر قرض کم ہے تو بینک کی اجرت کم مقرر کی جائے۔

تیسری شرط: بینک تاجر کو جو قرض فراہم کررہا ہے اس کی وجہ سے اپنی وکالت کی فیس میں اضافہ نہ کرے، ورنہ یہ "كل قرض جر نفعا فهو ربا" کے تحت داخل ہوکر سود اور ناجائز ہوجائے گا۔[1]

بل آف ایکسچینج کی مزید تحقیق کے لیے مندرجہ ذیل مآخذ کی طرف رجوع فرمائیں:

۱۔ أحكام الأوراق التجارية في الفقه الإسلامي، د. سعد بن تركي

(۱) بحوث في قضايا فقهية معاصرة ۲/ ۱۲۲

ہاں ویسے بھی ناجائز ہے اور کمی بیشی کے ساتھ تو بطریق اولی ناجائز ہے۔ اور اگر یہ ''حوالہ'' ہے تو بھی یہ ناجائز ہے، کیونکہ حوالہ میں ''تساوي دينين'' ضروری ہے، یعنی محال علیہ (بینک) محال (تاجر) کو جتنی رقم دے کر بل خریدے گا اتنی ہی رقم وہ محال لہ (خریدار) سے وصول کر سکتا ہے، کمی، بیشی جائز نہیں ہے، جبکہ یہاں کمی بیشی ہو رہی ہے جو کہ ''حوالة بأنقص من الدين'' ہے اور جائز نہیں ہے۔

آج کل باقاعدہ ایسے ادارے قائم ہو چکے ہیں جو مختلف کمپنیوں کے دیون اور قرضے کچھ کٹوتی کے ساتھ خریدتے ہیں اور پھر ان قرضوں کو وصول کر کے یا آگے بیچ کر اس پر نفع کماتے ہیں، جس کو آج کل (factoring companies) یا (forfeiting) کہتے ہیں۔ یہ سب قرضوں کی کمی بیشی کے ساتھ خرید و فروخت کے معاملات کرتے ہیں جو کہ جائز نہیں ہیں۔[1]

معاییر شرعیہ میں ہے:

۴/۵/۱۲ لا يجوز حسم (خصم) الأوراق التجارية بقيام حاملها بنقل ملكيتها وملكية الحق الثابت فيها عن طريق التظهير إلى المؤسسة أو غيرها قبل تاريخ الاستحقاق، مقابل حصول المظهر على قيمتها مخصوما منها مبلغ معين: ويعتبر من صور الربا.[2]

تجارتی دستاویزات کا بٹہ لگانا جائز نہیں ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ دستاویزات کا حامل مقررہ تاریخ کی آمد سے قبل ہی دستاویزات میں ثابت شدہ ملکیت کو توثیق کے ذریعے اصل قیمت سے کچھ کم قیمت کے بدلے میں بینک وغیرہ کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ اسے سود کی ایک قسم شمار کیا جائے گا۔

تبادلہ کا متبادل

بل آف ایکسچینج کی کمی، بیشی کے ساتھ تبادلہ کرنا جائز نہیں ہے، لیکن اس کی ایک جائز متبادل صورت موجود ہے جو استاد محترم مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مد ظلہم نے ذکر کی ہے۔ وہ صورت یہ ہے کہ جس شخص کے پاس یہ بل موجود ہے (تاجر) وہ بل، بینک کو فروخت نہ کرے، بلکہ بینک کو اس کام کے لیے اپنا وکیل بنا دے کہ بینک اس کے خریدار (مقروض)

---

(۱) فقه البيوع ۳۳۵/۱

(۲) المعايير الشرعية ص: ٥٤، رقم المعيار:٧

سے تاجر کے لیے اس کا قرض وصول کرے گا اور اس وکالت کے عقد کے بدلے بینک کے لیے ایک متعین اجرت مقرر کردے۔ مثلاً اگر ایک لاکھ کا قرض وصول کرنا ہے تو اس پر پانچ ہزار روپے بینک کے لیے اجرت مقرر کردے۔ اس کے بعد الگ عقد میں تاجر، بینک سے قرض لے لے۔ بعد میں بینک، خریدار سے ایک لاکھ روپے وصول کرکے اس میں سے پانچ ہزار روپے اپنی اجرت کے طور پر رکھ لے اور باقی پچانوے ہزار کا مقاصہ کرلے۔ یعنی بینک نے تاجر کو جو پچانوے ہزار کا قرض دیا تھا، تاجر کو بتا کر اپنا وہ قرض اس رقم سے وصول کرلے۔

واضح رہے کہ یہاں شرعاً تین عقود جمع ہو جائیں گے:

۱۔ وکالہ بالاجرۃ: یعنی تاجر نے بینک کو اپنا قرض وصول کرنے کے لیے وکیل مقرر کرکے اس کے لیے اجرت طے کردی۔

۲۔ قرض: یعنی تاجر نے بینک سے ایک خاص مقدار میں قرض لے لیا۔

۳۔ مقاصہ: یعنی بینک جب تاجر کا قرض وصول کرے گا تو اس سے اپنا قرض اور اپنی اجرت بھی وصول کرلے گا۔

اس متبادل صورت کے درست ہونے کے لیے تین شرائط ضروری ہیں:

پہلی شرط: تمام معاملات (وکالہ، قرض، مقاصہ) سب الگ الگ ہوں۔ کوئی بھی عقد دوسرے عقد کے ساتھ مشروط نہ ہو۔ سب کے ایگریمنٹ پیپرز بھی الگ الگ ہونے چاہییں۔

دوسری شرط: وکالت کی فیس کو مدت کے ساتھ مربوط نہ کیا جائے، مثلاً قرض کی وصولی کی مدت زیادہ ہو تو اجرت زیادہ رکھنا اور اگر وصولی کی مدت کم ہو تو اجرت کم رکھنا درست نہیں ہے۔ البتہ اگر قرض بہت زیادہ ہے جس کی وصولی کے لیے بینک کو وکیل بنایا جا رہا ہے تو بینک کی اجرت زیادہ مقرر کی جا سکتی ہے، اگر قرض کم ہے تو بینک کی اجرت کم مقرر کی جائے۔

تیسری شرط: بینک تاجر کو جو قرض فراہم کر رہا ہے اس کی وجہ سے اپنی وکالت کی فیس میں اضافہ نہ کرے، ورنہ یہ "كل قرض جر نفعا فهو ربا" کے تحت داخل ہو کر سود اور ناجائز ہو جائے گا۔[1]

بل آف ایکسچینج کی مزید تحقیق کے لیے مندرجہ ذیل مآخذ کی طرف رجوع فرمائیں:

۱-أحكام الأوراق التجارية في الفقه الإسلامي. د.سعد بن تركي

[1] بحوث في قضايا فقهية معاصرة ٢ ١٢٢

۲-فقه البيوع، للشيخ المفتي محمد تقي عثماني

۳-أحكام التعامل بالكمبيالة والشيك في الفقه الإسلامي والقانون الوضعي. للشيخ ناصر أحمد إبراهيم النشوي

۴-مجلة مجمع الفقه الإسلامي، جلد:۱۱، اس میں علماء کے چھ تحقیقی مقالات موجود ہیں، جن میں ضمناً بل آف ایکسچینج پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔

توثیق الدیون

(Debt Guaranteeing)

اس مضمون کا کچھ حصہ میگزین ''شریعہ اینڈ بزنس'' (۲۰۱۷ء) میں شائع ہو چکا ہے۔اس کے بنیادی عنوانات مندرجہ ذیل ہیں:

- تعارف
- توثیق کی حکمتیں
- توثیق کا شرعی حکم
- دین کی وصولی میں موانع/رکاوٹیں
- شرعی حل اور وسائل
  - ۱۔وسائل اثباتیہ
  - ۲۔وسائل استیفائیہ
- مسئلۃ الظفر

تعارف

یہ بات تو عیاں ہے کہ اس جہان کی بقاء میں ظاہری اسباب کی حد تک ایک اہم اور بنیادی کردار لوگوں کے باہمی لین دین اور تجارت و معیشت کا ہے،اسی لیے شریعت نے اس سلسلے میں انسان کو مکمل راہنمائی فراہم کی ہے۔اس لین دین اور تجارتی سرگرمیوں کے دوران کبھی کبھی ایک انسان دوسرے کا مقروض بن جاتا ہے اور کبھی تجارتی سرگرمی کے بغیر ہی ایک انسان اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے قرض لیتا ہے اور دوسرا شخص اس کو تبرع اور احسان کے طور پر قرض فراہم کرتا ہے، بہر صورت قرض خواہ کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ اس کا حق ضائع نہ ہو اور اُسے اس کا حق بروقت مل جائے۔شریعت نے بھی لوگوں کے حقوق کی حفاظت اور صاحبِ حق کو اس کا حق دینے کے لیے کئی احکام دیے ہیں اور اس سلسلے میں حق ملنے میں جو رکاوٹیں پیش آتی ہیں،ان کو دور کرنے کے لیے تدابیر بتائی ہیں۔اس مضمون میں اسی موضوع کو بیان کیا جائے گا کہ صاحب حق/قرض خواہ اپنا حق/قرض کی وصولی کو کیسے یقینی بنا سکتا ہے؟

اپنے حق یا قرض کی وصولی کو یقینی بنانے اور اسے پختہ کرنے کو عربی میں "توثیق الدیون" کہتے ہیں۔ اس کی تعریف معاصر علماء نے یوں کی ہے:

عبارة عن مجموعة من الوسائل التي تؤدي إلى استيفاء الحق عند تعذره من المدين، أو إثباته في ذمته عند إنكاره.[1]

(توثیق) ایسے وسائل کے مجموعہ کا نام ہے جن کے ذریعے مقروض کے عاجز ہونے کی صورت میں اپنے حق کی وصولی تک رسائی ہوتی ہے یا مقروض کے انکار کرنے کی صورت میں اس کے ذمہ اپنے حق کو ثابت کرنے تک رسائی ہوتی ہے۔

توثیق کی حکمتیں

۱۔ دین کی وصولی کو یقینی بنانے اور اس کی توثیق کی بنیادی حکمت یہ ہے کہ لوگوں کے مالی حقوق محفوظ ہوں۔ چونکہ بھول انسان کی طبیعت و فطرت میں موجود ہے، خصوصاً ان معاملات میں جہاں ذمہ داری یا ادائیگی مستقبل کی کسی تاریخ میں لازم ہوتی ہے۔ ایسی صورتحال میں اگر کتابت یا گواہوں وغیرہ کے ذریعے دین کی توثیق نہ کی گئی تو بھول کی وجہ سے صاحبِ حق کا حق ضائع ہو سکتا ہے، اس لیے شریعت نے اس کے حق کو محفوظ کرنے کے لیے توثیق کے وسائل وتدابیر کی طرف راہنمائی کی ہے۔

۲۔ اسی طرح انسان کی فطرت میں مال کی محبت بھی موجود ہے، دوسری طرف طمع ولالچ جیسے عناصر بھی موجود ہیں، اس لیے شریعت نے دوسروں کے حبِ مال ولالچ سے بچنے اور اپنا حق محفوظ کرنے کے لیے توثیق کے وسائل اختیار کرنے کا حکم دیا۔

۳۔ دین کی توثیق سے لوگوں کے درمیان تنازعات کے پیدا ہونے کا اندیشہ بھی نہیں رہتا اور شکوک وشبہات بھی باقی نہیں رہتے۔ اگر کوئی دین/قرض کا انکار کرتا ہے تو اس کو دستاویز یا گواہوں کے ذریعے ثابت کیا جا سکتا ہے، لہذا جھگڑے وغیرہ کا اندیشہ نہیں ہوگا۔

توثیق کا شرعی حکم

ادھار معاملہ کرتے وقت، یا کسی کو قرض دیتے وقت یا دین لازم ہونے کی صورت میں دین کی توثیق کرنے، اس

(1) توثيق الديون ص:٢٢

کی دستاویز لکھنے یا اس پر گواہ بنانے کا شریعت نے حکم دیا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے کہ:

{يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى فَاكْتُبُوهُ}[1]

اے ایمان والو! جب تم کسی معین میعاد کے لیے ادھار کا کوئی معاملہ کرو تو اُسے لکھ لیا کرو۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ حکم وجوبی ہے یا محض مستحب؟ اس سلسلے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں:

١۔ جمہور علماء کے ہاں یہ حکم ترغیبی ہے، واجب نہیں ہے، لہذا اگر کسی نے دین کی توثیق نہ کی تو کسی قسم کا کوئی گناہ نہیں ہوگا۔

٢۔ بعض علماء کے ہاں یہ حکم وجوبی ہے، لہذا جس نے دین کی توثیق نہ کی تو وہ گناہ گار ہوگا۔ یہ رائے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، شیخ ابراہیم نخعیؒ اور ابن جریر طبریؒ کی طرف منسوب ہے۔[2]

دین کی وصولی میں موانع/رکاوٹیں

حقوق یا قرضوں کی ادائیگی کی تفصیلات کو اگر سامنے رکھا جائے تو قرض خواہ کو اپنا قرض اور حق ملنے کے سلسلے میں درج ذیل چار قسم کی رکاوٹیں پیش آسکتی ہیں۔ ان میں سے ہر قسم کی رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے شریعت نے حل پیش کیا ہے اور ایسے وسائل اور تدابیر بتلائی ہیں جن کے ذریعے قرض خواہ کا قرض ملنا آسان اور یقینی ہو جاتا ہے، جبکہ دوسری طرف مقروض کا بھی خیال رکھا گیا ہے تاکہ اُسے بھی کوئی ضرر اور تکلیف لاحق نہ ہو۔ وہ رکاوٹیں یہ ہیں:

١۔ انکار

٢۔ موت

٣۔ تنگدستی

٤۔ ٹال مٹول

١۔ انکار (Refusal)

قرض خواہ کو اپنا حق ملنے کے سلسلے میں ایک رکاوٹ یہ ہو سکتی ہے کہ مقروض سرے سے دین/قرض کی ادائیگی کا ہی انکار کردے۔

---

[1] البقرة: ٢٨٢

[2] الموسوعة الفقهية الكويتية ١٣/ ١٣٦

۲۔موت(Death)

قرض خواہ واس کا حق ملنے کے سلسلے میں دوسری رکاوٹ مقروض کی موت ہے۔اگر قرض کی ادائیگی سے قبل مقروض کا انتقال ہو جائے تو ایسی صورتحال میں شریعت نے یہ راہنمائی کی ہے کہ اگر مرحوم نے کچھ مال چھوڑا ہے تو اس سے مرحوم کی تجہیز و تکفین کرنے کے بعد سب سے پہلے قرض خواہ کا قرض ادا کیا جائے گا،اس کے بعد وصیت اور پھر ورثاء کے درمیان ترکہ کی تقسیم کی جائے گی۔[1]

اگر مرحوم نے کچھ مال نہیں چھوڑا تو ورثاء پر یہ لازم نہیں ہے کہ مرحوم کا دین ادا کرے۔تاہم تبرع اور احسان کے طور پہ ادا کر سکتے ہیں۔لیکن مقروض کے انتقال کی صورت میں بھی یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں مقروض کے ورثاء قرض خواہ کے قرض کا انکار ہی نہ کردے۔

۳۔تنگدستی(Insolvency)

قرض ملنے کے سلسلے میں تیسری رکاوٹ یہ پیش آسکتی ہے کہ اگر مقروض تنگدست اور معسر ہے اور قرض کی ادائیگی پہ قادر نہیں ہے تو قرض خواہ کو اپنا قرض ملنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اس صورت میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ اگر مقروض واقعی قرض کی ادائیگی پر قادر نہیں ہے تو قرض خواہ کو چاہیے کہ اُسے قدرت واستطاعت کے حاصل ہونے تک مہلت دے دے،بلکہ اگر قرض خواہ اپنا حق معاف کردے تو یہ اس کے لیے بہترین صدقہ ہے۔قرآن مجید میں باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

{وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَى مَيْسَرَةٍ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ}[2]

اگر (مقروض) تنگدست ہے تو اس کو ہاتھ کھلنے تک مہلت دینی چاہیے،اور صدقہ ہی کردو تو یہ تمہارے لیے کہیں زیادہ بہتر ہے،اگر تمہیں سمجھ ہو۔

احادیث میں تنگدست کو مہلت اور ڈھیل دینے کے کئی فضائل وارد ہوئے ہیں۔ایک حدیث میں سرورِ دو عالم ﷺ فرماتے ہیں:

من يسر على معسر، يسر الله عليه في الدنيا والآخرة.[3]

[1] النساء: ۱۱

[2] البقرة: ۲۸۰

[3] صحيح مسلم ٤/ ٢٠٧٤، حديث نمبر:٢٦٩٩

جو شخص کسی تنگدست پر آسانی کرے گا، اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کے لیے آسانیاں پیدا فرمائے گا۔

اگر قرض خواہ کے حالات ایسے ہوں کہ وہ مقروض کو نہ مہلت دے سکتا ہو اور نہ ہی اُسے معاف کرنے کی قدرت ہو یا اس پر راضی نہ ہو تو وہ آخر میں آنے والے تین راستوں (رہن، کفالہ، حوالہ) میں سے کسی ایک کو اختیار کر سکتا ہے۔

۴۔ٹال مٹول (Procrastinating)

اگر مقروض قرض کی ادائیگی سے انکار نہ کرے، لیکن قدرت واستطاعت کے باوجود قرض کی ادائیگی میں تاخیر اور ٹال مٹول سے کام لے تو ایسی صورت میں بھی قرض خواہ کو اپنا قرض وصول کرنے میں مشکل پیش آتی ہے۔

اگر اصل مقروض اپنا قرض ادا کرنے سے عاجز و قاصر ہو جاتا ہے، یا اس کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرتا ہے تو ایسی صورتحال میں یہ بات مصلحت کے خلاف تھی کہ قرض خواہ کا قرض اور دین ہی سرے سے معاف کر دیا جائے، کیونکہ اس میں قرض خواہ کو ضرر لاحق ہوتا ہے، جو کہ شریعت میں مطلوب نہیں ہے۔ دوسری طرف اگر اس بات کو لازم کیا جاتا ہے کہ مقروض بہر صورت اپنا قرض خود ہی اداء کرے گا، کسی اور کی طرف قرض منتقل کر کے اس کے ذریعے ادائیگی نہیں کرا سکے گا، تو اس میں مقروض کو تکلیف وضرر لاحق ہوتی ہے، اس لیے شریعت نے ان دونوں انتہاؤں کے درمیان سے اعتدال کا راستہ اختیار کیا اور آخری دونوں قسم کی رکاوٹوں (تنگدستی اور ٹال مٹول) کو دور کرنے کے لیے چند راستے اور وسائل کی طرف راہنمائی کر دی ہے۔ جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

شرعی حل اور وسائل

اپنا حق/قرض کی وصولی یا اسے پختہ کرنے کے لیے شریعت نے جو وسائل بتائے ہیں، وہ دو قسم کے ہیں:

۱۔وسائل اثباتیہ

۲۔وسائل استیفائیہ

۱۔وسائل اثباتیہ:

اس قسم سے ایسے وسائل مراد ہیں جن کے ذریعے صاحبِ حق اپنا حق تو وصول نہیں کرتا، لیکن اپنے حق کو یقینی اور پختہ کر سکتا ہے تاکہ جس کے ذمہ حق لازم ہے وہ انکار نہ کر سکے اور صاحبِ حق کا حق ضائع نہ ہو۔ جیسے دستاویز لکھنا یا گواہ بنانا۔

اس قسم میں دو وسائل شامل ہیں:

الف-دستاویز لکھنا

ب- گواہ بنانا

الف-دستاویز لکھنا(Writing)

۱-تعارف:

شریعت نے یہ ہدایت دی ہے کہ جب کسی پر کوئی ادھار یا دین لازم ہو تو اُسے ایسی تحریر میں لکھنا چاہیے جو معاملے کی نوعیت کو واضح کر دے، تاکہ بوقتِ ضرورت مقروض انکار نہ کر سکے اور انکار کی صورت میں تحریری ثبوت پیش کی جا سکے۔ اسی طرح مقروض کے انتقال کی صورت میں اس کے ورثاء قرض کا انکار نہ کر سکے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے کہ:

{يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُمْ بِدَيْنٍ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى فَاكْتُبُوهُ}[1]

اے ایمان والو! جب تم کسی معین میعاد کے لیے ادھار کا کوئی معاملہ کرو تو اُسے لکھ لیا کرو۔

۲-دستاویز کی صفات:

دستاویز لکھنے میں مندرجہ ذیل امور کی رعایت رکھنی چاہیے:

۱-دستاویز کو ''بسم اللہ'' اور حمد وصلوۃ سے شروع کرنا چاہیے۔

۲-لکھنے والے پر لازم ہے کہ وہ اصل مدیون/مقروض اور قرض خواہ/دائن کی زبانی تفصیلات سن کر لکھے، یکطرفہ طور پر دستاویز نہ لکھے۔

۳-دین/قرض کی تمام ضروری تفصیلات لکھے۔ دین/قرض کی مقدار، اس کی وجہ، اس کی صفات، ادائیگی کا وقت اور طریقہ، ادائیگی کا مقام وغیرہ۔

۴-دائن/قرض خواہ اور مدیون/مقروض کا نام، ولدیت، مکمل پتہ، پیشہ اور اس کے علاوہ ضروری تفصیلات لکھے۔ اس کے علاوہ گواہوں کے نام اور تفصیلات بھی لکھے۔

۵-دستاویز کی عبارت اور زبان آسان اور قانونی ہونی چاہیے، تاکہ اس کے سمجھنے یا ثابت کرنے میں کسی قسم کی رکاوٹ یا التباس پیدا ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔

[1] البقرة: ٢٨٢

۲۔جب دستاویز مکمل ہو جائے تو آخر میں مکمل تاریخ لکھے۔ پھر اس دستاویز کو گواہوں اور فریقین کے سامنے پڑھا جائے اور آخری صفحہ پر گواہوں اور فریقین کے دستخط لے کر مہر لگائی جائے۔ اگر دستاویز کئی صفحات کی ہے تو ہر صفحہ پر کاتب اپنا/ادارے کی مہر لگائے۔

یہ دستاویز کی بنیادی صفات ہیں، ان کے علاوہ کوئی بات قانونی یا عرفی طور پر ضروری سمجھی جائے تو اسے بھی لکھ لیا جائے۔

۳۔کیا دستاویز حجت ہے؟

کیا صرف دستاویز کو حجت قرار دے کر کسی کے خلاف قاضی فیصلہ کر سکتا ہے؟ اس سلسلے میں قدیم فقہاء کی رائے یہ تھی کہ صرف دستاویز حجت نہیں ہے، کیونکہ خط اور تحریر میں مشابہت اور غلطی کا امکان ہوتا ہے، تاہم متاخرین فقہاء نے یہ رائے اختیار کی ہے کہ اگر تزویر اور جعل سازی سے بچنا ممکن ہو تو دستاویز کو حجت قرار دیا جا سکتا ہے۔ استاد محترم مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔اگر مدعی علیہ نے یہ اقرار کر لیا کہ دستاویز اس نے خود لکھی ہے یا اس کے حکم واجازت سے لکھی گئی ہے تو ایسی دستاویز کی بنیاد پر اس کے خلاف فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ دستاویز میں لکھے ہوئے قرض کا انکار کرتا ہے یا یہ دعوی کرتا ہے کہ اس نے وہ قرض اداء کر لیا ہے یا اس نے مزاح میں دستاویز لکھی تھی تو اس بات کو باقاعدہ گواہوں سے ثابت کرنا ہوگا، ورنہ اس کے خلاف فیصلہ کر دیا جائے گا۔

۲۔اگر کوئی فریق دستاویز کا انکار کرتا ہے تو اس کے خلاف دستاویز اور دستاویز میں لکھا ہوا مضمون باقاعدہ گواہوں کے ذریعے ثابت کرنا ہوگا جو یہ گواہی دے دیں کہ اس فریق نے خود دستاویز لکھی ہے یا کسی سے لکھوائی ہے یا یہ گواہی دے دیں کہ ہمارے سامنے دستخط ہوئے ہیں یا اس فریق نے ہمارے سامنے انگوٹھا لگایا ہے۔ اس طرح کی گواہی کے بعد اس کے خلاف فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

۳۔اگر کوئی فریق دستاویز کا انکار کرتا ہے اور دستاویز کے ثبوت پر کوئی گواہ بھی نہیں ہے تو ایسی صورت میں ماہرین کے سامنے اس فریق کی تحریر اور دستاویز دونوں کو پیش کیا جائے گا جو یہ تحقیق کریں گے کہ یہ دستاویز اسی فریق کی لکھی ہوئی ہے یا نہیں؟ اگر وہ یہ کہہ دیں کہ یہ اسی فریق کی تحریر ہے تو اس کے خلاف فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر ان کو شک ہو اور یقین سے ثابت نہ ہو کہ یہ دستاویز اسی فریق کی لکھی ہوئی ہے تو اس دستاویز کی بنیاد پر اس کے خلاف فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔[1]

---

(۱) تونبق الدیون ص ۳۲۷

ب۔ گواہ بنانا (Witnessing)

مقروض یا اس کے ورثاء کے انکار سے بچنے اور اپنے حق کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے اسلامی شریعت نے یہ بتلایا ہے کہ قرض دیتے وقت یا معاملہ کرتے وقت اس بات پر گواہ قائم کر لیے جائیں کہ مقروض کے ذمے اتنا قرض لازم ہوا ہے، تاکہ بعد میں اگر مقروض یا اس کے ورثاء انکار کرے تو ان کے خلاف گواہ پیش کر لیے جائیں۔ اسی طرح قرآن مجید میں اس طرح راہنمائی کی گئی ہے:

﴿وَأَشْهِدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ﴾[1]

اور جب تم خرید و فروخت کا معاملہ کرو تو اس پر گواہ بنالیا کرو۔

گواہ بنانے میں شرعی شرائط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہیں۔ مثلاً گواہ کا عقلمند ہونا، بالغ ہونا، مسلمان ہونا اور فاسق نہ ہونا ضروری ہے، البتہ بعض علماء کے ہاں اگر کوئی شخص دینی امور کی رعایت نہ رکھنے کی وجہ سے فاسق ہو، لیکن عام معاملات میں عموماً سچ بولتا ہو تو اسے گواہ بنایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح گواہوں کی تعداد کی بھی رعایت رکھنا ضروری ہے کہ دو مرد ہوں یا ایک مرد اور دو عورتیں۔

۲۔ وسائلِ استیفائیہ:

اس قسم سے ایسے وسائل مراد ہیں جن کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ اگر مدیون/مقروض شخص سے دین/یا حق نہ ملے تو اسی وسیلہ یا تدبیر سے ہی اپنا حق وصول کیا جاسکے۔ اس قسم کی تدابیر میں محض حق کی توثیق نہیں ہوتی، بلکہ ان کے ذریعے باقاعدہ اپنا حق وصول کیا جاتا ہے۔ جیسے رہن وغیرہ۔

اس میں تین وسائل شامل ہیں:

الف۔ رہن

ب۔ کفالہ

ج۔ حوالہ

الف۔ رہن (Mortgage)

رہن کے احکام تفصیل طلب ہیں، یہاں مختصراً چند بنیادی باتیں ذکر کی جائیں گی۔

[1] البقرۃ ۲۸۲

ا۔ تعارف:

رہن کا مطلب یہ ہے کہ قرض خواہ اپنے حق یا دین کے بدلے میں مقروض کی کوئی چیز اپنے پاس روک لے، تاکہ بوقتِ ضرورت (اگر مقروض قرض ادا نہ کرے تو) اس چیز کو بازار میں فروخت کر کے اس کی قیمت سے اپنا حق وصول کر سکے۔

اس میں قرض خواہ (جس کے پاس چیز رکھی جاتی ہے) کو "مرتہن"، اور رہن کے اصل مالک کو "راہن" کہتے ہیں۔[1]

رہن کی مشروعیت قرآن وحدیث دونوں سے ثابت ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ:

{وَإِنْ كُنتُمْ عَلَى سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهَانٌ مَقْبُوضَةٌ}[2]

اگر تم سفر پر ہو اور تمھیں کوئی لکھنے والا نہ ملے تو (ادائیگی کی ضمانت کے طور پر) رہن قبضے میں رکھ لیا جائے۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے ایک یہودی سے کھانا خریدا اور اپنی ذرع بطورِ رہن اس کے پاس رکھی۔[3]

۲۔ رہن کے بنیادی احکام:

رہن کے تمام شرعی احکام کی رعایت رکھنا ضروری ہے، مثلاً:

ا۔ ایسی چیز کو رہن میں رکھا جا سکتا ہے جو بیچنے کے قابل ہو، تاکہ بعد میں اسے بیچ کر اس سے اپنا حق وصول کیا جا سکے۔

۲۔ جب تک رہن کی چیز قرض خواہ کے پاس موجود ہے تو قرض خواہ اس چیز کو استعمال میں نہیں لا سکتا۔ اس سے کسی قسم کا انتفاع حاصل کرنا درست نہیں ہے، یہ سود کے زمرے میں آتا ہے، البتہ مالک کی اجازت سے اجرت مثل دے کر اس کو استعمال کرنا جائز ہے۔

---

(1) مجلة الأحكام العدلية ص: ۱۳۳ (المادّة: ۷۰۱)

(2) البقرة: ۲۸۳

(3) صحيح البخاري ص: ۳۱۷، باب من رهن درعه، حديث نمبر: ۲۵۰۹

۳۔ جب قرض خواہ نے رہن میں رکھی ہوئی چیز بیچ دی تو اس سے اپنا حق وصول کرلے، اگر قیمت زیادہ ہو تو اسے رہن کے مالک کو واپس کرنا ضروری ہے۔

۴۔ اگر رہن میں رکھی ہوئی چیز میں اضافہ ہو جائے تو اس کو بھی اصل چیز کے ساتھ رہن میں رکھا جائے گا، جیسے جانور کا بچہ پیدا ہو گیا۔ اگر وہ ایسا اضافہ ہے جو رہن کی چیز کو کرایہ پر دینے سے حاصل ہوا ہے جیسے مرہونہ گھر کا کرایہ تو وہ اصل مالک (راہن) کا حق ہے۔

۵۔ راہن، مرتہن کی اجازت سے مرہونہ چیز استعمال کر سکتا ہے۔ اگر اس نے مرہونہ چیز بیچ دی تو یہ بیع بھی مرتہن کی اجازت پر موقوف رہے گی۔

۶۔ مرہونہ چیز مرتہن کے پاس امانت ہے، لہٰذا اگر اس کی تعدی و غفلت کے بغیر ضائع ہو گئی تو مرتہن پر کوئی ضمان لازم نہیں ہوگا، اگر اس نے تعدی یا غفلت کی ہو تو اس پر مرہونہ چیز کی ضائع ہونے والے دن کی قیمت لازم ہوگی، البتہ راہن کے ذمہ اس کا دین/قرض برقرار رہے گا۔

۳۔ رہن کی جدید صورتیں:

۱۔ رہن کی جدید صورتوں میں سے ایک صورت یہ ہے کہ اصل چیز (مرہونہ) تو مالک یعنی راہن کے پاس ہی ہوتی ہے، البتہ مرتہن (قرض خواہ) کو اس چیز کے کاغذات دے دیے جاتے ہیں۔ اس کو (mortgage by deposting title deeds) کہتے ہیں۔ یہ صورت شرعاً درست ہے۔

۲۔ دوسری صورت آج کل یہ رائج ہے نہ تو اصل چیز قرض خواہ کے قبضہ میں دی جاتی ہے، نہ اس کے کاغذات دیے جاتے ہیں، البتہ حکومتی اداروں اور کاغذات میں یہ لکھا جاتا ہے کہ یہ چیز فلاں شخص کے پاس بطورِ رہن رکھی ہوئی ہے۔ جب طے شدہ شرائط کے مطابق قرض خواہ عدالت کی طرف رجوع کرتا ہے تو اسے اس چیز سے اپنا حق وصول کرنے کا حق ہوتا ہے۔ یہ صورت بھی شرعاً درست ہے۔

۳۔ تیسری صورت یہ ہے کہ مرہونہ چیز متعین نہیں ہوتی، نہ اسے مرتہن کے قبضہ میں دیا جاتا ہے، نہ اس کے کاغذات دیے جاتے ہیں، البتہ مرتہن کے پاس راہن کی مملوکہ اشیاء میں اپنے قرض کی مقدار کا حق بطورِ رہن دے دیا جاتا ہے۔ اس کو (floating charge) کہتے ہیں۔ یہ شرعی طور پر رہن نہیں ہے اور نہ ہی اس پر رہن کے احکام جاری ہوں گے۔

۴۔ آج کل رہن کی ایک شکل یہ رائج ہے کہ اگر مقروض، قرض کی ادائیگی سے عاجز آجاتا ہے تو مرتہن کو یہ حق

حاصل ہوتا ہے کہ وہ رہن میں رکھی ہوئی چیز کا مالک ہو جائے، خواہ اس کی قیمت جتنی بھی ہو۔ اس کو عربی میں "غلق الرہن" اور انگریزی میں (foreclosure) کہتے ہیں۔ یہ شرعا جائز نہیں ہے اور اگر بیع میں ایسی شرط لگا دی تو اس سے بیع فاسد ہو جائے گی۔

۵۔ شئیرز (shares) کو کسی کے پاس بطورِ رہن رکھا جاسکتا ہے۔ اسی طرح بل آف ایکسچینج، بانڈز (بشرطیکہ جائز ہو، سودی نہ ہو) اور چیک وغیرہ کو بھی رہن میں رکھا جاسکتا ہے، کیونکہ یہ "رہن الدین" کے ضمن میں آتا ہے۔[۱]

ب- کفالہ (Guaranty/Assurance)

ا۔ تعارف:

کفالہ کا مطلب ہے کہ اصل مدیون/مقروض کے ساتھ کسی دوسرے شخص کو (اس کی رضامندی کے ساتھ) دین/قرض کی ذمہ داری میں شریک کر کے اُسے بھی ضامن بنالیا جائے، تاکہ اگر اصل مقروض سے قرض کی وصولی مشکل ہو تو دوسرے شخص (کفیل) سے قرض وصول کیا جاسکے۔ مثلاً زید کے ذمہ عمر کا قرض ہے، خالد اس قرض کی ضمانت دیتے ہوئے یوں کہہ دے کہ اگر زید نے قرض ادا نہ کیا تو میں اس کا ذمہ دار ہوں، آپ (عمر) مجھ سے بھی مطالبہ کر سکتے ہیں، یہ عقدِ کفالہ ہے۔

اس میں اصل مقروض کو "مکفول عنہ"، قرض خواہ کو "مکفول لہ" اور ذمہ داری لینے والے کو "کفیل" کہتے ہیں۔[۲]

عقدِ کفالہ کی مشروعیت پر بھی قرآن وحدیث کی تصریحات موجود ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

{وَلِمَنْ جَاءَ بِهِ حِمْلُ بَعِيرٍ وَأَنَا بِهِ زَعِيمٌ}[۳]

اور جو شخص اس (شاہی پیمانہ) کو لا کر دے گا، اس کو ایک اونٹ کا بوجھ (انعام) میں ملے گا اور میں اس (انعام کے دلوانے) کی ذمہ داری لیتا ہوں۔

یہاں "زعیم" کفیل کے معنی میں آیا ہے اور ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

[۱] توثيق الديون ص: ٣٤٢

[۲] مجلة الأحكام العدلية، ص: ١١٥ (المادّة: ٦١٢)

[۳] يوسف: ٧٢

وَالزَّعِيمُ غَارِمٌ.[1]

کفیل (ضامن) ذمہ دار ہوگا۔

۲۔ کفالہ کے بنیادی احکام:

۱۔ کفالہ کے بعد اصل دائن/قرض خواہ اپنے حق کا مطالبہ مقروض سے بھی کر سکتا ہے اور کفیل (ضمانت لینے والے) سے بھی کر سکتا ہے۔

۲۔ اگر عقدِ کفالہ میں یہ شرط لگادی گئی کہ اصل مقروض/مدیون بری ہوگا، اس سے مطالبہ نہیں کیا جائے گا تو یہ درست ہے، لیکن یہ کفالہ نہیں ہوگا، بلکہ اسے عقدِ حوالہ قرار دیا جائے گا۔

۳۔ اگر اصل مدیون/مقروض پر دین کی ادائیگی فوری ضروری ہو تو کفیل پر بھی فوری ادائیگی ضروری ہوگی، اگر اصل دین کی ادائیگی مؤجل ہو، مستقبل کی کسی تاریخ میں ادائیگی طے ہوئی ہو تو کفیل سے بھی اسی تاریخ کو مطالبہ کیا جائے گا۔

۴۔ اگر قرض خواہ/دائن نے اصل مدیون/مقروض کو دین سے بری کر کے اپنا حق معاف کر دیا تو کفیل بھی بری ہو جائے گا، اب اس سے مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اگر قرض خواہ نے کفیل کو بری کر دیا تو اس سے اصل مدیون/مقروض بری نہیں ہوگا، بلکہ اس سے مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔[2]

۵۔ کفالہ ایک عقدِ تبرع ہے، لہٰذا اس پر کوئی اجرت/فیس وصول کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ اگر اس کے ساتھ کوئی خدمات بھی فراہم کی جاتی ہیں تو ان کی فیس وصول کی جا سکتی ہے، جیسے آج کل بینک ایل سی کھولتے ہیں تو یہ بنیادی طور پہ عقدِ کفالہ ہے، لیکن اس میں بینک کو کئی خدمات بھی فراہم کرنی ہوتی ہیں، ان پر بینک فیس وصول کر سکتا ہے۔[3]

ج۔ حوالہ (Debt Transferring)

مقروض کے ٹال مٹول سے بچنے یا مقروض کے تنگدست ہونے کی صورت میں اپنے قرض کو آسانی سے وصول کرنے کے لیے شریعت نے جو تیسیر اراستہ یا وسیلہ مشروع فرمایا ہے وہ ''حوالہ'' ہے، جس میں قرض یا دین اصل مقروض

(۱) سنن ابی داود ۳/ ۳۲۱، حدیث نمبر: ۳۵۶۷

(۲) درر الحکام فی شرح مجلۃ الأحکام ۱/ ۸۳۶

(۳) توثیق الدیون ص: ۳۳

کے ذمہ سے کسی دوسرے شخص کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ حوالہ اور کفالہ میں بنیادی فرق یہی ہے کہ کفالہ میں اصل مقروض اور ضمانت لینے والے دونوں سے قرض کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے، جبکہ حوالہ کے وجود میں آجانے کے بعد صرف ضمانت لینے والے شخص سے قرض/دین کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے، اصل مقروض بری ہو جاتا ہے۔[1]

اس قسم کے عقد میں اصل مقروض کو ''محیل''، قرض خواہ کو ''محال/محال لہ'' ضمانت لینے والے شخص کو ''محال علیہ/محتال علیہ''، اور جس مال کی ضمانت لی جاتی ہے اس کو ''محال بہ'' کہتے ہیں۔[2]

سرورِ دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

مطل الغني ظلم فإذا أتبع أحدكم على ملي فليتبع .[3]

یعنی مالدار کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے، جب تم میں سے کسی کو (اپنا حق وصول کرنے کے لیے) کسی مالدار شخص کے پیچھے لگا دیا جائے تو اس کے پیچھے لگ جانا چاہیے۔

اس حدیث کا مطلب علماء نے یہ بیان کیا ہے کہ اگر کسی شخص پر کسی دوسرے کا قرض/دین ہو اور اصل مقروض اپنے قرض خواہ کو کسی تیسرے شخص (محال علیہ) کے سپرد کر دے تاکہ وہ اس کا قرض ادا کر دے تو قرض خواہ کو خواہ مخواہ کی ضد کے بجائے اس بات (حوالہ) کو قبول کر لینا چاہیے۔

مسئلۃ الظفر

اگر کسی شخص کے ذمہ دوسرے کا دین/قرض ہو تو شرعی حکم یہ ہے کہ مقروض، قرض اداء کرے، لیکن اگر مقروض ادائیگی میں ٹال مٹول سے کام لے رہا ہو اور قرض خواہ کے ہاتھ مقروض کی کوئی چیز آجائے تو کیا وہ مقروض کی اجازت کے بغیر اس کی چیز سے اپنا حق/قرض وصول کر سکتا ہے یا نہیں؟

اس کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ اتحادِ جنس: قرض خواہ کے ہاتھ مقروض کی ایسی چیز آجائے جو دین/قرض ہی کی جنس سے ہے۔ مثلاً رقم قرض دی تھی، اب قرض خواہ کے ہاتھ بھی مقروض کی رقم آگئی، یا گندم بطورِ قرض دی تھی، اب قرض خواہ کے ہاتھ مقروض کی

---

(۱) مجلة الأحكام العدلية ص: ۱۲۷، (المادّة ٦٧٣)

(۲) حواله بالا، ص: ۱۲۷، (المادّة ٦٧٣ تا المادّة ٦٧٧)

(۳) صحيح البخاري ص: ۲۰٦، حديث نمبر: ۲۲۸۸

گندم آگئی۔

۲۔ اختلافِ جنس: دونوں چیزوں کی جنس مختلف ہو: دوسری صورت یہ ہے کہ قرض خواہ کے ہاتھ مقروض کی جو چیز آئی ہے وہ دین/قرض کی جنس میں سے نہیں ہے۔ مثلاً گندم کسی قرض دی تھی، اب قرض خواہ کے ہاتھ مقروض کی [illegible] آگئی۔

بعض علماء کی رائے تو یہ ہے کہ درج بالا دونوں صورتوں میں قرض خواہ کے لیے مقروض کی اجازت کے بغیر اس کی چیز بیچ کر یا اسی سے اپنا حق وصول کرنا جائز نہیں ہے۔ جبکہ بعض علماء صرف پہلی صورت (اتحادِ جنس) میں قرض خواہ اپنا حق وصول کرنے کی اجازت دیتے ہیں، دوسری صورت میں اجازت نہیں دیتے۔ متقدمین فقہاءِ حنفیہ کی بھی یہی رائے ہے۔ تیسری رائے یہ ہے کہ قرض خواہ کو دونوں صورتوں میں اپنا حق وصول کرنے کی اجازت ہے۔ یہ رائے شافعیہ اور متاخرین حنفیہ کی ہے، اسی پر فتویٰ دیا جاتا ہے۔[1]

لیکن اس کے لیے درج ذیل نکات ذہن میں رکھنا ضروری ہے:

۱۔ اگر مقروض شخص ٹال مٹول سے کام نہیں لے رہا ہے، بلکہ قرض کا اقرار بھی کر رہا ہے اور ادائیگی پر آمادہ بھی ہے تو ایسی صورت میں اس کی چیز واپس کر کے اس سے اپنا حق وصول کرنا چاہیے۔

۲۔ اگر مقروض کے مالی حالات کمزور ہیں اور وہ قرض کی ادائیگی سے قاصر ہے تو اسے کچھ مہلت دینی چاہیے، یہی قرآن کا تقاضا اور مسلمان کے اعلیٰ اخلاق میں سے ہے۔

۳۔ اگر مقروض، قرض کا اقرار کر رہا ہے، لیکن ادائیگی میں تاخیر/ٹال مٹول کر رہا ہے تو اس کی چیز سے اپنا حق وصول کرنا جائز ہے۔ اگر اس کی چیز کی قیمت قرض خواہ کے حق سے زیادہ ہے تو قرض خواہ پر لازم ہے کہ اضافی قیمت واپس کرے۔

توثیق الدیون کی مزید تفصیلات کے لیے مندرجہ ذیل دو کتابیں مفید ہیں:

۱۔ توثيق الديون على المذاهب الفقهية الأربعة. للشيخ المفتي محمد تقي العثماني

۲۔ توثيق الديون في الفقه الإسلامي. للدكتور صالح بن عثمان

(۱) رد المحتار ۱۵۱/۶

فرنچائز: تعارف، شرعی حیثیت، احکام

(Franchise)

یہ مقالہ سہ ماہی مجلہ "الصدیق" اور میگزین "شریعہ اینڈ بزنس" (۲۰۱۰ء) میں شائع ہو چکا ہے۔ اس مضمون کے بنیادی عنوانات مندرجہ ذیل ہیں:

- فرنچائز کا تعارف
- فرنچائز کی ابتداء
- فرنچائز معاہدے کی دفعات
- فرنچائز کے فوائد
- فرنچائز کی اقسام
- فرنچائز کی شرعی حیثیت واحکام

فرنچائز کا تعارف

آج کل کی تجارتی دنیا میں فرنچائز کا نظام بہت پھیل گیا ہے، بڑی بڑی کمپنیاں، خصوصاً ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنی مصنوعات کی ترویج اور فروخت کے لیے عام طور پر فرنچائز کے طریقہ کے تحت ہی ڈیلروں سے معاملات کرتی ہیں، ذیل میں فرنچائز کی حقیقت وتعارف اور اس سے متعلق شرعی احکام کا ذکر کیا جاتا ہے۔

"فرنچائز" فرانسیسی زبان کا لفظ ہے، عربی زبان میں اس کے لیے "حق الامتیاز" اور "الإعفاء" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی کمپنی کامیابی اور شہرت حاصل کر لیتی ہے، ایک سے زیادہ مقامات پر اپنا برانچ یا کمپنی کھول لیتی ہے اور وہ مزید ترقی کی خواہاں ہوتی ہے، لیکن اس کے لیے ہر جگہ کے انتظام ونگرانی کرنا دشوار ہوتا ہے تو وہ دوسرے مقامات پر اپنا نائب مقرر کر لیتی ہے۔ دوسری طرف کوئی شخص (نائب) اس طرح کی مشہور کمپنی کے نام ومعاملات سے فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو دونوں آپس میں ایک معاہدہ کر لیتے ہیں، جس کی رو سے کمپنی اپنا نام (گڈول) اس شخص کو دیتی ہے جس کی وجہ سے وہ شخص کسی خاص علاقے میں اسی کمپنی کے نام سے مصنوعات فروخت کرتا ہے۔ اس صورتحال میں کمپنی کو "franchisor" کمپنی کے نائب یا فرنچائز کے خریدار کو "franchisee" کہتے ہیں۔ کمپنی

اس کے عوض فرنچائز لینے والے سے اجرت لیتی ہے اور کبھی کمپنی فرنچائز لینے والے کے لیے متعلقہ خدمات بھی سرانجام دیتی ہے اور اس پر فرنچائز لینے والے سے اجرت کا مطالبہ کرتی ہے۔

جیسے غذائی اشیاء کی ایک کمپنی "میکڈونلڈ" (McDonald's) پوری دنیا میں مشہور ہو چکی ہے، لیکن یہ کمپنی ہر ملک اور ہر شہر میں بذاتِ خود اپنی مصنوعات فروخت نہیں کرتی، بلکہ پاکستان میں کسی ادارے یا کمپنی کے ساتھ فرنچائز کا عقد کرتی ہے، جس کی بناء پر پاکستان میں موجود فرنچائز لینے والا اسی کمپنی کے نام وعلامت کے ساتھ، اسی کمپنی کی صفات اور طرز کی چیزیں فروخت کرتا ہے۔ اسی طرح دوسرے ممالک اور شہروں میں بھی ان کے فرنچائزی موجود ہیں۔

فرنچائز کی حقیقت انوسٹوپیڈیا میں یوں بیان کی گئی ہے:

A franchise is a type of license that grants a franchisee access to a franchisor's proprietary business knowledge, processes and trademarks, thus allowing the franchisee to sell a product or service under the franchisor's business name. In exchange for acquiring a franchise, the franchisee usually pays the franchisor an initial start-up fee and annual licensing fees.(1)

فرنچائز ایک قسم کا لائسنس ہے جو کسی فرنچائزی کو کسی فرنچائزر کے ملکیتی کاروبار سے متعلق معلومات، عمل اور ٹریڈ مارک تک رسائی فراہم کرتا ہے، اس طرح یہ فرنچائزی کو فرنچائزر کے کاروباری نام کے تحت کسی مصنوع یا خدمات کو فروخت کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ فرنچائز کے حصول کے بدلے، فرنچائزی عام طور پر فرنچائزر کو ابتدائی اسٹارٹ اپ فیس اور سالانہ لائسنسنگ فیس ادا کرتا ہے۔

موسوعہ عربیہ عالمیہ میں فرنچائز کی حقیقت کی مزید وضاحت کی گئی ہے:

Franchise/ الإعفاء:

الإعفاء في التجارة والأعمال (الفرانشايز) نوع من اتفاقيات الأعمال التجارية. وبموجب هذه الاتفاقيات تمنح الشركة أو الفرد أو المصلحة الحكومية شركة أخرى أو فردًا حق بيع سلع أو خدمات لفترة محددة وفي مكان معين. ويُسمى هذا

(1) https://www.investopedia.com/terms/f/franchise.asp.

الحق أيضا امتيازا. وبمقتضى اتفاقية الامتياز يدفع الشخص الذي يشتري هذا الامتياز رسمًا للمانح (البائع) ليحصل على الحق. وقد يدفع المشتري نسبة مئوية من مبيعات الشركة للجهة البائعة. وفي المقابل يقدم البائع خدمات مثل تدريب العاملين، والمساعدة المالية، والإعلان. وبالإضافة إلى ذلك، يسمح البائع عادة للمشتري باستخدام اسمه التجاري الذي يكون عادة معروفا لدى الجميع. وهذه الميزة تكون ذات قيمة كبيرة للمشتري. وعلى سبيل المثال، إذا كانت هناك عائلة مسافرة عبر مدينة غير معروفة وقد حان وقت الطعام، ورأت العائلة ثلاثة أماكن وأرادت التوقف في أحدها لتناول الطعام، فإنها ستتوقف بلاشك أمام المكان الذي يحمل اسمًا تجاريا معروفًا لديها. يحدث ذلك بالرغم من أن الناس الذين يتناولون وجباتهم في أي واحد من الأماكن الثلاثة يعرفون أن طعامهم على نفس القدر من الجودة. ومن المحتمل أن تتعرف هذه العائلة على اسم المحل؛ لأنها قد تناولت الطعام في الماضي في مطعم يحمل نفس الاسم. (۱)

اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ تجارت اور خدمات میں فرنچائز ایک قسم کے معاہدے کا نام ہے جس کی رو سے کوئی کمپنی / شخص یا سرکاری ادارہ، دوسری کمپنی یا شخص کو متعین علاقے میں طے شدہ مدت تک کے لیے مصنوعات اور خدمات (services) کے فروخت کرنے کا حق دیتا ہے۔ اس حق کی وجہ سے حق خریدنے والا (franchisee) فروخت کرنے والے (franchisor) کو فیس ادا کرتا ہے۔ بعض مرتبہ حق کا خریدار کمپنی کی مصنوعات کے فروخت کے تناسب سے کمپنی کو مخصوص فیصدی حصہ ادا کرتا ہے، جبکہ اس کے بدلے میں کمپنی یا متعلقہ ادارہ (franchisor) مختلف خدمات مہیا کرتا ہے، مثلاً ملازمین کی تربیت، تشہیر اور مالی تعاون وغیرہ۔ مزید برآں متعلقہ ادارہ اپنا تجارتی نام (goodwill) استعمال کرنے کی اجازت دیتا ہے جس کی عام طور پر مارکیٹ میں بہت زیادہ قیمت اور اہمیت ہوتی ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ مثلاً کوئی فیملی کسی سفر پر نکلی ہے اور کسی اجنبی علاقے یا ملک میں ہے۔ کھانے کے وقت ان کے سامنے تین مقامات / ہوٹلز ہیں تو وہ اسی مکان کا انتخاب کرے گی جس کا نام وہ فیملی جانتی ہو، اگرچہ وہاں کے لوگ جو ان مقامات پر کھانا کھاتے ہیں، ان کو معلوم ہوگا کہ تینوں مقامات کا کھانا ایک جیسا ہے، لیکن یہ فیملی صرف جانے پہچانے والے مقام کا انتخاب کرے گی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نام / تجارتی مارک کا کتنا اثر ہوتا ہے۔

(۱) الموسوعة العربية العالمية: الإعلان، Franchise

فرنچائز کی ابتداء

فرنچائز کے نظام کے بارے میں آتا ہے کہ اس کی ابتداء(۱۸۷۱عیسوی) کو متحدہ امریکہ میں ہوئی تھی۔اس وقت متحدہ امریکہ کو تجارت وصنعت کے اعتبار سے بڑے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔دوسری طرف اُس وقت ربط واتصال کے وسائل بھی زیادہ نہیں تھے،اس لیے مختلف کمپنیوں نے مختلف علاقوں میں اپنے فرنچائز کھول دیے۔سب سے پہلے گارمنٹس اور کپڑے کی مصنوعات کی ترویج وفروخت کے لیے اس طریقہ کار کو اپنایا گیا،پھر مشروبات اور اس کے بعد گاڑیاں بنانے والی کمپنیوں نے اس طریقہ کار کو اختیار کیا اور پھر رفتہ رفتہ تقریباً ہر قسم کی مصنوعات کے لیے فرنچائز کے نظام کا سہارا لے لیا گیا۔

آج کل تقریباً پچھتر(۷۵) پیشے یا صنعتیں ایسی ہیں جو فرنچائز کے نظام کے تحت پوری دنیا میں چلتی ہیں۔ان میں اشیاء وخدمات دونوں قسم کا رسد شامل ہے۔اسی طرح ٹیکنالوجی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لیے بھی اس طریقہ کو اپنایا جارہا ہے،تاہم سب سے زیادہ فرنچائز کے نظام کو ملبوسات، ماکولات اور مشروبات کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔[1]

فرنچائز معاہدے کی دفعات

فرنچائز کے عقد میں فریقین کے درمیان ہونے والے معاہدے میں عموماً درج ذیل دفعات کو بیان کیا جاتا ہے:

۱۔ کمپنی(franchisor) کی ذمہ داریاں اور پابندیاں

۲۔ فرنچائز لینے والے(franchisee) کی ذمہ داریاں

۳۔ کمپنی کے حقوق

۴۔ فرنچائز لینے والے کے حقوق

۵۔ کمپنی کے نام(گڈول) کے استعمال کا حق،اس کی حدود اور عمل کا طریقہ کار

۶۔ فرنچائز لینے والے کے عمل کا مقام اور اس کی حدود

۷۔ فرنچائز کے عقد(عقدِ امتیاز) کی مدت

۸۔ تجدیدِ عقد کی شرائط

(۱) https://en.wikipedia.org/wiki/Franchising

۹۔ کمپنی کی مصنوعات کی ترقی اور ان کی حفاظت سے متعلقہ امور

۱۰۔ فرنچائز کے عقد کی انتہاء اور اس پر مرتب ہونے والے اثرات

چونکہ فرنچائز کے متعلق ہر کمپنی کے اپنے اصول وضوابط ہوتے ہیں، نیز قانونی طور پر بھی ان کے لیے کسی خاص طریقہ کی پابندی ضروری نہیں ہے، اس لیے ممکن ہے کہ بعض کمپنیوں کے معاہدات میں درج بالا دفعات سے زائد یا مختلف دفعات بھی ہوں، تاہم اس طرح کے معاہدات علماء کرام کی نگرانی میں تیار کرنے چاہیے، تاکہ کسی خلافِ شرع امر کا ارتکاب لازم نہ آئے۔[1]

فرنچائز کے فوائد

فرنچائز کے نظام میں کمپنی، فرنچائز لینے والے اور مملکت کے لیے کئی فوائد ہیں، جو مختصراً ذیل میں ذکر کیے جاتے ہیں:

ا۔ کمپنی کے فوائد:

۱۔ زیادہ اخراجات کے بغیر ہی مارکیٹ میں تیزی کے ساتھ مصنوعات کی توسیع وتشہیر اور ہدف کا حصول۔

۲۔ اپنی مصنوعات اور سروسز کی ایک منظم اور مخصوص انداز میں تقسیم۔

۳۔ وہ مادی فوائد جو فرنچائز لینے والا، کمپنی کو فیس یا اجرت کی صورت میں دیتا ہے۔

۴۔ وہ مادی فوائد جو کمپنی کو خام مال اور دیگر خدمات کی سپلائی کے بدلے ملتے ہیں، کیونکہ عموماً فرنچائز لینے والا یہ چیزیں کمپنی سے ہی خریدتا ہے، اس لیے کمپنی ان میں نفع رکھ سکتی ہے۔

۵۔ جب کمپنی کے کئی فرنچائزی ہوں تو اس سے کمپنی کی ساکھ میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کی شہرت بڑھتی ہے، اور فرنچائز میں زیادہ سرمایہ بھی خرچ نہیں ہوتا، لیکن اگر کمپنی خود ہی اپنے اخراجات سے اپنا برانچ کھولتی ہے تو اس میں بہت سرمایہ لگتا ہے اور رسک بھی زیادہ ہوتے ہیں۔

۲۔ فرنچائز لینے والے کے فوائد:

۱۔ فرنچائز لینے والا، کمپنی کے نام اور تجارتی مارکہ اور اس کی شہرت سے فائدہ اُٹھاتا ہے، جس سے وہ کسٹمرز کا اعتماد حاصل کر لیتا ہے اور فرنچائز کھلنے کے ساتھ ہی اس پر کسٹمرز ٹوٹ پڑتے ہیں، یہ بات کامیابی کی ضامن ہے۔

[1] http://kenanaonline.com/users/ahmedkordy/posts/241465

۲۔ فرنچائز لینے والا عموماً ان رسکز وخطرات سے تقریباً مامون ہوتا ہے جو عموماً نیا کاروبار شروع کرنے والے کو پیش آتے ہیں، کیونکہ وہ کسی کامیاب کمپنی کا نام استعمال کر کے فنی، ادارتی اور تسویقی (مارکیٹ میں) استحکام حاصل کرلیتا ہے۔

۳۔ فرنچائز لینے والے کو خام مال اور دیگر ضروری خدمات کے لیے کسی دوسری جگہ رابطہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ وہ سہولت اور آسانی کے ساتھ کمپنی سے ہی یہ چیزیں حاصل کرلیتا ہے۔

۴۔ فرنچائز لینے والے کو یہ فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ کمپنی اس کو مکمل طریقہ کار بتاتی ہے اور اس کے ملازمین کو تربیت دیتی ہے، جس کی وجہ سے غلطیوں سے بچا جاتا ہے اور یہ بات نفع کی مقدار میں اضافے کا باعث ہوتی ہے۔

۵۔ فرنچائز لینے والے کو مالیاتی اداروں تک رسائی اور ان کے ساتھ تمویلی سرگرمیاں انجام دینا آسان ہوجاتا ہے، کیونکہ ان کو ایک مجرب اور قابلِ اعتماد بنیاد "کمپنی" کی صورت میں حاصل ہوتی ہے۔

۶۔ فرنچائز لینے والے کو کمپنی کی مصنوعات فروخت کرنے میں آسانی اور سہولت ہوتی ہے، کیونکہ اس کے لیے علاقے کی جغرافیائی حدود متعین کرلی جاتی ہیں، جہاں کسی اور کو اس کمپنی کی مصنوعات فروخت کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

۳۔ ملک کے فوائد:

۱۔ فرنچائز کا نظام اقتصادی وتجارتی ترقی میں مدد ومعاون ثابت ہوتا ہے، اس قسم کی سرمایہ کاری میں بہت سارے مقامی لیبرز کے ہاتھ مصروف ہوجاتے ہیں اور بے روزگاری کے بحران میں کمی آسکتی ہے۔

۲۔ اس نظام کی ترقی ملکی لیکویڈیٹی کے بیرون ملک جانے کو کم کرتی ہے، چھوٹے اور درمیانے درجے کے تمویلی منصوبوں میں سرمایہ کاری کو بڑھاتی ہے اور صارفین کو زیادہ سے زیادہ معیاری اور عمدہ مصنوعات وخدمات فراہم کرنے کی وجہ سے ملکی مصنوعات کو ترویج ملتی ہے، درآمد شدہ مصنوعات کی طرف رغبت کم ہوجاتی ہے اور ملکی مصنوعات کی برآمدی میں اضافہ ہوجاتا ہے۔[1]

فرنچائز کی اقسام

ہماری معلومات کی حد تک کمپنی اور فرنچائز لینے والے کے درمیان ہونے والا معاہدہ چار اقسام کا ہوتا ہے، بالفاظِ دیگر فرنچائز کی چار صورتیں یا قسمیں ہیں:

(1) https://ar.wikipedia.org/wiki: حق الامتياز

۱۔ صنعتی فرنچائز:

اس کو انگریزی میں "Manufacturing Franchise" اور عربی میں "الامتياز التصنيعي" کہتے ہیں۔اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ فرنچائز لینے والا (franchisee) کمپنی کی مقرر کردہ معیارات اور اوصاف کے مطابق خود ہی مصنوعات تیار کرکے، فرنچائز دینے والی کمپنی (franchisor) کے نام اور تجارتی مارکہ کے ساتھ فروخت کرتا ہے، اور نام اور تجارتی مارکہ استعمال کرنے کی وجہ سے وہ کمپنی کو معاوضہ دیتا ہے۔ بعض کمپنیاں مصنوعات کی تیاری کے لازمی عناصر بھی مہیا کرتی ہیں اور کام کی نگرانی بھی کرتی ہیں۔ کھانے پینے کی اشیاء کی فرنچائز (مشہور ہوٹل، پیزاہٹ وغیرہ) عام طور پر اسی نوعیت کی ہوتی ہیں۔

۲۔ تقسیم کاری فرنچائز:

اس کو انگریزی میں "Distributing Franchise" اور عربی میں "الامتياز التوزيعي" کہتے ہیں۔یہ زیادہ معروف ہے۔اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کمپنی اپنی مصنوعات کی ترویج اور فروخت کے لیے مختلف علاقوں میں اپنے ڈسٹری بیوٹر (فرنچائزی) مقرر کرتی ہے۔اس صورت میں ڈسٹری بیوٹر کو مصنوعات خود تیار کرنے کی اجازت نہیں ہوتی، بلکہ وہ کمپنی ہی کی تیار کردہ مصنوعات خرید کر آگے فروخت کرتا ہے۔ کمپنی اور ڈسٹری بیوٹر کے درمیان ہونے والا یہ معاملہ بنیادی طور پر خرید وفروخت (Sale and Purchase) کا ہوتا ہے جس میں کمپنی (بائع) اپنی مصنوعات ڈسٹری بیوٹر کو فروخت کرتی ہے اور ڈسٹری بیوٹر مصنوعات خرید کر آگے کمپنی کے نام سے اپنے لیے فروخت کرتا ہے اور کمپنی کا تجارتی مارکہ استعمال کرنے کی وجہ سے کمپنی کو فیس بھی دیتا ہے۔

۳۔ بزنس فارمیٹ فرنچائز:

اس قسم کو انگریزی میں "Business Format Franchise" اور عربی میں "امتياز صيغة العمل" کہتے ہیں۔اس کی صورت یہ ہے کہ مخصوص رقم کے عوض متعلقہ کمپنی یا ادارہ، فرنچائز لینے والے کو اپنا تجارتی نام دے کر، تمام تر طریقہ کار اور کام کا معیار وغیرہ بتا کر خود اشیاء کی تیاری سے الگ ہو جاتا ہے۔ فرنچائز لینے والا خود ہی وہ سارے کام کرتا ہے جو متعلقہ کمپنی کے اختیارات میں تھے، البتہ کمپنی، فرنچائز لینے والے کو خام مال وغیرہ کی سپلائی کرتی ہے اور پروڈکٹس میں اپنا نام استعمال ہونے اور خام مال سپلائی کرنے کے عوض فرنچائزی سے کرایہ وصول کرتی ہے۔[1]

(1) http://kenanaonline.com/users/ahmedkordy/posts/241465 ـ احمد كردي، حق الامتياز التجاري

۴۔ایجنسی:

آج کل فرنچائز کی ایک اور صورت بھی رائج ہے، جسے ''ایجنسی''(Agency) کہا جاتا ہے، جس میں کمپنی یا ادارہ کسی شخص کے ساتھ یہ معاہدہ کرتا ہے کہ وہ کسی مخصوص علاقے میں اس کمپنی کا وکیل اور ایجنٹ بن کر اس کی مصنوعات اُسی کے نام سے فروخت کرے۔ایسی صورت میں کمپنی کے نائب کو ''ایجنسی'' کہا جاتا ہے۔

اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

A business or organization that provides a particular service especially on behalf of other businesses or organizations.[1]

ایک کاروبار یا ادارہ جو کسی دوسرے کاروبار یا ادارے کی نیابت میں خاص قسم کی خدمات مہیا کرتا ہے۔

اس صورت میں اور دوسری صورت (ڈسٹری بیوشن) میں یہ فرق ہے کہ اِس صورت میں اکثر و بیشتر ایجنسی والا (فرنچائز لینے والا) کمپنی کا تنخواہ دار ملازم اور کمپنی کا ہی ایجنٹ اور وکیل بن کر کمپنی کی مملوکہ اشیاء فروخت کرتا ہے اور اس کے بدلے کمپنی سے کمیشن (اجرت) لیتا ہے، جبکہ دوسری صورت میں عموماً کمپنی اور فرنچائزی کے درمیان وکالت کا نہیں، بلکہ باقاعدہ خرید و فروخت کا معاملہ ہوتا ہے۔

فرنچائز کی شرعی حیثیت و احکام

فرنچائز کے عقد میں اگر غور کیا جائے تو یہ بعض صورتوں میں ''خرید و فروخت'' کا عقد ہوتا ہے، بعض صورتوں میں ''اجارہ'' (کرایہ داری) کا اور بعض صورتوں میں یہ ''وکالت'' (ایجنسی) کا عقد ہوتا ہے۔ یہ تمام عقود اپنی ذات کے اعتبار سے مشروع اور جائز ہیں، تاہم اس سلسلے میں درج بالا چاروں صورتوں سے متعلق کچھ وضاحت کرنا ضروری ہے:

پہلی صورت کا حکم:

فرنچائز کی پہلی صورت (صنعتی/مینوفیکچرنگ فرنچائز) میں کمپنی، فرنچائز لینے والے سے فرنچائز کی فیس کے طور پر رقم لیتی ہے۔اس رقم کو گڈول اور تجارتی مارکہ کی قیمت قرار دے کر جائز کہا جا سکتا ہے، نیز چونکہ فرنچائز دینے والا فریق مختلف خدمات فراہم کرتا ہے، اس لیے اس رقم کو ان خدمات کا عوض بھی قرار دیا جا سکتا ہے، تاہم فرنچائز لینے والے کو کمپنی

(1) Oxford Advanced Learner's Dictionary - 8th Edition.

کے نام اور تجارتی مارکہ استعمال کرنے کا یہ حق کبھی تو دائی اور ہمیشہ کے لیے ہوتا ہے اور کبھی کسی خاص وقت تک؟ اس طرح اس پہلی قسم کی دو صورتیں سامنے آئی ہیں:

۱۔ دائمی فرنچائز (Perpetual Franchise)

اس کا مطلب یہ ہے کہ کمپنی ہمیشہ کے لیے فرنچائز لینے والے کو اپنا نام اور تجارتی مارکہ استعمال کرنے کا حق دے دے اور اس کے بدلے فرنچائزی سے رقم وصول کر لے۔ یہ جائز ہے، بشرطیکہ فرنچائز لینے والا، اشیاء کی تیاری میں اسی معروف کمپنی کی شرائط، معیار اور طریقہ کار کو ملحوظ رکھتا ہو اور خریدار کے حق میں کسی بھی قسم کے دھوکے اور التباس کا خدشہ نہ ہو۔ نیز قانونی طور پر بھی ایسی اجازت دینا کمپنی کے اختیارات میں شامل ہو، کیونکہ یہ ''تجارتی مارکہ'' (trade mark) کی بیع ہے جس کو عصرِ حاضر کے محقق علماء نے جائز قرار دیا ہے۔ (۱)

۲۔ وقتی فرنچائز (Timed Franchise)

اس کا مطلب یہ ہے کہ فرنچائز لینے والا مخصوص مدت کے لیے کمپنی کا نام، تجارتی مارکہ استعمال کرتا ہے اور اس کے عوض کمپنی کو طے شدہ معاوضہ دیتا ہے۔ یہ ''اجارہ'' یعنی تجارتی مارکہ کو کرایہ پر دینا ہے۔ اس طرح کرایہ داری کا معاملہ کرنا اگرچہ اصلاً درست نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ اجارہ، مادی اشیاء کا ہوتا ہے، غیر مادی اشیاء کا اجارہ صحیح نہیں ہے، جبکہ تجارتی مارکہ، مادی اشیاء میں سے نہیں ہے، بلکہ ایک معنوی چیز ہے جس کا حسی طور پر کوئی وجود نہیں ہے، تاہم عصرِ حاضر کے محقق علماء نے چونکہ تجارتی مارکہ کو عرف کی وجہ سے مادی اشیاء کے ساتھ ملحق قرار دیا ہے، کیونکہ علامہ شامیؒ کے بقول مالیت، لوگوں کے مال بنانے سے بھی ثابت ہوتی ہے اور موجودہ زمانے میں تجارتی مارکہ کی رجسٹریشن کے بعد تاجروں کے عرف میں یہ بڑی قیمتی چیز اور ''مادی اشیاء'' کے حکم میں ہو گیا ہے، اس لیے جس طرح اس حق کی خرید و فروخت کو جائز کہا گیا ہے۔ اسی طرح اگر تجارتی مارکہ باقاعدہ قانونی طور پر رجسٹرڈ ہو تو اس کو مادی اشیاء کے ساتھ ملحق کر کے اس حق کو کرایہ پہ لینے دینے کی بھی گنجائش معلوم ہوتی ہے، بشرطیکہ اجارہ کی دیگر شرائط کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مد ظلہم فرنچائز کے بارے میں لکھتے ہیں:

فإن نقل هذا الحق إلى من اشتراه بصفة دائمة، فإنه بيع، وإن نقل إليه لمدة معلومة، فإنه إجارة، يجب أن تراعى فيه أحكام الإجارة. (۲)

(۱) قرارات وتوصيات مجمع الفقه الإسلامي الدولي (ص: ٨٦) قرار رقم: ٤٣ (٥/٥)

(۲) فقه البيوع ١/ ٢٨٠

اگر اس حق (فرنچائز) کو دائمی طور پر خریدار کو دے دیا جائے تو یہ بیع ہے، اور اگر کسی خاص مدت تک کے لیے دیا جائے تو یہ اجارہ ہے، جس میں اجارہ کے احکام کی رعایت رکھنا ضروری ہے۔

دوسری اور تیسری صورت کا حکم:

فرنچائز کی دوسری اور تیسری صورت میں بھی چونکہ فرنچائز لینے والا کمپنی کا نام اور تجارتی مارکہ استعمال کرتا ہے، نیز کمپنی خام مال اور دیگر خدمات بھی فراہم کرتی ہے، اس لیے ان دونوں امور کے بدلے کمپنی، فرنچائز لینے والے سے معاوضہ وصول کر سکتی ہے، خواہ دائمی فرنچائز ہو یا وقتی فرنچائز ہو، جیسا کہ پہلی صورت کے حکم کے تحت بیان ہو چکا ہے۔

چوتھی صورت کا حکم:

چوتھی صورت (ایجنسی) میں فرنچائز لینے والا، کمپنی کا نام اور تجارتی مارکہ اپنے لیے استعمال نہیں کرتا، بلکہ اس کی حیثیت محض ایک وکیل اور ایجنٹ کی ہوتی ہے جو اپنے مؤکل (کمپنی) کے لیے ہی مصنوعات فروخت کرتا ہے، اس لیے اس صورت میں کمپنی کے لیے فرنچائزی (وکیل) سے تجارتی مارکہ استعمال کرنے کی وجہ سے اجرت کا مطالبہ کرنا درست نہیں ہوگا، البتہ فرنچائز لینے والا، کمپنی سے اس عمل کے بدلے کمیشن (اجرت) لے سکتا ہے۔

آخری بات: مصنوعات کے تناسب سے کمیشن لینا:

آج کل بعض کمپنیوں اور فرنچائز لینے والوں کے درمیان اس طرح معاہدہ ہوتا ہے کہ فرنچائز لینے والا جتنی مصنوعات فروخت کرے گا اس کی کمائی کا ایک خاص فیصدی حصہ کمپنی کا ہوگا، یہ شرعاً جائز نہیں ہے، بلکہ لم سم اور متعین رقم طے کرنا ضروری ہے، کیونکہ کمپنی اور فرنچائز لینے والے کے درمیان ہونے والا معاہدہ اگر دائمی ہو تو اس کی شرعی حیثیت بیع کی ہے، اور اگر معاہدہ وقتی اور عارضی ہو تو وہ اجارہ (کرایہ داری) ہے اور بیع کے اندر قیمت، جبکہ اجارہ میں اجرت کا متعین اور لم سم ہونا ضروری ہے۔ کسی موہوم و متوقع نفع میں سے قیمت یا اجرت کے طور پر کچھ فیصد طے کرنا یا مجہولی آمدنی پر کچھ رقم متعین کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس میں جہالت ہے۔

البتہ اس کے جواز کے لیے (صرف وقتی فرنچائز میں) یہ طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے کہ کمپنی، فرنچائز لینے والے سے اپنا نام استعمال کرنے کے عوض ہر ماہ کچھ لم سم رقم مقرر کرلے اور اس کے ساتھ ساتھ فروخت کردہ اشیاء کی آمدنی کا کچھ فی صد بھی مقرر کرلے تو اس صورت میں اگرچہ کل آمدنی مجہول ہے، لیکن ایک خاص مقدار بیان کر لینے کے بعد زیادہ جہالت (جہالتِ فاحشہ) ختم ہو جاتی ہے، لہٰذا اگر یہ صورت جھگڑے اور نزاع کا سبب نہ بنے تو جائز ہے، جیسا کہ شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مد ظلہم نے ''دلال'' کی اجرت کے بارے میں اجازت دی ہے۔

حضرت لکھتے ہیں:

وهذا كله في أجرة السمسار اذا لم تعين غير الزيادة على ما سماه الأصيل من ثمن البيع. وأما اذا سميت أجرته بمبلغ مقطوع، ثم قيل له: "ان بعث باكثر من كذا فالزائد كله لك علاوة على أجرك المقطوع" فالظاهر أنه لا يمنعه الجمهور أيضا. لأن جهالة الأجرة ارتفعت بتحديد أجر مقطوع. وان باعه باكثر من حد معين، فالزائد له على كونه حافزا على حسن عمله.[1]

دلال کی اجرت کے بارے میں یہ ساری تفصیل اس صورت میں ہے جب اس کے لیے بیع کی قیمت سے بچی ہوئی رقم کے علاوہ کوئی اجرت متعین نہ کی گئی ہو، البتہ اگر اس کے لیے متعین مقدار کی کچھ اجرت طے کر دی گئی، پھر اسے یہ کہہ دیا گیا کہ: اگر تم نے اتنی قیمت سے زیادہ میں چیز بیچ دی تو تمہاری متعین اجرت کے علاوہ وہ اضافی رقم بھی تمہاری ہے، تو ظاہر یہی ہے کہ اس کو جمہور علماء منع نہیں کرتے، کیونکہ اجرت کی جہالت، اجرت کی مقدار کی تعیین سے ختم ہو گئی۔ اگر اس نے متعین حد سے زیادہ قیمت میں چیز بیچ دی تو اس کے حسنِ عمل کے نتیجے میں وہ اضافی رقم اس کو بطورِ انعام مل جائے گی۔

اس موضوع پر ایم فل یا پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ بھی لکھا جا سکتا ہے۔ متعلقہ موضوع کی کچھ اہم کتب کے نام ذیل میں دیے جاتے ہیں:

۱- عقد الفرنشايزو أحكامه في الفقه الإسلامي: دراسة فقهية مقارنة بالقانون التجاري، فيصل عباس الرشيدي

۲- عقد الامتياز التجاري وأحكامه في الفقه الإسلامي، حسام الدين خليل فرج

۳- عقد الامتياز التجاري: دراسة فقهية مقارنة، محمود صديق رشوان، مجلة العلوم الشرعية

تنبیہ! واضح رہے کہ آج کل ایک اور معاملہ "حقوق الامتیاز" کے نام سے بھی ہے، جس پر بھی کئی کتب موجود ہیں، لیکن وہ فرنچائز سے الگ اور بی او ٹی جیسا معاملہ ہے، جس کی کچھ وضاحت پہلے باب میں بی او ٹی کے عقد میں ہو چکی ہے۔

---

[1] بحوث في قضايا فقهية معاصرة ٢٦٨/٢

تشہیر: تعارف، شرعی حیثیت، حدود
(Advertisement)

یہ مضمون میگزین "تشہیر اینڈ بزنس" (۲۰۱۲ء) میں اور ویب سائٹ daleel.pk پر شائع ہوا ہے۔

مضمون کے بنیادی عنوانات حسب ذیل ہیں:

- تشہیر کا تعارف
- تشہیر کی اقسام اور وسائل
- تشہیر کی خصوصیات
- تشہیر کے اقتصادی اثرات
- تشہیر کی شرعی حیثیت
- تشہیر کی حدودِ شرعیہ

تشہیر کا تعارف

گزشتہ دو صدیوں سے ذرائع مواصلات نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ دنیا سمٹ کر رہ گئی ہے۔ ہر شخص کو دوسرے مقام میں موجود شخص کے ساتھ رابطہ اور اس تک رسائی آسان ہوگئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بین الاقوامی تجارت نے زور پکڑا اور تاجروں نے ہر علاقے کے لوگوں کو اپنی مصنوعات سے آگاہ کرنے اور ان تک اپنی مصنوعات پہنچانے کی کوشش اور فکر شروع کردی۔ اس آگاہی کے سلسلے میں "تشہیر" نے بہت ترقی کر لی اور پلک جھپکنے میں اس شعبہ نے ایک منافع بخش کاروبار کی شکل اختیار کرلی۔ اب تشہیر کاروبار کا ایک لازمی اور ضروری جزء بن گیا ہے اور علماء نے اس کی شرعی حیثیت واضح کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ اس سلسلے میں چند مختصر گزارشات پیش کرنا مقصود ہے۔

تشہیر کو انگریزی میں ایڈورٹائزمنٹ (advertisement) اور عربی میں "إعلان" اور "دعاية" کہتے ہیں۔ تشہیر کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی ذریعے سے لوگوں کو اپنی مصنوعات (products) یا خدمات (services) کے بارے میں مطلع اور آگاہ کرنا تاکہ لوگوں کی رغبت بڑھے اور زیادہ سے زیادہ لوگ اس چیز کو خریدے یا ان خدمت کو حاصل کرے۔

عربی میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

الإعلان: هو مجموعة الوسائل المستخدمة لمصلحة مشروع، أو منتج، أو خدمة بقصد اجتذاب وتنمية العملاء.[1]

ان وسائل کے مجموعہ کو اعلان سے تعبیر کیا جاتا ہے جن کو کسی پروجیکٹ، پروڈکٹ یا خدمت (سروس) کی مصلحت کے لیے اس ارادے سے اختیار کیا جائے تاکہ ان کی طرف لوگوں کا میلان ہو اور کسٹمرز میں اضافہ ہو۔

کیمبرج ڈکشنری میں بھی تقریباً اسی مفہوم کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

Advertisement: A picture, short film, song, etc. which tries to persuade people to buy a product or service.[2]

یعنی کوئی ایسی تصویر، مختصر سی فلم یا گانا وغیرہ جس کے ذریعے لوگوں کو کسی پروڈکٹ کے خریدنے یا کسی خدمت کو حاصل کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔

تشہیر کی اقسام اور وسائل

ا۔ تشہیر کی قسام:

تشہیر کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں:

الف۔ تعمیم:

نئے آئیڈیاز کے ذریعے اشتہارات کی تیاری کرکے ان کو میڈیا کے ذریعے پھیلانا، تاکہ عوام کے ذہنوں پر بہتر اثرات مرتب ہوں اور برانڈ کی سیل میں اضافہ ہو۔

ب۔ اسکیم:

پروڈکٹس کو بڑھانے کے لیے کوئی اسکیم جاری کرنا۔ مثلاً ایک چیز خریدنے پر ایک چیز فری (buy one get one free) یا مخصوص مقدار میں چیز خریدنے پر کوئی انعام دینا وغیرہ۔

---

[1] الإعلان التجاري عن نشاط المحامي، ص: ۹

[2] Cambridge Advanced Learner's Dictionary - 3rd Edition.

۲۔ تشہیر کے وسائل:

گزشتہ زمانے میں تشہیر کے لیے بازاروں میں اعلان کیا جاتا تھا، کبھی مالک خود ایسا کرتا تھا تو کبھی کسی اور کو دلال مقرر کرتا جو مالک کی چیز کو متعارف کرانے کے لیے مختلف مقامات پر کھڑے ہو کر اعلان کرتا تھا۔ لیکن عصرِ حاضر میں تشہیر کے ذرائع نے کافی ترقی کر لی ہے۔ تشہیر کے لیے عموماً ایسے ذرائع ابلاغ کو استعمال کیا جاتا ہے جن کے ذریعے جلد از جلد اور زیادہ لوگوں تک پیغام پہنچے اور اس کے لیے ایسا اسلوب اور طریقہ اختیار کیا جاتا ہے جو مؤثر ترین ہو، مثلاً:

۱۔ **پرنٹ میڈیا** (print media) جیسے اخبارات، رسائل وجرائد اور پمفلٹ وغیرہ میں اشتہارات دیے جاتے ہیں جو روزانہ لاکھوں لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچتے ہیں۔

۲۔ **الیکٹرانک میڈیا** (electronic media) جیسے ٹی وی اور ریڈیو وغیرہ پر مصنوعات کی تعریف کے لیے دلچسپ الفاظ یا کوئی کہانی یا شارٹ فلم بنا کر پیش کیا جاتا ہے، جسے بھی کروڑوں لوگ دیکھتے اور سنتے ہیں۔ اسی میں آج کل ایس ایم ایس اور میسجز وغیرہ بھی آتے ہیں۔

۳۔ **سوشل میڈیا** (social media) یعنی انٹرنیٹ اور اس پر موجود مختلف ویب سائٹس اور پلیٹ فارمز کے ذریعے تشہیر کرنا، جیسے فیس بک، ٹویٹر، انسٹاگرام، لنکڈان وغیرہ۔

۴۔ **آؤٹ ڈور میڈیا** (outdoor media) تشہیر کے لیے سائن بورڈز، پینافلیکس، ہورڈنگز، بل بورڈز اور نیون سائنز کا استعمال کیا جاتا ہے جسے کسی ایسی جگہ نصب کیا جاتا ہے جہاں سے کثیر تعداد میں لوگوں کا آنا جانا ہو، جیسے سڑکوں اور شاہراہوں کے کنارے، چوک میں، بڑی بڑی عمارات اور مارکیٹوں پر، ریل گاڑیوں اور بسوں میں وغیرہ۔

ان کے علاوہ دیگر ذرائع کو بھی تشہیر کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جیسے کیلنڈر اور ڈائری، کی چین، کیری بیگ، شاپرز وغیرہ۔

تشہیر کی خصوصیات

تشہیر کے تعارف، اقسام اور وسائل سے معلوم ہوتا ہے کہ تشہیر کی بنیادی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ یہ غیر شخصی طریقہ اعلان ہے۔ یعنی تشہیر میں فروخت کنندہ اور خریدار کے درمیان عموماً بلاواسطہ بات یا رابطہ نہیں ہوتا، بلکہ دیگر ذرائع ابلاغ کے ذریعے خریداروں تک معلومات پہنچائی جاتی ہیں، جیسے اخبارات وجرائد وغیرہ۔

۲۔ تشہیر کے لیے عمومی طور پر معاوضہ ادا کرنا پڑتا ہے، خواہ پرنٹ میڈیا کے ذریعے تشہیر کی جائے یا الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے۔

۳۔ تشہیر فقط اشیاء وسامان کی نہیں ہوتی، بلکہ خدمات / سروسز اور آئیڈیاز وغیرہ کی بھی تشہیر ہوتی ہے، جیسے انشورنس وغیرہ۔

۴۔ تشہیر میں صرف اشیاء وخدمات کی تفصیلات پر اکتفاء نہیں کیا جاتا، بلکہ اکثر وبیشتر فروخت کنندہ (کمپنی) کا تعارف وتفصیلات بھی بیان کی جاتی ہیں، جن سے کمپنی/فروخت کنندہ کے بارے میں پہچان حاصل ہو جاتی ہے۔

۵۔ تشہیر کے لیے ہر ذریعہ اختیار نہیں کیا جاتا، بلکہ ایسا ذریعہ اور وسیلہ اختیار کیا جاتا ہے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک معلومات کو کم از کم وقت میں پہنچائے۔

۶۔ تشہیر کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی رغبت میں اضافہ کیا جائے اور مصنوعات یا خدمات کی ترویج اور فروختگی میں اضافہ ہو جائے۔

۷۔ تشہیر ایک ٹیکنکل اور فنی سرگرمی ہے۔ یہ ہر کوئی نہیں کر سکتا، اس لیے تشہیر کے لیے عموماً ماہرین کی خدمات لی جاتی ہیں، جن پر انہیں معاوضہ دینا پڑتا ہے۔[1]

تشہیر کے اقتصادی اثرات

اپنی مصنوعات کی شہرت اور اقتصادی ترقی کے لیے تشہیر ایک مؤثر ترین وسیلہ اور ذریعہ ہے جو کمپنی کی مصنوعات کی مانگ بڑھانے ان کو پھیلانے اور بیچنے میں مدد ومعاون ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح کبھی کبھار نئی پروڈکٹ پر ضخیم سرمایہ خرچ کر لیا جاتا ہے اور کسی بھی نئی پروڈکٹ کو متعارف کرانے اور صارف اور کسٹمر کی نظر میں اُسے وقعت دینے میں تشہیر کا بڑا قوی اثر ہوتا ہے۔ تشہیر کے بغیر نئی پروڈکٹ کو ترویج نہیں ملتی اور کمپنی کو خسارے کے دلدل میں گرنا پڑتا ہے۔

دوسری طرف تشہیر کا فائدہ اخبارات اور رسائل اور ملٹی میڈیا والوں کو بھی پہنچتا ہے جن کی اکثر آمدنی تشہیر کے معاوضہ کی صورت میں ہوتی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اس میں عوام کا بھی فائدہ ہے، کیونکہ اگر پرنٹ میڈیا یا ملٹی میڈیا والے تشہیر کا معاوضہ نہ لیتے تو اخبارات ورسائل اور دیگر ذرائع ابلاغ اتنے سستے اور کم قیمت میں لوگوں کے ہاتھوں تک نہ پہنچتے۔ اسی طرح تشہیر ہی کے ذریعے مختلف انواع کی پروڈکٹس اور خدمات کے بارے میں لوگوں کو اطلاع ملتی ہے۔ پروڈکٹس کی خوائص وصفات، ایک ہی نوع کی پروڈکٹس میں فرق اور ان کے دستیابی کے مقامات اور بنانے والوں کے بارے میں معلومات، یہ سب تفصیلات تشہیر کے ذریعے ہی حاصل ہوتی ہیں اور ہر فرد کو اپنی وسعت کے مطابق اپنی ضرورت کی چیز تک رسائی ہو جاتی ہے۔

(1) https://www.marketing91.com

اگرچہ تشہیر کا یہ منفی پہلو بھی ہے کہ بعض ادارے اور کمپنیاں تشہیر پر حد سے زیادہ سرمایہ خرچ کرتے ہیں اور سارے اخراجات(expenses) پروڈکٹ کی قیمت میں شامل کر لیتے ہیں، جس کی وجہ سے چیز مہنگی ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر اس سلسلے میں اعتدال اور میانہ روی سے کام لیا جائے تو یہ خرابی کسی حد تک کم ہو سکتی ہے۔

تشہیر کی شرعی حیثیت

مصنوعات(products)اور خدمات(services) کو بیچنے کے لیے ان کی تشہیر کرنا تاکہ لوگوں کے علم میں آجائے اور اگر وہ خریدنا چاہیں تو خرید سکیں، بذاتِ خود جائز ہے۔ درج ذیل آیات واحادیث اور آثار سے اس کا جواز ثابت ہوتا ہے:

۱۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام جب جیل میں تھے اور ان سے بادشاہ کے سفیر نے بات کی تو آپ علیہ السلام نے فرمایا تھا:

{قَالَ اجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ }[۱]

کہا کہ مجھے زمین کے خزانوں پر مقرر کردو کہ میں محافظ بھی ہوں اور صاحب علم بھی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھی انسان کے لیے اپنے اندر موجود صفات کو بیان کرنا جائز ہے۔ بالکل اسی طرح اگر کوئی شخص اپنی ملکیت میں موجود اشیاء وخدمات کے درست کوالٹیز وصفات بیان کرتا ہے تو وہ بھی جائز ہونا چاہیے۔

۲۔ ایک حدیث میں آتا ہے آنحضرت ﷺ نے ایک صحابی کی چٹکی بھری اور یہ اعلان کیا کہ: ''کون ہے جو مجھ سے یہ غلام خریدے؟''۔[۲]

۳۔ اسی طرح ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ کے بازار میں اپنی تلوار لہرا کر اعلان کر رہے تھے کہ کون ہے جو مجھ سے میری تلوار خریدے گا۔[۳]

ان دونوں احادیث سے مصنوعات کی تشہیر کے بنیادی تصور کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

۴۔ علامہ قرطبیؒ نے حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ آپ قحط سالی اور تنگی کے زمانے میں شام سے لوگوں کی ضروریات کی چیزیں لے کر آئے اور ''احجاز الزیت'' نامی مقام پر پڑاؤ ڈال کر طبل بجانا شروع کر دیا،

[۱] یوسف: ۵۵

[۲] مسند ابی یعلی، حدیث نمبر: ۳۴۵۶

[۳] المعجم الاوسط، حدیث نمبر: ۷۱۹۸

تاکہ لوگوں کو ان کی آمد کا علم ہو جائے۔ اکثر لوگ جمعہ کی نماز کے لیے گئے تھے، جنہوں نے حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی آواز سنی تو وہاں آگئے۔ اس پر سورہ جمعہ کی آیت نمبر (۱۱) نازل ہوئی۔[۱]

اس واقعے سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کے زمانے میں بھی لوگ اپنی اشیاء کی تشہیر کے لیے طبل بجانے اور اعلان وغیرہ کرنے کے ذرائع اختیار کرتے تھے، لہذا اگر آج کوئی شخص نیا جائز ذریعہ اختیار کر کے اپنی مصنوعات کی تشہیر کرتا ہے تو اس میں کوئی شرعی خرابی نہیں ہے۔

۵۔ فقہی نقطہ نظر سے شیخ یاسر بن طہ نے تشہیر کے جواز پر یہ دلیل پیش کی ہے کہ تشہیر ایک طرح سے دلال (ایجنٹ) کے عمل کے مشابہ ہے، کیونکہ دلال بھی مصنوعات کی صفات بیان کرتا ہے، کسٹمر کو ترغیب دے کر مصنوعات کے میسر ہونے کے مقامات کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور فروخت کنندہ کے لیے گاہک مہیا کرتا ہے۔ اسی طرح تشہیر کا بنیادی مقصد بھی تقریباً یہی ہے، اور دلال کے عمل کے جائز ہونے پر تقریباً تمام اہل علم کا اتفاق ہے، لہذا اگر تشہیر میں شرعی خرابیوں (دھوکہ، جھوٹ، موسیقی اور حرام تصاویر وغیرہ) سے احتراز کیا جائے تو یہ بھی جائز ہے۔

آپ لکھتے ہیں:

> الإعلان والدعاية فيهما شبه بعمل الدلال، وهو من يعرّف بمكان السلعة وصاحبها، وينادي في الأسواق عليها. وقد أجاز أهل العلم عمل الدلال، وجرى على ذلك عمل المسلمين، ولم ينقل إنكاره عن أحد من أهل العلم، وهذا يدل على أنها -أي الدِلالَة - من الأعمال المشروعة الرائجة المتوارثة بلا نكير.[۲]

> اعلان اور دعایہ (تشہیر) میں دلال کے عمل کے ساتھ مشابہت موجود ہے، جو سامان کے مقام اور مال کی پہچان کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور بازار میں سامان فروخت کرنے کے لیے آواز لگاتا ہے۔ دلال کے عمل کو اہل علم نے جائز قرار دیا ہے، اسی پر مسلمانوں کا عمل بھی چلا آرہا ہے اور کسی اہل علم سے اس پر انکار بھی منقول نہیں ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دلالہ (کمیشن ایجنسی) ایک جائز عمل ہے جو بلا نکیر رائج چلا آرہا ہے۔

۶۔ جب کوئی شخص اپنی پروڈکٹس یا خدمات کی تشہیر کے لیے لوگوں کو ملازم رکھتا ہے، جو ایڈز وغیرہ بناتے ہیں،

---

(۱) الجامع لأحكام القرآن ١٨/ ١٠٩

(۲) المعاملات المالية المعاصرة في الفكر الاقتصادي الإسلامي ص: ٦٧

جیسے آج کل کئی گرافکس ڈیزائنرز یہ کام کرتے ہیں۔اس پر ان کو معاوضہ دیا جاتا ہے۔اگر اس میں آنے والی شرعی حدود کی رعایت رکھی جائے تو یہ جائز ہے، کیونکہ فقہی نقطہ نظر سے یہ اجارہ کا معاملہ ہے، جس پر معلوم اجرت لینا جائز ہے۔

اسی طرح اگر کمپنی یا مالک کسی اخبار، رسالہ یا ویب سائٹ وغیرہ پر اپنے جائز اشتہارات دیتا ہے اور اس پر اس اخبار، رسالہ یا ویب سائٹ والے کو معاوضہ دیتا ہے تو یہ بھی اجارہ کے تحت آتا ہے اور جائز ہے، بشرطیکہ اس میں کوئی اور شرعی خرابی نہ ہو۔

تشہیر کی حدود شرعیہ

یہ بات تو اپنی جگہ درست ہے کہ اشتہارات آج کی دنیا میں مصنوعات اور خدمات وغیرہ کی ترویج کا اہم ذریعہ ہیں اور آج کے معاشرے میں یہ ایک بنیادی ضرورت بن چکی ہے اور شریعت کی نظر میں تشہیر کا بنیادی تصور بھی جائز ہے، لیکن اشتہارات کی ایک بہت بڑی تعداد فحاشی، موسیقی اور اس جیسی دیگر شرعی خرابیوں پر بھی مشتمل ہوتی ہے، اس لیے ذیل میں تشہیر کے جواز کی حدود بیان کی جاتی ہیں۔کسی بھی چیز کی تشہیر کرتے اور اشتہار بناتے وقت اِن حدود سے تجاوز کرنا شرعاً درست نہیں ہے:

۱۔ پروڈکٹس حلال ہوں:

سب سے پہلی اور بنیادی شرط تو یہ ہے کہ پروڈکٹ حلال ہو۔جس طرح حرام پروڈکٹس کا کاروبار اور اس کی آمدنی حرام ہے، اسی طرح اس کے لیے اشتہار بنانا، اُسے پرنٹ میڈیا یا الیکٹرانک میڈیا پر پھیلانا بھی جائز نہیں ہے، لہذا شراب، سود اور فلم وغیرہ اور ان جیسی دوسری حرام چیزوں کے اشتہارات کو اپنے رسائل وجرائد میں جگہ نہ دی جائے اور نہ ہی اسے نشر کیا جائے۔

۲۔ پروڈکٹ کی صفات اور عیوب:

دوسری شرط یہ ہے کہ پروڈکٹس کی درست صفات وکوالٹیز ہی بیان کی جائیں اور اگر پروڈکٹس میں کوئی نقص ہے تو اسے بھی بیان کیا جائے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ کبھی تشہیر کے وقت کسی چیز کی محض اطلاع دینا مقصود ہوتی ہے، تو ایسی صورت میں یہ ضروری نہیں ہے کہ اس چیز کے عیوب اور نقص کو بھی ذکر کیا جائے، البتہ جب عملاً خرید وفروخت کا معاملہ ہو رہا ہو تو اس وقت خریدار کو اس چیز کے عیوب کے بارے میں بتانا ضروری ہے۔لیکن اگر تشہیر کے وقت کسی چیز کا مکمل تعارف کرانا بھی مقصود ہو جس میں اس چیز کی خصوصیات اور فوائد ذکر کیے جا رہے ہوں تو اس چیز کے درست صفات کا تذکرہ ضروری

ہوگا، جھوٹ بول کر ایسے فوائد کو ذکر کرنا جائز نہیں ہوگا جو در حقیقت اس چیز میں نہ ہوں۔ اسی طرح اس وقت اس چیز کے اندر پائے جانے والے عیوب، نقص کا حقیقت پسندی سے تذکرہ کرنا بھی ضروری ہوگا، کیونکہ اگر اس وقت عیوب نہ بتائے گئے تو خریدار صرف فوائد دیکھ کر چیز خرید لے گا، جس کی وجہ سے اُسے دھوکہ ہوگا جو کہ شرعاً جائز نہیں ہے۔

۳۔ تصاویر اور انسانی اعضاء کی نمائش:

تشہیر میں کسی غیر جاندار چیز (جیسے درخت، پہاڑ وغیرہ) کی تصویر دکھانا بلاشبہ جائز ہے، البتہ جاندار کی تصویر کے حکم سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ذرائع ابلاغ دو قسم کے ہیں: ایک وہ ذرائع ہیں جن میں اشتہار کا کوئی پرنٹ نہیں نکالا جاتا، جیسے ملٹی میڈیا (سی ڈی، ٹی وی، کمپیوٹر وغیرہ) ذرائع ابلاغ کی دوسری قسم وہ ہے جس میں اشتہار کا باقاعدہ پرنٹ نکالا جاتا ہے، جیسے پرنٹ میڈیا (اخبارات ورسائل) اور سائن بورڈ کے اشتہارات، درج بالا دونوں قسموں کا حکم الگ ہے:

۱۔ ملٹی میڈیا کے ذریعے تشہیر کرتے وقت کسی جانور یا مرد کی تصویر دکھانا جائز ہے، بشرطیکہ مرد کے ستر کی جگہ نہ دکھائی جائے جو کہ ناف سے لے کر گھٹنوں کے نیچے تک کے حصے پر مشتمل ہے۔ جہاں تک عورت کی تصویر کی بات ہے تو عورت کے جسم کا کوئی بھی حصہ اشتہار میں دکھانا جائز نہیں ہے۔[۱]

اگر غور کیا جائے تو آج کل ایڈورٹائزمنٹ میں، خواہ آواز ہو یا تصویر، عورت ہی کو آلہ بنادیا گیا ہے اور اس سے بڑھ کر ایسی فحاشی اور اخلاقی معیار کا گھٹیا پن پیش کیا جاتا ہے جس سے جنسی جذبات کو ہوا دی جاتی ہے اور عورت کی تکریم وتعظیم کی دھجیاں بکھر جاتی ہیں۔ اس سے بچنا واجب اور ضروری ہے۔

۲۔ پرنٹ میڈیا اور سائن بورڈ کے اشتہارات میں جاندار کی تصویر کے بارے میں عورت کی تصویر کا وہی حکم ہے جو پہلے گزر چکا، اور اس قسم کے اشتہارات میں مرد، بلکہ کسی بھی جاندار کے چہرے کی تصویر بنانا بھی شرعاً جائز نہیں ہے۔ تاہم تصویر کا اصل مدار چہرے پر ہے، لہذا جو تصویر سر والی ہو جس میں کان، ناک اور آنکھ وغیرہ اعضاء صاف بنے ہوئے ہوں، وہ حرام ہے۔ اگر تصویر میں سَر نہ ہو، یا سر ہو مگر اس میں آنکھ، ناک، کان صاف بنے ہوئے نہ ہوں، بلکہ یہ اعضاء مٹے ہوئے ہوں، یا سر کے اوپر کوئی چیز لگا کر اس کو چھپایا گیا ہو، یا پوری تصویر نہ ہو، بلکہ تصویر کے اعضاء میں سے کوئی ایک عضو ہو، مثلاً صرف آنکھ، کہنی، ہاتھ، بازو، پیر، پیٹھ وغیرہ، یا پشت کی جانب سے لی گئی تصویر ہو جس میں چہرہ سامنے نہ ہو تو ایسی تصاویر شرعاً ممنوع تصویر میں داخل نہیں ہیں، بشرطیکہ مرد کی ہوں اور ستر والا عضو نہ ہو۔[۲]

(۱) تکملة فتح الملهم: ۴/۱۶۴

(۲) جواہر الفقہ: ۳/۲۳۱

۴۔ قانون کی پابندی:

تشہیر واشتہار کے سلسلے میں حکومتِ وقت نے جن قوانین کی پابندی کو لازم قرار دیا ہے،ان کی رعایت رکھنا ضروری ہے،کیونکہ اگر حکومت عوامی مصلحت کے لیے کوئی جائز قانون بنائے جس کے ساتھ مملکت کی یا عوام کی مصلحت وابستہ ہو تو عوام کے لیے شرعاً اس کی پابندی ضروری ہے اور اس کی خلاف ورزی جائز نہیں۔[1]

۵۔ منکرات سے احتراز:

تشہیر کرتے وقت جس طرح جھوٹ اور دھوکہ سے اجتناب کرنا ضروری ہے،اسی طرح موسیقی اور گانوں سے بچنا بھی ضروری ہے۔اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ تشہیر میں عورت کی آواز شامل نہ ہو،کیونکہ عورت کی آواز فی نفسہ پردہ میں داخل نہیں ہے،لیکن شرعاً یہ بات ناپسند کی گئی ہے کہ عورتیں بلاضرورت اپنی آواز غیر محرم مردوں تک پہنچائے۔[2]

۶۔ مبالغہ آرائی اور فرضی کہانی:

کسی پروڈکٹ کی تشہیر کے لیے ایسا مبالغہ کرنا جائز نہیں ہے کہ جو حقیقت کے خلاف اور جھوٹ کے زمرے میں داخل ہو اور خریداروں کو اس سے دھوکہ ہو،جیسے کسی درد کی دوائی سے اگر درد ختم ہونے میں دو،چار گھنٹے لگ جاتے ہیں یا اس دوا کو دو، چار دفعہ استعمال کرنا پڑتا ہے تو اس کے بارے میں یہ کہنا کہ اس دوا سے درد فوراً خاتمہ ہو جائے گا،درست نہیں ہے،البتہ اگر ایسے جملے یا الفاظ استعمال کیے جائیں جو بظاہر مبالغہ آمیز نظر آرہے ہوں،لیکن وہ حقیقت کے خلاف نہ ہوں اور جھوٹ کے زمرے میں داخل نہ ہوں تو اُن کی گنجائش ہے،جیسے ایئر کنڈیشنز کے بارے میں یہ کہنا کہ ''گرمیوں میں سردی کا مزہ'' وغیرہ۔

تشہیر کے لیے فرضی کہانی (realistic) بنانے کا بھی یہی حکم ہے کہ وہ جھوٹ پر مبنی نہ ہو اور کہانی میں جن فوائد وخصوصیات کا تذکرہ کیا جائے وہ واقعی اُس پروڈکٹ میں پائی جارہی ہیں تو ایسی کہانی بنانے کی بھی گنجائش ہے۔[3]

---

[1] تكملة فتح الملهم ۳۲۳/۳

[2] معارف القرآن ۱۳۲/۷

[3] تجارتی کمپنیوں کا لائحہ عمل،ص: ۲۴۲۔ اس موضوع پر مزید تحقیق کے لیے مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کیا جاسکتا ہے:

(۱)-الإعلانات التجارية: مفهومها وأحكامها في الفقه الإسلامي. علي عبد الكريم محمد المناصير.(۲)-الإعلانات التجارية: أحكامها وضوابطها في الفقه الإسلامي. عبد المجيد محمود الصلاحين.(۳)-الضوابط الشرعية للإعلانات التجارية. د. ماهر حامد الحولي. و سالم عبد الله.

عقودالمشتقات کی شرعی حیثیت

(Derivatives)

اس مضمون کے بنیادی عنوانات حسبِ ذیل ہیں:

- تعارف
- خصوصیات
- بنیادی اقسام
  - ۱۔ مستقبل کی بیع(Future Sales)
  - ۲۔ خیارات(Option)
  - ۳۔ سویپ(Swap)
- شرعی حکم
- شرعی متبادل

تعارف

مشتقات عربی کا لفظ ہے، اس کو انگریزی میں (derivatives) کہتے ہیں۔ اس لفظ کے لغوی معنی ماخوذ ہونا، کسی چیز/عقد سے اخذ کیا ہوا اور مشتق ہونا ہے۔ وکی پیڈیا وغیرہ میں اس کی اصطلاحی تعریف یوں بیان کی گئی ہے کہ: ''وہ عقد جس کی ویلیو کسی انڈر لائنگ(underling) معاملے میں اتار چڑھاو پر فارمنس {performance} سے اخذ کی گئی ہو۔ یہ انڈر لائینگ معاملہ کسی اثاثہ کی شکل میں، انڈیکس یا شرح سود کی شکل میں ہوتا ہے، جس کو عموماً انڈر لائینگ کہا جاتا ہے۔''[1]

انوسٹوپیڈیا میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

''دو یا دو سے زیادہ فریقوں کے درمیان ہونے والا ایسا عقد/کنٹریکٹ جس کی ویلیو کسی متفقہ مالی اثاثوں پر مبنی ہوتی ہے۔ ان اثاثوں میں بانڈز، اجناس، کرنسی، شرح سود اور مارکیٹ انڈیکس وغیرہ شامل ہیں۔''[2]

---

(1) Wikipedia.org

(2) www.investopedia.com

عربی میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

هي عقود معاوضة تهدف لتبادل المخاطر، وهي عقود مالية تشتق قيمتها من قيمة أصول حقيقية أو مالية أخرى، وتكون لتلك العقود المالية مدة زمنية محددة بالإضافة الى سعر وشروط معينة يتم تحديدها عند تحرير العقدين طرفي البائع والمشتري.[1]

ایسے عقودِ معاوضہ جن کا مقصد خطرات/رسک کا تبادلہ ہوتا ہے۔ ان کی قیمت بنیادی و حقیقی اثاثوں سے یا مالیاتی اثاثوں/دستاویزات سے اخذ کی جاتی ہے۔ ان میں خریدار اور فروخت کنندہ کے درمیان عقد کے وقت ہی تحریری طور پر مدت، قیمت اور شروط کو متعین کر لیا جاتا ہے۔

خصوصیات

مشتقات کی تعریف کو سامنے رکھنے سے اس کی بنیادی خاصیات میں یہ نکات شامل ہیں:

۱۔ یہ کنٹریکٹ/عقد یا معاملہ کسی دوسرے عقد کے ساتھ مربوط ہوتا ہے۔

۲۔ اس کی ویلیو اور قیمت کو کسی اثاثہ یا مالیاتی اصول سے اخذ کیا جاتا ہے۔

۳۔ اس عقد کی ویلیو اور قیمت کا تسویہ مستقبل کی کسی تاریخ میں ہوتا ہے۔

۴۔ اس قسم کے معاملات کا بنیادی مقصد مارکیٹ کے اُتار چڑھاو سے پیش آنے والے مالی خطرات/رسک کو کم کرنا ہوتا ہے۔[2]

بنیادی اقسام

مشتقات کی بنیادی قسمیں تین ہیں:

۱۔ مستقبل کی بیع

۲۔ خیارات

۳۔ سویپ

ذیل میں ان اقسام کی وضاحت کی جاتی ہے۔

(۱) www.equiti.com

(۲) المالية الدولية، ص ۹۱، دريد آل شبيب

ا۔ مستقبل کی بیع (Future Sales)

اس کو عربی میں "العقود المستقبلية" کہتے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی سے کوئی چیز خریدے اور اس بیع کی اضافت ونسبت مستقبل کی کسی تاریخ کی طرف کرے۔یعنی چیز مستقبل کی تاریخ میں وصول کی جائے گی۔ پھر یہی خریدار نقصان سے بچنے کے لیے اس چیز کو ابھی سے کسی تیسرے شخص کو فروخت کر دیتا ہے اور اس عقد کو بھی مستقبل کی تاریخ کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے۔

اسی سے ملتی جلتی صورت فارورڈ سیل (forward sale) کی بھی ہے۔اس کو عربی میں "العقود الآجلة" کہتے ہیں۔تاہم اس کی تعریف یوں کی جاتی ہے کہ مستقبل کی تاریخ میں کیا گیا ایک عقد جس میں چیز لینے دینے کے بجائے قیمتوں کا فرق (difference) برابر کرنا مقصود ہو۔اسی لیے اس کو (contracts for difference) اور "عقود الفروق" بھی کہتے ہیں۔

اس کو مثال سے سمجھا جا سکتا ہے، مثلاً زید نے عمر سے ایک من گندم خریدی، جس کی وصولی مستقبل کی کسی تاریخ میں ہوگی۔جب وہ تاریخ آتی ہے تو بجائے گندم لینے کے بیع کی تاریخ اور وصولی کی تاریخ کی قیمتیں معلوم کر کے فرق برابر کر لیا جاتا ہے۔اگر وصولی کے دن قیمت زیادہ ہے تو وہ اضافہ زید کو دے دیا جاتا ہے۔اگر قیمت میں کمی آئی ہے تو زید وہ کمی عمر کو دے دیتا ہے۔

اس طرح کے معاملات کا اصل مقصد ممکنہ نقصان سے تحفظ (hedging) ہوتا ہے، جس کو عربی میں "تأمين ضد الخسارة" کہتے ہیں۔

۲۔ خیارات (Option)

اس کو عربی میں "عقــود الخيــارات" کہتے ہیں۔اس کا مفہوم یہ ہے کہ مخصوص چیز کو مخصوص مدت میں مخصوص قیمت پر خریدنے یا بیچنے کا حق کسی کو دے دینا یا خریدنے اور بیچنے (دونوں) کا حق کسی کو دے دینا یا لے لینا۔اس حق کو (option) یعنی "خیار/خیارات" کا نام دیا گیا ہے۔

اس کی تین قسمیں ہیں:

ا۔ خریدنے کا حق (Call Option)

اس کو عربی میں "خيــار الطلــب" کہتے ہیں۔ایک شخص دوسرے کو کہے کہ اگر تم چاہو تو میں فلاں چیز کو فلاں قیمت پر فلاں مدت کے اندر تم پر فروخت کرنے کا معاہدہ کرتا ہوں۔اگر سامنے والا اس معاملے کو قبول کر لیتا ہے تو اس

صورت میں خریدار کو خریدنے، نہ خریدنے کا حق ہوتا ہے، لیکن اگر وہ خریدنا (call) چاہے تو فروخت کنندہ بیچنے کا پابند ہوتا ہے۔

اس صورت میں بائع (فروخت کنندہ) حق دینے والا ہوتا ہے اور مشتری (خریدار) حق لینے والا ہوتا ہے۔ اور حق دینے والا (فروخت کنندہ) اس حق دینے پر دوسرے شخص (خریدار) سے باقاعدہ فیس بھی وصول کرتا ہے۔

۲۔ بیچنے کا حق (Put Option)

اس کو عربی میں "خیار الدفع" کہتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص دوسرے سے کہے کہ اگر تم چاہو تو میں تم سے فلاں چیز، فلاں قیمت پر فلاں مدت کے اندر خریدنے کا معاہدہ کرتا ہوں۔ اگر دوسرا فریق اس معاملے کو قبول کر لیتا ہے تو اس میں بیچنے والے کو بیچنے، نہ بیچنے کا حق ہوتا ہے، لیکن اگر وہ بیچنا چاہے تو خریدنے والے پر خریدنا لازم ہوتا ہے۔

اس صورت میں حق دینے والا مشتری (خریدار) ہوتا ہے اور حق لینے والا بائع (فروخت کنندہ) ہوتا ہے اور خریدار، فروخت کنندہ سے اس حق کے بدلے فیس بھی وصول کرتا ہے۔

۳۔ خریدنے اور بیچنے کا حق (Straddle Option)

اس کو عربی میں "خیار المرکب" کہتے ہیں۔ کبھی کبھی خریدنے اور بیچنے کے حق کو جمع بھی کر دیا جاتا ہے کہ کوئی شخص کسی سے کسی چیز کے خریدنے کا حق لے لیتا ہے اور دوسرے کسی شخص سے معاہدہ کر کے بیچنے کا حق لے لیتا ہے۔ پھر وہ مارکیٹ ریٹ کو دیکھتا ہے۔ اگر اس چیز کی قیمت بڑھ گئی ہے تو وہ بیچنے کا حق استعمال کرتا ہے اور اگر کسی چیز کی قیمت گر رہی ہے تو وہ خریدنے کا حق استعمال کر کے چیز کو سستی قیمت میں خریدتا ہے اور نفع کماتا ہے۔ اس طرح کے معاملات میں حق (option) دینے والا اس مدت کے اندر باقاعدہ فیس وصول کرتا ہے۔

۴۔ سویپ (Swap)

اس کو عربی میں "عقود المبادلة" کہتے ہیں۔ اس سے مراد ایسا عقد ہے جس میں دو فریق اپنی فنانشل دستاویز / کیش فلو کا باہمی تبادلہ کرتے ہیں۔ اس کی کئی قسمیں ہیں:

مثلاً:

۱۔ کرنسی سویپ (Currency Swap)

۲۔ کریڈٹ سویپ (Credit Deferments Swap)

۳۔ انٹرسٹ ریٹ سویپ (Interest Rate Swap)

اس طرح کے معاملات میں بیک وقت دو معاملات ہوتے ہیں۔ایک حاضر معاملہ (ready/spot) کا اور دوسرا مستقبل کی بیع یعنی فارورڈ (forward) کا اور کبھی دونوں معاملات فارورڈ (forward) کے ہوتے ہیں۔ سویپ کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔

مثلاً کرنسی میں سویپ اس طرح ہوگا کہ زید کو ایک لاکھ ڈالر کی ضرورت ہے۔وہ ایک سو روپے (۱۰۰) فی ڈالر کے حساب سے عمر سے ایک لاکھ ڈالر آج کی تاریخ (ready) میں خریدتا ہے۔زید کو ایک لاکھ ڈالر، جبکہ عمر کو ایک کروڑ روپے ملے۔زید اور عمر دونوں آپس میں آج ہی کی تاریخ میں ایک ماہ بعد کے لیے ایک اور بیع (forward) کر لیتے ہیں، جس کا ریٹ مثلاً ایک سو ایک (۱۰۱) روپے فی ڈالر ہوگا۔ایک ماہ بعد عمر کو ایک لاکھ ڈالر واپس مل جائیں گے اور وہ اس کے بدلے زید کو ایک کروڑ ایک لاکھ روپے دے گا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں معاملات مستقبل یعنی فارورڈ (forward) کے ہوں اور ان کی مدت میں فرق ہو۔ مثلاً پہلا معاملہ ایک مہینہ کا دوسرا ایک سال کا ہو۔

شرعی حکم

اب مختصر الفاظ میں اس قسم (derivatives) کے معاملات کا شرعی حکم بیان کیا جاتا ہے۔ان کا شرعی حکم یہ ہے کہ یہ معاملات شرعاً جائز نہیں ہیں، ہر ایک کی وجہ درج ذیل ہے:

۱۔فیوچر سیل اگر کرنسی یا سونا چاندی وغیرہ میں ہو تو چونکہ عوضین میں کسی کا قبضہ بھی مجلس عقد میں نہیں ہوتا، اس لیے اس کی شریعت میں اجازت نہیں۔دوسرا اس میں محض فرق کو برابر کرنا مقصود ہوتا ہے، چیز لینا مقصود نہیں ہوتا، اس لیے یہ سٹہ ہے۔تیسرا اس میں مبیع مؤجل (خریدی ہوئی چیز ادھار) ہوتی ہے، اور عموماً اس میں سلم واستصناع کی شرائط بھی نہیں پائی جاتیں، جبکہ فقہ میں ان دو صورتوں کے علاوہ مبیع کو مؤجل کرنے کی کوئی تیسری صورت جائز نہیں ہے۔

۲۔خیارات (option) میں جس حق کی خرید و فروخت کی جاتی ہے، یا جس حق کا معاوضہ لیا جاتا ہے وہ شرعی اعتبار سے مال نہیں ہے، محض ایک وعدہ ہے، لہٰذا اس کی فیس وغیرہ لینا جائز نہیں ہے۔

۳۔سویپ (swap) میں یا تو دونوں معاملات فارورڈ کے ہوتے ہیں یا ایک معاملہ فارورڈ کا (forward) کا ہوتا ہے۔اس میں وہی خرابیاں ہیں جو پہلی قسم میں بیان ہو چکی ہیں۔دوسرا اس میں "صفقة في صفقة" یعنی ایک معاملہ میں دوسرے معاملہ کی شرط لگانے، کی خرابی بھی پائی جاتی ہے۔

شرعی متبادل

اس طرح کے معاملات سے بچتے ہوئے ایسے معاملات کرنے چاہییں جو شرعی نقطہ نظر سے درست اور جائز ہوں، جن میں سے چند اہم مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ بیع مؤجل: خرید و فروخت کا ادھار معاملہ کیا جائے، جس میں خریدی ہوئی چیز پر فی الفور قبضہ کر لیا جائے اور قیمت کو ادھار رکھا جائے۔ اس صورت میں فروخت کنندہ نقد قیمت سے زیادہ قیمت بھی رکھ سکتا ہے، تاہم دونوں جانب کی چیز کو ادھار رکھنا یا اگر دونوں جانب ایک ہی جنس کی کرنسی ہے تو وہاں ادھار کا معاملہ کرنا درست نہ ہوگا۔

۲۔ بیع سلم: جس میں خریدار مکمل قیمت فوری طور پر دے گا اور فروخت کنندہ کو یہ سہولت حاصل ہو جائے گی کہ وہ اس قیمت کو اپنی ضروریات وغیرہ میں خرچ کر سکے گا، جبکہ خریدار کو چیز سستی قیمت میں مل جائے گی۔ اس قسم کی بیع کی چند خاص شرائط ہیں، جن کی رعایت رکھنا ضروری ہے۔

۳۔ استصناع: آرڈر پر چیز بنوائی جائے۔ اس میں قیمت کو بھی ادھار رکھا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی بھی چند خاص شرائط ہیں، جن کی تفصیل کتاب کے پہلے باب میں موجود ہے۔

۴۔ اگر مستقبل میں کسی چیز کو خریدنا ہی ہے تو وعدہ کیا جا سکتا ہے اور اسے محض وعدہ سمجھا جائے گا، حقیقی بیع نہیں، لیکن اس وعدے پر فیس وصول نہ کی جائے۔

۵۔ اسی طرح خیارات کے بجائے، اگر خرید و فروخت کا ایسا معاملہ کیا جائے جس میں خریدار یا فروخت کنندہ اپنے لیے خیار شرط رکھے تو یہ بھی جائز ہے۔[1]

عقود مشتقات پر مزید تحقیق کے لیے مندرجہ ذیل کتب کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے:

۱- بحوث المشتقات في الأسواق المالية المعاصرة، خالد بن عبد الرحمن

۲- عقود المشتقات المالية، دراسة فقهية اقتصادية، هشام السعدي خليفة بدوي

۳- عقود المشتقات المالية، دراسة مقارنة، إياد جواد محمد

۴- المشتقات المالية في الممارسة العملية وفي الرؤية الشرعية، عبد الحميد محمود البعلي

(1) البدائل الشرعية للمشتقات المالية [illegible]، مجلة الاقتصاد الإسلامي العالمية، العدد ٦٣، ص ٤١

بذریعہ نمونہ خرید وفروخت

(Sale by Sample)

یہ مضمون میگزین "شریعہ اینڈ بزنس" میں اور ویب سائٹ dalecl.pk پر نشر ہو چکا ہے۔اس مضمون میں مندرجہ ذیل عنوانات شامل ہیں:

- تعارف
- شرعی حکم
- ناجائز صورت کے شرعی متبادل
- خریدار کا اختیار (خیارِ رؤیت)
- خریدار اور فروخت کنندہ کا اختلاف
- ہلکی کوالٹی کا مال فراہم کرنا
- امپورٹڈ نمونہ دکھا کر لوکل مال فراہم کرنا

تعارف

آج کل خرید وفروخت کا ایک طریقہ یہ رائج ہو گیا ہے کہ اگر کسی کمپنی یا کسی شخص کو کوئی چیز خریدنی ہو تو وہ کہیں سے اس چیز کا نمونہ (sample) حاصل کرتا ہے اور کسی کارخانہ یا مال فراہم کرنے والے کو نمونہ دکھا کر اس کے مطابق مال بنانے یا فراہم کرنے کا آرڈر دے دیتا ہے۔

عموماً ایسا ہوتا ہے کہ کمپنی مختلف وینڈرز کو بلا کر انہیں نمونہ دکھاتی ہے اور وہ اس کی تصویر نکال کر اپنے پاس محفوظ کر لیتے ہیں۔وینڈرز سیمپل لے کر تلاش کرتے ہیں کہ یہ چیز کہاں سے ملے گی۔یہ معلوم کرنے کے بعد بذریعہ ای میل یا کسی اور ذریعے سے سیمپل کی تصویر وہاں بھیج دیتے ہیں اور آگے سے ریٹ لے کر اس پر اپنا نفع رکھ کر کمپنی کو ریٹ بتا دیتے ہیں اور کمپنی اس وینڈر کی پیشکش قبول کر لیتی ہے جس کا ریٹ کم ہو اور اس کے نام پر چیز آرڈر (purchase order) جاری کر دیتی ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کمپنی کسی کارخانے والے کو سیمپل دکھا کر، قیمت طے کر کے ایک خاص مقدار میں اسی

جیسا مال تیار کرنے کا آرڈر دیتی ہے اور جب مال تیار ہو جائے تو کارخانے والے کمپنی کو مال فراہم کر دیتے ہیں۔ نمونہ کی بنیاد پر بیع کرنے کو عربی میں "بیع بالنموذج" یا "بیع الأنموذج" کہتے ہیں۔ اس مضمون میں ہم بذریعہ نمونہ خرید و فروخت کے طریقے پر مختصراً شرعی نقطہ نظر سے روشنی ڈالیں گے۔

شرعی حکم

فروخت کنندہ کو کسی چیز کا نمونہ دکھا کر اس سے خاص مقدار میں وہ چیز خریدنا یا خریدار کو کسی چیز کا نمونہ دکھا کر اس پر کوئی چیز فروخت کرنا شرعاً جائز ہے۔ یہ حنفیہ کی رائے ہے۔ فقہاء شافعیہ کے ہاں صرف امثال متساویہ میں نمونہ کی بنیاد پر بیع کرنا جائز ہے، یعنی ایسی اشیاء ہوں جن کی ہر اکائی دوسری اکائی سے مختلف نہ ہو، جیسے گندم کے دانے وغیرہ۔ فقہاء حنابلہ کے ہاں اگر بیچی جانے والی مکمل چیز حاضر نہ ہو تو محض نمونہ کی بنیاد پر بیع کرنا جائز نہیں ہے، البتہ اگر معاملہ کرتے وقت مکمل چیز موجود ہے اور نظر آ رہی ہے تو پھر جائز ہے۔[1]

آج کل عموماً فروخت کنندہ کسی شخص یا کمپنی سے نمونہ کی بنیاد پر آرڈر (purchase order) لے کر کسی دوسرے ملک سے مال درآمد کر کے آگے فراہم کرتا ہے اور کمپنی کے ساتھ ڈیل کرتے وقت فروخت کنندہ کے پاس مکمل چیز موجود نہیں ہوتی۔ اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ اگر نمونہ دکھاتے وقت باقاعدہ ایجاب و قبول کر کے خرید و فروخت کا عقد کرنا مقصود ہے تو اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسی وقت بیچا جانے والا مکمل مال فروخت کنندہ کی ملکیت میں موجود ہو۔ اگر اس وقت مکمل مال فروخت کنندہ کے پاس موجود نہ ہو، اس کے باوجود بیع کا عقد کر لیا تو یہ شرعاً جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ "بیع معدوم" یا "بیع قبل القبض" یا "بیع غیر مملوک" ہے اور یہ تینوں صورتیں شریعت کی نظر میں ممنوع اور ناجائز ہیں۔

سرورِ دو عالم ﷺ کا درج ذیل ارشاد ملاحظہ فرمائیں:

عَنْ حَكِيمِ بْنِ حِزَامٍ قَالَ: نَهَانِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ أَبِيعَ مَا لَيسَ عندِي. وفي رواية: قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ يَأْتِينِي الرَّجُلُ فَيُرِيدُ مِنِّي الْبَيْعَ وَلَيْسَ عِنْدِي فَأَبْتَاعُ لَهُ مِنَ السُّوقِ قَالَ: لَا تبِعْ مَا لَيسَ عندَكَ.[2]

حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے آپ ﷺ نے ایسی چیز بیچنے سے منع فرمایا ہے جو میرے پاس نہ ہو۔ دوسری روایت میں ہے کہ حضرت حکیم رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ:

---

(۱) الموسوعة الفقهية الكويتية ٤١/٧

(۲) سنن النسائي بشرح السيوطي وحاشية السندي ٧/ ٣٣٤، حديث نمبر: ٤٦٢٧

یارسول اللہ! میرے پاس کوئی آدمی آتا ہے اور مجھ سے ایسی چیز خرید تا ہے جو میرے پاس نہ ہو، میں بازار سے خرید کر اسے دے دیتا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا: جو چیز تیرے پاس نہ ہو اُسے مت بیچو۔

تاہم اگر کسی نے ایسا معاملہ کرلیا کہ معاملہ کرتے وقت مکمل مال فروخت کنندہ کے پاس موجود نہیں تھا، لیکن بعد میں جب فروخت کنندہ کے پاس مال آیا تو فریقین نے سابقہ معاملہ ختم کر کے دوبارہ ایجاب و قبول کر کے نئے سرے سے معاملہ کرلیا تو یہ جائز ہے، کیونکہ سابقہ ناجائز معاملہ ختم ہو کر نیا جائز معاملہ وجود میں آگیا۔

ناجائز صورت کے شرعی متبادل

نمونہ کی بنیاد پر معاملہ کرتے وقت اگر مکمل مال فروخت کنندہ کے پاس نہ ہو تو اس کے جائز ہونے کی درج ذیل تین صورتیں ہیں۔ان میں سے کسی ایک کو اختیار کیا جاسکتا ہے:

۱۔وعدہ:

ایک صورت یہ ہے کہ نمونہ دکھاتے وقت باقاعدہ خرید و فروخت کا معاملہ نہ کیا جائے، بلکہ اس وقت محض یہ وعدہ کرلیا جائے کہ اتنے عرصے بعد جب مال آجائے گا تو اس وقت مال اتنی قیمت پر فروخت کردیا جائے گا۔اس صورت میں اگر خریدار سے پیشگی کچھ رقم لی گئی تو وہ اس مال کی قیمت نہیں ہوگی، بلکہ خریدار کا فروخت کنندہ پر قرض ہوگا۔جب مال فروخت کنندہ کے پاس آجائے گا تو اس وقت باقاعدہ ایجاب و قبول کر کے خرید و فروخت کا معاملہ کرلیا جائے گا۔تاہم اگر ایجاب و قبول کے بغیر بھی یہ مال خریدار کے حوالے کر کے اس سے قیمت لے لی گئی تو بھی یہ معاملہ جائز ہو جائے گا۔اسے ''بیع تعاطی'' کہا جاتا ہے۔یہاں یہ بھی ذہن میں رہے کہ اگر مال کم کوالٹی کا آگیا تو خریدار کو اس پر مطلع کرنا ضروری ہے، اس کو بتائے بغیر کم کوالٹی کا مال دینا دھوکہ ہے جو کہ شرعاً جائز نہیں ہے۔

۲۔بیع سلم:

دوسری صورت یہ ہے کہ نمونہ دکھاتے وقت ہی باقاعدہ ایجاب و قبول کر کے بیع سلم کرلی جائے۔یعنی مال کی مکمل قیمت اسی وقت وصول کر کے ایک متعین مدت کے بعد مال دینا طے کیا جائے۔یہ صورت شرعاً جائز ہے، لیکن اس کے لیے درج ذیل شرائط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہیں:

۱۔ جتنی قیمت پر معاملہ ہوا ہے وہ متعین کر کے فی الفور پوری رقم پیشگی وصول کرلی جائے۔

۲۔ جس مال کی فراہمی پر معاملہ ہوا ہے وہ ایسا مال ہو کہ کسی بھی جگہ مل سکے، کسی خاص شہر یا ملک کا مخصوص مال

نہ ہو جو دوسرے کسی بھی جگہ نہ مل سکے۔

۳۔مال کا مجموعہ ایسا ہو کہ اس کی ہر اکائی دوسرے کے قریب قریب ہو، مختلف اور الگ الگ صفات کی شیء کا مجموعہ نہ ہو۔

۴۔ خریدار کو کس دن مال فراہم کیا جائے گا، اس دن اور تاریخ کو متعین کر دیا جائے۔

۵۔مال کی جنس، نوع، صفات اور مقدار کی مکمل وضاحت کر دی جائے، تاکہ بعد میں جھگڑے کا اندیشہ نہ رہے۔

۶۔اگر مال ایسا ہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے میں مشقت ہو تو مال حوالے کرنے کی جگہ بھی طے کر دی جائے۔

۷۔فقہاء حنفیہ کے ہاں ایک شرط یہ بھی ہے کہ خریدار کو مال کی فراہمی کم از کم ایک مہینہ بعد کی جائے، اس سے کم مدت متعین کرنا درست نہیں ہے۔[1] لیکن عصر حاضر کے فقہاء نے ضرورت کی وجہ سے حضرت امام شافعیؒ اور بعض حنفی فقہاء کی رائے اختیار کرتے ہوئے اس بات کی گنجائش دی ہے کہ بیع سلم میں ایک مہینہ سے کم مدت بھی طے کی جاسکتی ہے۔[2]

۳۔استصناع:

تیسری صورت جو دوسری صورت کے قریب قریب ہے، یہ ہے کہ اگر فروخت کنندہ ایسا شخص ہے جس کا کارخانہ ہے اور وہ اپنا خام مال استعمال کر کے مال خود تیار کر کے خریدار کو فراہم کرتا ہے تو اس کے لیے ''استصناع'' (یعنی آرڈر پہ چیز بنوانے) کا عقد کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً خریدار، فروخت کنندہ کو یوں کہہ دے کہ میرے لیے اس نمونہ کے مطابق اتنی مقدار میں یہ چیز بنا دو اور آپس کی رضامندی سے قیمت بھی متعین کر دی جائے۔

یہی صورت اس وقت بھی اختیار کی جاسکتی ہے جب کسی شخص نے خریدار (یعنی کمپنی وغیرہ) سے نمونہ کی بنیاد پہ مال فراہم کرنے کا یہ چیز آرڈر لیا ہو اور وہ خود آگے کسی کارخانہ والے سے مال بنوانا چاہتا ہے تو یہ سپلائر، کارخانہ والے کے ساتھ ''استصناع'' کا عقد کر سکتا ہے۔

استصناع کے صحیح ہونے کے لیے درج ذیل باتوں کو مد نظر رکھنا ضروری ہیں:

۱۔ایسے مال پہ استصناع کا عقد کیا جائے جو صنعت کا محتاج ہو اور اسے باقاعدہ بنایا جاتا ہو، لہذا گندم اور جو وغیرہ جو

(۱) الدر المختار ۵: ۲۱۴

(۲) فقہ البیوع ۱: ۵۲۸

صنعت کی محتاج نہیں ہوتی، ان پر استصناع کا عقد کرنا درست نہیں ہے۔

۲۔ جو چیز بنوانی ہے اس کی مکمل صفات کی وضاحت کردی جائے کہ وہ کیا ہے اور کیسی ہونی چاہیے۔

۳۔ بیع سلم کی طرح اس میں بھی قیمت کا تعین فی الفور ضروری ہے، البتہ اس صورت میں پوری قیمت پیشگی دینا ضروری نہیں ہے، بلکہ باہمی رضامندی سے رقم پیشگی بھی لی جاسکتی ہے اور قسط وار یا کوئی اور وقت بھی طے کیا جاسکتا ہے۔

۴۔ استصناع کے درست ہونے کے لیے مدت کا تعین ضروری نہیں ہے، لیکن فریقین باہمی رضامندی سے چیز جلد بنوانے کے لیے کوئی مدت طے کرسکتے ہیں۔ کارخانے والا اس مدت سے پہلے چیز بنا کر دے سکتا ہے، لیکن اگر اس نے تاخیر کردی تو لینے والا انکار کرسکتا ہے۔ اس کو ''مدتِ استعجال'' کہتے ہیں۔[1]

خریدار کا اختیار (خیارِ رؤیت)

یہاں ایک اہم اور بنیادی نکتہ یہ ہے کہ جب خریدار اور فروخت کنندہ نمونہ (sample) کی بنیاد پر معاملہ کرلیتے ہیں اور پھر سپلائر مال لاکر خریدار کے حوالے کردیتا ہے تو کیا خریدار کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ یہ کہہ کر مال واپس کردے کہ یہ مال مجھے پسند نہیں ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ شریعت کی نظر میں جو شخص بن دیکھے کوئی چیز خرید لیتا ہے تو اُسے مال دیکھنے کے فوراً بعد یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ اگر پسند آئے تو رکھ لے، ورنہ بیچنے والے کو واپس کردے۔ اس کو فقہی اصطلاح میں ''خیارِ رؤیت'' (یعنی دیکھنے کا اختیار) کہتے ہیں۔

لیکن اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر خریدا گیا مال کئی چیزوں پر مشتمل ہے اور ہر چیز دوسرے سے مختلف ہے، مثلاً خریدے ہوئے سامان میں میز، کرسیاں، ٹیبل، لیمپ وغیرہ ہیں، یا مختلف قسم کے کپڑے ہیں یا یا کئی جانور ہیں تو خریدار کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ ہر چیز دیکھے اور پسند کرے، اگر پسند نہ آئے تو واپس کردے۔ لیکن اگر خریدا گیا مال ایک ہی طرح کی کئی چیزوں کا مجموعہ ہے، مثلاً صرف ایک ہی قسم اور کوالٹی کے پنکھے، کرسیاں یا کپڑے وغیرہ ہیں تو ایسی صورت میں بطورِ نمونہ کسی ایک کو دیکھنے سے یہ اختیار ختم ہو جاتا ہے اور خریدار بعد میں ''دیکھنے کے اختیار'' کی بنیاد پر یہ کہہ کر مال واپس نہیں کرسکتا کہ مجھے مال پسند نہیں ہے۔

عموماً جو اشیاء ایک دوسرے سے مختلف ہوں ان کو نمونہ کی بنیاد پر فروخت نہیں کیا جاتا ہے، بلکہ یکساں اور ایک ہی طرح کی چیزوں کو اس طرح بیچا جاتا ہے، اسی لیے مجلہ الاحکام العدلیہ میں عمومی رائے اختیار کی گئی ہے کہ نمونہ دیکھنے سے یہ

---

[1] فقه البيوع ٦٠٢/١

اختیار ساقط ہو جائے گا۔

ہاں! اگر بعد میں فراہم کیا ہوا مال طے شدہ صفات اور کوالٹی کے مطابق نہ ہو تو خریدار کو مال واپس کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔ اگر مال میں کوالٹی کی کمی یا کوئی عیب ہے تو ''خیارِ عیب'' کی بنیاد پر مال واپس کیا جاسکے گا۔ اور اگر مال میں کوئی عیب تو نہیں ہے، لیکن جو مال دینا طے ہوا تھا، اس سے مختلف مال فراہم کیا گیا تو بھی خریدار مال واپس کر سکتا ہے، اسے ''خیارِ وصف'' کہتے ہیں۔ کیونکہ نمونہ کی بنیاد پر معاملہ کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سپلائر یا کارخانے والا اُسی جیسا مال فراہم کرے گا۔ یہ شرط کی حیثیت رکھتا ہے، لہٰذا جب فراہم کیا ہوا مال مختلف اور الگ قسم کا نکلا تو وہ شرط اور صفت نہ پائی گئی جس کی بنیاد پر عقد ہوا تھا۔[1]

اس سلسلے میں درج ذیل تین دفعات اہم ہیں:

۱- الأَشْيَاءُ الَّتِي تُبَاعُ عَلَى مُقْتَضَى أُنْمُوذَجِهَا تَكْفِي رُؤْيَةُ الأُنْمُوذَجِ مِنْهَا فَقَطْ.[2]

جن اشیاء کو نمونہ کی بنیاد پر فروخت کیا جاتا ہے، ان میں (خیارِ رؤیت کے ساقط ہونے کے لیے) صرف نمونہ دیکھنا کافی ہے۔

اس دفعہ کے تحت علامہ اتاسی لکھتے ہیں:

والمراد بتلك الأشياء ما لاتتفاوت آحادها، كالمكيلات والموزونات وكذا العدديات المتقاربة في الصحيح خلافا للكرخي كما في رد المحتار، وما عدا ذلك مما تتفاوت آحادها، كالثياب والدواب والأمتعة والعقارات، إذا بيع منها شيأ متعددة فلابد من رؤية كل واحد منها.[3]

ان سے وہ اشیاء مراد ہیں جن کی ہر اکائی دوسرے سے مختلف نہ ہو، جیسے کیل کر کے یا وزن کر کے بیچی جانے والی اشیاء، اسی طرح وہ اشیاء جو گنتی کی بنیاد پر فروخت ہوتی ہیں اور ایک دوسرے کے قریب ہیں، یہی صحیح قول ہے، البتہ امام کرخی کی رائے اس سے مختلف ہے، جیسا کہ ردالمحتار میں ہے۔ ان کے علاوہ وہ اشیاء جن کے افراد ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، جیسے کپڑے، جانور،

(۱) فقه البيوع ۲/ ۱۹۰

(۲) مجلة الأحكام العدلية ص: ٦٥ (المادّة ۳۲۴)

(۳) شرح المجلة للأتاسي ۱/ ۲۲۳

سامان اور زمینیں وغیرہ، جب ان میں سے کسی چیز کا مجموعہ فروخت کیا جائے تو (خیار رویت سے ساقط ہونے کے لیے) ہر ایک چیز کو دیکھنا ضروری ہے۔

دوسری دفعہ یہ ہے کہ:

۲- إذا بيعت جملة أشياء متفاوتة صفقة واحدة فلابد للزوم البيع من رؤية كل واحد منها على حدته ولا يكتفي برؤية بعضها.[1]

جب کئی مختلف اشیاء کو ایک ہی سودے میں بیچا جائے تو بیع کے لازم ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ان میں سے ہر چیز کو علیحدہ دیکھ لیا جائے، بعض اشیاء کو دیکھنا کافی نہیں۔

تیسری دفعہ یوں ہے:

۳- مَا بِيعَ عَلَى مُقْتَضَى الْأُنْمُوذَجِ إِذَا ظَهَرَ دُونَ الْأُنْمُوذَجِ يَكُونُ الْمُشْتَرِي مُخَيَّرًا إِنْ شَاءَ قَبِلَهُ وَإِنْ شَاءَ رَدَّهُ مَثَلًا الْحِنْطَةُ وَالسَّمْنُ وَالزَّيْتُ وَمَا صُنِعَ عَلَى نَسَقٍ وَاحِدٍ مِنَ الْكِرْبَاسِ وَالْجُوخِ وَأَشْبَاهِهَا إِذَا رَأَى الْمُشْتَرِي أُنْمُوذَجَهَا ثُمَّ اشْتَرَاهَا عَلَى مُقْتَضَاهُ فَظَهَرَتْ أَدْنَى مِنَ الْأُنْمُوذَجِ يُخَيَّرُ الْمُشْتَرِي حِينَئِذٍ.[2]

جس چیز کو نمونہ کی بنیاد پر بیچا گیا ہو، اگر وہ نمونہ سے کم درجے کی نکلی تو خریدار کو اختیار ہوگا کہ چاہے تو رکھ لے یا واپس کر دے۔ مثلاً گندم، گھی، تیل، موٹا اور اونی کپڑا جو ایک ہی طرز پر بنایا جاتا ہے اور اس جیسی دوسری اشیاء، جب خریدار ان کے نمونہ کو دیکھ کر مال خریدے پھر مال نمونہ سے کم کوالٹی کا نکلے تو اس وقت خریدار کو اختیار حاصل ہوگا۔

خریدار اور فروخت کنندہ کا اختلاف

اگر خریدار اور فروخت کنندہ کے درمیان اس بات میں اختلاف ہو جائے کہ فراہم کیا گیا مال سیمپل اور طے شدہ صفات کے مطابق ہے یا نہیں؟ مثلاً خریدار یہ کہے کہ مال طے شدہ صفات کے مطابق نہیں ہے اور فروخت کنندہ کہے کہ مال طے شدہ صفات کے مطابق ہے۔ تو اس کا حل یہ ہے کہ اگر سیمپل موجود ہے تو ماہر اور تجربہ کار لوگوں کو مال دکھا کر معلوم کیا جائے کہ مال سیمپل کے مطابق ہے یا نہیں۔ وہ جو فیصلہ کریں گے، اُسی کے مطابق عمل کیا جائے۔ اگر سیمپل ضائع ہو چکا

---

[1] مرشد الحيران إلى معرفة أحوال الإنسان ص: ٤٦ (مادة ٢٨٣)

[2] مجلة الأحكام العدلية ص: ٦٥ (المادة ٣٢٥)

ہے توفقہاء نے لکھا ہے کہ ایسی صورت میں فروخت کنندہ کی بات معتبر ہوگی،البتہ اگر خریدار نے اپنی بات گواہوں سے ذریعے ثابت کردی توپھراس کی بات تسلیم کرلی جائے گی۔[1]

ہلکی کوالٹی کامال فراہم کرنا

جب کوئی شخص کسی کمپنی وغیرہ سے نمونہ کی بنیاد پر آرڈر لے کر کسی دوسرے ملک سے مال منگواتا ہے یا کسی کارخانے والے سے مال بنواکر وہ مال کمپنی کوفراہم کرتا ہے توایسی صورت میں بسااوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس شخص یا ادارے نے کمپنی سے آرڈر لیاہوتاہے،اس کے پاس دوسرے ملک سے یاکارخانے سے ہلکی کوالٹی کامال آتاہے۔چونکہ اب مال کودوبارہ واپس بھیجنے میں مشکل پیش آتی ہے،اس لیے مجبوراوہی ہلکی کوالٹی کامال کمپنی کوفراہم کردیاجاتاہے اور چیکنگ کے لیے بھی مکمل مال چیک کرنامشکل ہوتاہے،اس لیے ہلکی اور خراب کوالٹی کامال نکل جاتاہے۔

اس بارے یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ جب کمپنی سیمپل دکھاکر کسی ایک ریٹ پر رضامند ہوجاتی ہے اور پرچیز آرڈر جاری کردیتی ہے تواس کامطلب یہ ہوتاہے کہ کمپنی اُسی کوالٹی کے مال کو خریدنے کاآرڈر دے رہی ہے جس کا سیمپل دکھایاگیاہے۔اس لیے ہلکی کوالٹی کامال آنے کی صورت میں کوالٹی بتائے بغیر کمپنی کوہلکی کوالٹی کامال دیناجائزنہیں ہے،کیونکہ اس میں دھوکہ اور وعدہ خلافی ہے۔

اس کاحل یہ ہے کہ کارخانے والوں یادوسرے ملک کے جس شخص یاادارے سے مال منگوایاجاتاہے،اس کے سامنے مال کی کوالٹی کی مکمل وضاحت کردی جائے،تاکہ وہ مطلوبہ کوالٹی کامال بھیجے۔اگرکارخانے یادوسرے ملک کی طرف سے ہلکی کوالٹی کامال آتاہے توشرعااس مال کوواپس بھی کیاجاسکتاہے۔

دوسراحل یہ بھی ہے کہ سیمپل کی بنیادپر آرڈر لیتے وقت کمپنی پرواضح کردیں کہ کسی مخصوص کمپنی یامخصوص کوالٹی کامال فراہم کرنے کی شرط نہیں ہے،بلکہ اس سیمپل کامال جس کوالٹی کابھی آجائے وہ کمپنی کے حوالے کردیاجائے گا۔اگر کمپنی اس پرراضی ہوجائے توپھراس سیمپل کے کسی بھی کوالٹی کامال کمپنی کودیاجاسکتاہے۔

امپورٹڈنمونہ دکھاکرلوکل مال فراہم کرنا

بعض اوقات جس سیمپل کی بنیادپر معاملہ کیاجاتاہے یاآرڈر جاری کیاجاتاہے وہ امپورٹڈ(imported)ہوتا ہے،لیکن مال فراہم کرنے والاباہر سے مال منگوانے کے بجائے لوکل مال تیار کرکے اس کمپنی کے حوالے کردیتاہے،کیونکہ

[1] فقہ البیوع ۲/ ۸۹۱

لوکل مال سستا پڑتا ہے، جبکہ باہر سے مال منگوانا مہنگا ہوتا ہے۔

اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ امپورٹڈ سیمپل کی بنیاد پر آرڈر جاری کرنے سے اگر کمپنی کا مقصد اس امپورٹڈ سیمپل جیسی کوالٹی کا مال خریدنا ہو، خواہ مال باہر سے منگوایا جائے یا لوکل مال تیار کیا جائے یا کسی کمپنی سے خریدا جائے، یعنی باہر سے مال منگوانے کی شرط نہ ہو تو اس صورت میں سیمپل کی کوالٹی کا لوکل مال تیار کر کے کمپنی کو دینا جائز ہے۔ لیکن اگر کمپنی کا مقصد وہی امپورٹڈ سیمپل ہی خریدنا ہو اور اس بات کی وضاحت بھی ہو جائے کہ ہمیں امپورٹڈ مال چاہیے تو ایسی صورت میں امپورٹڈ سیمپل کی بنیاد پر کمپنی سے ریٹ لے کر اسے لوکل مال فراہم کرنا شرعاً جائز نہیں ہوگا اور آمدنی بھی حلال نہ ہوگی۔

پگڑی اور زرِ ضمانت

(Key-Money and Security Deposit)

یہ مضمون میگزین ''شریعہ اینڈ بزنس'' میں شائع ہو چکا ہے۔اس مضمون کے بنیادی عنوانات حسب ذیل ہیں:

- پگڑی اور زرِ ضمانت کا تعارف
- پگڑی کی صورتیں
- پگڑی اور زرِ ضمانت میں فرق
- شرعی احکام

پگڑی اور زرِ ضمانت کا تعارف

آج کل کرایہ داری کے معاملات میں کرایہ دار سے پیشگی رقم لی جاتی ہے جو بعض صورتوں میں پگڑی کے تحت داخل ہو کر ناجائز ہوتی ہے، جبکہ بعض صورتوں میں اس رقم کی حیثیت زرِ ضمانت یا سیکورٹی کی ہوتی ہے جو کہ شرعی اعتبار سے جائز ہے۔بعض لوگ پگڑی اور زرِ ضمانت کو ایک سمجھ کر دونوں پر جائز ہونے کا یا دونوں پر ناجائز ہونے کا حکم جاری کرتے ہیں، حالانکہ پگڑی اور زرِ ضمانت میں فرق ہے، جس کو مد نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔

پگڑی کسی بھی دکان یا مکان میں حق قرار کا نام ہے۔اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مکان یا دکان کا مالک کرایہ دار کو اپنا مکان یا دکان ایک طویل مدت کے لیے کرایہ پر دیتا ہے اور کرایہ دار سے ماہانہ کرایہ کے علاوہ ابتداء میں کچھ رقم یکمشت لے لی جاتی ہے۔کرایہ دار کو پیشگی رقم دینے کی وجہ سے یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ تاحیات اسی دکان یا مکان کو کرایہ داری کے طور پر استعمال کرے۔بسا اوقات کرایہ دار اپنا یہ حق (قرار) کسی دوسرے شخص کی طرف منتقل کر دیتا ہے اور اس سے رقم لے لیتا ہے۔اس کے بعد دوسرا شخص اس مکان یا دکان میں بطورِ کرایہ دار رہتا ہے اور پہلے کرایہ دار کا حق ساقط ہو جاتا ہے۔اگر مکان یا دکان کا مالک، کرایہ دار سے مکان یا دکان واپس لینا چاہتا ہے تو اس پر لازم ہوتا ہے کہ کرایہ دار کو اتنی رقم دے جس پر دونوں رضامند ہو جائے، خواہ یہ رقم پیشگی دی ہوئی رقم کے برابر ہو، کم ہو یا زیادہ ہو۔ایسی صورت میں پیشگی دی ہوئی رقم کو عربی میں ''بدلِ الخلو'' اردو میں ''پگڑی'' اور بعض علاقوں میں ''سلامی'' کہتے ہیں۔[1]

---

[1] فقه البيوع ١/٢٧١

أما الذي جرى عليه الفقهاء والقانونيين فهو إطلاق لفظ (الخلو) على المنفعة نفسها التي يملكها دافع النقود إلى المالك أو إلى المستأجر قبله ليحصل على حق القرار في العقار وإطلاق لفظ (بدل الخلو) على المقابل النقدي لهذه المنفعة.[1]

فقہاء اور قوانین کی اصطلاح میں لفظِ ''خلو'' کا اطلاق اس منفعت (Services) پر ہوتا ہے جو اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جو مالک کو یا کرایہ دار کو نقود دے کر کسی زمین میں قرار اور ٹھہرنے کا حق حاصل کرتا ہے۔ اور ''بدلِ خلو'' اس معاوضہ یا بدل کو کہتے ہیں جو اس منفعت کے مقابلے میں دیا جاتا ہے۔

جہاں تک ''زرِ ضمانت'' کی رقم کی بات ہے تو یہ کسی حق قرار کے بدلے نہیں دی جاتی اور نہ ہی اس کی وجہ سے کرایہ دار کو مکان یا دکان میں طویل مدت یا تاحیات رہنے کا حق حاصل ہوتا ہے، بلکہ یہ صرف اس اندیشہ کی وجہ سے لی جاتی ہے کہ اگر کرایہ دار بجلی یا گیس وغیرہ کا بل دیے بغیر چلا جائے تو مالکِ مکان یا دکان اس پیشگی رقم سے بل ادا کر سکے اور خود بلاوجہ نقصان میں پڑنے سے بچ جائے۔ اگر کرایہ دار کسی مہینہ کا کرایہ ادا نہ کرے تو مالک ایسی رقم سے اپنا کرایہ بھی وصول کرتا ہے۔

پگڑی کی صورتیں

عرف میں پگڑی کی کئی صورتیں رائج ہیں، زیادہ مشہور تین ہیں:

۱۔ جائیداد کے مالک اور کرایہ دار کے درمیان پگڑی کا معاہدہ۔ اس میں کرایہ دار، مالک کو کرایہ کے علاوہ کچھ رقم یکمشت دے کر اس سے اس کی جائیداد/مکان وغیرہ میں حق قرار حاصل کر لیتا ہے۔ یہ کبھی اجارہ کے عقد کی ابتداء میں ہوتا ہے اور کبھی درمیان میں، کبھی آخر میں۔

۲۔ جائیداد کے مالک کا کرایہ دار سے حق قرار واپس خرید لینا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص نے ایک خاص مدت تک کوئی جائیداد/مکان وغیرہ کرایہ پر لے کر اس کا کرایہ دے دیا یا ماہانہ کرایہ دے رہا ہے، تو اس مدت کے اندر اندر مالک یہ چاہتا ہے کہ کرایہ داری کا معاملہ ختم کر دیا جائے، لہٰذا وہ کرایہ دار کو کچھ رقم یکمشت دے کر اجارہ کا عقد ختم کر کے اس سے حق قرار واپس لے لیتا ہے۔

[1] مجلة مجمع الفقه الإسلامي ۲/ ۸۰۱۷. بدل الخلو: الدكتور محمد سليمان الأشقر

۳۔ تیسری صورت یہ ہے کہ پرانا کرایہ دار، جس نے مالک کے ساتھ پگڑی کا معاملہ کرکے حق قرار حاصل کر لیا ہے، وہ کسی نئے کرایہ دار کے ساتھ پگڑی کا معاملہ کرکے اس کو حق قرار بیچ کر خود دستبردار ہو جاتا ہے۔[1]

پگڑی اور زر ضمانت میں فرق

اگر غور کیا جائے تو پگڑی اور زر ضمانت میں درج ذیل فروق پائے جاتے ہیں:

۱۔ پگڑی میں جو پیشگی رقم لی جاتی ہے وہ حق قرار کے بدلے لی جاتی ہے، جبکہ زر ضمانت کو صرف کرایہ دار کی طرف سے ہونے والے نقصان یا اخراجات کی ادائیگی کے لیے لیا جاتا ہے۔

۲۔ پگڑی میں کرایہ داری کی کوئی مجموعی مدت مقرر نہیں ہوتی، بلکہ کرایہ دار کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اس وقت تک اس مکان یا دکان میں رہ سکتا ہے جب تک مالک سے اپنی خوشی کے ساتھ کچھ رقم لے کر چلا نہ جائے یا کسی اور کو یہ حق دے کر اس سے رقم نہ لے۔ دوسری طرف زر ضمانت لینے کی صورت میں کرایہ داری کے لیے باقاعدہ مہینوں یا سالوں کے اعتبار سے وقت مقرر ہوتا ہے۔ اس میں مدت کے اعتبار سے کسی قسم کی جہالت نہیں ہوتی۔

۳۔ پگڑی کی صورت میں جب کرایہ دار مکان یا دکان کو خالی کرکے جانا چاہے، یا مالک اس سے اپنا مکان یا دکان واپس لینا چاہے تو اس پر پیشگی لی ہوئی رقم کی واپسی لازم نہیں ہوتی، بلکہ مالک اور کرایہ دار جس رقم پر بھی متفق ہو جائے وہ رقم کرایہ دار کے حوالے کر دی جاتی ہے۔ لیکن زر ضمانت میں ایسا نہیں ہوتا، بلکہ یہ رقم مالک کے پاس امانت ہوتی ہے اور مالک پر لازم ہوتا ہے کہ کرایہ داری کے معاملے کے ختم ہو جانے کے بعد یہ رقم کرایہ دار کو واپس کر دے، البتہ کرایہ دار نے اگر بجلی یا گیس وغیرہ کا بل ادا نہیں کیا تو مالک اس رقم سے اداء کر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر کرایہ دار نے کسی مہینہ کا کرایہ اداء نہیں کیا تو مالک اس رقم سے اپنا کرایہ بھی وصول کر سکتا ہے۔

شرعی احکام

۱۔ پگڑی کا معاملہ شرعاً ناجائز ہے اور اس میں حق قرار کی وجہ سے جو رقم لی جاتی ہے اس کا حکم رشوت کی طرح ہے، یہ بھی جائز نہیں ہے۔ اگرچہ اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ نے پگڑی کے معاملے کو جائز قرار دیا ہے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ پگڑی کی جو رقم پیشگی لی جائے گی اُسے اجرت سمجھا جائے، لیکن اس کے لیے اجارہ کی دیگر شرائط کا پایا جانا ضروری ہے، مثلاً مدت کا معلوم ہونا اور پیشگی رقم کے بارے مکمل وضاحت کر دینا کہ یہ کرایہ کی رقم ہے۔ اگر غور کیا جائے تو اس کے بعد

[1] المعاملات المالية المعاصرة ص: ٦٨

یہ رقم عام عرف میں "پگڑی" نہیں کہلائے گی۔[۱]

۲۔ پگڑی کی رقم پر زکوۃ بھی لازم نہیں ہے۔ مالکِ مکان یا دکان پر اس رقم کی زکوۃ اس لیے واجب نہیں ہے کہ یہ رقم رشوت کے حکم میں ہے اور اس کی ملکیت میں داخل نہیں ہوئی، اس لیے اس پر زکوۃ بھی نہیں ہے۔ کرایہ دار پر بھی پگڑی کی رقم کی زکوۃ واجب نہیں ہے، کیونکہ اس رقم میں کرایہ دار کو کسی قسم کے تصرف کا حق نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ رقم اس کو واپس ملتی ہے، لہٰذا یہ "مال ضمار" کے حکم میں ہے، جس پر زکوۃ واجب نہیں ہوتی۔

علامہ کاسانیؒ ایسے مال کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فلا تجب الزكاة في المال الضمار عندنا خلافا لهما. وتفسير مال الضمار هو كل مال غير مقدور الانتفاع به مع قيام أصل الملك.[۲]

۳۔ کرایہ داری کے معاملے میں زرِ ضمانت کے طور پر رقم لینا شرعاً جائز ہے، بشرطیکہ اس کی وجہ سے ماہانہ کرایہ میں کمی نہ کی جائے۔ اس رقم کا اصل حکم تو یہ ہے کہ یہ مالکِ دکان کے پاس امانت ہے، لیکن چونکہ مالکِ مکان کا اس رقم کو استعمال کرنا عام ہو چکا ہے، اس لیے اِسے "إجارة بشرط القرض" قرار دیا جائے گا، اور اس شرط کا چونکہ عرف عام ہو چکا ہے، اور اس میں مقرِض (کرایہ دار) کو اس قرض پر کوئی نفع بھی نہیں مل رہا، اس لیے یہ اجارہ جائز ہے۔

علامہ شامیؒ ایسی شرط کے بارے فرماتے ہیں:

وَمُقْتَضَى هَذَا أَنَّهُ لَوْ حَدَثَ عُرْفٌ فِي شَرْطٍ غَيْرِ الشَّرْطِ فِي النَّعْلِ وَالثَّوْبِ وَالْقَبْقَابِ أَنْ يَكُونَ مُعْتَبَرًا إذَا لَمْ يُؤَدِّ إلَى الْمُنَازَعَةِ.[۳]

۴۔ سیکورٹی یا ضمانت کی یہ رقم کرایہ دار کی طرف سے مالکِ مکان یا دوکان کے ذمہ دین/قرض ہے۔ لہٰذا اگر یہ رقم نصاب کے برابر ہو اور اس پر سال گزر جائے یا پہلے سے موجود بقدرِ نصاب مال کے ساتھ ملا کر اس مال کی زکوۃ ادا کرنا کرایہ دار کے ذمہ واجب ہے، لیکن یہ ادائیگی فوراً واجب نہیں ہو گی، بلکہ جب یہ کل رقم یا اس رقم کا کم از کم پانچواں حصہ وصول ہو جائے اس وقت اس کی زکوۃ ادا کرنا واجب ہے، اور اگر یہ مال چند سالوں بعد وصول ہو تو گذشتہ سالوں کی زکوۃ بھی ادا کرنی ہو گی۔

(۱) قرارات وتوصيات مجمع الفقه الإسلامي التابع لمنظمة المؤتمر الإسلامي ١ - ١٧٤ (ص: ٤٩) قرار رقم: ٣١ (٤/٦)

(۲) بدائع الصنائع ٢/ ٩

(۳) حاشية ابن عابدين ٥/ ٨٨

پگڑی کے سلسلے میں اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ نے ایک قرارداد منظور کی ہے، فائدہ کے لیے اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

<u>أولاً:</u> تنقسم صور الاتفاق على بدل الخلو إلى أربع صور هي :

١- أن يكون الاتفاق بين مالك العقار وبين المستأجر عند بدء العقد.

٢- أن يكون الاتفاق بين المستأجر وبين المالك وذلك في أثناء مدة عقد الإجارة أو بعد انتهائها.

٣- أن يكون الاتفاق بين المستأجر وبين مستأجر جديد، في أثناء مدة عقد الإجارة أو بعد انتهائها.

٤- أن يكون الاتفاق بين المستأجر الجديد وبين كل من المالك والمستأجر الأول، قبل انتهاء المدة، أو بعد انتهائها.

<u>ثانياً:</u> إذا اتفق المالك والمستأجر على أن يدفع المستأجر للمالك مبلغاً مقطوعاً زائداً عن الأجرة الدورية - وهو ما يسمى في بعض البلاد خلواً-، فلا مانع شرعاً من دفع هذا المبلغ المقطوع على أن يعد جزءاً من أجرة المدة المتفق عليها، وفي حالة الفسخ تطبق على هذا المبلغ أحكام الأجرة.

<u>ثالثاً:</u> إذا تم الاتفاق بين المالك وبين المستأجر أثناء مدة الإجارة على أن يدفع المالك إلى المستأجر مبلغاً مقابل تخليه عن حقه الثابت بالعقد في ملك منفعة بقية المدة، فإن بدل الخلو هذا جائز شرعاً، لأنه تعويض عن تنازل المستأجر برضاه عن حقه في المنفعة التي باعها للمالك.

أما إذا انقضت مدة الإجارة، ولم يتجدد العقد، صراحة أو ضمناً، عن طريق التجديد التلقائي حسب الصيغة المفيدة له، فلا يحل بدل الخلو، لأن المالك أحق بملكه بعد انقضاء حق المستأجر.

<u>رابعاً:</u> إذا تم الاتفاق بين المستأجر الأول وبين المستأجر الجديد، في أثناء مدة الإجارة، على التنازل عن بقية مدة العقد، لقاء مبلغ زائد عن الأجرة الدورية، فإن بدل الخلو هذا جائز شرعاً، مع مراعاة مقتضى عقد الإجارة المبرم بين المالك والمستأجر الأول، ومراعاة ما تقضي به القوانين النافذة الموافقة للأحكام الشرعية.

على أنه في الإجارات الطويلة المدة، خلافاً لنص عقد الإجارة طبقاً لما تسوغه بعض القوانين، لا يجوز للمستأجر إيجار العين لمستأجر آخر، ولا أخذ بدل

الخلو فيها إلا بموافقة المالك. أما إذا تم الاتفاق بين المستأجر الأول وبين المستأجر الجديد بعد انقضاء المدة فلا يحل بدل الخلو، لانقضاء حق المستأجر الأول في منفعة العين.[1]

اولا- پگڑی پر معاہدہ کی درج ذیل چار صورتیں ہیں:

۱۔مالک اور کرایہ دار کے درمیان عقد کی ابتداء میں معاہدہ ہو۔

۲۔مالک اور کرایہ دار کے درمیان یہ معاہدہ عقد اجارہ کی مدت کے دوران یا مدت کے اختتام کے بعد ہو۔

۳۔پہلے کرایہ دار اور نئے کرایہ دار کے درمیان یہ معاہدہ عقد اجارہ کی مدت کے دوران ہو یا مدت کے اختتام کے بعد۔

۴۔مالک اور کرایہ دار کے ساتھ نیا کرایہ دار معاہدہ کرے، عقد اجارہ کی مدت کے دوران یا مدت کے اختتام کے بعد۔

ثانیا- اگر مالک اور کرایہ دار کے درمیان عقد کی ابتداء میں یہ معاہد ہو جائے کہ کرایہ دار، مالک کو ماہانہ کرایہ کے علاوہ ایک مخصوص رقم دے گا تو اس میں شرعا کوئی مانع نہیں ہے۔ یہ مخصوص رقم کرایہ داری کی اجرت کا ایک حصہ قرار پائے گا اور معاملہ ختم ہونے کی صورت میں اس پر اجرت کے احکام لاگو ہوں گے۔

ثالثا- اگر مالک اور کرایہ دار کے درمیان مدت اجارہ کے دوران ہی یہ معاہدہ ہو جائے کہ مالک، کرایہ دار کو ایک خاص رقم دے گا، جس کے بدلے کرایہ دار اپنے اس حق سے دستبردار ہو جائے گا، جو اس کو کرایہ داری کی بقیہ مدت تک جائیداد سے نفع اٹھانے کی صورت میں حاصل ہے تو یہ بھی شرعا جائز ہے، کیونکہ یہ اس حق منفعت کا بدل ہے جو کرایہ دار اپنی خوشی سے مالک کو فروخت کر رہا ہے۔

اگر کرایہ کی مدت ختم ہو جائے اور عقد کی دوبارہ تجدید صراحت کے ساتھ یا اس سلسلے میں مقررہ

[1] قرارات وتوصيات مجمع الفقه الإسلامي التابع لمنظمة المؤتمر الإسلامي ١ - ١٧٤ (ص: ٤٩) قرار رقم: ٣١ (٤/٦) بشأن بدل الخلو.

ضابطہ کے مطابق ضمناً نہیں ہوئی ہو تو پگڑی درست نہیں ہوگی، کیونکہ کرایہ دار کا حق ختم ہونے کے بعد مالک ہی اپنی ملکیت کا زیادہ حق دار ہے۔

رابعاً۔ اگر پہلے کرایہ دار اور دوسرے نئے کرایہ دار کے درمیان مدت اجارہ کے دوران یہ معاہدہ ہو جائے کہ پہلا کرایہ دار اجارہ کی بقیہ مدت میں اپنے حق سے دستبردار ہو جائے گا اور نیا کرایہ دار ماہانہ کرایہ کے علاوہ ایک خاص رقم اس کرایہ دار کو دے گا تو اصل مالک کے ساتھ ہونے والے عقد اجارہ، احکام شرعیہ اور مروجہ قوانین کی رعایت کے ساتھ یہ صورت بھی جائز ہے۔

طویل مدتی اجارہ میں کرایہ دار کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کرایہ کی چیز مالک کی اجازت کے بغیر آگے کسی اور کو کرایہ پر دے دے یا اس پر پگڑی لے، کیونکہ یہ قوانین کی تصریح کے خلاف ہے۔اسی طرح مدت اجارہ کے بعد پہلے کرایہ دار اور نئے کرایہ دار کے درمیان پگڑی کا معاہدہ بھی جائز نہیں ہے، کیونکہ سامان کی منفعت میں پہلے کرایہ دار کا حق ختم ہو چکا ہے۔

مزید تفصیلات کے لیے مندرجہ ذیل کتب کی طرف مراجعت کریں:

۱۔ فقه البيوع ۱/۲۷۱، للشيخ المفتي محمد تقي العثماني

۲۔ بحوث في قضايا فقهية معاصرة ۱/۱۰۷، للشيخ المفتي محمد تقي العثماني

۳۔ مجلة مجمع الفقه الإسلامي ۴/ ۱۷۲۹۔ اس میں مختلف معاصر فقہاء کے اس موضوع پر پانچ مقالے موجود ہیں۔

۴۔المعاملات المالية المعاصرة، ڈاکٹر محمد عثمان بشیر، ص:۵۸

۵۔بدل الخلو في الفقه الإسلامي، حقيقته وأحكامه، ڈاکٹر صالح بن عثمان

نفع کی تحدید اور مصنوعی طلب

(Profit Margin and Artificial Demand)

یہ مضمون میگزین ''شریعہ اینڈ بزنس'' میں اور ویب سائٹ mazameen.com پر نشر ہو چکا ہے۔ اس مضمون کے بنیادی عنوانات مندرجہ ذیل ہیں:

- نفع کی تحدید (Profit Margin)
- تسعیر/نرخ مقرر کرنا (Pricing)
- مصنوعی طلب (Artificial Demand)

نفع کی تحدید (Profit Margin)

نفع کو عربی میں ''ربح'' اور انگریزی میں ''profit'' کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کو بیچ کر اس کی اصل لاگت سے زیادہ رقم حاصل کی جائے یا کسی چیز یا انسان کی خدمات مہیا کر کے اس کے بدلے آمدنی حاصل کی جائے۔
جس سوال کا حل یہاں مقصود ہے وہ یہ ہے کہ کیا شریعت میں نفع کمانے کی کوئی حد مقرر کی گئی ہے؟ بالفاظِ دیگر کیا شریعت میں کوئی ایسی زیادہ سے زیادہ مقدار بیان کی گئی ہے جس سے اوپر نفع لینا جائز نہ ہو؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ شریعت نے ہر شخص کو اپنے اموال و جائیداد میں خرید و فروخت اور دیگر تصرفات کی مکمل آزادی دی ہے، اسی لیے شریعت نے اس بات کے لیے بھی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی کہ اپنی مملوکہ چیز بیچتے ہوئے یا خدمات مہیا کرتے ہوئے اس پر کتنا نفع لینا چاہیے، بلکہ اصل اور ضروری امر یہ ہے کہ بائع (فروخت کنندہ) اور مشتری (خریدار) راضی ہوں اور نفع کمانے میں حرام اسباب اور ذرائع (جیسے دھوکہ دہی وغیرہ) کا ارتکاب نہ کیا جائے تو بیچنے والے کو اختیار ہے کہ وہ جس قیمت پر چاہے اپنی چیز بیچ سکتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دور میں اشیاء کے نرخ متعین نہیں فرمائے، بلکہ انہیں آزاد چھوڑا کہ اشیاء کی طلب و رسد (demand & supply) سے، مصنوعات کی کوالٹی اور لوگوں کے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اپنا مال فروخت کرنے کے جذبے سے چیزوں کے مناسب نرخ (Rate) وجود میں آتے ہیں۔

ایک سے زائد دلائل ایسے موجود ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے کسی چیز پر نفع کمانے کی کوئی متعین حد مقرر نہیں کی۔ مثلاً:

۱۔قرآن وسنت میں کوئی ایسی وضاحت نہیں ہے کہ نفع کی حد کیا ہے، بلکہ اس کے برعکس قرآن میں تجارت کے لیے بنیادی طور پر صرف باہمی رضامندی کو ضروری قرار دیا ہے۔[1]

۲۔آپ ﷺ نے حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کو ایک دینار دے کر بکری خریدنے کے لیے بھیجا۔انہوں نے ایک دینار کے بدلے دو بکریاں خریدیں اور پھر ایک بکری ایک دینار پر بیچ کر آپ ﷺ کے پاس ایک دینار اور بکری لے کر آگئے۔آپ ﷺ نے ان کی تحسین فرمائی اور ان کے لیے برکت کی دعا دی۔[2]

۳۔احادیث کے علاوہ آثار صحابہ سے بھی زیادہ نفع کمانا ثابت ہے۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے مدینہ کے اطراف میں واقع اپنی جنگل کی زمین کو اصلی قیمت سے نوگنا زیادہ قیمت پر بیچا تھا۔[3]

قرآن وسنت میں نفع کی کوئی حد مقرر نہ کرنے کی حکمت بظاہر یہ ہے کہ نفع کی کوئی ایسی متعین حد مقرر کرنا ممکن نہیں ہے جو ہر زمانے، ہر علاقے اور ہر قسم کی اشیاء پر منطبق ہو سکے، کیونکہ زمانے، علاقے اور اشیاء کے مختلف ہونے اور ضروری وغیر ضروری اشیاء کے اعتبار سے اس پر فرق پڑتا ہے۔اسی طرح نقد اور ادھار کی صورتوں میں بھی قیمت مختلف ہو جاتی ہے۔اس لیے شریعت نے اس معاملہ کو باہمی رضامندی کی بنیاد پر آزاد چھوڑ دیا ہے، تاکہ عرف و معاشرے، زمانے اور لوگوں کی ضروریات وغیرہ کو دیکھ کر لوگ خود ہی مناسب نفع کمائے۔

لیکن یہاں دوسرا پہلو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے وہ یہ کہ نفع کمانے میں شریعت کے آداب یعنی نرمی، قناعت، رواداری اور آسانی کی رعایت رکھنی چاہیے۔یہی وجہ ہے کہ کسی چیز میں اس قدر نفع رکھنا کہ اس کی اصلی قیمت سے کئی گنا زیادہ ہو جائے مروت اور اخلاق کے خلاف سمجھا جاتا ہے، اس سے بچنا بہتر ہے۔

> چنانچہ اسلامی فقہ اکیڈمی، جدہ نے اپنی ایک قرارداد میں اس کی وضاحت درج ذیل الفاظ میں کی ہے:
> <u>أولاً:</u> الأصل الذي تقرره النصوص والقواعد الشرعية ترك الناس أحراراً في بيعهم وشرائهم وتصرفهم في ممتلكاتهم وأموالهم، في إطار أحكام الشريعة الإسلامية الغراء وضوابطها ، عملاً بمطلق قول الله تعالى : (يا أيها الذين آمنوا لا

[1] النساء، ۲۲

[2] صحيح البخاري ص: ۲۳۷، حديث نمبر: ۳۶۴۲

[3] حواله بالا ص: ۱۸۴، حديث نمبر: ۳۱۲۹

تاكلوا أموالكم بينكم بالبطل إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم).

ثانياً: ليس هناك تحديد لنسبة معينة للربح يتقيد بها التجار في معاملاتهم ، بل ذلك متروك لظروف التجارة عامة وظروف التاجر والسلع ، مع مراعاة ما تقضي به الآداب الشرعية من الرفق والقناعة والسماحة والتيسير.[1]

اول۔ شرعی نصوص اور قواعد سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل یہ ہے کہ لوگوں کو خرید وفروخت اور اپنی اشیاء واموال کے معاملے میں آزادر کھا جائے، کیونکہ قرآن مجید کا یہ ارشاد مطلق ہے:

{يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ}[2]

ترجمہ: اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے اموال کو ناحق طریقے سے نہ کھاؤ، ہاں مگر یہ کہ باہمی رضامندی سے تجارت ہو۔

دوم۔ شریعت میں نفع کی کوئی ایسی حد متعین نہیں کی گئی کہ تاجروں کو اس کا پابند کرنا ضروری ہو، بلکہ یہ تجارت کے احوال اور اشیاء کی ضرورت وحیثیت پر منحصر ہے، البتہ نفع کمانے میں شریعت کے آداب جیسے نرمی، قناعت، فراخدلی اور دوسرے کے لیے آسانی وغیرہ کا ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہے۔

اسی طرح بعض اوقات خریدار یا فروخت کنندہ مجبوری کی حالت میں ہوتا ہے تو وہ اپنی مجبوری کی وجہ سے سامنے والے شخص کی مرضی اور اس کی من مانی قیمت کے مطابق معاملہ کرتا ہے۔ کسی مجبور شخص کی ایسی اضطراری حالت سے فائدہ اُٹھاکر اپنی مرضی کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کرنا اور اس سے بہت زیادہ نفع لینا مکروہ اور ناپسندیدہ ہے، لہٰذا اس سے بھی بچنا چاہیے۔[3]

خلاصہ یہ ہے کہ شریعت نے کسی بھی چیز پر نفع کمانے کی کوئی حد متعین نہیں کی، بشرطیکہ نفع کمانے میں مندرجہ ذیل اصولوں کو مدنظر رکھا جائے:

---

[1] قرارات وتوصيات مجمع الفقه الإسلامي الدولي (١-١٨٥=٥-١٤٠٥-١٤٣٠هـ) (ص: ٨٩) قرار رقم: ٣٦ (٥/٨)

[2] النساء: ٢٩

[3] فقه البيوع ٢/٧٠٢

۱۔ نفع کے اندر سود کا عنصر نہ ہو۔

۲۔ نفع میں ذخیرہ اندوزی کا عنصر شامل نہ ہو، جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

۳۔ مارکیٹ ریٹ سے بہت زیادہ مہنگا نہ بیچے، ایسا کرنا ناپسندیدہ ہے۔

۴۔ نفع غرر سے پاک ہونا چاہیے۔

۵۔ دھوکہ دے کر یا غلط بیانی کر کے نفع نہ کمایا جائے۔

۶۔ چیز کے بازاری نرخ کو خریدار سے نہ چھپایا جائے۔

۷۔ چیز میں عیب ہو تو اسے خریدار سے نہ چھپایا جائے۔

۸۔ جس عقد، معاملہ میں نفع کمایا جائے وہ شرعی اصولوں کے مطابق ہو۔

۹۔ اگر حکومت کی طرف سے کسی چیز کا نرخ مقرر ہے تو اس ریٹ سے مہنگا نہ بیچے، ورنہ حکومت کے جائز قوانین کی خلاف ورزی کا گناہ ہوگا، اگرچہ نفع حرام نہیں ہوگا۔

۱۰۔ کسی چیز کے لیے مصنوعی طلب بڑھا کر نفع نہ کمایا جائے۔ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

۱۱۔ نفع کمانے میں دوسروں کے ساتھ نرمی، قناعت اور آسانی کا معاملہ کرنا پسندیدہ ہے۔

تسعیر/نرخ مقرر کرنا (Pricing)

یہاں ایک اور بات بھی واضح کر دینا مناسب ہے کہ اگر کسی جگہ کے تاجر قیمتوں میں من مانی کر کے لوگوں کو تکلیف دینا شروع کر دیں تو حکومتِ وقت عوام الناس کو ضرر سے بچانے کے لیے اہل رائے کے مشورہ سے نرخ مقرر کر سکتی ہے، بشرطیکہ نرخ کی بنیاد عدل وانصاف پر رکھی گئی ہو، تاکہ تاجروں کو بھی ضرر لاحق نہ ہو، جو فقہاء کی اصطلاح میں ''تسعیر'' کہلاتا ہے۔ ایسی صورتحال میں اگر کوئی شخص حکومت کے مقرر کردہ نرخ سے زیادہ پر کوئی چیز فروخت کر دے تو اگرچہ اس چیز پر لیا گیا نفع حلال ہوگا، لیکن حکومت کے جائز قانون کی خلاف ورزی کا گناہ ہوگا۔

علماء نے تین شرائط کے ساتھ حکومتِ وقت کو تسعیر کی اجازت دی ہے:

۱۔ ضرورت اور حاجت کے وقت ہی اشیاء کا نرخ مقرر کرے، مثلاً عوام کو ضرر سے بچانا ہو وغیرہ۔

۲۔ عدل کو مدنظر رکھ کر نرخ مقرر کیا جائے۔ نہ اتنا کم نرخ طے کرے کہ تاجروں کو ضرر لاحق ہو اور نہ اتنا زیادہ نرخ مقرر کرے کہ عوام کو تکلیف ہو۔

۳۔ ماہرینِ اقتصادیات اور دیگر تجربہ کار حضرات کے مشورہ سے نرخ طے کیا جائے۔

اسلامی فقہ اکیڈمی، جدہ کی ایک اجلاس میں یہ دفعہ بھی طے ہوئی کہ:

لا يتدخل ولي الأمر بالتسعير إلاّ حيث خللاً واضحاً في السوق والأسعار، ناشئاً من عوامل مصطنعة، فإن لولي الأمر حينئذ التدخل بالوسائل العادلة الممكنة التي تقضي على تلك العوامل وأسباب الخلل والغلاء والغبن الفاحش.[1]

عام حالات میں حاکم وقت اشیاء کا نرخ مقرر نہ کرے، البتہ جب مارکیٹ اور اشیاء کی قیمتوں میں مصنوعی عامل کی وجہ سے واضح خلل واقع ہونے لگے تو ایسی صورت میں حاکم عدل وانصاف کے ساتھ ایسے وسائل اختیار کر سکتا ہے جن سے اُن عوامل اور خلل، مہنگائی اور دھوکہ دہی کے اسباب کا خاتمہ ہو سکے۔

معنوی طلب (Artificial Demand)

آج کل کے دور میں ناجائز اسباب و وسائل اختیار کر کے کسی چیز کے لیے مصنوعی طلب پیدا کر لی جاتی ہے، جس کی وجہ سے مصنوعات کی قیمتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے، مہنگائی ہو جاتی ہے اور طلب و رسد (demand and supply) کے قدرتی قانون میں خلل اور بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے اور لوگوں کو ضرر و تکلیف لاحق ہوتی ہے، اس لیے شریعت نے ایسے طریقوں کو ممنوع قرار دیا ہے، جن کی وجہ سے مصنوعات کی طلب میں مصنوعی اضافہ ہوتا ہے، اُن میں سے چند طریقے درج ذیل ہیں:

۱۔ نجش (False Bidding)

نجش کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کی بہت زیادہ تعریف کرنا اور بڑھا چڑھا کر دام لگانا تاکہ سننے والے یہ سمجھیں یہ بڑی اچھی چیز ہے اور اس چیز کو زیادہ دام میں خرید لیں۔ اس صورت میں زیادہ دام لگانے والے کا مقصد چیز کو خریدنا نہیں ہوتا، بلکہ وہ دوسروں کو دھوکہ دینے اور رغبت دلانے کے لیے زیادہ دام لگاتا ہے۔ حدیث میں اس طرح کے عمل سے منع کیا گیا ہے۔[2] اگر کسی نے اس طریقے پر اپنی کوئی چیز فروخت کر دی تو بیع منعقد ہو جائے گی، لیکن ایسا کرنا سخت گناہ ہے۔ ایسا کام اکثر نیلام (auction) میں ہوتا ہے کہ فروخت کنندہ اپنے دو چار آدمیوں کو کھڑا کر لیتا ہے کہ جب بولی

---

[1] قرارات وتوصيات مجمع الفقه الإسلامي الدولي (١-١٨٥=٥-١٣٠٠-١٤٣٣هـ) (ص: ٨٩)

[2] صحيح البخاري ،حديث نمبر:٢١٤٢

لگائی جائے تو تم بڑھ کر زیادہ بولی لگانا تاکہ دوسرے لوگ اس چیز کو زیادہ قیمت میں خرید لیں۔ اگر "نجش" کے عمل سے بچتے ہوئے نیلام کے ذریعے کوئی چیز فروخت کی جائے تو جائز ہے۔

اسلامی فقہ اکیڈمی، جدہ کی ایک قرارداد میں "نجش" کی چار صورتیں بیان کی گئی ہیں:

النجش حرام، ومن صوره:

أ- أن يزيد في ثمن السلعة من لا يريد شراءها ليغري المشتري بالزيادة.

ب- أن يتظاهر من لا يريد الشراء بإعجابه بالسلعة وخبرته بها، ويمدحها ليغرّ المشتري فيرفع ثمنها.

ج - أن يدعي صاحب السلعة، أو الوكيل، أو السمسار، ادعاء كاذباً أنه دفع فيها ثمن معين ليدلس على من يسوم.

د - ومن الصور الحديثة للنجش المحظورة شرعاً اعتماد الوسائل السمعية، والمرئية، والمقروءة، التي تذكر أوصافاً رفيعة لا تمثل الحقيقة، أو ترفع الثمن لتغر المشتري، وتحمله على التعاقد.[1]

نجش حرام ہے اور اس کی چند صورتیں یہ ہیں:

۱۔ جس چیز کو خریدنا مقصود نہ ہو، اس کی قیمت بڑھا چڑھا کر بیان کرنا، تاکہ خریدار، دھوکہ میں مبتلا ہو۔

۲۔ جو شخص کسی چیز کو خریدنا نہ چاہتا ہو، وہ اُس چیز کے بہتر ہونے اور اس کے بارے میں خود کا باخبر ہونا ظاہر کر دے اور اس کی تعریف کرے تاکہ خریدار اس چیز کی قیمت زیادہ ادا کرلے۔

۳۔ سامان کا مالک، وکیل یا دلال جھوٹا دعوی کر دے کہ اس نے اس چیز کے لیے اتنی رقم دی ہے، تاکہ سودا کرنے والا دھوکہ میں پڑ جائے۔

۴۔ نجش کی جدید صورتوں میں ایک ممنوع صورت یہ بھی ہے کہ سمعی، بصری اور پڑھے جانے وسائل میں ایسے اوصاف کا تذکرہ کیا جائے جو حقیقت کے خلاف ہوں یا قیمت میں اضافے کا سبب بنے، تاکہ خریدار عقد پر آمادہ ہو۔

[1] قرارات وتوصيات مجمع الفقه الإسلامي الدولي (١-١٨٥=١٤٠٥-١٤٣٠هـ) (ص: ١٣٦) قرار رقم: ٧٣ (٨/٤) بشأن عقد المزايدة.

۲۔ تلقی رکبان یا تلقی جلب:

اس کی صورت علماء نے یہ لکھی ہے کہ دیہات کے کاشتکار اپنی پیداوار فروخت کرنے کے لیے قافلے کی شکل میں شہر کی طرف آئے، تو کچھ شہری شہر سے باہر جا کر اُن کا استقبال کرے اور شہر میں آنے سے پہلے ہی اُن سے ساری پیداوار خرید کر اپنے پاس ذخیرہ کر لیں۔ پھر جب شہر میں اس پیداوار کی ضرورت وطلب بڑھ جائے تو اُسے مہنگے داموں فروخت کر لیں۔ آپ ﷺ نے اس طرح کے عمل سے منع فرمایا ہے۔[۱]

اس ممانعت کی دو وجوہات ہیں:

الف۔ ''تلبیس'' و''غرر'': یعنی باہر سے آنے والے تاجروں کو ضرر اور نقصان سے بچانے کے لیے اس قسم کے معاملہ کو منع کیا گیا، کیونکہ بسا اوقات شہر کے باہر سے آنے والے تاجروں کو یہ علم نہیں ہوتا کہ شہر میں اس سامان کے کیا بھاؤ چل رہے ہیں، تو خریدار باہر ہی اُن کو دھوکہ دے کر اُن سے سستے داموں سارا مال خرید لیتے ہیں جس کی وجہ سے اُنہیں نقصان کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس لیے آپ ﷺ نے اس طرح کی بیع کو ممنوع قرار دیا۔

ب۔ دوسری وجہ ''ضرر'' ہے کہ جو آدمی باہر جا کر آنے والے تاجروں سے سارا مال خرید لیتا ہے وہ تمام مال کا مالک اور اجارہ دار بن جائے گا۔ ایسا آدمی عموماً پہلے ذخیرہ اندوزی کرتا ہے، پھر جب شہر میں اُس مال کی کمی ہونے لگتی ہے، اُس کی ڈیمانڈ(demand) میں اضافہ، سپلائی(supply) میں کمی آنے لگتی اور اُس کی قیمت زیادہ ہو جاتی ہے تو تب وہ اپنی من چاہی قیمت لگا کر مال شہر کے لوگوں پر فروخت کرتا ہے، اس سے اہلِ شہر کو ضرر و تکلیف لاحق ہوتی ہے۔

لہٰذا اگر ان دونوں وجوہات میں سے کوئی ایک وجہ بھی نہ پائی جائے تو پھر یہ عمل جائز ہے، یعنی شہر کی طرف آنے والوں کو دھوکہ نہ دیا جائے، بلکہ ان کو شہر کی درست اور حقیقی قیمت بتلائی جائے اور پیداوار کی ذخیرہ اندوزی بھی نہ کی جائے۔[۲]

۳۔ بیع حاضر للبادی:

اکثر فقہاء کرام نے اس کی صورت یہ لکھی ہے کہ دیہاتی اپنا سامان، کھیت کی پیداوار یا سبزی وغیرہ فروخت کرنے کے لیے شہر آ جائے تو کوئی شہری اس کو یوں کہے کہ تم خود اپنی چیز فروخت نہ کرنا، بلکہ مجھے اپنا وکیل اور ایجنٹ بنا دینا،

---

[۱] صحيح البخاري، حديث نمبر:٢١٦٣

[۲] تكملة فتح الملهم ١/ ٣٣٠

میں تمہارے لیے یہ چیز اچھے دام میں فروخت کرلوں گا۔ حدیث میں اس سے بھی منع کیا گیا ہے۔[1]

فقہاء حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ یہ ممانعت اس وقت ہے جب اس سے اہلِ شہر کو ضرر و تکلیف لاحق ہو، یعنی شہری کے اس عمل سے مہنگائی اور گرانی پیدا ہو جائے، جس کی صورت یہ ہے کہ اگر دیہاتی خود اپنی چیز فروخت کرتا تو اس پر مناسب نفع رکھ کر ہی فروخت کرتا اور شہری کے مقابلے میں سستا فروخت کرتا، لیکن اگر اس کی چیز شہری فروخت کرے گا تو وہ اس کو مہنگے داموں فروخت کرنے کی غرض سے اس کو روکے رکھے گا اور جب شہر میں اس چیز کی قلت ہو جائے گی تو اس وقت مہنگی قیمت میں اسے فروخت کردے گا۔ وہ اپنی اجرت و کمیشن بھی رکھے گا، جس کی وجہ سے وہ چیز مزید مہنگی ہو جائے گی اور اہلِ شہر کو تکلیف لاحق ہوگی۔ اس طرح مصنوعی مہنگائی پیدا کرنے کو شریعت نے منع فرمایا ہے۔ اسی سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ شریعت کی نظر میں خریدار اور فروخت کنندہ کے درمیان دوسرے لوگوں کا واسطہ (middle man) بننا مستحسن نہیں ہے، کیونکہ جتنے واسطے زیادہ ہوں گے، اتنی مہنگائی پیدا ہوگی۔[2]

آج کل آڑھتیوں کا کاروبار بھی اسی کے تحت آتا ہے، لہٰذا اگر اس عمل سے شہریوں کو تکلیف پہنچے، مہنگائی اور گرانی پیدا ہو تو آڑھت کا کاروبار درست نہیں ہوگا، البتہ اگر انتظامی مصلحت اور آسانی کے لیے ہو کہ دیہات اور دور کے لوگوں کے لیے اپنی پیداوار شہر لاکر فروخت کرنا آسان نہ ہو، اس لیے وہ پہلے سے کسی شہری سے یہ معاملہ کرلیتے ہیں کہ ہم اپنی چیز تمہارے پاس اُتاریں گے، تم اسے فروخت کردینا، جیسا کہ آج کل اکثر ایسا ہوتا ہے تو یہ جائز ہے اور شہری کے لیے اس پر مناسب کمیشن لینا بھی جائز ہے۔

۴۔ احتکار (Monopoly)

احتکار کے معنی ذخیرہ اندوزی کے آتے ہیں، یعنی اشیاء ضروریہ کو اپنے پاس روکے رکھنا تاکہ بازار میں ان کی رسد میں قلت پیدا ہو جائے اور ان کی قیمت میں اضافہ ہو جائے۔ اس عمل سے اشیاء کی قیمتوں میں مصنوعی اضافہ ہوتا ہے، اس کی کچھ تفصیل پہلے باب میں گزر چکی ہے۔

جن اشیاء میں ذخیرہ اندوزی کی ممانعت ہے اس کی ممنوع صورت کی شرعاً کوئی تحدید نہیں کی جاسکتی، بلکہ اس کا مدار اُس ضرر (نقصان) پر ہے جس کو عرفِ عام میں ضرر (نقصان) کہا جاسکے، لہٰذا اگر کسی چیز کی عام لوگوں کو ضرورت ہو

---

(۱) صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۵۲۰

(۲) تکملة فتح الملهم ۱/ ۳۲۷، ۳۲۳

اور ذخیرہ کرنے کے نتیجہ میں وہ آسانی سے نہ ملے، جس کی وجہ سے عام لوگوں کو پریشانی لاحق ہو، یا وہ اتنی مہنگی اور گراں ہو جائے کہ عام لوگوں کے لیے عرفاً باعثِ ضرر شمار ہو، مثلاً اس گرانی کو عام لوگ برداشت نہ کر سکتے ہوں تو یہ ذخیرہ کرنا ممنوع ذخیرہ اندوزی کے تحت داخل ہوگا، لیکن اگر کوئی شخص ذخیرہ اندوزی عام لوگوں کو ضرر (نقصان) پہنچانے کے لیے نہیں کرتا، بلکہ کسی اور مقصد مثلاً چاول وغیرہ پرانا کرنے کے لیے یا قیمت بڑھنے کی امید پر ذخیرہ کرتا ہے اور اس صورت میں وہ چیز مارکیٹ میں بآسانی عام قیمت پر مل رہی ہو تو یہ صورت ممنوع ذخیرہ اندوزی میں شامل نہیں ہوگی۔

ذخیرہ اندوزی کی مدت میں فقہاء کا اختلاف ہے، بعض کے نزدیک ایک ماہ اور بعض کے نزدیک چالیس روز ہے۔ اس اختلاف کی وجہ بھی یہی ہے کہ بعض مقامات پر لوگوں کو کم مدت میں ضرر لاحق ہونا شروع ہو جاتا ہے اور بعض جگہ دیر سے ضرر لاحق ہوتا ہے، لہذا غرض یہ کہ جب لوگوں کو ضرورت پڑنے لگے اور روکنے سے ضرر ہونے لگے تو ذخیرہ اندوزی شرعاً ناجائز ہوتی ہے۔[1]

احادیث میں ذخیرہ اندوزی کی سخت مذمت وارد ہوئی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ذخیرہ اندوزی کرنے والا گناہگار ہے۔[2] دوسری حدیث میں آتا ہے کہ ذخیرہ اندوزی کرنے والا ملعون ہے۔[3]

۵۔ غبن و دھوکہ:

اپنی مملوکہ چیز کو فروخت کرنے پر نفع لینے کی کوئی خاص حد تو شریعت نے متعین نہیں فرمائی، لیکن خریدار کو دھوکہ دے کر یا غلط بیانی کر کے نفع کمانے کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے، چنانچہ خریدار کو جھوٹ بول کر اور دھوکہ دے کر کوئی چیز زیادہ مہنگی قیمت میں فروخت کرنا جائز نہیں ہے، مثلاً اپنی چیز کے عیوب کو چھپانا یا جھوٹ بول کر غلط قیمت بتانا یا اپنی چیز میں کوئی ایسا تصرف کرنا جس سے وہ بظاہر اچھی لگے، لیکن حقیقت اس کے خلاف ہو، مثلاً جس بکری یا بھینس کو فروخت کرنے کا ارادہ ہو، کئی دنوں تک اس کا دودھ رُوکے رکھنا تاکہ خریدار یہ سمجھے کہ اس میں دودھ زیادہ ہے، اس طرح کے افعال سے شریعت نے منع فرمایا ہے۔[4]

---

[1] امداد الفتاوی ۱۹/۳

[2] صحیح مسلم، حدیث نمبر: ١٦٠٥

[3] سنن ابن ماجة، حدیث نمبر: ٢١٥٣

[4] فقه البیوع ٨٩٩/٢

اس کی ایک جدید مثال آج کل کے اشتہارات(advertisement)اور تشہیری وسائل ہیں، جن میں غیر اخلاقی اور غیر شرعی تصاویر کے ساتھ ساتھ کسی چیز کے فوائد کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے اور اُس کے نقصانات اور منفی پہلو پر پردہ ڈالا جاتا ہے۔یہ بھی جھوٹ اور دھوکہ دہی کے زمرے میں آتا ہے۔اگر اس طرح کی کوئی شرعی خرابی نہ پائی جائے تو بذاتِ خود اشتہار و تشہیر میں کوئی قباحت نہیں ہے،بلکہ ایک جائز اور مفید عمل ہے، جس کی تفصیل پہلے ایک مستقل مضمون میں بیان کر دی گئی ہے۔

نفع اور تحدیدِ نفع پر مندرجہ ذیل کتب کا مطالعہ مفید ہوگا:

۱-تحديد الربح في المعاوضات المالية في الفقه الإسلامي، العياشي الصادق فداد

۲-أسباب استحقاق الربح في الفقه الإسلامي، محمد سيد أحمد عامر

۳-أحكام الربح بين الفقه الإسلامي والاقتصاد الوضعي، نورالدين بوكرديد

بین الاقوامی تجارت کے احکام

(Export and Import)

یہ مضمون میگزین ''شریعہ اینڈ بزنس'' میں شائع ہو چکا ہے۔اس مضمون کے بنیادی عنوانات مندرجہ ذیل ہیں:

- تعارف
- چھ بنیادی مسائل
  - پہلا مسئلہ: معاملہ کب مکمل ہو گا؟
  - دوسرا مسئلہ: ڈیلیوری والا کس کا وکیل ہے؟
  - تیسرا مسئلہ: چیز خریدار کے رسک میں کب داخل ہو گی؟
  - چوتھا مسئلہ: ٹرانسپورٹر سے نقصان لینا
  - پانچواں مسئلہ: ڈیلیوری والے کے ہاتھ میں قیمت کی حیثیت
  - چھٹا مسئلہ: ڈیلیوری کا طریقہ کار

تعارف

دورِ حاضر میں کمیونیکیشن کے جدید ذرائع کی وجہ سے پوری دنیا سمٹ کر رہ گئی ہے،انسان دنیا کے ایک کونے میں بیٹھ کر دوسرے کونے میں بیٹھے ہوئے شخص سے رابطہ کر سکتا ہے۔اس کا جہاں دیگر معاملات پر کافی اثر ہوا، وہاں درآمدات و برآمدات میں بھی کافی اضافہ ہوا اور اب دیگر ممالک سے چیزیں خرید کر منگوانا یا فروخت کر کے اپنا مال باہر بھیجنا کوئی مشکل نہ رہا، موجودہ دور میں کئی لوگ آپس میں اس طرح خرید و فروخت کے معاملات کرتے ہیں۔

اس قسم کے معاملات کو عربی میں "التجارة الدولية" اور انگریزی میں (international trading) کہتے ہیں۔ عربی میں اس کی تعریف یوں کی جاتی ہے:

التِجارة الدولية: عملية تبادل السلع والخدمات بين الدول. وتختلف عن التجارة المحلية التي تتم كلية داخل البلد الواحد. وتسمى التجارة الدولية أحيانًا بالتجارة

العالمية أو التجارة الخارجية.[1]

بین الاقوامی تجارت ایسی سرگرمی کو کہتے ہیں جس میں مصنوعات اور سروسز کا مختلف ممالک کے درمیان تبادلہ ہوتا ہے۔ یہ لوکل تجارت سے مختلف ہے جو کسی ایک ملک کے اندر ہوتی ہے۔ اس کو کبھی "تجارت دولیہ"، کبھی "عالمی تجارت" اور کبھی "خارجی تجارت" کہتے ہیں۔

عالمی/بین الاقوامی تجارت کے کئی فوائد ہیں، مثلاً:

۱۔ ملکی مصنوعات پر اکتفاء کرنے کے بجائے اور ہر ضرورت کی چیز کو خود تیار کرنے کے بجائے، صارفین دوسرے ممالک سے تبادلے کے ذریعے کم قیمت پر زیادہ سامان حاصل کر سکتے ہیں۔

۲۔ اگر ہر ملک ایسی اشیاء پر توجہ مرکوز کرے جو وہ دوسرے ممالک کے مقابلے میں زیادہ موثر انداز میں اور اعلیٰ طریقے سے پیدا کر سکتا ہے تو ممکن ہے کہ قلیل وسائل کو زیادہ موثر طریقے سے استعمال کرنا ممکن ہو جائے۔ یہ ایک معاشی اصول ہے کہ ہر ملک کو ایسی اشیا پر توجہ دینی چاہئے جو وہ اعلی کارکردگی کے ساتھ تیار کر سکتا ہے اور جو اشیاء وہ خود اعلی طریقے سے تیار نہیں کر سکتا، ان کو دوسرے ممالک سے خرید سکتا ہے۔ ہر دو صورتوں میں اس کے فوائد ہیں۔

۳۔ برآمد کنندہ ملک کے ادائیگیوں کے توازن کو بڑھایا جا سکتا ہے، کیونکہ درآمدات سے زیادہ برآمدات میں اضافے سے ادائیگیوں کے توازن میں اضافہ ہو جائے گا اور پیداواری صلاحیت میں اضافہ قومی آمدنی میں اضافے اور اس طرح معاشی ترقی کو حاصل کرنے کا باعث بنتا ہے۔ اس طرح ریاست کی سرپلس اور دولت میں بھی اضافہ ہو گا۔

۴۔ بین الاقوامی تجارت مختلف ممالک کے مابین تعلقات کو مضبوط اور مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

۵۔ اس سے معاشروں کی فلاح و بہبود میں اضافہ ہوتا ہے، چاہے وہ برآمد کرنے والے ملک کے لیے ہو یا درآمد کرنے والے ملک کے لیے، کیونکہ ان کے لیے دستیاب سامان اور خدمات کے آپشن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

۶۔ بین الاقوامی تجارت کا ایک اہم فائدہ یہ بھی ہے کہ دونوں ممالک کے مابین ماہرین کے تجربات و مہارت سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، خواہ وہ مادی مہارت ہو، انسانی یا تکنیکی مہارت ہو۔

اس قسم کے معاملات میں کئی شرعی احکام آتے ہیں، جن کو سمجھنا ضروری ہے۔ استاذ محترم مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے اپنی کتاب "فقہ البیوع" میں درآمدات، و برآمدات کے احکام کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ذیل میں اسی کا خلاصہ، کچھ اضافہ و تبدیلی کے ساتھ دیا جاتا ہے۔

---

[1] الموسوعة العربية العالمية. التجارة الدولية

چھ بنیادی مسائل

پہلا مسئلہ: معاملہ کب مکمل ہوگا؟

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب دو ایسے انسان بذریعہ فون یا فیکس، انٹرنیٹ وغیرہ خرید و فروخت کا معاملہ کرتے ہیں جو دونوں ایک دوسرے سے دور ہیں تو ایسی بیع یا معاملہ کب مکمل سمجھا جائے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ جب فون، یا فیکس یا ای میل وغیرہ پر بیع/ خرید و فروخت کا معاملہ ہو رہا ہے، اس وقت بیچی جانے والی چیز فروخت کنندہ کی ملکیت اور قبضہ میں موجود ہے تو ایسی صورت میں اسی وقت (فون یا فیکس وغیرہ پر) ہی ایجاب و قبول کے فوراً بعد بیع کا معاملہ مکمل ہو جائے گا، اور جب مال پہنچانے والا بیچی ہوئی چیز کو خریدار کے پاس لے جائے گا تو وہ وکیل کی حیثیت سے چیز لے جا کر خریدار کو حوالے کرے گا۔

یہاں اس تفصیل کو بھی مد نظر رکھنا ضروری ہے جو ہم نے کتاب کے پہلے باب میں ''ایجاب و قبول'' کے تحت بیان کی ہے کہ کیا عقد/ معاملہ دوسرے فریق کے زبانی ایجاب سے مکمل ہوگا یا مراسلہ وغیرہ سے۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جس وقت فریقین فون وغیرہ پر بیع کا معاملہ کر رہے ہیں، اس وقت بیچی جانے والی چیز فروخت کنندہ کی ملکیت میں یا قبضہ میں نہیں ہے تو ایسی صورت میں اسی وقت بیع کا معاملہ مکمل نہیں ہوگا، کیونکہ جو چیز ملکیت میں نہ ہو یا قبضہ میں نہ ہو، اس کو بیچنا شرعاً جائز نہیں ہے، البتہ فون وغیرہ پر جو بات ہوئی اس کو محض وعدہ سمجھا جائے گا اور پھر جب فروخت کنندہ اس چیز کو کہیں سے فراہم کر کے خریدار کو ارسال کرے گا اور چیز خریدار کے پاس پہنچ جائے گی تو خریدار کی وصولی کے ساتھ ہی بیع کا معاملہ مکمل ہو جائے گا، اس کو فقہی اصطلاح میں ''بیع تعاطی'' کہتے ہیں۔

ایسی صورت میں فروخت کنندہ کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ فون وغیرہ پر ہی خریدار سے باقاعدہ بیع کا معاملہ مکمل کر لے، بلکہ صرف اس سے چیز پہنچانے یا مہیا کرنے کا وعدہ کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا مسئلہ: ٹرانسپورٹر کس کا وکیل ہے؟

دوسرا اہم اور بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ جو شخص بیچی ہوئی چیز (مبیع) لے کر خریدار کے پاس لے جاتا ہے وہ ڈیلیوری والا شخص یا ادارہ/ ٹرانسپورٹر کس کا وکیل شمار ہوگا؟ فروخت کنندہ کا یا خریدار کا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی تین صورتیں ہیں:

۱۔ اگر خریدار اور فروخت کنندہ نے آپس میں یہ طے کر لیا ہے کہ بیچی جانے والی چیز کو خریدار تک پہنچانا فروخت

کنندہ کی ذمہ داری ہے تو ایسی صورت میں ڈیلیوری والا (ٹرانسپورٹر یا ادارہ) فروخت کنندہ کا وکیل شمار ہوگا۔

۲۔ اگر خریدار اور فروخت کنندہ کے درمیان یہ طے پایا کہ فروخت کنندہ کی ذمہ داری صرف اتنی ہے کہ وہ بیچی جانے والی چیز ڈاک والے یا ٹرانسپورٹر/ آگے پہنچانے والے تک پہنچادے، خریدار تک پہنچانا فروخت کنندہ کی ذمہ داری نہیں ہے تو ایسی صورت میں ٹرانسپورٹر/ڈیلیوری والا یا ادارہ خریدار کا وکیل سمجھا جائے گا۔

۳۔ اگر خریدار اور فروخت کنندہ کے درمیان آپس میں اس سلسلے سے متعلق کوئی وضاحت یا معاہدہ طے نہیں ہوا، اور نہ ہی کوئی وضاحت ہوئی تو اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ ایسی صورت میں بھی چیز آگے پہنچانے والا، فروخت کنندہ کا وکیل ہوگا۔ اس کی دو وجوہات ہیں:

الف۔ ٹرانسپورٹر/ چیز آگے پہنچانے والے کے ساتھ معاملہ خود فروخت کنندہ کرتا ہے، اس لیے وہ اسی کا وکیل ہوگا۔

ب۔ اگر چیز پہنچانے والے سے چیز ضائع ہو جاتی ہے تو اس سے ضمان کا مطالبہ یا رجوع بھی فروخت کنندہ کرتا ہے۔ اس لیے وہ فروخت کنندہ کا وکیل ہوگا۔

لیکن اس سلسلے میں آج کل کے عرف کو بھی مد نظر رکھنا چاہیے اور آج کل کا عرف یہ ہے کہ لوکل معاملات میں ڈاک والا، فروخت کنندہ کا وکیل سمجھا جاتا ہے، جبکہ بین الاقوامی معاملات میں ٹرانسپورٹر کو خریدار کا وکیل سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا اسی کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔

تیسرا مسئلہ: چیز خریدار کے ضمان میں کب داخل ہوگی؟

اس کا مطلب یہ ہے کہ بیچی جانے والی چیز کب خریدار کے ضمان اور رسک میں داخل ہوگی؟ اگر وہ چیز راستے میں، خریدار تک پہنچنے سے پہلے ہی ضائع ہوگئی تو کیا خریدار ذمہ دار ہوگا یا فروخت کنندہ ضامن ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ سابقہ دوسرے مسئلہ کو سامنے رکھتے ہوئے دیکھا جائے گا کہ چیز آگے پہنچانے والا کس کا وکیل ہے؟

الف۔ اگر پہلی صورت ہے جس میں چیز آگے پہنچانے والا شخص/ٹرانسپورٹر فروخت کنندہ کا وکیل ہوتا ہے تو جب تک اس چیز پر خریدار یا اس کا کوئی نائب قبضہ نہیں کرے گا اس وقت تک یہ چیز فروخت کنندہ کے رسک میں ہوگی، اگر چیز راستے میں ضائع ہوگئی تو فروخت کنندہ ذمہ دار ہوگا۔

ب۔ اگر دوسری صورت ہے جس میں چیز آگے پہنچانے والا/ٹرانسپورٹر، خریدار کا وکیل ہوتا ہے تو اس صورت

میں اگر چیز راستے میں ضائع ہو گئی تو اس کا ذمہ دار خریدار ہو گا۔

ج- اگر تیسری صورت ہو، یعنی فریقین نے آپس میں کوئی طے نہیں کیا کہ چیز پہنچانے والا کس کا وکیل ہو گا، یہ بھی طے نہ ہوا کہ راستے کا ضمان کون برداشت کرے گا تو اس سلسلے میں بعض علماء کی رائے تو یہ ہے کہ راستے کا رسک فروخت کنندہ کے ذمہ ہو گا، کیونکہ چیز پہنچانے والا اسی کا وکیل ہے، البتہ شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ ایسی صورت میں وہاں کے تاجروں کا عرف دیکھا جائے گا اور اسی کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ حضرت فرماتے ہیں کہ آج کل کا عرف یہ ہے کہ اگر لوکل معاملہ ہے، ایک ہی ملک کے دو شہر والوں کا معاملہ ہے اور چیز ڈاک کے ذریعے بھیجی جائے تو راستے کا رسک اور ضمان عموماً فروخت کنندہ کا ہوتا ہے، لہذا وہی ضامن ہو گا اور اگر بین الاقوامی معاملہ ہے، دو ملک والوں کا معاملہ ہے اور چیز شپ اور بحری جہاز وغیرہ کے ذریعے بھیجی جائے تو راستے کا ضمان عموماً آپس میں باقاعدہ طے ہوتا ہے، اگر تصریح نہ ہو تو پھر خریدار راستے کا رسک برداشت کرے گا، یہی عرف ہے۔ اسی کے مطابق عمل ہو گا۔

چوتھا مسئلہ: ٹرانسپورٹر سے نقصان لینا

چوتھا اہم مسئلہ یہ ہے کہ اگر بیچی جانے والی چیز ڈیلیوری والے/ڈاکیہ یا شپنگ کمپنی کے قبضہ میں ہی ضائع ہو گئی تو کیا اس کا نقصان اس سے وصول کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چیز آگے پہنچانے والے کے پاس وہ چیز امانت کے حکم میں ہوتی ہے، لہذا اگر اس کی کوتاہی یا غفلت و تعدی سے چیز ضائع ہو گئی یا چیز میں نقص پیدا ہو گیا تو وہ ذمہ دار ہو گا، لیکن اگر اس کے مکمل احتیاط کے باوجود اس کی غفلت و کوتاہی کے بغیر نقصان ہو گیا یا چیز ضائع ہو گئی تو اس کا ذمہ دار ڈیلیوری والا/شپنگ کمپنی نہ ہو گی۔

آج کل ڈیلیوری والے/ٹرانسپورٹر کبھی کبھی اس چیز کا ضمان بھی قبول کرتے ہیں اور فروخت کنندہ سے کہتے ہیں کہ اگر چیز راستے میں ضائع ہو گئی تو ہم ذمہ دار ہوں گے۔ ایسی شرط لگانا بھی شرعاً جائز ہے اور چیز آگے پہنچانے والے اب راستے کا رسک برداشت کریں گے۔ اس کو فقہی اصطلاح میں یوں تعبیر کرتے ہیں کہ: وکالت بالاجرۃ میں وکیل پر ضمان کی شرط لگانا جائز ہے۔

چیز آگے پہنچانے والے یعنی ڈیلیوری والے/ٹرانسپورٹر اپنے عمل کے بدلے میں اجرت اور عوض وصول کر سکتے ہیں، یہ شرعاً جائز ہے۔

پانچواں مسئلہ: ڈیلیوری والے کے ہاتھ میں قیمت کی حیثیت

پانچواں اہم مسئلہ یہ ہے کہ جب چیز آگے پہنچانے والا شخص یا ادارہ وہ چیز خریدار کے حوالے کر دے اور خریدار

سے اس چیز کی قیمت وصول کرلے جو فروخت کنندہ کو پہنچانی ہوتی ہے، تو ایسی رقم کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ بالفاظ دیگر اگر یہ رقم ڈلیوری والے کے قبضہ میں ضائع ہو گئی یا چوری ہو گئی تو کیا وہ ذمہ دار ہو گا یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اصولاً تو یہ رقم امانت کے حکم میں ہے، لیکن عموماً اس رقم کو ڈلیوری والے اپنی رقوم کے ساتھ ملا لیتے ہیں، اس لیے اس کی حیثیت قرض کی بن جاتی ہے، لہٰذا اگر یہ رقم ان سے ضائع ہو گی تو وہ ذمہ دار ہوں گے، کیونکہ قرض کی ادائیگی بہر صورت واجب ہوتی ہے، اگرچہ وہ ضائع ہو جائے۔

چھٹا مسئلہ: ڈلیوری کا طریقہ کار

بسا اوقات کمپنی کسی دوسرے شہر یا ملک سے مال منگواتی ہے یا اپنی پروڈکٹس دوسری جگہ بھیجتی ہے، اس سلسلے میں ڈلیوری سے متعلق دو باتیں اہم ہیں:

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ ڈلیوری یعنی مال پہنچانے اور راستے کے اخراجات کس کے ذمے ہوں گے؟

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب تک مال راستے میں ہے اور خریدار کے پاس نہیں پہنچا، کیا خریدار اس کو آگے فروخت کر سکتا ہے یا نہیں؟

ان دونوں باتوں کا جواب یہ ہے کہ آج کل مال بھیجنے کے مختلف طریقے رائج ہیں، جن میں باقاعدہ وضاحت ہوتی ہے، لہٰذا اگر فروخت کنندہ اور خریدار کے درمیان باقاعدہ وضاحت کے ساتھ ان میں سے کوئی طریقہ متعین طور پر بیان کیا گیا ہو تو اس سے یہ بات بھی طے ہو جائے گی کہ راستے کے اخراجات اور ضمان فروخت کنندہ کا ہے یا خریدار کا ہے۔

انٹرنیشنل چیمبر آف کامرس نے ۱۹۳۶ء میں کچھ اصطلاحات (Intoterms) طے کی ہیں، جو بنیادی طور پر تین نکات کی وضاحت کرتی ہیں:

۱- خرچہ (costs): شپمنٹ کا خرچہ کس کے ذمہ ہو گا؟

۲- ملکیت (control) شپمنٹ کے دوران سامان کس کی ملکیت میں ہو گا؟

۳- ذمہ داری (liability) اگر راستے میں سامان کو نقصان ہو جائے تو کون ذمہ دار ہو گا؟

کچھ مشہور اصطلاحات کی وضاحت ذیل میں ہے:

1-(EXW): اس اصطلاح کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فروخت کنندہ اسی موقع پر مال، خریدار کے حوالے کر دے گا۔ یہ صورت تب ہی ممکن ہے جب خریدار اور فروخت کنندہ ایک دوسرے کے قریب ہوں۔ اس صورت میں نقل و حمل کے اخراجات اور راستے کا رسک و ضمان وغیرہ خریدار کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

2-(FCA): اس اصطلاح کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خریدار، فروخت کنندہ کے لیے کوئی جگہ یا کمپنی متعین کرلیتا ہے کہ مال وہاں تک پہنچادیا جائے۔ اس صورت میں اس مکان یا متعین شپنگ کمپنی تک مال پہنچانا فروخت کنندہ کی ذمہ داری ہوتی ہے، اس سے آگے کے خرچہ اور ضمان وغیرہ خریدار کے ذمہ ہوتا ہے۔

3-(FAS): اس کا مطلب یہ ہے کہ خریدار خود ہی کسی شپنگ کمپنی یا بحری جہاز سے بات کرکے پھر فروخت کنندہ کو کہتا ہے کہ مال فلاں کمپنی یا جہاز تک پہنچادیا جائے۔ اس میں فروخت کنندہ کی ذمہ داری صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ متعین کمپنی یا جہاز کے بندرگاہ تک مال پہنچادے، اس سے آگے کے کام جیسے مال کی شپمنٹ وغیرہ اور راستے کا ضمان وغیرہ سے فروخت کنندہ بری ہوتا ہے۔

4-(FOB): اس طریقہ میں خریدار خود کسی شپنگ کمپنی سے بات کرتا ہے یا فروخت کنندہ کو بات کرنے کا اختیار دے دیتا ہے، اس میں بھی راستے کا کرایہ، مصارف اور ضمان خریدار کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

5-(C and F): اس میں راستے کا کرایہ اور اخراجات فروخت کنندہ ادا کرتا ہے، لیکن راستے کا ضمان تاجروں کے عرف میں خریدار کا سمجھا جاتا ہے، لہذا یہ عرف بھی معتبر ہے۔

6-(CPT): یہ طریقہ اور پانچواں طریقہ ایک جیسے ہیں، البتہ صرف یہ فرق ہے کہ (CandF) کی اصطلاح وہاں استعمال ہوتی ہے جہاں مال پہنچانے کا ذریعہ بحری جہاز ہو، جبکہ یہ (CPT) کی اصطلاح عام ہے، یہ ہر جگہ استعمال ہوتی ہے، خواہ مال پہنچانے کا ذریعہ ہوائی جہاز ہو، گاڑی ہو یا کوئی اور وسیلہ۔

7-(C.I.F): اس میں بقیہ تفصیل تو پانچویں طریقے (C and F) کی طرح ہی ہوتی ہے، البتہ فروخت کنندہ اپنے خریدار کے لیے مال کا بیمہ کرادیتا ہے اور بیمہ کمپنی راستے کا ضمان برداشت کرتی ہے۔

یہ تمام طریقے شرعاً ناجائز نہیں ہیں، البتہ ساتویں طریقے میں چونکہ بیمہ کرایا جاتا ہے اور آج کل بیمہ کا طریقہ شرعی اعتبار سے درست نہیں ہے، اس لیے اس سے بچنا ضروری ہے۔[1]

ارسال بھیجنے کے معروف طریقوں میں سے کسی خاص طریقے کی وضاحت نہ ہوئی اور نہ ہی الگ سے ان باتوں کی وضاحت ہوئی ہو تو ایسی صورت میں اگر خریدار نے فروخت کنندہ کے لیے کسی گاڑی، بحری جہاز یا نقل و حمل کی کسی کمپنی کو

[1] فقہ البیوع ۲/ ۱۰۵۹

ان کے علاوہ کچھ مزید اصطلاحات بھی ہیں، جیسے DAF,DES,DEQ,DDP,DDQ وغیرہ، ان کی تفصیلات کے لیے انسائیکلوپیڈیا ملاحظہ کرلیں۔

متعین کر کے بتادیا کہ اس کے ذریعے مجھے مال بھیج دیا جائے تو راستے کا ضمان خریدار کا ہوگا، اور گاڑی یا بحری جہاز اس کا وکیل سمجھا جائے گا۔ اگر خریدار نے متعین کر کے نہیں بتایا، بلکہ فروخت کنندہ کو عام اجازت دے دی کہ جس ذریعے سے بھی چاہے بھیج دے تو بھی شپنگ کمپنی/ٹرانسپورٹ کمپنی خریدار ہی کی وکیل ہوگی اور راستے کا ضمان اسی کے ذمہ ہوگا۔

جہاں تک دوسرے مسئلہ کا تعلق ہے کہ خریدی ہوئی چیز اگر ابھی تک خریدار کے ہاتھ میں نہیں آئی تو کیا وہ اس سے پہلے اس چیز کو آگے کسی اور کو فروخت کر سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سابقہ مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے دیکھا جائے گا کہ ڈیلیوری والا کس کا وکیل ہے؟ یا راستے کا رسک اور ضمان کس کے ذمہ ہے؟ اگر راستے کا ضمان خریدار کے ذمے ہو تو اس صورت میں ٹرانسپورٹ کمپنی خریدار کی وکیل (ایجنٹ) سمجھی جائے گی اور جب ٹرانسپورٹ کمپنی مال وصول کرلے تو خریدار کے لیے اس مال کو آگے بیچنا جائز ہوگا، اگرچہ ابھی تک مال راستے میں ہو۔ اور اگر راستے کا رسک فروخت کنندہ کا ہے اور ڈیلیوری والا اسی کا وکیل ہے تو اب خریدار اس چیز کو اس وقت تک آگے فروخت نہیں کر سکتا، جب تک چیز خریدار یا اس کے نائب کے قبضہ میں نہ آجائے۔

لہذا اگر لوکل معاملہ ہے تو ایسی صورت میں چونکہ ڈاکیہ، فروخت کنندہ کا وکیل ہوتا ہے، اس لیے خریدار اس وقت تک چیز آگے کسی اور کو نہیں بیچ سکتا، جب تک اس چیز پر قبضہ نہ کرلے۔ اور اگر بین الاقوامی معاملہ ہے تو چونکہ شپنگ کمپنی/ٹرانسپورٹ کمپنی کو عرف میں خریدار کا وکیل سمجھا جاتا ہے، اس لیے اس کمپنی کا قبضہ ہی خریدار کا قبضہ سمجھا جائے گا اور خریدار اس مال کو آنے سے پہلے ہی کسی اور پر فروخت کر سکتا ہے۔ لیکن اس خریدار سے جس شخص نے ایسا مال خرید لیا جو مال ابھی تک راستے میں ہے، دوسرا خریدار اس مال کو اس وقت تک کسی اور پر نہیں بیچ سکتا، جب تک مال پر قبضہ نہ کرلے، کیونکہ شپنگ کمپنی/ٹرانسپورٹ کمپنی پہلے اور اصل خریدار کی وکیل ہے، دوسرے خریدار کی وکیل نہیں ہے۔ اس لیے آج کل جو ایکسپورٹ امپورٹ میں مال پہنچنے سے پہلے ہی اسے کئی ہاتھوں میں بیچ دیا جاتا ہے، یہ شرعاً جائز نہیں ہے، ان میں زیادہ سے زیادہ پہلی بیع درست ہوگی۔[1]

[1] فقه البيوع ۱۰۸۹/۲

نیٹ ورک مارکیٹنگ کی شرعی حیثیت

(Network Marketing/MLM)

اس مضمون کا کچھ حصہ میگزین ''شریعہ اینڈ بزنس'' میں شائع ہو چکا ہے۔اس مختصر مضمون میں نیٹ ورک مارکیٹنگ/ملٹی لیول مارکیٹنگ کے بارے میں مندرجہ ذیل اہم نکات پر روشنی ڈالی جائے گی:

- تعارف
- خصوصیات
- اصولی باتیں
- نیٹ ورک مارکیٹنگ کی شرعی حیثیت

تعارف

آج کل کچھ کمپنیوں نے یہ طریقہ ایجاد کیا ہے کہ لوگوں کو اپنی مصنوعات بیچ کر ان کو ممبر شپ فراہم کرتی ہیں اور ممبر بنانے کے بعد انہیں یہ حق دیا جاتا ہے کہ وہ کمپنی کے لیے مزید ممبر بنائے۔لہذا لوگ ایسی کمپنیوں کے ممبر بن کر ان کے لیے مزید ممبر تلاش کرتے ہیں اور ایک خاص تعداد میں ممبر بنانے پر کمپنی سے انعام کی صورت میں کمیشن وغیرہ وصول کرتے ہیں۔ ممبر بنانے کا یہ سلسلہ ایک جال کی طرح پھیلتا رہتا ہے اور جس کے واسطے سے زیادہ ممبر بنتے ہیں، اس کو سب سے زیادہ کمیشن ملتا ہے۔اسی لیے اس کو پرامیڈ اسکیم(pyramid scheme) بھی کہتے ہیں، کیونکہ پرامیڈ ''مخروطی'' شکل کو کہتے ہیں جس کا ایک سرا ہوتا ہے اور اس سے نیچے مزید شاخیں پھیلتی رہتی ہیں۔ عربی میں اس کو "الطريقة الهرمية" کہتے ہیں۔

اس کی تعریف یوں کی جاتی ہے:

توظيف قوة تسويقية بيعية تتكون من مجموعة من الزبائن، تقوم بالترويج لمنتجات الشركة بمقابل مادي متصاعد۔[1]

سیلز مارکیٹنگ کی ایسی قوت کا استعمال جو گاہکوں کے ایک گروپ پر مشتمل ہوتی ہے اور وہ گروپ

[1] تحليل نظام التسويق الشبكي في إطار رؤية اقتصادية إسلامية، ص: ٥٢٧

مالیاتی منافع میں اضافے کی خاطر کمپنی کی مصنوعات کو فروغ دیتے اور تشہیر کرتے ہیں۔

اس طریقہ کار کو انگریزی میں نیٹ ورک مارکیٹنگ (network marketing) اور ملٹی لیول مارکیٹنگ (multi-level marketing) کہتے ہیں۔ عربی میں اس کو "التسويق الشبكي/شبكة التسويق" کہتے ہیں۔

نیٹ ورک مارکیٹنگ کے طریقہ کار کو اپنانے والی پہلی کمپنی (california vitamins) کیلیفورنیا وٹامنز، کے نام سے ایک کمپنی تھی۔ یہ کمپنی ۱۹۵۴ء میں ریاستہائے متحدہ امریکہ میں وجود میں آئی تھی، جہاں اس نے کاسمیٹکس اور کھانے پینے کی اشیاء کی فراہمی کا سلسلہ شروع کیا تھا۔[1]

نیٹ ورک مارکیٹنگ کی مختلف شکلیں رائج ہیں، جن میں سے چند اہم مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ پونزی اسکیم (Ponzi Scheme)

اس کو عربی میں "النظام البنزي" کہتے ہیں۔ اس کے بارے میں آتا ہے کہ یہ طریقہ چارلس پونزی (Charles Ponzi) نامی ایک اطالوی نے شروع کیا تھا جو انیسویں صدی کے آخر سے بیسویں صدی کے آغاز تک امریکہ میں تھا۔ یہ سرمایہ کاری کی شکل میں ایک بڑا دھوکہ دہی کا نظام تھا۔ اس کے نتیجے میں اس پر کئی بار مقدمہ چلا اور اسے امریکہ سے جلاوطن کر دیا گیا۔

اس طریقہ کار کی بنیاد یہ ہے کہ سرمایہ کاری کے خواہشمند افراد کا پیسہ اکٹھا کیا جائے اور تھوڑی ہی مدت میں ان کو اعلیٰ منافع کی فراہمی کا وعدہ کیا جائے۔ اس نظام میں اکٹھے کیے گئے پیسوں سے کوئی کاروبار وغیرہ نہیں کیا جاتا، بلکہ سرمایہ کاری کرنے والوں کو جو منافع ادا کیا جاتا ہے وہ درحقیقت خود سرمایہ کاروں ہی کی رقم ہوتی ہے، یا ان کے بعد شریک ہونے والے شرکاء کی رقم ہوتی ہے۔ اس کا انجام فراڈ اور دھوکہ ہوتا ہے۔

۲۔ پرامڈ اسکیم (Pyramid Scheme)

یہ ایک غیر مستحکم کاروباری ماڈل ہے۔ اس کا آغاز اہرامی اور مخروطی شکل میں کسی فرد یا کمپنی سے ہوتا ہے اور نئے شرکاء سے سرمایہ جمع کرکے ان کو مزید نئے شرکاء لانے کی ترغیب اور ٹریننگ دی جاتی ہے اور اس پر ان کو نفع دیا جاتا ہے۔ اس میں مصنوعات کو بھی بطور نام شامل کر لیا جاتا ہے، لیکن بڑا مقصد نئے شرکاء/صارفین کو لانا ہوتا ہے، اور اسی وجہ سے اس نظام کو اہرام کہا جاتا ہے، کیونکہ پچھلے شرکاء کے تحت نئے خریدار شامل کیے جاتے ہیں۔

[1] التسويق مفاهيم معاصرة، ص٢٤

۳۔ بائنری سسٹم(Binary System)

اس کو عربی میں "النظــام الثنــائی" کہتے ہیں۔ یہ بھی در حقیقت پرامڈ اسکیم ہی کی ذیلی قسم ہے جس میں ممبر کے لیے دائیں طرف اور بائیں طرف کا توازن حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً اگر آپ کو چھ افراد شامل کرنا مطلوب ہوتا ہے تو اس کے لیے دائیں جانب تین اور بائیں طرف تین ہونا ضروری ہیں۔ اس صورت میں اگر ممبر ایک شخص کو دائیں طرف اور چھ افراد بائیں جانب لائے تو اسے کچھ حاصل نہیں ہوگا، کیونکہ اس نے مطلوبہ توازن حاصل نہیں کیا۔

۴۔ میٹرکس سسٹم(Matrix System)

اس طریقہ کو عربی میں "نظام المصفوفة" کہتے ہیں۔ یہ بھی پرامڈ اسکیم کی ایک آسان قسم ہے۔ اس میں نئے بنائے جانے والے ممبرز کی تعداد محدود ہوتی ہے اور اس کے مختلف پیکجز ہوتے ہیں۔(جیسے 5x7, 3x9, 3x7, 2x12, 4x7 وغیرہ) اس طریقہ کار میں بنیادی طور پر محدود لسٹ کو مکمل کرنا ہوتا ہے، خواہ اس لسٹ کو بلاواسطہ خود ہی مکمل کیا جائے، یا آپ ایک، دو ممبرز بنالیں اور بقیہ لسٹ ان ممبرز کے واسطہ سے مکمل کرلی جائے۔ جب آپ ممبر بن کر ایک محدود لسٹ تک نئے ممبرز بنالیتے ہیں تو میٹرکس بند ہوجاتا ہے اور اس کے بعد نئے ممبرز اپنے نیچے مزید لوگوں کو شامل کرتے ہیں اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ آپ کے واسطے سے جتنے بھی ممبرز کا اضافہ ہوتا ہے، اس کا فائدہ آپ کو ملتا رہتا ہے۔

۵۔ مرحلہ وار نظام(Stair-step break-away System)

اس طریقہ کار کو عربی میں "نظام الانفصال" کہتے ہیں۔ یہ طریقہ کار بھی اسی نیٹ ورک مارکیٹنگ کے طریقہ کار جیسا ہے، اس میں بھی مصنوعات کو بیشتر لوگوں کو فروخت کرنا ہوتا ہے اور انہیں مصنوعات آگے فروخت کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے اور نیٹ ورک میں داخل ہونے والے ہر فرد کو کمیشن دیا جاتا ہے، لیکن جب ممبر کا نیٹ ورک فروخت کی ایک خاص مقدار تک پہنچ جاتا ہے اور افراد کی ایک خاص تعداد پوری ہوجاتی ہے تو ہر ممبر اپنے گروپ یا نیٹ ورک سے الگ ہوجاتا ہے اور اس کے بعد کسی نئے یونٹ، یا نیٹ ورک میں نئے لوگوں کی شمولیت پر اسے کوئی کمیشن ادا نہیں کیا جاتا ہے، البتہ اختتام میں اسے ایک حتمی کمیشن دیا جاتا ہے۔[1]

خصوصیات

۱۔ ان کمپنیوں کی نمایاں خصوصیت تو یہی ہے کہ ان کا ممبر بننے کے بعد مزید لوگوں کو کمپنی کا ممبر بنانا ہوتا ہے اور

(1) https://www.aliftaa.jo/Research.aspx?ResearchId=102#.X9Wud9gzblV

اس پر کمپنی سے کمیشن وصول کیا جاتا ہے۔

۲۔ اکثر کمپنیاں ایسی ہیں کہ ان کا ممبر بننے کے لیے باقاعدہ یہ شرط ہے کہ پہلے ان کمپنیوں کی کچھ مصنوعات (products) خریدنی پڑتی ہیں، جن کی کوالٹی انتہائی کمزور اور قیمت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ایسی مصنوعات عام مارکیٹ میں نہیں بیچی جاتی، بلکہ بعض کمپنیوں کی طرف سے ان کی مصنوعات کو عام مارکیٹ میں لے جانا ممنوع بھی ہے۔

۳۔ ایسی کمپنیوں کے ممبرز کا بنیادی مقصد کمپنی کی مصنوعات کو خریدنا نہیں ہوتا، بلکہ کمپنی کا ممبر بن کر اس نظام کا حصہ بننا اور لوگوں کو کمپنی کا ممبر بنا کر اس پر کمیشن لینا ہوتا ہے۔ ایسے ممبرز کو مجبورا (ممبر بننے کے لیے) کمپنی کی مصنوعات بھی مہنگے داموں خریدنی پڑتی ہیں، جس قیمت پر کوئی خریدار ملنا ناممکن ہوتا ہے۔ اسی لیے ایسی کمپنیوں کی خاصیات میں یہ بھی ہے کہ ان کی مصنوعات استعمال کرنے والے عام لوگ نہیں ہوتے، بلکہ ان کے ممبرز ہی کمپنی کی مصنوعات استعمال کرتے ہیں، کیونکہ ان کو کوئی خریدار نہیں ملتا۔

۴۔ عموما براہ راست کوئی بھی ایسی کمپنی کا ممبر نہیں بن سکتا، بلکہ ہر نئے ممبر کے لیے لازم ہوتا ہے کہ وہ کسی پرانے ممبر کے واسطہ سے کمپنی کا ممبر بنے، تاکہ اسے فائدہ ہو اور کمپنی کی طرف سے کمیشن حاصل کرے۔

۵۔ کوئی بھی ممبر جب نئے لوگوں کو ممبر بناتا ہے تو مرحلہ وار یہ سلسلہ بہت آگے تک چلا جاتا ہے، مثال کے طور پر اگر پہلے مرحلہ میں دو ممبر بنے، پھر ہر ایک نے دو دو لوگوں کو ممبر بنایا تو دوسرے مرحلہ میں چار ہو گئے۔ پھر ہر ایک نے دو دو ممبر بنائے تو تیسرے مرحلہ میں آٹھ ہو گئے۔ پھر ہر ایک نے دو دو ممبر بنائے تو چوتھے مرحلہ میں ممبروں کی تعداد سولہ تک پہنچ گئی۔ پہلے ممبر نے صرف دو ممبر خود بنائے تھے، لیکن اس کو دوسرے تیسرے اور چوتھے مراحل میں بنے ہوئے سولہ ممبروں کی خریداری تک کا کمیشن ملتا رہے گا اور یہ سلسلہ آگے بھی بڑھے گا، البتہ کمپنی کی طرف سے اس کی خاص حد بھی مقرر کی جاتی ہے۔

۶۔ کچھ کمپنیاں ایسی ہیں جن کی ممبر شپ کو برقرار رکھنے کے لیے سالانہ فیس بھی اداء کرنی پڑتی ہے۔

۷۔ کچھ کمپنیوں کا کہنا ہے کہ مصنوعات کی تشہیر (advertise) پر کافی اخراجات آتے ہیں، اس لیے کمپنی کی کوشش ہے کہ جو رقم تشہیر پر خرچ ہوتی ہے، وہ اس کے بجائے خود گاہکوں (ممبروں) کو دی جائے، اس لیے ممبران کو کمیشن دیا جاتا ہے، لیکن یہ خلاف حقیقت ہے، کیونکہ ایسی کمپنیاں تشہیر کے لیے لٹریچر وغیرہ چھاپتی ہیں اور مختلف قسم کے سیمینارز بھی کرواتی ہیں۔

اصولی باتیں

نیٹ ورک مارکیٹنگ کی شرعی حیثیت معلوم کرنے سے پہلے بطورِ تمہید چند اصولی باتیں سمجھنا ضروری ہیں:

۱۔ شریعت میں "صفقة في صفقة" ممنوع ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دو معاملات/عقود کو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مشروط کرنا کہ اگر ایک معاملہ وجود میں آئے گا، تو دوسرا بھی وجود میں آئے گا۔ اور اگر پہلا معاملہ وجود میں نہیں آئے گا تو دوسرا بھی وجود میں نہیں آئے گا۔ مثلاً کسی کو مزدور رکھنے (اجارہ) کے لیے یہ شرط عائد کرنا کہ وہ پہلے مالک سے کوئی خاص چیز خریدے گا۔ یہاں دو معاملات (اجارہ اور بیع) کو ایک دوسرے پر مشروط کیا گیا ہے۔

۲۔ رشوت لینا یا دینا شرعاً ممنوع ہے۔ رشوت کا مطلب یہ ہے کہ کسی سے بلا عوض، اپنے فرائضِ منصبی پر رقم لی جائے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی کا اجیر/مزدور بننا چاہتا ہے تو مالک کو اختیار ہے کہ اسے مزدور رکھے یا نہ رکھے، لیکن اسے مزدوری پر رکھنے کے لیے اس سے کسی قسم کی رقم/فیس کا مطالبہ کرنا رشوت ہے جو کہ جائز نہیں ہے۔

رشوت کی تعریف یوں کی جاتی ہے:

هو ما يؤخذ عمّا وجب على الشخص.[۱]

انسان پر واجب ذمہ داری کے بدلے جو اضافی رقم لی جائے۔

۳۔ قمار اور جوا بھی شرعاً ممنوع اور حرام ہے۔ قمار کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی رقم اس طرح داؤ پر لگائے جس میں نفع کا بھی امکان ہو کہ داؤ پر لگی ہوئی رقم اپنے ساتھ مزید رقم لے آئے گی اور اس میں نقصان کا بھی امکان ہو کہ جو رقم داؤ پر لگی ہے وہ بھی ضائع ہو جائے۔

أخذ مال الإنسان وهو على مخاطرة، هل يحصل له عوضه أو لا يحصل.[۲]

۴۔ انسان کسی بھی قسم کے نفع کا مستحق تب ہوتا ہے جب اس نے مال خرچ کیا یا لگایا ہو، یا کوئی عمل کیا ہو یا کسی چیز کا رسک/ضمان برداشت کر رہا ہو۔ اگر کسی شخص نے ان تین میں سے کوئی بھی کام نہیں کیا تو وہ نفع کا مستحق نہیں ہوتا۔ اس اصول کو فقہاء نے یوں لکھا ہے:

والأصل أن الربح إنما يستحق عندنا إما بالمال، وإما بالعمل، وإما بالضمان.[۳]

---

[۱] كشاف اصطلاحات الفنون والعلوم ۱/ ۸٦٥

[۲] فقه المعاملات ۳/ ۱۲۸

[۳] بدائع الصنائع ٦/ ٦۲

نیٹ ورک مارکیٹنگ کی شرعی حیثیت

نیٹ ورک مارکیٹنگ کے طریقہ کار میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کئی قسم کی شرعی خرابیاں ہیں اور فقہی اعتبار سے یہ طریقہ کار شرعی اصولوں کے خلاف اور ناجائز ہے۔اس کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔اس طریقہ کار میں پہلی خرابی "صفقة في صفقة" کی ہے۔اس کی وضاحت یہ ہے کہ نیٹ ورک مارکیٹنگ کے اکثر کمپنیوں کے طریقہ کار میں یہ ہوتا ہے کہ ہر نئے شامل ہونے والے ممبر پر یہ شرط عائد کی جاتی ہے کہ وہ ایک مخصوص مقدار میں کمپنی کی مصنوعات خریدے گا تو اس کے بعد ہی وہ کمپنی کا ممبر بن کر دوسرے لوگوں کو کمپنی کا ممبر بنا سکے گا اور اس پر کمپنی سے کمیشن حاصل کر سکے گا۔لہذا یہاں دو معاملات کو ایک دوسرے پر مشروط کیا گیا ہے۔ایک معاملہ مصنوعات کی خریداری کا ہے اور دوسرا معاملہ کمپنی کا ممبر (سمسار/دلال) بننے کا ہے۔دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مشروط کیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ وہ کمپنی کی مصنوعات نہ خریدے اور صرف کمپنی کا ممبر (سمسار) بن کر نئے ممبرز کو کمپنی کے نیٹ ورک میں شام کر کے اس پر کمپنی سے کمیشن وصول کرے تو عموماً کمپنی ایسا نہیں کرتی، بلکہ ممبر کو کچھ مصنوعات ہر صورت خریدنی ہوتی ہے۔

۲۔اس طریقہ کار میں دوسری خرابی قمار (جوا) کی ہے۔وہ اس طرح کہ جو شخص کمپنی کا ممبر بننا چاہتا ہے، اس کو کمپنی اپنی مصنوعات مہنگی قیمت پر فروخت کرتی ہے۔یہ مصنوعات کوالٹی کے اعتبار سے بہت کم، جبکہ قیمت کے لحاظ سے بہت مہنگی ہوتی ہیں۔اسی لیے ممبر کو یہ مصنوعات عموماً خود ہی استعمال کرنی پڑتی ہیں، دوسرے لوگ اس قیمت پر یہ مصنوعات نہیں خریدتے۔ممبران مصنوعات کی عام مارکیٹ سے زیادہ قیمت اس لالچ میں ادا کرتا ہے کہ وہ کمپنی کا ممبر بن کر نئے ممبر بنائے گا اور اس پر کمپنی سے کمیشن لے کر نفع کمائے گا۔اس میں مصنوعات کی جو اضافی رقم ممبر کو دینی پڑتی ہے وہ درحقیقت داؤ پر لگ گئی ہے کہ ممبر اگر مزید لوگوں کو شامل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو ممکن ہے کہ مہنگی مصنوعات کی خریداری پر جو رقم دینی پڑی ہے، اس سے زیادہ رقم کما لے گا اور اگر ممبر اس میں ناکام ہو جاتا ہے تو اس نے مصنوعات پر جو رقم لگائی تھی، وہ بھی ضائع ہو جائے گی۔یہی قمار اور جوا کی حقیقت ہے۔

واضح رہے کہ اگر پہلی خرابی (صفقة في صفقة) نہ بھی ہو، اور مصنوعات کی خریداری کو بالکل الگ اور کمپنی کا ممبر بننا بالکل الگ معاملہ ہو تو بھی اس میں قمار/جوا کی یہ خرابی بہر صورت پائی جاتی ہے۔

۳۔پہلی دونوں خرابیوں کے ساتھ ساتھ اس نظام میں تیسری خرابی غرر اور جہالت کی ہے۔اگر کمپنی کا ممبر بننا، کمپنی کی مصنوعات کی خریداری پر مشروط نہ بھی ہو تو ایسی صورت میں یہ معاملہ فقہی اعتبار سے سمسار/دلال کا ہے اور اس

میں کمپنی کی طرف سے ایسی شرائط عائد ہوتی ہیں جن کی وجہ سے اس میں غرر/ جہالت کا عنصر شامل ہو جاتا ہے اور یہ معاملہ خراب ہو جاتا ہے۔ مثلاً کمپنی کی طرف سے ممبر کو کمیشن ملنا ایک خاص تعداد پر منحصر ہوتا ہے کہ اگر ممبر ایک خاص تعداد میں نئے لوگوں کو ممبر بنائے گا تو تب ہی اسے کمپنی کی طرف سے کمیشن ملتا ہے، اگر وہ اس میں ناکام ہو جاتا ہے اور اس تعداد سے کم لوگوں کو ممبر بنا پاتا ہے تو اسے کوئی کمیشن نہیں ملتا۔ یہی جہالت فاحشہ اور غرر ہے کہ ممبر کی اجرت/ کمیشن مجہول ہے، یہ معلوم نہیں کہ اسے کمیشن ملے گا یا نہیں؟ اگر ملے گا تو کتنا ملے گا؟ اس وجہ سے یہ معاملہ شرعی اعتبار سے فاسد ہے۔

۴۔ اس نظام میں ایک خرابی "رشوت" کی بھی ہے۔ وہ اس طرح کہ کچھ طریقوں میں ممبر سے سالانہ یا ماہانہ فیس بھی لی جاتی ہے، یا نئے بننے والے ممبرز سے رجسٹریشن کے نام پر فیس وصول کر کے ان کو کمپنی کا ممبر بنایا جاتا ہے۔ یہ فیس در حقیقت رشوت کے زمرے میں آتی ہے جو کہ جائز نہیں ہے، کیونکہ کمپنی کا ممبر بن کر اس کے لیے نئے ممبر تلاش کرنا ایک قسم کا اجارہ/ یا سمسار کا عقد ہے اور اس طرح کسی کو مزدور رکھنے یا اپنا ایجنٹ/ ممبر بنانے پر اس سے فیس لینے کا شرعاً کوئی جواز موجود نہیں ہے، بلکہ یہ رشوت ہے جو کہ جائز نہیں ہے۔

۵۔ اصولی باتوں کے ضمن میں ہم نے چوتھا اصول یہ بیان کیا تھا کہ انسان یا تو اپنا مال لگا کر، یا عمل کر کے یا کسی چیز کا رسک/ ضمان برداشت کر کے ہی نفع کما سکتا ہے۔ اگر کسی شخص نے نہ کسی کاروبار میں مال لگایا ہے یا عمل کیا ہے اور نہ کسی چیز کا رسک برداشت کر رہا ہے، اس کے باوجود وہ نفع کما رہا ہے تو یہ نفع جائز نہیں ہے، اس کو دوسرے الفاظ میں "ربح مالم یضمن" بھی کہتے ہیں۔

اس نظام میں یہ خرابی ہے کہ جب شروع میں کوئی ممبر کچھ نئے لوگوں کو شامل کر لیتا ہے تو اس کے بعد نئے ممبرز کوشش کر کے مزید اپنے نیچے اور لوگوں کو ممبر بناتے ہیں اور جتنے بھی نئے لوگ ممبر بنتے ہیں، اس پر سب سے اوپر سطح والے ممبر کو نفع ملتا رہتا ہے، حالانکہ اس نے تھوڑا سا عمل کر کے اس پر کمپنی سے کمیشن بھی وصول کر لیا ہے، اب مزید لوگوں کے شامل ہونے میں اس کا کوئی عمل شامل نہیں ہے، لہٰذا اسے بلا کسی عوض کے نفع مل رہا ہے جو کہ درست نہیں ہے۔

یہ وہ بنیادی خرابیاں ہیں، جن کی وجہ سے نیٹ ورک مارکیٹنگ کی اکثر صورتیں شرعی طور پر ٹھیک نہیں ہیں۔ ان کے علاوہ یہ نظام پورا جھوٹ، دھوکہ اور فراڈ پر مبنی ہوتا ہے، اس میں دولت کی غیر منصفانہ تقسیم اور ارتکاز دولت جیسی معاشی خرابیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایس ای سی پی (SECP) نے کئی بار اس قسم کے طریقوں سے بچنے کی تاکید کی ہے۔

اس طریقہ کار کو عرب و عجم کے علماء نے ناجائز قرار دیا ہے، چنانچہ دار الافتاء اردن نے فتویٰ نمبر (۱۹۹۵) میں اس

کو ناجائز لکھاہے۔اس کے علاوہ دار الافتاء مصر، لجنۃ دائمۃ للافتاء سعودیہ، دار الافتاء فلسطین اور دیگر عرب علماء نے بھی اس کو ناجائز لکھاہے۔ مجمع الفقہ الاسلامی سوڈان نے بھی اس کے ناجائز ہونے پر فتوی جاری کیا ہے۔[1]

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے نیٹ ورک مارکیٹنگ کے بارے میں ایک فیصلے میں لکھاہے کہ:

۱۔ ملٹی لیول مارکیٹنگ (نیٹ ورک مارکیٹنگ) کی مروجہ شکلیں مختلف مفاسد کو شامل ہیں، اس میں دھوکہ، غرر، بیع کو ایک غیر متعلق چیز کے ساتھ مشروط کرنا، ایک معاملہ کو دو معاملوں سے مرکب بنادینا اور شبہ قمار وغیرہ خلاف شرع باتیں پائی جاتی ہیں اور خریداروں کا اصل مقصد سامان خرید کرنا نہیں ہوتا ہے، بلکہ غیر معمولی کمیشن حاصل کرنا ہوتا ہے، اس لیے اس میں شرکت کرنا جائز نہیں ہے۔

۲۔ چونکہ اس میں شرکت جائز نہیں ہے، اس لیے دوسروں کو اس میں شریک کرنا اور نیچے کے ممبروں کی وساطت سے کمیشن حاصل کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

۳۔ مسلمانوں کو اس طرح کے تمام کاروبار سے بچنا چاہیے، اور کسی بھی ایسی تجارت میں شامل نہیں ہونا چاہیے جو اسلام کے مقرر کیے ہوئے اصولِ تجارت سے متصادم ہو۔[2]

اس موضوع پر مزید تحقیق کے لیے مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کیا جاسکتا ہے:

۱-التسويق الشبكي والهرمي وأحكامه في الفقه الإسلامي، محمد بن عبدالعزيز بن سعد

۲-عقد التسويق الشبكي في ميزان الفقه الإسلامي دراسة تأصيلية فقهية مقارنة، إعداد دكتور مندي عبد الله محمود حجازي

۳-التسويق الشبكي من منظور الفقه الإسلامي، دراسة فقهية مقارنة، المغاوري محمد عبد الرحمن الفقي

۴-التسويق الشبكي من المنظور الفقهي، أسامة عمر الأشقر، مجلة الزرقاء للبحوث والدراسات - المجلد الثامن

(1) https://www.aliftaa.jo/Research.aspx?ResearchId=102#.X9XHBtgzb1U

(۲) نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے، ص: ۲۲۸

آن لائن تجارت کی شرعی حیثیت

(Drop Shipping)

اس مختصر مضمون میں آن لائن تجارت/خرید وفروخت کا مختصر تعارف اور بنیادی احکام بیان کیے جائیں گے۔اس مضمون کے بنیادی نکات یہ ہیں:

- تعارف
- آن لائن تجارت کی شرعی حیثیت
  - ۱۔ایجاب وقبول
  - ۲۔آن لائن تجارت کی بنیادی شرائط
  - ۳۔متبادل صورتیں
  - ۴۔ایمازون پر کاروبار

تعارف

سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کی وجہ سے عصرِ حاضر میں آن لائن تجارت کو کافی فروغ ملا ہے۔آن لائن دنیا میں متعدد طریقوں سے تجارت ہوتی ہے۔یہ تجارت انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی، کمپنیوں کے درمیان باہمی تجارت بھی جاری ہے تو عوام کے درمیان بھی،اور کمپنیوں اور عوام کے درمیان بھی آن لائن تجارتی سرگرمیاں جاری ہیں۔

آن لائن تجارت کو ای کامرس(e-commerce) اور ڈراپ شپنگ(drop shipping) کہتے ہیں۔علماء عرب نے اس تجارت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

هي عمليات الإعلان والتعريف للبضائع والخدمات، ثم تنفيذ عمليات عقد الصفقات وابرام العقود، ثم الشراء والبيع لتلك البضائع والخدمات، ثم سداد القيمة الشرائية عبر شبكات الاتصال المختلفة سواء الإنترنت أو غيرها من الشبكات التي تربط بين المشتري والبائع.[1]

[1] أساسيات ومفاهيم التجارة الإلكترونية، جمال نادر، ص:٦

اس طریقہ میں سامان اور خدمات کا اعلان اور تشہیر کی جاتی ہے، پھر سودوں پر عمل درآمد ہوتا ہے اور معاملات طے کیے جاتے ہیں، پھر ان سامان اور خدمات کی خرید وفروخت کی جاتی ہے، پھر مختلف مواصلاتی طریقوں کے ذریعے قیمت کی ادائیگی ہوتی ہے، خواہ وہ انٹرنیٹ کے طریقے ہوں یا دیگر مواصلاتی طریقے جو بائع اور خریدار کے درمیان رابطہ جوڑتے ہیں۔

اس طریقہ کا مختصر تعارف یہ ہے کہ بیچنے والا شخص کسی ویب سائٹ پر اپنا اسٹور بناتا ہے اور اس پر اپنی مصنوعات کی تصاویر اور دیگر معلومات دے دیتا ہے۔ یا اگر کوئی چاہے تو انفرادی سطح پر کسی ویب سائٹ کے توسط کے بغیر اپنی مصنوعات کی تصاویر اور معلومات کو اپنے سوشل میڈیا یا کسی اور پلیٹ فارم پر دے دیتا ہے۔ لوگ ایسی اشیاء کا وزٹ کر کے دیکھتے ہیں اور جس کو جو چیز پسند آجائے، اس پر کلک کر کے، اپنا پتہ وغیرہ کی تفصیلات دے کر آرڈر کنفرم کر دیتے ہیں۔ یا بیچنے والے کے ساتھ رابطہ کر کے بذریعہ میسج/ای میل یا بذریعہ فون کوئی چیز منگوا لیتے ہیں۔

ویب سائٹ یا اپنے پیج وغیرہ پر مصنوعات کی تصاویر دینے والے (بائع) کے پاس کبھی مصنوعات موجود ہوتی ہیں، کبھی اس کے پاس مصنوعات موجود نہیں ہوتی، بلکہ آرڈر کنفرم ہونے کے بعد ہی کسی جگہ سے مہیا کر کے کسٹمر کو بھیج دی جاتی ہیں۔ اسی طرح جب آرڈر لینے کے بعد کسی دوسری جگہ سے چیز مہیا کی جاتی ہے تو اس میں بھی کبھی چیز خرید کر، خود اس پر قبضہ کر کے کسٹمر کو روانہ کی جاتی ہے اور کبھی بیچنے والا آرڈر لے کر کسی دوسرے شخص سے رابطہ کر کے اسی کو چیز آگے بھیجنے کا آرڈر دے دیتا ہے۔

قیمت کی ادائیگی کبھی چیز کی وصولی کے بعد کی جاتی ہے، جسے سی او ڈی/ کیش آن ڈلیوری (cash on delivery) کہتے ہیں اور کبھی شروع میں ہی قیمت دے دی جاتی ہے، جسے ایڈوانس کیش یا کیش ود آرڈر (cash with order) کہتے ہیں۔ ایڈوانس کیش میں عموماً کریڈٹ کارڈ وغیرہ یا آن لائن بینکنگ یا ایزی پیسہ، جیز کیش وغیرہ کے طریقوں سے رقم بھیجی جاتی ہے۔

آن لائن تجارت میں جن دو لوگوں کے درمیان معاملہ ہوتا ہے، ان کے اغراض و مقاصد کو مد نظر رکھتے ہوئے اس معاملہ کو مختلف علامات اور نام دیے گئے ہیں، مثلاً:

1۔ (Business to Business/B2B): ایسی تجارتی سرگرمی جو دو بزنس اور کاروبار کرنے والوں یا دو کمپنیوں کے درمیان کسی آن لائن ویب سائٹ وغیرہ کے توسط سے طے ہو جائے۔

2۔ (Business to Customer/B2C): یہ آن لائن تجارت کا عام طریقہ ہے جس میں ایک کاروبار

کرنے والا یا کمپنی اور دوسرا کسٹمر اور چیز کو استعمال کی غرض سے خریدنے والا ہوتا ہے۔

3۔(Business to Government/B2G): ایسی تجارتی معاملہ جو بزنس و کاروبار کرنے والوں اور حکومت کے درمیان بذریعہ انٹرنیٹ طے پائے۔ مثلا حکومت کی طرف سے مختلف ٹینڈرز وغیرہ کا اعلان کسی ویب سائٹ وغیرہ پر کیا جاتا ہے اور مختلف لوگ / کمپنیاں ٹینڈر لینے کے لیے حکومت سے رابطہ کرتی ہیں۔

4۔(Government to Customer/G2C): ایسا تجارتی معاملہ جو حکومت اور عام افراد کے درمیان طے پائے۔ جیسے اشیاء کو نیلامی کی غرض سے کسی ویب سائٹ وغیرہ پر دے کر لوگوں کو بیچنا۔

5۔(Customer to Customer/C2C): یہ ایسے تجارتی معاملہ کو کہتے ہیں جس میں کوئی فریق کاروبار کرنے والا نہیں ہوتا، بلکہ عام کسٹمر اپنے استعمال کی اشیاء کو بیچتے ہیں اور دوسرے لوگ ان کو استعمال کے لیے لیتے ہیں، جیسے ہمارے ہاں او ایل ایکس (OLX) ویب سائٹ پر مختلف استعمال شدہ اشیاء کو بیچا جاتا ہے۔(1)

آن لائن تجارت میں جہاں کاروبار کرنے والوں کے لیے کئی آسانیاں ہیں کہ انہیں دفاتر، عملے اور دیگر لوازمات واخراجات کی جھنجھٹ میں پڑنا ضروری نہیں ہوتا، وہاں آن لائن تجارت میں خریداروں کے لیے بھی کئی فوائد ہیں، مثلاوہ گھر بیٹھ کر آسانی سے اپنی پسند کی کوئی بھی چیز منگوا سکتے ہیں۔ آن لائن کسی چیز کی معلومات لینے پر زیادہ وقت خرچ نہیں ہوتا اور بہت کم وقت میں ایک سے زائد اسٹورز اور بیچنے والوں کی اشیاء کا وزٹ کر کے اپنی پسند اور معیار کی چیز کو منتخب کیا جاسکتا ہے اور آمد و رفت کی تکلیف سے بھی بچا جاتا ہے۔ لیکن ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے، ہم خواہ کسٹمر ہوں یا کاروبار کرنے والے، ہماری یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم ہر تجارت کی طرح آن لائن تجارت بھی اسلامی تجارتی اصولوں کو مد نظر رکھ کر کریں اور صرف دنیوی و مادی فوائد کو سامنے نہ رکھیں۔ اس کے لیے آن لائن تجارت کی شرعی حیثیت اور شرائط وغیرہ کی تفصیل کو سمجھ کر ان پر عمل کرنا ضروری ہے۔

آن لائن تجارت کی شرعی حیثیت

آن لائن تجارت کے لیے شریعت کے عام اصولوں کو بہر صورت مد نظر رکھنا ضروری ہیں، جیسے حلال اشیاء کا کاروبار کیا جائے وغیرہ، لیکن یہاں خاص چار نکات کی تفصیل بیان کرنا ضروری ہے:

۱۔ایجاب وقبول ۲۔آن لائن تجارت کی بنیادی شرائط ۳۔متبادل صورتیں ۴۔ایمازون پر کاروبار

(1) www.wikipedia.org

۱۔ایجاب وقبول:

پہلی بات یہ ہے کہ آن لائن خرید وفروخت میں ایجاب وقبول کونسے الفاظ یا اعمال ہیں؟اس سلسلے میں دو طریقے الگ الگ ہیں:

الف۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ بیچنے والا اپنی مصنوعات کو کسی ویب سائٹ پر لگاتا ہے اور خریدار آکر وہاں کسی چیز کے آرڈر کے لیے اس پر کلک کرتا ہے اور پھر بیچنے والا اس کو وہی چیز روانہ کردیتا ہے۔اس طریقہ میں ویب سائٹ پر اپنی مصنوعات کی تشہیر کرنے والے کا عمل نہ ایجاب ہے اور نہ قبول، بلکہ یہ صرف ایک قسم کی دعوت اور لوگوں کو اپنی مصنوعات دکھانے کا محض عمل ہے، جیسے عمومی طور پر عام دکاندار اپنی دکان یا سٹال پر اشیاء کو سجاتے ہیں۔استاد محترم حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

> وكذلك الدعوة العامة عن طريق النشرة في الصحف والمجلات والإعلانات المنشورة عن طريق المذياع والتلفزيون ليست إيجابا،وإنما هي دعوة عامة للتعاقد،فإن تقدم أحد بإيجاب الشراءاعتمادا على هذه النشرات أو الأسعار، فالبائع له خيار القبول،ولايتم البيع إلا بقبول منه۔[1]

جہاں تک خریدار کا کسی خاص چیز کو منتخب کرکے اس پر آرڈر کے لیے کلک کرنے کا عمل ہے تو یہ ایجاب ہے۔اگر اس کے بعد اس ایجاب کو بیچنے والے نے بذریعہ میسج/ای میل یا بذریعہ فون قبول کرلیا تو معاملہ مکمل ہوجائے گا۔اگر بیچنے والے نے ایسا نہیں کیا، بلکہ وہ چیز خریدار کو بھیج دی تو بیچنے والے کا یہ عمل (چیز بھیجنا) ہی قبول سمجھا جائے گا اور معاملہ مکمل ہوجائے گا۔

ب۔ آن لائن کسی چیز کی خریداری میں ایجاب وقبول کی دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی مصنوعات کسی ویب سائٹ پر یا سوشل میڈیا کے کسی پلیٹ فارم پر لگاتا ہے اور خریدار اس کا فون نمبر لے کر اس سے بذریعہ فون یا میسج رابطہ کرکے چیز خرید لیتا ہے۔یا اسے ای میل کرکے یا مسنجر وغیرہ پر رابطہ کرکے کسی چیز کی خریداری کرتا ہے اور بیچنے والا اس کو زبانی یا تحریری طور پر قبول کرلیتا ہے تو ایسی صورت میں بھی اسی وقت فوری طور پر معاملہ مکمل ہوجائے گا۔

۲۔آن لائن تجارت کی بنیادی شرائط:

آن لائن اپنی مصنوعات بیچنے کے لیے بنیادی طور پر مندرجہ ذیل شرائط کی رعایت رکھنا ضروری ہیں:

---

(۱) فقه البيوع ۳۷/۱

۱۔آن لائن سونا، چاندی کے معاملات سے احتراز کرنا چاہیے۔اگر دونوں طرف سونا ہو، یا دونوں طرف چاندی ہو یا ایک طرف سونا اور دوسری طرف چاندی ہو تو ان تمام صورتوں میں دونوں جانب کی چیزوں پر فی الفور قبضہ کرنا ضروری ہوتا ہے جو کہ آن لائن ممکن نہیں ہے،اس لیے یہ صورتیں آن لائن جائز نہیں ہیں،البتہ اس کے لیے وکالت کی صورت اختیار کی جاسکتی ہے کہ کسی کو وکیل بنایا جائے جو دوسرے فریق کے پاس جاکر معاملہ کرے اور دونوں جانب کی چیزوں پر اسی مجلس میں قبضہ ہو جائے۔اگر کرنسی کے ذریعے سونا خریدا جارہا ہے تو یہ جائز ہے، لیکن اس میں آنے والی شرائط کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ کم از کم قیمت پر اسی نشست میں قبضہ کیا جائے کہ خریدار کسی طرح فوری طور پر قیمت بھیج دے۔

۲۔بیچی جانے والی چیز کی مکمل تفصیل، کوالٹی اور مقدار وغیرہ طے کی جائے اور قیمت کی بھی مکمل تفصیل طے کر دی جائے۔اگر قیمت ادھار ہے تو اس کا وقت بھی کنفرم و متعین کیا جائے۔

۳۔جس کوالٹی کی چیز پر معاملہ ہو جائے یا تصویر میں جو چیز دکھائی جائے،وہی چیز خریدار کو بھیجی جائے۔اگر خریدار کو کوئی اور چیز بھیج دی گئی تو اسے یہ حق حاصل ہو گا کہ چیز یہ کہہ کر واپس کر دے کہ میں نے یہ چیز نہیں خریدی۔

۴۔جو چیز آن لائن بیچی جارہی ہے وہ بیچتے وقت بیچنے والے کی ملکیت میں ہو۔اگر بیچتے وقت وہ چیز بیچنے والے کی ملکیت میں ہی نہیں ہے، بلکہ وہ بعد میں کہیں سے مہیا کر کے بھیجے گا تو ایسی چیز کو ابھی سے باقاعدہ فروخت کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ ''غیر مملوک'' کی بیع ہے جو کہ باطل ہے۔

۵۔جو چیز فروخت کی جارہی ہے وہ بیچنے والے کے قبضہ میں ہو۔اگر کوئی چیز بیچنے والے نے خریدی ہے، لیکن اس کے قبضہ میں نہیں آئی اور وہ ایسی چیز فروخت کر رہا ہے تو یہ شرعاً جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ ''بیع قبل القبض'' ہے جو کہ شرعاً فاسد ہے۔

یہ وہ بنیادی شرائط ہیں جو آن لائن مصنوعات بیچنے کے لیے ضروری ہیں۔آن لائن کاروبار میں عموماً شرط نمبر (۴) اور شرط نمبر (۵) کی رعایت نہیں رکھی جاتی، بلکہ لوگ کسی اور سے مختلف مصنوعات کی تصاویر لے کر ویب سائٹ یا اپنے پیج وغیرہ پر لگادیتے ہیں اور جب کسٹمر سے آرڈر مل جاتا ہے تو اس کے بعد ان مصنوعات کے اصل مالک سے وہ چیز خرید کر کسٹمر کو بھیج دی جاتی ہے یا اصل مالک کو کسٹمر کا پتہ دے کر اس کو چیز بھیجنے کا کہہ دیا جاتا ہے۔ایسی تمام صورتیں جن میں مصنوعات کو خود خریدنے سے پہلے ہی کسی کسٹمر کو فروخت کیا جاتا ہے یا خود قبضہ کرنے سے پہلے کسی کسٹمر کو چیز فروخت کی جاتی ہے، شرعی طور پر جائز نہیں ہیں۔ایسی صورتحال میں مندرجہ ذیل متبادل صورتوں کو اختیار کیا جاسکتا ہے:

۳۔متبادل صورتیں

ا۔پہلی صورت: وعدہ

آن لائن مصنوعات بیچنے کی صورت میں اگر بیچتے وقت چیز بیچنے والے کی ملکیت میں موجود نہیں ہے، بلکہ وہ محض تصویر یا اشتہار دکھا کر چیز فروخت کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے کہ وہ کسٹمر کو چیز باقاعدہ فروخت نہ کرے، بلکہ اس کے بجائے کسٹمر کے ساتھ ''وعدہ'' کرے۔ مثلاً یا تو اس کو یہ کہہ دے کہ: ''یہ چیز میری ملکیت میں نہیں ہے، میں کسی سے خرید کر آپ کو دے دوں گا''۔ یا صرف اتنا کہہ دے کہ: میں یہ چیز آپ کو بھیج دوں گا۔ پھر کہیں سے وہ چیز خود خریدے اور اس پر خود یا کسی وکیل کے ذریعے قبضہ کرلے۔ اس کے بعد یا تو کسٹمر سے رابطہ کرکے زبانی یا تحریری طور پر باقاعدہ خرید وفروخت کا معاملہ کرلے یا اس کے بغیر ہی کسٹمر کو وہ چیز بھیج دیں۔ یہ صورت یوں جائز ہو جائے گی کہ ابتداء میں کسٹمر کے ساتھ کیا گیا معاہدہ محض وعدہ ہوگا اور بعد میں جب وہ چیز کہیں سے مہیا کرکے کسٹمر کو بھیج دی جائے گی تو بذریعہ عمل (تعاطی) یہ معاملہ مکمل ہو جائے گا۔

۲۔دوسری صورت: بیع سلم

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی سے مصنوعات کی تصاویر لے کر کسی ویب سائٹ پر دے دے اور جب خریدار اسے کسی چیز کا آرڈر دے تو اس کے ساتھ بیع سلم کرلے۔ بیع سلم کے لیے کوئی خاص الفاظ ضروری نہیں ہیں، البتہ بیع سلم کی خاص شرائط کی رعایت رکھنا ضروری ہیں، مثلاً:

ا۔جو چیز بیچی جارہی ہے، معاملہ کرتے وقت اس کی صنف اور کوالٹی وغیرہ اس قدر وضاحت کے ساتھ بیان کردی جائے کہ بعد میں فریقین (خریدار اور فروخت کنندہ) کے درمیان کسی قسم کے نزاع یا اختلاف کا امکان نہ رہے۔

۲۔اس چیز کا نرخ/قیمت مقرر کرلیا جائے، خواہ وہ نرخ نقد خریداری کے مقابلے میں زیادہ ہو۔

۳۔بیع سلم کی ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ معاملہ کرنے کے بعد خریدار کی طرف سے اسی نشست میں مکمل قیمت ادا کردی جائے۔ آن لائن خریداری میں اس کے لیے ایڈوانس کیش کی صورت اختیار کی جاسکتی ہے، جس میں اگرچہ ایک ہی نشست میں قیمت کی ادائیگی نہیں ہو پاتی، لیکن معاصر علماء نے ایک دو دن کی تاخیر کی گنجائش دی ہے۔[1]

۴۔فروخت کنندہ کی طرف سے چیز بھیجنے کی تاریخ کنفرم اور متعین ہو۔

---

[1] قرارات وتوصيات مجمع الفقه الإسلامي التابع لمنظمة المؤتمر الإسلامي قرار رقم: ٨٥ (٩/٢)

۵۔ چیز بھیجنے کا طریقہ اور اس کے اخراجات بھی طے کیے جائے۔

بیع سلم کی ان بنیادی شرائط کی رعایت رکھ کر چیز کسٹمر کو فروخت کی جاسکتی ہے، لیکن اس کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ بیچنے والا جو چیز اپنے کسٹمر کو بیع سلم کے طور پر فروخت کردے، اس چیز کو کہیں سے خود خرید کر، اس پر خود یا کسی وکیل کے ذریعے قبضہ کرکے آگے کسٹمر کو روانہ کردے۔

۳۔ تیسری صورت: بروکری

تیسری صورت یہ ہے کہ ویب سائٹ یا پیج وغیرہ پر تصاویر لگانے والا مصنوعات کے اصل مالک کے ساتھ بروکری/سمسرہ کا عقد کرلے اور جب اس کے پاس آرڈر آجائے تو مصنوعات کے مالک کو کسٹمر کا پتہ اور دیگر تفصیلات بھیج کر فی کسٹمر یا فی آئٹم کے حساب سے مصنوعات کے مالک سے کمیشن وصول کرے۔ یہ صورت بھی جائز ہے۔

پہلی دو صورتوں (وعدہ، بیع سلم) اور تیسری صورت (بروکری) میں بنیادی طور پر دو فرق ہوں گے:

۱۔ پہلی دونوں صورتوں میں آرڈر ملنے کے بعد مصنوعات کو خود کہیں سے خرید کر، اس پر قبضہ کرنا بھی ضروری ہوگا، اس کے بعد کسٹمر کو چیز بھیجی جائے گی، جبکہ تیسری صورت میں آرڈر ملنے کے بعد اس چیز کو کہیں سے خریدنے اور قبضہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ مصنوعات کے اصل مالک کو کسٹمر مہیا کرکے اس پر اس سے کمیشن وصول کی جاسکتی ہے۔

۲۔ پہلی صورت میں بیچنے کا وعدہ کیا جائے گا، دوسری صورت میں باقاعدہ چیز کو بیچنا بھی جائز ہے، جبکہ تیسری صورت میں کسٹمر کو یہ بتانا ہوگا کہ میں یہ چیز آپ کو دے دوں گا یا مہیا کردوں گا، یہ نہ کہے کہ یہ چیز میں نے آپ کو بیچ دی۔ البتہ اگر مصنوعات کے مالک نے اس کو اپنے اشیاء بیچنے کا باقاعدہ وکیل بھی بنادیا ہے تو ایسی صورت میں وہ کسٹمر کو چیز باقاعدہ بیچ بھی سکتا ہے اور بعد میں مؤکل (مصنوعات کے مالک) کے ذریعہ کسٹمر کو چیز بھیج دی جائے۔

۴۔ ایمازون (Amazone) پر کاروبار

ایمازون (Amazon) ایک آن لائن ویب سائٹ ہے، جو لوگوں کو اپنی اشیاء بیچنے کے لیے اپنی خدمات فراہم کرتی ہے۔ ایمازون پر خریداروں کو مال دو طریقوں سے پہنچایا جاتا ہے:

۱۔ ایف بی اے (FBA)

۲۔ ایف بی ایم (FBM)

پہلی صورت (ایف بی اے) میں جو مال بیچا جاتا ہے، اس کا اسٹاک ایمازون کے گودام (Warehouse) میں

رکھوانا پڑتا ہے اور آرڈر ملنے کے بعد ایمازون خود وہ مال اپنے گودام سے لے کر خریدار تک پہنچاتا ہے، جبکہ دوسری صورت (ایف بی ایم) میں تاجر خود ہی اپنا مال خریدار تک پہنچاتا ہے،اس کے ساتھ عموماً تاجر کسی تیسرے فریق/کمپنی کی مدد سے مال کسی اور سے بنوا کر اس کی انسپکشن (Insepction) بھی کرواتا ہے۔

ایمازون پر ڈراپ شپنگ (جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے) کے علاوہ تین طریقوں سے کام ہوتا ہے:

۱-ہول سیل (Whole Sale)

۲-پرائیویٹ لیبل (Private Label)

۳-ایفیلیٹ مارکیٹنگ (Marketing Affiliate)

۱-ہول سیل (Whole Sale)

ہول سیل کے کاروبار میں تاجر عام طور پر چیز خریدنے اور اس پر قبضہ کرنے کے بعد آگے فروخت کرتا ہے۔اس میں اپنا مال تیار کرنا ضروری نہیں، بلکہ تاجر بطور رجسٹرڈ کمپنی کسی ہول سیلر، ڈسٹری بیوٹر یا برانڈ سے مال خریدتا ہے، البتہ اپنی کمپنی رجسٹرڈ کروائے بغیر ہول سیل ریٹ پر مال نہیں لیا جاسکتا،اس لیے اس میں جس کمپنی سے مال خریدا گیا ہو، تاجر کے پاس اس کا اجازت نامہ یعنی برانڈ آتھورائزیشن لیٹر ہونا ضروری ہے۔پھر مال بیچنے کے بعد خواہ ایف بی اے کے ذریعہ کسٹمر تک مال پہنچایا جائے یا ایف بی ایم کے طریقہ سے، ہر صورت درست ہے۔ان میں فرق یہ ہے کہ ایف بی اے میں فروخت کنندہ چیز خرید کر ایمازون کے گودام میں رکھواتا ہے اور پھر ایمازون کو خریدار تک چیز پہنچانے کا وکیل بناتا ہے۔جبکہ ایف بی ایم میں خریدار تک خود وہ چیز پہنچاتا ہے، لیکن بہر صورت ہول سیل کے طریقہ میں مال پہلے خرید کر پھر آگے بیچا جاتا ہے۔لہٰذا اگر قانون کی پابندی کی جائے اور کمپنی کے اجازت نامہ کے ساتھ مال بیچا جائے تو یہ جائز ہے۔

۲-پرائیویٹ لیبل (Private Label)

اس صورت میں تاجر کبھی اپنا برانڈ تیار کر کے ایمازون پر فروخت کرتا ہے اور اکثر مینوفیکچرر (مال بنانے والوں) سے بنواتا ہے اور اس پر اپنا لیبل لگاتا ہے۔تاجروں کی طرف سے دی گئی معلومات کے مطابق پرائیویٹ لیبل میں چیز خود تیار کرنا یا کسی سے تیار کروا کر اس کے اوپر اپنا لیبل لگوانا ضروری ہے۔پرائیویٹ لیبل میں گاہکوں یعنی کسٹمرز کے درمیان یہ بات معروف ہوتی ہے کہ یہ تاجر اپنا برانڈ تیار کرواتا ہے اور پھر گاہک اس کا نام لے کر ایمازون کے ذریعہ مال خریدتے ہیں۔

یہ صورت بھی شرعاً درست ہے، خواہ کسی بھی طریقے سے مال خریدار تک پہنچایا جائے۔پرائیویٹ لیبل میں

چیز

از خود تیار کرنے یا مینوفیکچر رسے تیار کروانے سے پہلے بھی خریداروں سے آرڈر لینے اور ان سے معاملہ حتمی کرنے کی اجازت ہے، کیونکہ یہ استصناع کا معاملہ ہے، جس میں چیز تیار کرنے سے پہلے آرڈر لینا درست ہے۔اس کے علاوہ اس صورت کے جائز ہونے کی شرائط مندرجہ ذیل ہیں:

۱. بیچی جانے والی مصنوعات پر موجود پیکجنگ (Packaging) پر پہلے سے رجسٹرڈ کمپنی یا رجسٹرڈ (یا جس کو آپ آگے چل کر رجسٹر کروائیں گے) ٹریڈ مارک کا نام ہو ،ایسی کمپنی کا لیبل نہ لگایا جائے جس نے آپ کو مال بیچنے کی اجازت نہیں دی۔لیبل لگانے میں دھوکہ دہی اور جعل سازی کا عنصر نہ پایا جائے۔
۲. جھوٹ اور دھوکہ دہی سے مکمل اجتناب کیا جائے اور مصنوعات کی صرف ان خصوصیات کو اجاگر کیا جائے جو ان میں موجود ہوں، غلط بیانی پر مبنی اوصاف نہ بیان کیے جائیں۔
۳. ایمازون کے ساتھ معاہدہ نامہ کی تمام جائز شرائط کا خیال رکھا جائے۔
۴. غلط / منفی تجزیہ آنے کی صورت میں بھی اچھے تجزیہ کے لیے محض جائز طریقے استعمال کیے جائیں۔ نیز اگر حقیقت پر مبنی منفی تجزیے موصول ہوں تو مصنوعات میں موجود خرابیوں کو دور کیا جائے۔
۵. ناجائز مصنوعات، جیسے شراب، سور وغیرہ جیسی اشیاء یا ان کے اجزاء والی مصنوعات کی فروخت سے بچا جائے۔

۳-ایفیلیٹ مارکیٹنگ (Affiliate Marketing)

اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایمازون پر مختلف کمپنیوں کی پروڈکٹس فروخت ہوتی ہیں اور ہر پروڈکٹ کا ایک لنک ہوتا ہے۔اگر کوئی شخص اس لنک کو کاپی کر کے دوسری جگہ مثلاً اپنی ویب سائٹ، فیس بک یا یوٹیوب چینل پر بھیجے اور پھر کوئی شخص اس لنک کو کھول کر ایمازون سے وہ پروڈکٹ خرید لے تو لنک بھیجنے والے کو اس کا کمیشن دیا جاتا ہے، کیونکہ اس کے بھیجے گئے لنک کے ذریعہ خرید و فروخت ہوتی ہے۔اس طرح مارکیٹنگ کر کے کمیشن حاصل کرنا درج ذیل شرائط کے ساتھ جائز ہے:

۱. شرعی اعتبار سے جائز پروڈکٹ کا لنک بھیجا جائے، ناجائز اشیاء کی مارکیٹنگ جائز نہیں ہے۔
۲. پروڈکٹ کی خرید و فروخت میں غلط بیانی اور دھوکہ دہی سے کام نہ لیا جائے، مثلاً غیر خالص اشیاء کو خالص یا پرانی چیز کو نئی کہہ کر فروخت نہ کیا جائے۔
۳. کمیشن متعین رقم یا کم از کم فیصد کے اعتبار سے طے ہو، تاکہ معاملہ میں کسی قسم کا خفاء اور ابہام نہ ہو۔[1]

---

[1] ایمازون کی تفصیلات کچھ تبدیلی کے ساتھ جامعۃ الرشید کے فتوی نمبر: ۷۵۸۵۵/۷۱ سے لی گئی ہیں۔

پی ٹی سی کی شرعی حیثیت
(Paid to Click)

یہ مضمون میگزین ''شریعہ اینڈ بزنس'' میں شائع ہو چکا ہے۔اس مضمون کے بنیادی نکات دو ہیں:

- تعارف
- شرعی حکم

تعارف

دورِ حاضر میں مختلف شعبہ ہائے زندگی میں نت نئی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ تجارت و معیشت کے فروغ کی بے شمار صورتیں وجود میں آگئی ہیں۔ معیشت کے انھیں جدید طریقوں میں آن لائن پیسہ کمانے کے مختلف طریقے سامنے آئے ہیں۔ان میں سے ایک طریقہ پی ٹی سی (paid to click) ہے۔پی ٹی سی کی ویب سائٹس درمیانے واسطے کا کردار ادا کرتی ہیں۔ مشتہرین اور جو لوگ اشتہارات دینا چاہتے ہیں وہ اپنے اشہارات باقاعدہ معاوضہ کی ادائیگی کر کے ان ویب سائٹس کے پلیٹ فارم پر لگا کر تشہیر کرتے ہیں اور لوگ ان ویب سائٹس پر اشتہارات دیکھ کر، ان پر کلک کر کے پیسے اور نفع کماتے ہیں۔

اس طرح کے معاملات میں پہلے رجسٹریشن کرنی پڑتی ہے، جس کے لیے اس میں کسی ویب سائٹ پر جا کر پہلے اپنا اکاؤنٹ بنانا پڑتا ہے اور پھر اس ویب سائٹ / کمپنی سے اشتہارات دیکھنے کی سروس خرید لی جاتی ہے۔اشتہارات کی خریداری کے مختلف پیکجز ہوتے ہیں، تین ہزار سے لے کر پچاس ہزار تک، بلکہ پچاس ہزار سے لے کر پانچ لاکھ تک بھی پیکجز ہوتے ہیں۔اس قسم کے پیکجز کو ''ایڈ پیک''(aid pack)اور ''کریڈٹ پیک''(credit pack) کہتے ہیں۔ اس کے بعد کمپنی کی طرف سے ممبر کو یومیہ بنیاد پر ایڈ پیک بھیجا جاتا ہے اور ممبر ان پر کلک کر کے ایڈز اور اشتہارات دیکھتا ہے اور اشتہارات دیکھنے پر کمپنی کی طرف سے کمیشن ملتا ہے۔کچھ کمپنیاں مزید ممبرز بنانے پر بھی کمیشن دیتی ہیں۔در حقیقت اشتہارات دیکھنے پر اتنا کمیشن نہیں ملتا، بلکہ اصل پیسہ اس پر ملتا ہے جو ممبر آگے جتنے افراد لاتا ہے اور ان کو ممبر شپ فراہم کرتا ہے اس پر اس شخص کو کمیشن ملتا رہتا ہے، اور مرحلہ وار یہ سلسلہ بہت آگے تک چلا جاتا ہے۔مثال کے طور پر اگر پہلے مرحلہ میں دو ممبر بنے، پھر ہر ایک نے دو دو لوگوں کو ممبر بنایا تو دوسرے مرحلہ میں چار ہو گئے۔ پھر ہر ایک نے دو دو ممبر

بنائے تو تیسرے مرحلہ میں آٹھ ہوگئے، پھر ہر ایک نے دو دو ممبر بنائے تو چوتھے مرحلہ میں ممبروں کی تعداد سولہ تک پہنچ گئی، پہلے ممبر نے صرف دو ممبر خود بنائے تھے، لیکن اس کو دوسرے تیسرے اور چوتھے مراحل میں بنے ہوئے سولہ ممبروں کی خریداری تک کا کمیشن ملتا رہے گا اور یہ سلسلہ آگے بھی بڑھے گا۔

ہم بطورِ مثال اس کی ایک صورت کا تذکرہ اور اس طریقہ کا شرعی حکم بیان کریں گے۔ایسی ایک ویب سائٹ (PayWao) ہے، اس سے متعلق اسی ویب سائٹ پر جو معلومات دی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ:

۱۔اس ویب سائٹ پر اکاؤنٹ بنانے کے بعد اُسے فعال (activate) کرنے کے لیے دو ڈالر ($2) رقم دینی پڑتی ہے۔

۲۔اس کے بعد اکاؤنٹ ہولڈر کو ایک ریفرل لنک (referral link) دے دیا جاتا ہے، جس کے ذریعے وہ اور لوگوں کو اس ویب سائٹ کی دعوت دیتا ہے۔جتنے زیادہ لوگ اس کے ریفرل لنک کے ذریعے اس ویب سائٹ پر آکر اکاؤنٹ بناتے ہیں، اس کا فائدہ سابقہ اکاؤنٹ ہولڈر کو یوں ملتا ہے کہ اس کو پیڈ ایڈز کے اشتہارات دیکھنے کے لیے مل جاتے ہیں۔

۳۔اکاؤنٹ ہولڈر درج ذیل فوائد حاصل کرتا ہے:

الف۔اکاؤنٹ ہولڈر کو مختلف قسم کے اشتہارات دیکھنے پڑتے ہیں۔بعض اشتہارات یومیہ (daily aids) ہوتے ہیں جن میں سے ہر اشتہار کو دیکھنے پر (0.001) ڈالر اور بعض اشتہارات (paid aids) کے دیکھنے پر (0.004) ڈالر رقم ملتی ہے۔لیکن دوسری قسم کے اشتہارات اس وقت دیکھنے کے لیے میسر ہوتے ہیں جب اکاؤنٹ ہولڈر ریفرل لنک (referral link) کے ذریعے ایک مخصوص تعداد میں ویب سائٹ کے ممبران میں اضافہ کردے۔

ب۔اکاؤنٹ ہولڈر اپنے ریفرل لنک (referral link) کے ذریعے ویب سائٹ کے ممبران میں ایک مخصوص تعداد میں اضافہ کرتا ہے اور مختلف لیول اور مراحل طے کرتا ہے، جس پر اسے آئی ڈیز فراہم کی جاتی ہے اور ہر آئی ڈی کے بدلے اُسے نفع ملتا ہے۔

ج۔ویب سائٹ پر سائن اپ کرنے اور ریفرل میں اضافہ کرنے پر کچھ پوائنٹس ملتے ہیں۔ان کے ذریعے اکاؤنٹ ہولڈر اپنا کوئی اشتہار یا ویڈیو اس ویب سائٹ پر لگا سکتا ہے، جس کے بدلے پوائنٹس کاٹے جاتے ہیں۔

شرعی حکم

اگر درج بالا صورتحال میں غور کیا جائے تو اس معاملے کی فقہی حیثیت ''اجارہ'' کی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں ویب سائٹ (یا اس کے مالکان) مستاجر اور اکاؤنٹ ہولڈر اجیر یعنی مزدور کے حکم میں ہے۔ گویا کہ ویب سائٹ والے اکاؤنٹ ہولڈر کو اپنی ویب سائٹ پر اشتہارات دیکھنے کے لیے اجرت/مزدوری پر رکھتے ہیں۔ یہ کاروبار درج ذیل وجوہات کی بناء پر جائز نہیں ہے:

۱۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ محض اشتہارات دیکھنا کوئی منفعت مقصودہ نہیں ہے جس کو عقد اجارہ کا محل قرار دیا جائے، حالانکہ اجارہ کے درست ہونے کے لیے ضروری ہے کہ منفعت مقصودہ ہو اور عام عرف میں اس پر اجارہ کیا جاتا ہو۔

أن تكون المنفعة مقصودة من العين في نظر الشرع الشريف ونظر العقلاء.[1]

۲۔ اس قسم کی ویب سائٹ پر اکاؤنٹ فعال (activate) کرنے کے لیے دو ڈالر رقم دینی پڑتی ہے۔ یہ رشوت کے حکم میں ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ادارہ کسی شخص کو دس ہزار روپے تنخواہ پر استاذ رکھتا ہے اور ملازمت کی تقرری کے بدلے اس سے کچھ رقم لیتا ہے۔ استاذ کو پڑھانے کے بدلے اجرت ملتی ہے، لیکن ملازمت حاصل کرنے کے لیے جو رقم دینی پڑتی ہے وہ رشوت ہی کے حکم میں ہے۔

کچھ ویب سائٹس یا کمپنیاں ایسی ہیں جہاں اکاؤنٹ بنانے پر تو فیس نہیں دینی پڑتی، لیکن اشتہارات دیکھنے کی سروس خریدنی پڑتی ہے، جو کہ در حقیقت ملازم بننے کا حق خریدنا ہے۔ یہ حق مجرد ہے اور اس پر کمپنی کو رقم ادا کرنا بھی رشوت ہی کے زمرے میں آتا ہے جو کہ جائز نہیں ہے۔

۳۔ فقہاء کی تصریحات کے مطابق عقدِ اجارہ میں اگر صرف مدت اور ٹائم کی بنیاد پر معاملہ کیا جائے تو ایسی صورت میں کام کرنے والا ''اجیر خاص'' ہوتا ہے اور اگر عمل کی بنیاد پر معاملہ کیا جائے تو اس میں کام کرنے والا ''اجیر مشترک'' کہلاتا ہے۔ جہاں کہیں مدت اور عمل دونوں کی بنیاد پر معاملہ کیا جائے گا تو امام ابو حنیفہؒ کی رائے میں یہ معاملہ فاسد ہو جائے گا، کیونکہ اس صورت میں ''معقود علیہ'' مجہول ہے۔[2]

---

[1] درر الحكام في شرح مجلة الأحكام ١/ ٤٩٥

[2] حواله بالا ١/ ٤٥٥

پی ٹی سی اور اشتہارات پر کلک کر کے نفع کمانے میں مدت اور عمل دونوں کو جمع کیا جاتا ہے، چنانچہ اشتہارات کی مجموعی تعداد اور ٹائم دونوں کی باقاعدہ شرط لگائی جاتی ہے، ان میں کسی کی بھی مخالفت کرنے پر کمیشن یا اجرت نہ ملنا طے کیا جاتا ہے۔اس لیے یہ بھی ایک خرابی ہے، جس کی بنیاد پر یہ معاملہ درست نہیں رہتا۔

۴۔ کسی بھی ویب سائٹ پر جو لوگ اشتہارات دیتے ہیں، ان کا مقصد اپنی ریٹنگ (rating) کرنا اور اپنی چیز زیادہ سے زیادہ لوگوں کو دکھانا ہوتا ہے۔درج بالا معاملے میں اگر ایک ہی شخص ایک اشتہار کئی بار دیکھتا ہے تو اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ اشتہار دیکھنے والے بہت ہے، حالانکہ یہ بات خلاف حقیقت ہوتی ہے۔لہذا یہ دھوکہ کے زمرے میں آتا ہے۔

چونکہ یہ معاملہ شرعا جائز نہیں ہے، اس لیے دوسرے لوگوں کو اس میں شامل ہونے کی دعوت دینا بھی جائز نہیں ہے اور اس پر کمیشن لینا بھی ناجائز ہے۔

مال ودولت اور خرچ: اسلامی تعلیمات

یہ مضمون میگزین ''شریعہ اینڈ بزنس'' میں شائع ہو چکا ہے۔

۱۔مال ودولت کی محبت

ہم مال ودولت سے محبت کیوں کرتے ہیں؟ ہم نے دولت کو اپنی زندگی کا محور کیوں بنایا ہے؟ ہم نے اپنی زندگی میں مال ودولت کو ایک اساسی اور مرکزی درجہ کیوں دیا ہے؟ کیا ہمیں مال ودولت کی محبت میں اتنا ڈوبنا چاہیے؟ ان سوالات کے جوابات پر غور کرنے کے لیے ذیلی سطور ملاحظہ کرنا ضروری ہے:

کوئی عقلمند اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتا کہ مال ودولت انسان کے لیے ضروری وناگزیر ہے، کیونکہ اس کے بغیر زندگی کا قیام ناممکن ہے، اس کے بغیر انسان بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اس کے بغیر زندگی تباہی کے کنارے آپہنچتی ہے۔ مال کے ذریعے انسان اپنے اور اپنے اہل وعیال کی بنیادی وفطری حوائج وضروریات کا انتظام کرتا ہے، اپنی اور اپنے اہل وعیال کی عزت وآبرو کی حفاظت کرتا ہے اور دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی رسوائی اور ذلت سے محفوظ ومامون رہتا ہے۔ مال ہی کے ذریعے انسان اپنے فرائض وذمہ داریوں کو کما حقہ اداء کر لیتا ہے۔ دوسری طرف مال کے ذریعے حج اور زکوۃ وصدقات جیسی عبادات انجام دے کر باری تعالیٰ کی طرف سے اپنے دامن میں اجر عظیم، خیر وبرکت کا سامان ڈالتا اور اُخروی درجات کی بلندی حاصل کر لیتا ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ﴾[1]

انسان مال کی محبت میں بہت پکا ہے۔

اس آیت میں مال کے ساتھ شدتِ محبت کی مذمت بیان کی گئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مال ودولت کے ساتھ نفسِ محبت نہ مذموم ہے اور نہ ہی گناہ ہے، کیونکہ مال کے ساتھ محبت کرنا تو انسان کی سرشت میں داخل ہے، لیکن اس محبت کو حدود کے اندر رکھنا ضروری ہے، حدود سے تجاوز کر کے محبت میں شدت پیدا کر کے مال ودولت ہی کو اپنی زندگی کا مقصد ومحور بنانا اور اس کی وجہ سے فرائض وواجبات میں کوتاہی کرنا ہرگز درست نہیں ہے۔ اس درجے کی محبت میں انسان

[1] العادیات: ۸

مال ودولت کا غلام بن جاتا ہے، جہاں سے مال آئے، خواہ وہ حلال ذریعہ ہو یا حرام، اُسے تجوری میں ڈال دیا جاتا ہے، اس قسم کے انسان پر آپ ﷺ نے ایک حدیث میں لعنت فرمائی ہے، آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

لعن عبد الدينار، لعن عبد الدرهم.[1]

دینار ودرہم کا غلام ملعون ہے۔

دوسری حدیث میں ہے کہ:

تعس عبد الدينار والدرهم والقطيفة والخميصة إن أعطي رضي، وإن لم يعط لم يرض.[2]

ہلاک وناکام ہو وہ شخص جو درہم ودینار اور لباس وکھانے کا غلام بنا رہتا ہے، اگر مل جائے تو خوش ہے، اگر محروم رہے تو ناراض رہتا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مال ودولت کو ضرورت کے درجے میں رکھ کر اس سے محبت کی جاسکتی ہے اور اُس کے حصول کے لیے سعی کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ اس کی محبت میں اپنی زندگی کا اصل مقصد بھلا دینا اور مال ودولت کو ہی اپنی زندگی کا محور ومقصد بنا دینا شرعی نقطۂ نظر کے خلاف ہے۔ یہی وہ فرق ہے جو اسلامی معیشت کو سرمایہ دارانہ نظام، اشتراکیت اور دیگر مادی معاشی نظاموں سے ممتاز کرتا ہے۔ ان کی نظر میں معیشت اور اس کی ترقی انسان کی زندگی کا بنیادی مسئلہ اور منتہائے مقصود ہے، لیکن اسلامی معاشیات میں یہ چیزیں اگرچہ ضروری اور ناگزیر ہیں، لیکن انسان کی زندگی کا اصل مقصد نہیں ہے۔

مفتی محمد شفیع قدس اللہ سرہ لکھتے ہیں:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام رہبانیت کا مخالف ہے اور انسان کی معاشی سرگرمیوں کو جائز، مستحسن، بلکہ بسااوقات واجب اور ضروری قرار دیتا ہے، انسان کی معاشی ترقی اس کی نگاہ میں پسندیدہ ہے اور کسبِ حلال اس کے نزدیک ''فریضہ بعد فریضہ'' کا مقام رکھتا ہے، لیکن ان تمام باتوں کے ساتھ یہ حقیقت بھی اتنی ہی واضح ہے کہ اسلام کی نظر میں انسان کا بنیادی مسئلہ ''معاش'' نہیں ہے اور نہ معاشی ترقی اس کے نزدیک انسان کا مقصدِ زندگی ہے۔''

[1] سنن الترمذي ۴/ ۵۸۷، حديث نمبر: ۲۳۷۵

[2] صحيح البخاري ص: ۷۰، حديث نمبر: ۲۸۸٦

"قرآن کریم کی نظر میں تمام وسائلِ معاش انسان کی رہ گزر کے مرحلے ہیں، اس کی اصل منزل در حقیقت ان سے آگے ہے اور وہ ہے کردار کی بلندی اور اس کے نتیجے میں آخرت کی بہبود، انسان کا اصل مسئلہ اور اس کی زندگی کا بنیادی مقصد، انہی دو منزلوں کی تحصیل ہے۔"[۱]

۲۔مال و دولت کی آزادی و خود مختاری

اسلام نے حصولِ دولت، اس کے خرچ کرنے اور اس میں تصرف کرنے میں انسان کو نہ سرمایہ دارانہ نظام (capitalism) کی طرح بالکل آزاد و بے مہار چھوڑا ہے کہ جو کچھ، جس طریقے سے بھی کمایا جائے وہ درست ہو، اور نہ ہی اشتراکیت (socialism) کی طرح انسان کو بے دست وپا، بے جان مشین اور بے عقل جانور سمجھا ہے کہ جس کو مال و دولت کے پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جائے، لیکن اس کو دولت کے استعمال کی صحیح آزادی بھی نہ دی جائے، بلکہ اسلام نے ان دونوں انتہاؤں کے درمیان سے راستہ نکال کر انسان کی ملکیت کو قبول کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس پر کچھ پابندیاں عائد کر کے اس کے لیے درج ذیل قسم کے انتظامات کیے ہیں:

۱۔ شرعی نقطہ نظر سے مال و دولت کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے، اس کے فضل و توفیق سے یہ مال و دولت انسان کو نصیب ہوئی ہے، لہذا مالکِ حقیقی کی مقرر کی ہوئی حدوں کی پابندی ضروری ہے۔[۲]

۲۔ اسلام نے یہ یقین پیدا کیا ہے کہ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی ہے، جس میں تمام مال و دولت کا حساب دینا ہوگا کہ انسان نے نیابت اور امانت کا حق کیسے اداء کیا ہے، اور یہ دنیا عیش و عشرت کی جگہ نہیں ہے، بلکہ یہ دار الامتحان ہے۔[۳]

۳۔ اسلام نے تجارت کو جائز قرار دے کر، سود کو ناجائز اور حرام قرار دیا۔[۴]

۴۔ اسلام نے یہ تعلیم دی کہ دولت کے حصول کے طریقے جائز اور غیر ظالمانہ ہو، دھوکہ، فریب، خیانت، سود، چوری، غصب، قمار، سٹہ بازی، ذخیرہ اندوزی اور رشوت جیسی خرابیوں سے احتراز کیا جائے۔[۵]

---

[۱] اسلام کا نظام تقسیم دولت، ص:۸

[۲] النور: ۳۳

[۳] آل عمران: ۱۸۶

[۴] البقرة: ۲۷۵

[۵] النساء: ۲۹

۵۔اسراف اور فضول خرچی سے منع کیا گیا۔ [1]

۶۔جو اشیاء واعمال حرام ہیں، ان کی تجارت اور ان کے ذریعے دولت کمانے کو بھی حرام قرار دیا گیا، جیسے شراب، گانے بجانے کے آلات، زنا اور دیگر فسق وفجور۔

۷۔اسلام نے یہ تصور پیش کیا کہ ہر فرد کے مال ودولت میں عوام کے بھی کچھ حقوق ہیں، جو ان تک پہنچانا ضروری ہے، اسی سے تقسیم دولت کا ایک معتدل اور ہموار راستہ نکل آتا ہے، اس کے لیے اسلام نے زکوۃ وصدقات، عشر وخراج، کفارات ونفقات اور وراثت ووصیت کے احکامات جاری کر دیے، جن سے ایک قابلِ عمل نظامِ معیشت وجود میں آجاتا ہے، حقدار کو حق پہنچ جاتا ہے اور ارتکازِ دولت واحتکار کی بیخ کنی ہو جاتی ہے۔

۳۔مال کمانے کے درجات

علماء نے لکھا ہے کہ مال ودولت کے کمانے کے چار درجے ہیں:

۱۔فرض:

اتنا مال ودولت کمانا انسان پر فرض ہے کہ جس کے ذریعے وہ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی کفالت کر سکے، اپنے قرضوں اور دیون کو اداء کر سکے اور جن لوگوں کا نان ونفقہ اور خرچہ انسان پر لازم ہے، اس کے لیے کافی ہو۔

۲۔مستحب:

اس نیت سے فرض مقدار سے زیادہ مال ودولت کمانا کہ اس کے ذریعے فقراء ومساکین کے ساتھ تعاون وہمدردی اور اپنے عزیز واقارب کے ساتھ صلہ رحمی کر سکے۔ یہ مستحب ہے، ایسی کمائی کے بارے میں علماء نے لکھا ہے کہ اس کی کوشش میں مصروف رہنا، نفل عبادت سے افضل ہے۔

۳۔جائز ومباح:

زینت، خوشحالی اور آسودگی کے لیے یا اپنے اور اپنے اہل وعیال کی آسانی، آرام وراحت اور سکون کے لیے مستحب مقدار سے بھی زیادہ مال کمانا جائز ومباح ہے۔

۴۔حرام یا مکروہ:

دوسرے لوگوں سے دولت مندی میں آگے بڑھنے کی نیت سے یا دوسروں پر فخر کرنے کے لیے مال ودولت

---

[1] الانعام: ۱۴۱

کمانا مکروہ ہے، بشرطیکہ حلال ذرائع سے مال حاصل کیا جائے، اگر کسی حرام ذریعہ سے مال حاصل کیا گیا تو وہ حرام ہے، خواہ کچھ بھی نیت ہو۔ [1]

۴۔ دولت سے متعلق چند ہدایات

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے قارون کو مخاطب کر کے چار ہدایات دی ہیں، جو ہر دولت مند شخص کے لیے ہدایت وراہنمائی کا سامان ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

{وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ} [2]

اور اللہ نے تمھیں جو کچھ دے رکھا ہے، اُس کے ذریعے آخرت والا گھر بنانے کی کوشش کرو، اور دنیا میں اپنے حصے کو نظر انداز نہ کرو، اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا ہے، تم بھی (دوسروں پر) احسان کرو، اور زمین میں فساد مچانے کی کوشش نہ کرو، یقین جانو! اللہ فساد مچانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

پہلی ہدایت:

پہلی ہدایت یہ دی ہے کہ دولت کے ذریعے آخرو الا گھر بنانے کی کوشش کرو، یعنی دولت اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق استعمال کرو، جس کے نتیجے میں آخرت کا ثواب حاصل ہوگا۔

دوسری ہدایت:

دوسری ہدایت یہ دی ہے کہ دنیا میں اپنا حصہ نظر انداز مت کرو، یعنی ایسا نہ کرو کہ دنیاوی ضروریات کو بالکل پس پشت ڈال کر صرف آخرت ہی کو مد نظر رکھو، بلکہ ضرورت کے مطابق دنیا کا ساز وسامان رکھنے اور کمانے میں کچھ گناہ نہیں ہے، البتہ مال ودولت اس انداز سے مت کماؤ، جس کے نتیجے میں آخرت کا نقصان اُٹھانا پڑے۔

تیسری ہدایت:

تیسری ہدایت دیتے ہوئے باری تعالیٰ نے فرمایا کہ جس طرح تم پر اللہ تعالیٰ نے احسان کیا ہے، تم بھی دوسروں پر

[1] الفتاوى الهندية ٥/ ٣٤٨

[2] القصص: ٧٧

احسان کرو، یعنی جو کچھ مال ودولت تمھارے پاس ہے، حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے اور اس نے تم پر احسان کر کے تمہیں عطا کیا ہے، اسی طرح تم بھی لوگوں پر احسان کر کے اُن کو مال ودولت میں شریک کرو، جس کے لیے زکوۃ وصدقات کے دروازے کھلے ہیں۔

چوتھی ہدایت:

چوتھی ہدایت یہ دی ہے کہ زمین میں فساد مچانے کی کوشش نہ کرو، یعنی مال ودولت کے بل بوتے پر دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ نہ ڈالو اور دوسروں کے حقوق کو غصب مت کرو۔

یہ وہ چار ہدایات ہیں جن پر عمل کر کے کوئی بھی دولت مند اپنے آپ کو انبیاء، صدیقین اور شہداء کی فہرست میں شامل کر سکتا ہے، ورنہ ساری معاشی سرگرمیاں بے کار ہیں اور آخرت میں اس کا نتیجہ سزا وعذاب کی صورت میں سامنے آئے گا۔

علامہ ابو لیث سمرقندیؒ نے لکھا ہے کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کا مال حلال، پاک اور طیب رہے، اس کو چاہیے کہ پانچ چیزوں کو مد نظر رکھے:

۱۔ مال کمانے کی وجہ سے فرائض اور شرعی ذمہ داریوں کو مؤخر نہ کرے اور ان میں کوئی خلل اور نقص نہ آئے۔

۲۔ مال کمانے کے سلسلے میں دوسروں کو اذیت دینے سے اجتناب کرے۔

۳۔ مال کمانے سے اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضروریات کی کفایت مقصود ہو، جمع، ذخیرہ اندوزی اور تفاخر مقصود نہ ہو۔

۴۔ مال کمانے کے لیے اپنے نفس کو اتنا نہ کھپائے کہ مشقت وتکلیف میں مبتلا ہو کر کمزوری اور عجز کا سامنا کرنا پڑے۔

۵۔ یہ نیت نہ رکھے کہ جو مال مجھے حاصل ہوا ہے میرے عمل وکسب سے حاصل ہوا ہے، بلکہ یہ نیت رکھے کہ حقیقت میں مال عطا کرنے والی ذات اللہ کی ہے، عمل وکسب محض ایک سبب ہے۔[1]

۵-مال: کہاں اور کیسے خرچ کیا جائے؟

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرما کر دنیا میں اپنا نائب بنا کر بھیجا، تاکہ وہ دنیوی سرگرمیوں سے دنیا کی بقاء کا کام بھی کرے اور عبادت اور ایسے اعمال بھی سرانجام دے جن سے اس کی آخرت سنور جائے۔ اب اس دنیا میں رہنے کے لیے مال

(۱) تنبیه الغافلین ۲ / ۵۰۰

کمانااور اپنی اور اہل وعیال کی ضروریات پر خرچ کرنا ناگزیر ہے، ورنہ انسانی زندگی کی بقاء ناممکن ہے۔اسی طرح دینی اعمال اور اپنی آخرت کو سنوارنا بھی مال کمانے اور خرچ کرنے کے بغیر ممکن نہیں ہے، کیونکہ جو انسان اپنے اوپر خرچ کرنے پر قادر نہ ہو، اس کی زندگی مشکل میں پڑ جاتی ہے اور وہ دینی امور انجام دینے سے بھی قاصر رہتا ہے۔

چونکہ مال کمانے اور خرچ کرنے کی ضرورت یقینی بات ہے، اس لیے شریعت نے بھی اس کی اجازت دی ہے۔ قرآن میں ایک سے زائد مقامات پر باری تعالیٰ نے رزق کو اپنی نعمت قرار دے کر اس کے حصول اور خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے اور کئی مقامات پر فرمایا ہے کہ پاک اور حلال چیزیں کھا کر رب کا شکر ادا کرو۔[1] لیکن شریعت نے جہاں مال کمانے کے جائز طریقوں کی طرف راہنمائی کر کے ان کو لازم کیا ہے، اسی طرح مال خرچ کرنے میں بھی انسان کو کھلی چھوٹ اور آزادی نہیں دی کہ جہاں چاہے، جیسے چاہے خرچ کرے، بلکہ شریعت نے اس کے لیے کچھ حدود مقرر کی ہیں اور ایسے اصول وضوابط بیان کیے ہیں جن کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

الف۔ خرچ کا مقصد کیا ہو؟

جدید اقتصادی نظریات کی نظر میں انسان کی تمام معاشی اور غیر معاشی سرگرمیوں کا اصل مقصد یہ ہے کہ جو کچھ کمایا جائے اُسے خرچ کیا جائے۔ان کی رائے میں انسان کی کوششوں کی انتہاء یہ ہے کہ کمائی ہوئی چیز کو حاجت پوری کرنے اور لذت کے حصول کے لیے استعمال کیا جائے۔رہی یہ بات کہ انسان کس نیت و مقصد کے لیے خرچ کرے اور اپنی حاجت پوری کر لینے اور بدن کی صحت وسلامتی کے حصول کے بعد بھی انسان کا کوئی مقصد وہدف ہے یا نہیں، اس قسم کی باتوں سے بحث نہیں ہوتی، بلکہ ایسی باتیں دنیوی قوانین کی نظر میں عبث اور فضول سمجھی جاتی ہیں۔

اسلام کی نظر میں مال کمانے کی سرگرمیاں اور کوششیں اور مال کو خرچ کرنا اور اپنی حاجت وضرورت پوری کرنا نہ صرف جائز، بلکہ ضروری ہے، کیونکہ جو شخص کھانا، پینا چھوڑ دے اور اس کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو جائے، وہ اسلام کی نظر میں مجرم وگناہ گار کہلاتا ہے۔[2] لیکن انسان کی زندگی کا اصل مقصد یہ نہیں ہے، یہ سب چیزیں محض ضرورت اور اسباب کے درجے میں ہیں، اسی لیے اس سے آگے بھی ایک مقصد ہے کہ مال سے اپنی زندگی کی ظاہری بقاء حاصل کر کے اللہ کی عبادت کرے، اس کی خوشنودی حاصل کرے اور اپنی آخرت سنوارے، لہذا مال کمانے اور خرچ کرنے کے سلسلے میں یہی نیت اور مقصد ہونا چاہیے، اس نیت سے حلال روزگار کی کوششیں بھی عبادت بن سکتی ہیں۔

---

(۱) البقرة:۱۷۲

(۲) رد المحتار ٦ / ٣٣٨

ب- خرچ کی جانے والی اشیاء کی اقسام

انسان جو اشیاء اپنے داخلی یا خارجی استعمال میں لاتا ہے، ان کی درج ذیل اقسام ہو سکتی ہیں:

(۱)۔ استعمال میں آنے والی اشیاء کی پہلی قسم حلال و حرام ہے کہ ایک مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ حلال چیز ہی استعمال کرے، حرام سے بچے۔ اس بارے میں قرآن کریم اور احادیث طیبہ نے "طیبات" کو حلال اور "خبائث" کو حرام قرار دیا ہے، لیکن ان دونوں قسم کی اشیاء کی مکمل وضاحت قرآن وحدیث میں موجود نہیں ہے۔ اس سلسلے میں علماء نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ:

"طیبات" سے مراد وہ اشیاء ہیں جو عقل اور جسم کے لیے مضر نہ ہوں، جن سے لذت اٹھائی جائے وہ فی نفسہ حلال اور پاک ہوں، ان کے نجس و حرام ہونے پر کوئی اور دلیل موجود نہ ہو۔ "خبائث" وہ اشیاء ہیں جو عقل یا جسم کے لیے مضر ہوں، جن سے لذت حاصل نہ کی جا سکے یا ان کے حرام یا ناپاک ہونے پر کوئی اور شرعی دلیل موجود ہو۔

فقوله قل أحل لكم الطيبات جائز أن يريد به ما استطبتموه واستلذتموه مما لا ضرر عليكم في تناوله من طريق الدين فيرجع ذلك إلى معنى الحلال الذي لا تبعة على متناوله وجائز أن يحتج بظاهره في إباحة جميع الأشياء المستلذة إلا ما خصه الدليل.[1]

(۲)۔ استعمال میں آنے والی بعض اشیاء انسان کی ضروریات اور اشیاء کی اہمیت کے اعتبار سے پانچ قسم کی ہیں:

۱۔ ضروریات:

اس سے ایسی اشیاء مراد ہیں جن پر انسانی زندگی کی بقاء موقوف ہو، جیسے ضروری کھانا، پانی، ضروری لباس وغیرہ۔ انسان پر لازم ہے کہ اس قسم کی اشیاء کے حصول کی کوشش کرے، بلکہ اس پر دوسرے جن لوگوں (جیسے بیوی، بچے اور محتاج والدین) کا خرچہ لازم ہے، ان کے لیے بھی انتظام کرے۔ اگر کسی شخص کو ایسی اضطراری حالت پیش آجائے کہ بھوک سے مرنے کا خوف ہو، اس کے پاس کوئی جائز وسیلہ بھی نہ ہو تو اس کے لیے حرام چیز بقدرِ ضرورت استعمال کرنے کی اجازت ہے۔

۲۔ حاجیات:

حاجیات ایسی اشیاء کا نام ہے جن کو اگر استعمال نہ کیا جائے تو مرنے کا خوف نہ ہو، لیکن انسان مشقت اور تکلیف

---

[1] أحكام القرآن للجصاص ۳ / ۳۰۷

میں پڑسکتا ہو۔ان اشیاء کو استعمال کرنے سے سہولت اور آسانی پیدا ہوتی ہے۔ جیسے ذاتی مکان، گاڑی اور نوکر چاکر وغیرہ، ایسی اشیاء کا استعمال نہ صرف جائز، بلکہ مستحسن ہے، بشرطیکہ حلال ذرائع سے حاصل کی گئی ہوں، لیکن محض سہولت پسندی اور آسانی کے لیے حرام اشیاء کو استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

۳۔ منفعت کی اشیاء:

اس سے ایسی چیزیں مراد ہیں کہ اگر انسان ان کو استعمال کرے گا تو اس کے بدن کو فائدہ پہنچے گا، لیکن استعمال نہ کرنے کی صورت میں نہ ہلاکت کا خطرہ رہتا ہے اور نہ ہی کوئی سخت تکلیف لاحق ہوتی ہے، جیسے عمدہ قسم کے کھانے، مقوی غذائیں وغیرہ۔ان چیزوں کا استعمال بھی شریعت کی نظر میں جائز اور مباح ہے، بشرطیکہ حلال ذریعہ سے حاصل ہو، اگر ایسی چیزیں نہ ملے تو صبر کرے، کسی ناجائز کام کا ارتکاب نہ کرے۔

۴۔ زینت کی اشیاء:

ایسی چیزیں جن سے انسانی بدن کو کوئی خاص فائدہ یا تقویت نہ ملے، محض تفریح اور خواہش کے لیے استعمال کی جائے، جیسے مختلف قسم کی لذیذ اور ذائقہ دار اشیاء اور بہترین وآرائشی لباس وغیرہ۔اس کا حکم بھی منفعت کی اشیاء والا ہے، اگر حلال ذرائع سے حاصل ہو جائیں تو استعمال کرے، ورنہ صبر کرے۔

۵۔ فضول اشیاء:

اس سے مراد ایسی چیزیں ہیں جن میں حرمت کا عنصر شامل ہو جائے، مثلاً جن اشیاء میں حرام چیز کے استعمال کا گمان ہو اس کے استعمال میں توسع کرنا یا حلال اشیاء میں اسراف سے کام لینا یا دوسروں پر فخر کرنے اور خود کو بڑا دکھانے کے لیے استعمال کرنا وغیرہ۔ایسی اشیاء سے یا اس طریقہ استعمال سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔

اس کا خلاصہ فقہاء نے یوں لکھا ہے کہ اتنی مقدار کھانا جس پر انسان کا زندہ رہنا اور فرائض کی ادائیگی موقوف ہو، یہ فرض ہے۔اس سے زیادہ اتنی مقدار میں کھانا جس سے بدن کو قوت حاصل ہو یہ مباح اور جائز ہے، لیکن اس کا حساب دینا ہوگا۔ تفریح اور خواہش کی خاطر لذیذ اور عمدہ کھانے کھانا بھی حلال ہے، لیکن اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا ضروری ہے اور بھوکے پڑوسیوں کے حق کا جواب بھی دینا ہوگا، جبکہ بھوک مٹ جانے کے باوجود اتنا زیادہ کھانا جو مضر ہو یہ حرام ہے۔[1]

ج۔ خرچ میں میانہ روی

خرچ سے متعلق شریعت کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ خرچ میں میانہ روی اور اعتدال سے کام لیا جائے اور اس

(۱) المبسوط للسرخسي ۳۰/ ۲۶۸

میں اسراف، تبذیر اور تقتیر سے بچنا ضروری ہے۔

''اسراف'' کا مطلب ہے جائز اور مباح کام میں ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا اور اعتدال سے کام نہ لینا، جبکہ ''تبذیر'' کا مطلب ہے کہ مال کو ناجائز اور گناہ کے کاموں میں استعمال کرنا۔ دونوں باتوں سے شریعت میں منع کیا گیا ہے۔ ''تقتیر'' کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جن کاموں میں خرچ کرنے کا حکم دیا ہے اور جن لوگوں کا نفقہ انسان پر واجب کیا ہے ان پر خرچ نہ کرنا اور تنگی و بخل سے کام لینا۔ یہ بھی شرعاً ممنوع ہے۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: ''جو لوگ بے ہودہ کاموں میں اپنا مال اُڑاتے ہیں، وہ شیطان کے بھائی ہیں''۔[۱]
ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ: ''(اللہ کے بندے وہ ہیں) جو مال خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں، نہ تنگی کرتے ہیں، بلکہ ان کا طریقہ اس کے درمیان اعتدال کا طریقہ ہے''۔[۲] اسی طرح ایک اور آیت میں ہے کہ: ''کھاؤ، پیو اور اسراف و فضول خرچی سے بچو، اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا''۔[۳]

لہٰذا اسراف اور فضول خرچی سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ جب بھی کوئی چیز خریدے تو اپنے آپ سے یہ سوالات کریں کہ میں یہ چیز کیوں خرید رہا ہوں؟ کیا مجھے حقیقت میں اس چیز کی ضرورت ہے؟ اگر میں اس کو نہ خریدوں تو مجھے کیا تکلیف لاحق ہو سکتی ہے؟ اور جس قیمت پر میں خرید رہا ہوں، کیا یہ اس کی درست قیمت ہے یا نہیں؟ اگر ان سوالات کے مثبت جوابات ذہن میں آجائے تو ایسی چیز ضرور خریدیں، ورنہ احتراز ہی بہتر ہے۔

د- عزیز و اقارب پر خرچ

شریعت کی نظر میں انسان اپنے آپ پر خرچ کرنے کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی ذمہ دار ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال یعنی بیوی اور بچوں پر بھی خرچ کرے۔ اپنے محتاج والدین کا نفقہ بھی برداشت کرے اور اگر اُسے مزید قدرت اور استطاعت حاصل ہے تو ان کے علاوہ دیگر فقیر و محتاج عزیز و اقارب پر بھی بقدرِ ضرورت خرچ کرے۔[۴]

---

[۱] بنی اسرائیل:۲۷

[۲] فرقان:٦٧

[۳] الاعراف:۳۱

[۴] اللباب في شرح الكتاب ص: ۲۹٦

ھ- ضرورت مند افراد پر خرچ

انسان کے مال و دولت میں اپنے اہل و عیال اور رشتہ داروں کے علاوہ شریعت نے معاشرے کے دوسرے محتاج اور غریب لوگوں کو بھی مستحق قرار دیا ہے، جن کو زکوۃ، عشر، صدقہ فطر اور کفارات وغیرہ کی صورت میں مال دیا جاتا ہے، لہذا یہ لازم ہے کہ انسان اپنے مال کا وہ متعین حصہ غریب و مستحق لوگوں تک پہنچائے جو شریعت نے زکوۃ وغیرہ کے نام سے اس پر لازم کیا ہے۔

و- خرچ کے ذریعے آخرت سوارنا

شریعت نے واجب صدقات کے علاوہ ثواب کے حصول اور آخرت کی زندگی سنوارنے کے لیے نفلی صدقات کی ترغیب بھی دی ہے۔ خرچ کا یہ مد اگرچہ فرض اور لازم کے درجے میں نہیں ہے، لیکن اللہ کے راستے میں خرچ کر کے مخلوقِ خدا کی حاجت پوری کرنا اللہ کی خوشنودی کے حصول کا ایک بہتر راستہ ہے، چنانچہ باری تعالی نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے کہ: "اور اللہ نے تمہیں جو کچھ دے رکھا ہے، اُس کے ذریعے آخرت والا گھر بنانے کی کوشش کرو اور دنیا میں سے بھی اپنے حصے کو نظر انداز نہ کرو، اور جس طرح اللہ نے تم پر احسان کیا ہے، تم بھی (دوسروں پر) احسان کرو، اور زمین میں فساد مچانے کی کوشش نہ کرو، یقین جانو اللہ فساد مچانے والوں کو پسند نہیں کرتا"۔[1]

---

[1] القصص:۷۷

معاشی منصوبہ بندی اور اسلام

(Economic Planning)

یہ مضمون میگزین ''شریعہ اینڈ بزنس'' میں چھپ چکا ہے۔اس مضمون کے بنیادی عنوانات مندرجہ ذیل ہیں:

❁ تعارف

- معاشی منصوبہ بندی
- معاشی منصوبہ بندی کے مقاصد
- معاشی منصوبہ بندی کے فوائد

❁ اسلامی تعلیمات

- پیدائش دولت کی منصوبہ بندی
- تبادلہ دولت کی منصوبہ بندی
- تقسیم دولت کی منصوبہ بندی
- خرچ کی منصوبہ بندی

تعارف

موجودہ دور میں ترقی کے مدارج طے کرنے اور متعین مقاصد کو حاصل کرنے میں منصوبہ بندی اور پلاننگ کو کلیدی کردار حاصل ہے۔انسانی معاشرے کا کوئی بھی میدان ہو، خواہ سیاسی ہو، اقتصادی، دینی، دنیوی، انتظامی ہو یا علمی اور عملی، غرض ہر شعبہ اور ہر یونٹ اور اکائی میں منصوبہ بندی کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور یہ انسان کی کامیابی میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ مستقبل کے لیے کامیاب منصوبہ بندی فلاح کا پہلا زینہ ہے، اس کی بنیاد خالی امنگوں کے بجائے عملی اقدامات پر ہوتی ہے۔ مستقبل کے لیے منصوبہ بندی زندہ دلوں کو جلا بخشتی ہے، عزائم کو پختہ بناتی ہے، مایوسی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتی ہے اور سستی کا خاتمہ کرتی ہے، بلکہ موجودہ وسائل کو بروئے کار لا کر روشن مستقبل کی تعمیر کے لیے غور و فکر کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ منصوبہ بندی ایک ترقی یافتہ اور منظم و سلیقہ مند قوم کا شعار بھی ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج کل منصوبہ بندی کو ایک مستقل فن سمجھا جاتا ہے اور یونیورسٹیوں، مینجمنٹ اداروں اور سرکاری محکموں میں اس فن کو سکھانے کے لیے باقاعدہ

شعبے قائم کیے گئے ہیں۔

جو لوگ منصوبہ بندی اور پلاننگ سے نفرت کرتے ہیں یا جو بغیر کسی پلاننگ کے اندھا دھند مختلف کام بے ڈھنگے اور غیر سلیقہ مندی سے کرتے ہیں، ایسے افراد کو معاشرے میں اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا اور انہیں اعلیٰ اقدار کے حامل نہیں سمجھا جاتا۔ ایسے لوگوں کا منصوبہ بندی نہ کرنا اس وجہ سے ہوتا ہے کہ انہیں مشکل کاموں سے گھبراہٹ ہوتی ہے اور وہ سہل پسندی کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ عجلت اور جلدی میں ہر کام ختم کرنے کی کوشش میں ہوتے ہیں۔ سب سے اہم سبب یہ ہے کہ ایسے لوگ منصوبہ بندی کے فوائد واہمیت سے ناآشنا اور اجنبی ہوتے ہیں اور انہیں منصوبہ بندی کے طریقہ کار سے واقفیت نہیں ہوتی۔ اگر ان خامیوں کو دور کیا جائے تو نہ صرف بذات خود اپنا ہر کام پلاننگ کے مطابق کریں گے، بلکہ اس کے فوائد و ثمرات سے بھی مستفید ہوں گے۔

منصوبہ بندی کو عربی میں ''تخطـــیط'' اور انگریزی میں ''planning'' کہتے ہیں۔ اس کے لفظی معنی کو دیکھا جائے تو یہ کسی کام کو انجام دینے کا خاکہ تیار کرنے اور طریق عمل تجویز کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ منصوبہ بندی عمومی بھی ہو سکتی ہے جس میں پوری سوسائٹی اور مکمل نظام کا خاکہ تیار کیا جاتا ہے اور جزوی بھی ہو سکتی ہے جس میں معاشرے کے کسی خاص یونٹ اور اکائی مثلاً معیشت یا معیشت ہی کے کسی خاص جزء مثلاً رسک کو مینج کرنے کے لیے طریق عمل تجویز کیا جاتا ہے، اس لیے عمومی منصوبہ بندی کی تعریف و مفہوم الگ اور جزوی منصوبہ بندی کا مطلب مختلف ہے۔ مستقبل میں کسی بھی کام کو کرنے سے پہلے اس کے کرنے کا منصوبہ و خاکہ تیار کرنا اور طریقہ کار متعین کرنا، اہداف و مقاصد طے کرنا، مقصد تک پہنچانے والے ضروری وسائل و ذرائع کی تحدید کرنا اور فوائد و نقصانات کے امکان سے آگاہی حاصل کرنا منصوبہ بندی کہلاتی ہے۔

معاشی منصوبہ بندی (Economic Planning)

جہاں تک معاشی منصوبہ بندی کے مفہوم کی بات ہے تو اس سلسلے میں ماہرین معیشت نے الفاظ کے چناؤ میں کچھ مختلف انداز اختیار کیے ہیں، تاہم مقصد و نتیجہ میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ سب سے جامع تعبیر یہ ہے کہ معاشی منصوبہ بندی سے مراد کسی ملک کی ذمہ دار اتھارٹی کے ایسے اہم فیصلے ہیں جن میں دیکھا جاتا ہے کہ کونسی اشیاء اور کتنی مقدار میں اور کن کے لیے پیدا کی جائیں؟ نیز کہاں اور کس طرح تیار ہوں؟ اور یہ بڑے فیصلے پورے معاشی نظام کا مکمل جائزہ لے کر کیے جاتے ہیں۔[1]

---

[1] اسلام اور معاشی تصورات، ص: ۴۳۹

لہذا معاشی نظام کے مجموعی جائزہ پر مبنی ایک معین ادارہ کی طرف سے کئے گئے درج ذیل اہم فیصلے ''معاشی منصوبہ بندی'' کہلاتی ہے:

۱۔ کون سی اشیاء اور کتنی پیدا کی جائیں؟

۲۔ کس مقدار میں پیدا کی جائیں؟

۳۔ کس کے لیے پیدا کی جائیں؟

۴۔ کیسے صرف کی جائے؟

ان چار سوالات کے حل کے لیے ایک مرکزی تنظیم یا ادارہ کی موجودگی ضروری ہے جو منصوبہ بندی کے نظام کو کنٹرول کرے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ موجودہ اور امکانی وسائل کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہوں، منصوبہ سازوں اور عوام میں ان وسائل سے استفادہ کی شدید خواہش بھی ہو اور پسندیدہ معاشی و معاشرتی مقاصد کا تعین کیا جائے۔

معاشی منصوبہ بندی کے مقاصد (Objectives)

معاشی منصوبہ بندی کے بنیادی مقاصد میں یہ شامل ہے کہ اشیاء کی پیداوار میں مقدار اور معیار کے اعتبار سے اضافہ اور ترقی ہو۔ دولت کی ایسی منصفانہ تقسیم ہو کہ جس سے اجارہ داریاں ختم ہوں۔ عامۃ الناس کو معاشی آسانی اور محروم طبقات کو معاشی سہولت میسر آجائے۔ بیرونی امداد پر انحصار میں کمی ہو۔ لوگوں کی مادی فلاح کے ساتھ ان کی اخلاقی ترقی کو یقینی بنایا جائے۔ لوگوں کے معیارِ زندگی میں بہتری آئے اور محرومی کا استیصال ہو۔ ملک صنعتی ترقی کی راہ پر گامزن، غذائی قلت کی کمی کا خاتمہ اور دفاعی ضروریات کو پورا کیا جاسکے۔

معاشی منصوبہ بندی کے فوائد (Benefits)

منصوبہ بندی خواہ کسی بھی سرگرمی و عمل کے لیے ہو، اس کے فوائد، اہمیت اور بہتر ثمرات سے انکار ممکن نہیں ہے۔ یہی حال معاشی سرگرمیوں کا بھی ہے۔ اسی لیے دنیا میں پائے جانے والے تمام اقتصادی و معاشی نظاموں میں معاشی مسائل کے حل کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی اور خاکہ تیار ملتا ہے۔ معاشی منصوبہ بندی کے فوائد بہت ہیں۔ مختصر الفاظ میں انہیں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ:

۱۔ منصوبہ بندی بے روزگاری کے خاتمہ اور روزگار کی فراہمی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

۲۔ متوازن معاشی ترقی اور استحکام کا سبب بنتی ہے۔

۳۔ منصوبہ بندی کے ذریعے وسائل پیداوار اور ذرائع آمدنی کا بہتر استعمال ہوتا ہے اور اس کے ذریعے ان کو ضائع

ہونے سے بچایا جاتا ہے۔

۴۔ارتکاز دولت اور ذخیرہ اندوزی کا سد باب ہو سکتا ہے۔

۵۔آمدنی اور دولت کی منصفانہ تقسیم، اجارہ داریوں کا خاتمہ اور مزدوروں کے حقوق کو تحفظ فراہم کیا جا سکتا ہے۔

اسلامی تعلیمات

یہ بات ہر مسلمان کے عقیدے میں ہے کہ مستقبل سے متعلق ہر چیز علم غیب سے تعلق رکھتی ہے اور ان کا مکمل ادراک صرف اللہ تعالی کو ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ مستقبل کے لیے کسی قسم کی منصوبہ بندی ہی نہ کی جائے، بلکہ مستقبل کے بارے میں غور و خوض اور مستقبل کی ٹوہ میں رہنا، اسے جاننے کی کوشش کرنا، ممکنہ خطرات سے بچاؤ کے لیے اقدامی تدابیر کرنا، اللہ تعالی کی طرف سے لوگوں میں پیدا کردہ فطرتی چیز ہے، روح کو اسی پر پیدا کیا گیا ہے۔ چونکہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات اور زندگی کا جامع منہج ہے، اسی لیے اس کی نظر میں منصوبہ بندی نہ صرف جائز ہے، بلکہ اسلامی تعلیمات میں منصوبہ بندی اور پلاننگ نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

تخلیقِ کائنات کے مراحل ہوں یا اس جہان کی بقاء، دونوں ایک جامع منصوبہ بندی کے تحت وجود میں آئے اور اسی کے تحت رواں دواں ہیں۔اسی طرح تخلیقِ انسان میں اور اس کی رشد وہدایت کے لیے انبیاء کی بعثت میں بھی ایک خاص طریقہ اور منصوبہ بندی کار فرما ہے۔

معاشی مسائل، جیسے وسائل کا استعمال، دولت کی پیدائش اور اس کی تقسیم و ترقی کے لیے منصوبہ بندی کرنا شرعی نقطہ نظر سے درست، بلکہ بہتر ہے، بشرطیکہ شریعت کی مقرر کردہ حدود اور اصولوں کو مد نظر رکھا گیا ہو۔اس کی سب سے بہترین مثال اللہ کے نبی یوسف علیہ السلام کی منصوبی بندی کی ہے جنہوں نے مصر کے مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے ایک جامع منصوبہ بندی کی تو اللہ تعالی نے ملک و قوم کو کمر توڑ اقتصادی بحران سے بچالیا۔

اگر معیشت سے متعلق اسلامی تعلیمات میں غور کیا جائے تو واضح طور پر یہ سامنے آتا ہے کہ اسلام نے معاشی مسائل اور سرگرمیوں کے لیے بھی ایک لائحہ عمل اور منصوبہ بندی کی تعلیم دی ہے، جن میں سے کچھ تعلیمات ترغیبی اور استحبابی ہیں اور کچھ جبری اور ضروری۔ معاشی مسائل میں اسلامی تعلیمات کیسے منصوبہ بندی کرتی ہیں، اس کا ایک مختصر خاکہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

پیدائش دولت کی منصوبہ بندی (Planning of Production of Wealth)

اسلام کی نظر میں ذاتی منافع کے محرک کو تسلیم کیا گیا ہے، جس سے دولت کی پیدائش میں اضافہ ہوتا ہے، لیکن

اس سلسلے میں حرام اور ناجائز اشیاء کی ایک فہرست دے کر ان کی پیدائش سے منع کر دیا گیا تاکہ ممکنہ خرابیوں کا سد باب ہو سکے۔ جائز وسائل اور ذرائع کی راہنمائی کر دی۔ دولت کی پیدائش کے لیے حیوانات، نباتات، جمادات، تجارت، صنعت و حرفت اور نقل و حمل میں سے ہر وسیلہ اختیار کرنے کو جائز قرار دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا کہ پیداواری سرگرمیوں کو اعتدال میں رکھا جائے۔ زیادہ منافع کی لالچ میں بلا ضرورت پیداوار سے بچا جائے۔ وسوسوں اور انجانے خوف کا شکار ہو کر عمل پیدائش سے ہاتھ نہ روکا جائے۔

تبادلہ دولت کی منصوبہ بندی (Planning of exchange of Wealth)

اسلام نے تجارت اور لین دین میں شرعی شرائط واحکام اور اصولوں کو ملحوظ رکھنا اور باہمی رضامندی کو ضروری قرار دیا۔ یہ بتایا کہ تبادلہ صرف جائز اور مباح اشیاء کا کیا جائے۔ معاملہ میں کسی کو ضرر پہنچانے اور اس پر ظلم کرنے سے اجتناب کی تعلیم دی۔ ملاوٹ، دھوکہ اور غرر سے بچنے کی تلقین کی۔ احتکار اور ذخیرہ اندوزی کو ناجائز قرار دے کر اجارہ داریوں اور کاروباری بدعنوانیوں کا خاتمہ کر دیا۔ سود، جوا اور سٹہ کو حرام قرار دیا۔ عہد اور وعدہ پورا کرنے کی تعلیم دی اور ناپ تول میں کمی کو حرام قرار دیا۔ ریاست کو ایسے جائز کام پر پابندی لگانے کا اختیار دے دیا جس میں عوام کی مصلحت ہو۔ غرض! خدائی، ریاستی اور اخلاقی پابندیوں سے مبادلہ دولت کو جکڑ کر ایک جامع منصوبہ بندی تیار کر کے دے دی۔

تقسیم دولت کی منصوبہ بندی (Planning of Distribution of Wealth)

اسلام نے دولت کی منصفانہ اور شرعی تقسیم کو لازم کیا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ دولت اور آمدنی کے اولین مستحقین عوامل پیدائش ہیں، جیسے زمین، سرمایہ وغیرہ، لیکن اس کے ساتھ ساتھ آمدنی میں ثانوی مستحقین کا بھی حق ہے جن کو زکوۃ، عشر، خراج، کفارات، میراث، وصیت اور صدقات وغیرہ کے ذریعے دولت پہنچائی جائے گی۔ فرمایا: ''اور ان کے اموال میں سائل اور محروم کا ایک متعین حق ہے۔''[1]

اسی کے ساتھ خرید و فروخت، کرایہ داری، شرکت و مضاربت اور مزدوری کے ایسے اصول طے کر دیے جن سے دولت کی متوازن تقسیم وجود میں آتی ہے۔ مالک اور مزدور، پارٹنر اور شرکاء اور کوئی بھی معاملہ کرنے والے فریقین کے حقوق و ذمہ داریاں طے کر کے اور اخوت و مساوات، احسان و معاونت اور قناعت کی ترغیب دیکر دولت کو امراء سے غرباء کی طرف منتقل کرنے اور آمدنیوں کے تفاوت کو دور کرنے کی کوشش کی گئی۔

---

(1) الذاریات:۱۹

خرچ کی منصوبہ بندی(Planning of Consumption of Wealth)

خرچ سے متعلق اسلامی تعلیمات کی منصوبہ بندی کا خلاصہ یہ ہے کہ صرف حلال اور پاک اشیاء استعمال میں لائی جائیں۔اپنے اہل وعیال اور رشتہ داروں پر خرچ کیا جائے۔نہ حد سے زیادہ خرچ کر کے اسراف کا مرتکب ہو،اور نہ بخل وکنجوسی سے کام لے کر تبذیر کی قباحت میں پڑے،بلکہ اعتدال اور میانہ روی کا راستہ اختیار کرے۔اپنی ضروریات وحاجات اور آسائش وسہولیات کے لیے خرچ کرے،لیکن نمائش، تعیش، تکبر اور فخر کرنے سے پرہیز کرے۔واجب صدقات جیسے زکوۃ اور عشر وغیرہ اداء کرے اور نفلی صدقات ادا کر کے اپنے لیے آخرت کا گھر تلاش کرے۔[۱]

دولت کو ناجائز اور فضول کاموں میں خرچ کرنے سے بچے اور دولت کو بے کار پڑے رہنے سے بہتر ہے کہ اُسے کسی مفید کام میں لگائے تاکہ دولت چند مخصوص لوگوں کے ہاتھوں میں سمٹنے کے بجائے گردش کرے اور دوسرے لوگ بھی مستفید ہو۔[۲]

---

[۱] القصص:۷۷

[۲] الحشر:۷

بے روزگاری اور اسلام

یہ مضمون میگزین ''شریعہ اینڈ بزنس'' میں چھپ چکا ہے۔اس میں بے روزگاری کے اسباب، نقصانات اور ممکنہ حل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

عصرِ حاضر میں عمومی طور پر ہر ملک اور خصوصاً اسلامی ممالک بے روزگاری کی مصیبت اور اس کا مقابلہ کرنے کی مشکلات میں مبتلا ہیں۔جدید اقتصادی نظریات کے حامل کئی اداروں نے بے روزگاری اور اس کے اسباب کو سمجھنے اور اس کے لیے علاج دریافت کرنے کی بڑی کوششیں اور تگ ودو بھی کی ہے، لیکن ساری کوششیں بے سود و بے کار ثابت ہوئیں۔ مغربی ممالک ان تمام تر کوششوں کے باوجود بے روزگاری کی بھیانک پرچھائی سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکے اور نہ ہی انہیں بے روزگاری اور اس کے اثرات کا مقابلہ کرنے کی قدرت حاصل ہوئی۔

جہاں تک اسلامی ممالک کی بات ہے تو جن اسلامی ممالک نے اپنی اقتصادی باگ ڈور مغربی اقتصادی نظریات کے ہاتھوں میں دے رکھی ہے، ان اسلامی ممالک کی حالت مغربی ممالک سے بھی ابتر ہے۔ان کو لیبر مارکیٹ کے بگاڑ اور بے روزگاری کا شدت سے سامنا کرنا پڑا ہے۔ایسے اسلامی ممالک میں طبقاتی فاصلے اور دوریاں پیدا ہوئی اور لوگوں کے معیارِ زندگی میں گراوٹ اور نقص آیا ہے۔اسلامی ممالک میں مغرب کے اقتصادی طرز و نظریات کو لاگو کرنے والے یہ نہ سمجھے کہ مغرب کی تقلید کبھی بھی مفید ثابت نہیں ہوئی۔ مغربی اور اسلامی ممالک کے درمیان اقتصادی اور ذہنی اختلافات اور رغبات و خواہشات کا مختلف ہونا اس بات کے لیے ایک اہم سبب ہے کہ اسلامی ممالک میں مغربی تصورات کو منطبق کرنا جہالت اور تاریکی کی طرف چلنے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

اسلامی ممالک کو چاہیے کہ مغرب کی تقلید کے بجائے اپنے لیے الگ اور خاص اقتصادی نہج طے کر لیں، کیونکہ ہر سلامتِ فکر رکھنے والے شخص کو یہ ادراک حاصل ہے کہ بے روزگاری اور مالی و اقتصادی بحران سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ اپنا اقتصادی نہج اسلامی خطوط پر استوار کیا جائے۔

بے روزگاری کے اسباب

۱۔شعبہ تعلیم کا ناقص ہونا، جہالت کا پھیل جانا اور لوگوں کو بے روزگاری کے نقصانات سے آگاہ نہ کرنا بے روزگاری کا بنیادی سبب ہے۔

۲۔ بے روزگاری کے اضافے میں صنعت کے لیے انسانوں کے بجائے جدید مشینری، آلات اور ٹیکنالوجی کا استعمال اور صنعتی اداروں کی سرگرمیوں میں کمی کی وجہ سے روزگار کی فراہمی میں کمی ایک اہم سبب ہے۔

۳۔ کسی شخص کو اس کی اہلیت و قابلیت کی سطح سے کم سطح کے کام پر لگانا اور جو کام ایک کثیر مقدار کے افراد کے کرنے کا ہوتا ہے، وہی کام لوگوں کو مشقت و تکلیف میں مبتلا کر کے کم اور قلیل افراد سے لینا۔

۴۔ بے روزگاری کا ایک سبب مہارت کی کمی ہے۔ آج کل نوجوان طبقہ جس کسی شعبہ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو سرسری سی تعلیم حاصل کر کے فوراً نوکری کی تلاش میں لگ جاتے ہیں، حالانکہ کسی بھی شعبہ میں اختصاص اور مہارت نہایت اہم اور ضروری ہے۔

۵۔ غیر مستقل مزاجی اور کسی ایک جگہ کام نہ کرنا، بلکہ ایک نوکری سے استعفی دے کر دوسری نوکری کی تلاش میں لگ جانا اور اس کو عادت بنالینا بھی بے روزگاری کا سبب ہے۔

۶۔ نوجوانوں کو ابتدائی تعلیم کے بعد کوئی بہتر راہنمائی نہیں ملتی کہ مارکیٹ لیول پر کس قسم کی جابز اور بزنس کی مانگ زیادہ ہے اور جس نوجوان کے ہاتھ میں ڈگری آجائے وہ بڑے جاب کے انتظار میں بیٹھا رہتا ہے اور نچلی سطح کی جاب میں عار محسوس کرتا ہے۔

۷۔ اپنے علاقے، ملک اور معاشرے کے افراد کے بجائے دوسرے علاقوں اور ممالک کے افراد کو نوکریاں دینا کسی بھی علاقے کے اندر بے روزگاری کا سبب بن سکتا ہے۔

۸۔ ان کے علاوہ کساد بازاری، موسموں کا تغیر، ملکوں کی باہمی جنگیں، سستی و کسل مندی اور والدین کی کمائی پر قناعت اور دیگر عالمی معاشی اسباب بھی بے روزگاری میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔

نقصانات

بے روزگاری کے کچھ نقصانات تو فرد سے متعلق ہیں، مثلاً بے روزگار شخص کو زندگی گزارنے کے لیے آمدنی نہیں ملتی۔ حرکت و عمل نہ کرنے کی وجہ سے سستی اور کاہلی کا عادی بن جاتا ہے۔ جسمانی و نفسیاتی پریشانی اور ڈپریشن کی وجہ سے مختلف امراض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ نااہلی اور احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ اپنی فیملی اور گھر والوں کی ذمہ داریاں نبھانے سے قاصر رہتا ہے اور دوسرے افراد کے لیے بوجھ اور دردِ سر بن جاتا ہے۔

بے روزگاری کا اثر انسانی معاشرے پر بھی ہوتا ہے، مثلاً بے روزگاری مصنوعات کی پیداوار میں کمی اور توانائیوں میں خلل کا باعث بنتی ہے۔ معاشرے میں لوٹ مار اور چوری ڈکیتی کا سبب بنتی ہے۔ بھیک جیسی لعنت کو پیدا کرتی ہے۔

نوجوان طبقہ دوسرے ممالک کی طرف جانا شروع کر دیتے ہیں اور بے روزگاری کسی بھی ملک کی ترقی میں رکاوٹ بن کر عالمی سطح پر اس کے اثر ورسوخ اور شہرت کو نقصان پہنچاتی ہے۔

بے روزگاری کا اسلامی حل

اسلامی کی اقتصادی ومعاشی تعلیمات پر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے جہاں معاشی سرگرمیوں سے متعلق مکمل ہدایات دی ہیں، وہیں اسلام نے بے روزگاری کے علاج اور حل کے لیے بھی کئی قوانین اور تعلیمات فراہم کی ہیں۔ بے روزگاری سے متعلق اسلامی تعلیمات دو قسم کی ہیں:

ا۔ اقدامی حل:

اس سے مراد ایسی تعلیمات، طریقے یا علاج ہے جو بے روزگاری کے وقوع سے پہلے ہی اپنانے ضروری ہیں، تاکہ بے روزگاری کی مصیبت سرے سے واقع ہی نہ ہو۔ اس قسم کی اسلامی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے:

(ا)۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ مسلمان معاشرے کا فرد اپنی معاشی ضروریات میں دوسروں پر بوجھ بننے کے بجائے خود ہی معاشی کوششیں کرے، بلکہ خاندان کے جو دوسرے افراد کمزور ہیں، جیسے عورت اور بچے، ان کی ذمہ داری اور بوجھ بھی یہی شخص اٹھائے۔ اس سلسلے میں قرآن وحدیث میں عمل ومحنت کرنے اور معاش ورزق کے حصول کی کوشش کی ترغیب دی گئی ہے۔[1]

اسی طرح احادیث میں بھی سرورِ دوعالم ﷺ نے حلال رزق کمانے کی فضیلت بیان فرما کر ترغیب دی ہے۔ آپ ﷺ نے حلال رزق کمانے کو دوسرے درجے کا فرض قرار دیا۔[2] ایک حدیث میں ہے کہ حلال رزق کمانا ایسا ہے جیسا بہادروں سے مقابلہ کرنا اور جس نے حلال کی طلب میں گھر سے دور رات گزاری تو اس کی رات مغفرت کے ساتھ گزری۔[3] اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ محترفین (کام کرنے والوں) کو پسند فرماتے ہیں۔[4] دوسری جگہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ اس رزق سے بہتر کوئی رزق نہیں ہے جو انسان اپنے ہاتھ سے کما کر کھائے۔[5]

---

(۱) تفصیل کے لیے قرآن کی ان آیات کی تفسیر ملاحظہ کی جاسکتی ہے: سورتِ جمعہ، آیت نمبر: ۱۰۔ سورتِ ملک، آیت نمبر: ۱۵۔ سورتِ بنی اسرائیل، آیت نمبر: ۷۲۔ سورتِ حجر، آیت نمبر: ۲۰۔ سورتِ اعراف، آیت نمبر: ۱۰۔

(۲) المعجم الكبير ۱۰/ ۷٤، حديث نمبر: ۹۹۹۳

(۳) شعب الإيمان ۲/ ٤۳۸، حديث نمبر: ۱۱۷۷

(٤) المعجم الأوسط، حديث نمبر: ۸۹۳٤

(۵) صحيح البخاري ص: ۱۲٤، حديث نمبر: ۲۰۷۲

(۴)۔ اسلام نے سخت ضرورت اور اضطراری حالت کے بغیر دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے اور بھیک مانگنے سے منع فرمایا ہے۔ حدیث میں اس پر سخت وعید آئی ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص باجود قدرت وطاقت کے لوگوں سے بھیک مانگتا ہے وہ قیامت کے دن چہرے پر سوال کا داغ لے کر آئے گا۔[۱] ایک اور مقام پر آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ کسی شخص کے لیے دوسروں سے مانگنے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ وہ رسی لے کر پہاڑ پر جائے اور لکڑیاں کاٹ کر اُسے فروخت کرے، ایسے شخص کے لیے اللہ کافی ہو جاتا ہے۔[۲]

۲۔دفاعی حل:

اسلام کی دوسری قسم کی تعلیمات دفاعی ہیں۔ یعنی اگر معاشرہ بے روزگاری کی مصیبت میں مبتلا ہو چکا ہے تو اس سے خلاصی کیسی حاصل کی جائے؟ اس کے لیے بھی اسلام نے اہم تعلیمات دی ہیں، مثلاً:

(۱)۔ اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ حکومت بے روزگاروں کو روزگار کے مواقع فراہم کرے۔ سرورِ دوعالم ﷺ نے جہاں طلبِ حلال کی اہمیت اور مانگنے کی مذمت بیان فرمائی، وہیں آپ ﷺ نے کئی مرتبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو روزگار کے مواقع کی طرف بھی راہنمائی فرمائی ہے۔ اس سلسلے میں یہاں صرف ایک ہی روایت بیان کی جاتی کہ ایک صحابی نے اپنی کسی حاجت کے لیے سوال کیا تو آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ تمہارے گھر میں کچھ موجود ہے؟ اس نے عرض کیا کہ ہاں، ایک چادر اور ایک پیالہ ہے۔ آپ ﷺ نے دونوں چیزیں منگوا کر مجلس میں دو درہم کے عوض فروخت کرکے فرمایا کہ ایک درہم سے گھر والوں کے لیے کھانا لے لو اور دوسرے سے کلہاڑی خرید لو۔ آپ ﷺ نے خود ہی کلہاڑی کا دستہ لگایا اور صحابی کو لکڑیاں کاٹنے کے کام کا حکم دیا۔ جب وہ پندرہ دنوں کے بعد آیا تو دس درہم کما چکا تھا۔[۳]

(۲)۔ اسلامی تعلیمات سے یہ راہنمائی بھی ملتی ہے کہ حکومت کو چاہیے کہ وہ زکوۃ اور خراج کا نظام درست کرے اور اس سے مستحق لوگوں کی امداد اور بے روزگاروں کے لیے روزگار فراہم کرے۔

(۳)۔ حکومت کو چاہیے کہ بے روزگاروں اور عاجز لوگوں کو قرضِ حسنہ فراہم کرے، تاکہ وہ اپنا کوئی کاروبار اور

---

(۱) سنن الترمذي ۳/ ٤٠، حديث نمبر: ٦٥٠

(۲) صحيح البخاري، حديث نمبر: ١٤٧١

(۳) مشكاة المصابيح ١/ ٥٧٩، حديث نمبر: ١٨٥١

تجارت کر سکے۔اس سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ آپ نے بیت المال سے عراق کے کسانوں کو زمینیں آباد کرنے اور غلہ اور پیداوار اگانے کے لیے قرض فراہم کیا تھا۔

(۴)۔جو زمینیں حکومت کی ملکیت ہیں اور بنجر ہیں، بے روزگاروں کو ان زمینوں کے احیاء اور آباد کرنے کی اجازت دی جائے اور جو شخص ایسی زمین میں محنت کر کے اُسے آباد کرے، شرعی حکم کے لحاظ سے وہ اس زمین کا مالک ہو جائے گا۔[1]

(۵)۔جو افراد زمین آباد کرنے پر قدرت نہ رکھتے ہوں، حکومت ان کو زمین عطاء اور تحفہ کے طور پر بھی دے سکتی ہے، جسے وہ لوگ کسی اور کے ذریعے سے آباد کروا سکتے ہیں یا بیچ کر رقم حاصل کر کے اپنا کوئی روزگار شروع کر سکتے ہیں۔

(۶)۔سودی نظام اور رقم پر رقم لینے کے ناجائز طریقوں اور سودی بینکوں سے توبہ کرلے اور غرر و جوے پر مبنی نظام تجارت کی اصلاح کرلے، کیونکہ سود، جوا اور سٹہ معاشی بحران کا ایک بنیادی سبب ہے۔اس کے بجائے اسلامی بینکاری کی ترویج کے لیے کوششیں کرے اور ایسے معاملات کی اہمیت وافادیت اجاگر کی جائے جن کی پشت پر حقیقت میں اثاثہ جات ہوں، جن کو "asset based transection" کہا جاتا ہے۔

---

[1] سنن أبي داود ٣/ ١٤٢، حديث نمبر: ٣٠٧٥

مصادر و مراجع

(BIBLIOGRAPHY)

مصادر و مراجع
(bibliography)

- القرآن

عربی اور اُردو کتب

(أ)

١. الإبهاج في شرح المنهاج، علي بن عبد الكافي السبكي، دار الكتب العلمية، بيروت

٢. الإجارة بجزء من العمل: صورها، حكمها، تكييفها، مجلة العدل، العدد:٣٧، السعودية

٣. احسن الفتاوی، مفتی رشید احمد لدھیانوی، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی

٤. أحكام الأوراق التجارية في الفقه الإسلامي، الدكتور سعد بن تركي الخثلان، دار ابن الجوزي

٥. أحكام القرآن لابن العربي، محمد بن عبد الله الأندلسي، دار الكتب العلمية

٦. أحكام القرآن للجصاص، أحمد بن علي الرازي الجصاص، دار إحياء التراث العربي، بيروت

٧. الإحكام في أصول الأحكام، علي بن أحمد ، ابن حزم، دارالأفاق، بيروت

٨. أحكام المعاملات الشرعية، الشيخ علي الخفيف، دارالفكر العربي، قاهرة

٩. الأدب المفرد، محمد بن إسماعيل أبو عبدالله البخاري، دار البشائر الإسلامية، بيروت

١٠. أساسيات ومفاهيم التجارة الإلكترونية، جمال نادر، دار الإسراء، عمان

١١. استكمال موضوع الصكوك الإسلامية، عادل عوض بابكر، مجمع الفقه الإسلامي الدولي

١٢. اسلام اور جدید معاشی مسائل، مفتی محمد تقی عثمانی، ادارہ اسلامیات

١٣. اسلام اور معاشی تصورات، پروفیسر ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی، مکتبہ دانیال

١٤. اسلام کا نظام تقسیم دولت، مفتی محمد شفیع، دارالاشاعت کراچی

١٥. اسلامی بینکاری کی بنیادیں، مفتی محمد تقی عثمانی، مکتبہ العارفی، فیصل آباد

١٦. الأسواق المالية المعاصرة، أحمد السعد، دارالكتاب الثقافي

١٧. الأشباه والنظائر، زين العابدين بن إبراهيم بن نجيم، دار الكتب العلمية،بيروت

١٨. إعلام الموقعين عن رب العالمين، محمد بن أبي بكر أيوب الزرعي، ابن قيم، دار الجيل

١٩. الإعلان التجاري عن نشاط المحامي، بكر بن عبد اللطيف، وزارة العدل السعودية

٢٠. الإفادة الشرعية في بعض المسائل الطبية، وليد بن راشد السعيدان، مكتبة النور

٢١. اقتضاء الصراط المستقيم، أحمد بن عبد الحليم بن تيمية الحراني، دار عالم الكتب، بيروت

٢٢. امداد الفتاوی، حکیم الامت اشرف علی تھانوی، مکتبہ دار العلوم کراچی

٢٣. الإنصاف، علاء الدين أبو الحسن علي بن سليمان المرداوي ، دار إحياء التراث العربي، بيروت

٢٤. أوفوا بالعقود، دكتور عبد الستار أبو غده، المنهاج

(ب)

٢٥. البحر الرائق،ابن نجيم، زين الدين بن إبراهيم، دار الكتاب الإسلامي

٢٦. بحوث في قضايا فقهية معاصرة، مفتي محمد تقي عثماني، مكتبة معارف القران، كراتشي

٢٧. بدائع الصنائع، علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني، دار الكتب العلمية

٢٨. بداية المجتهد،ابن رشد، أبو الوليد محمد بن أحمد، مطبعة مصطفى البابي الحلبي، مصر

٢٩. بدل الخلو في الفقه الإسلامي، حقيقته وأحكامه، ڈاكٹر صالح بن عثمان، دار المؤيد

٣٠. البناية شرح الهداية، بدر الدين العينى ، أبو محمد محمود بن أحمد، دار الكتب العلمية، بيروت

٣١. بنك لبن الأمهات، المفتي أحمد هريدى، فتاوى الأزهر، دارالإفتاء المصرية

٣٢. بنوك الحليب البشري من منظور شرعي، احمد مصطفى القضاة، دارالنفائس،عمان

٣٣. بنوك الحلِيب في ضوء الشريعةالإسلامية، دراسة فقهية مقارنة، عبدالتواب مصطفى خالد معوض، http://www.alukah.net/sharia/

٣٤. بنوك الحليب وموقف الشريعة الاسلامية منها، أمل بنت إبراهيم بن عبدالله الدباسي، مجلة الجمعية الفقهية السعودية

٣٥. بنوك الحليب، يوسف قرضاوي، مجلة مجمع الفقه الإسلامي، جدة

٣٦. بنوك الحليب، الدكتور محمد علي البار، مجلة مجمع الفقه الإسلامي، جدة

٣٧. بنوك الحليب، دكتور عبلة الكحلاوي، الدار المصرية اللبنانية

٣٨. البنوك الطبية البشرية وأحكامها الفقهية، دكتور اسماعيل، دارابن الجوزية

٣٩. بيع الدين وتطبيقاته المعاصرة في الفقه الاسلامي. الدكتور آسامة بن محمود. دار الميمان للنشر والتوزيع

(ت)

٤٠. تبصرة الحكام في أصول الأقضية ومناهج الأحكام. ابن فرحون برهان الدين. إبراهيم بن محمد. دار القلم، دمشق

٤١. تبيين الحقائق، فخر الدين الزيلعي. عثمان بن علي بن محجن البارعي. المطبعة الكبرى الأميرية، بولاق، القاهرة

٤٢. تجارتی کمپنیوں کالائحہ عمل، ڈاکٹراعجازاحمدصمدانی، ادارہ اسلامیات

٤٣. تحرير الكلام في مسائل الالتزام. الحطاب، أبوعبد الله محمد بن محمد. دارالغرب الإسلامي. تونس

٤٤. تحفة المحتاج، ابن حجر الهيثمي، شهاب الدين، أحمد بن محمد. دارالكتب العلمية

٤٥. تحفة الفقهاء، علاء الدين السمرقندي، دار الكتب العلمية، بيروت

٤٦. التسويق مفاهيم معاصرة. نظام موسى سويدان، شفيق حداد. دارالحامد للنشر والتوزيع

٤٧. التعليق الممجد على موطأ محمد، أبو الحسنات، محمد عبد الحي اللكنوي. دار القلم، دمشق

٤٨. تكملة فتح الملهم. المفتي محمد تقي عثماني، دار القلم. دمشق

٤٩. التكييف الفقهي، دكتور محمد عثمان شبير، دار القلم، دمشق

٥٠. تنبيه الغافلين، أبو الحسن الصفاقسي، دار الكتب العلمية، بيروت

٥١. تنبيه اللبيب حول بنوك الحليب، محمدبن فنخور. http://www.qoranona.com

٥٢. توثيق الديون في الفقه الإسلامي، للدكتور صالح بن عثمان. الإدارة العامة للثقافة والنشر

٥٣. توثيق الديون. المفتي محمد تقي عثماني، مكتبه معارف القرآن

٥٤. توظيف عقد البناء والتشغيل والنقل، أحمد بشناق، الجامعة الأسمرية، ليبيا

(ج)

٥٥. جامع الترمذي، محمد بن عيسى أبو عيسى الترمذي. دار إحياء التراث العربي. بيروت

٥٦. الجامع الصغير. أبو عبد الله محمد بن الحسن الشيباني. عالم الكتب

٥٧. الجامع لأحكام القرآن. القرطبي .أبو عبد الله محمد بن أحمد. دار عالم الكتب. الرياض

٥٨. جواہر الفقہ، مفتی محمد شفیع عثمانی، مکتبہ دار العلوم کراچی

٥٩. الجوهرة النيرة. أبو بكر بن علي بن محمد الحدادي. دار الكتب العلمية. بيروت

(ح)

٦٠. حاشية ابن عابدين. ابن عابدين. محمد أمين بن عمر الدمشقي، دار الفكر. بيروت

٦١. حاشية الدسوقي على الشرح الكبير. محمد عرفه الدسوقي، دار الفكر. بيروت

٦٢. حاشية قليوبي على شرح جلال الدين المحلي على منهاج الطالبين. شهاب الدين أحمد بن أحمد القليوبي. دار الفكر. بيروت

٦٣. حق الامتياز التجاري، احمد السيد كردي. kenanaonline.com

(خ)

٦٤. خطة إدارة المخاطر. أمل عبد الله، نورة خالد، www.slideshare.com

٦٥. الخيار وأثره في العقود، دكتور عبد الستار أبوغده، مطبعة مقهوي، كويت

(د)

٦٦. الدر المختار. الحصكفي،محمد بن علي، دار الكتب العلمية، بيروت

٦٧. الدرالمنتقى حاشيه على الملتقى الابحر، الحصكفي، محمد بن علي، دار الكتب العلمية، بيروت

٦٨. درر الحكام شرح مجلة الأحكام، علي حيدر خواجه أمين أفندي، دار الجيل

٦٩. دفاتر البحوث العلمية. المجلد ٩ ،العدد ١ ،السنة ٢٠٢١، تحليل نظام التسويق الشبكي في إطار رؤية اقتصادية إسلامى، سمير بن سحنون ، خالد ليتيم، عبد الناصر حبوشي

٧٠. الدسوقي على الشرح الكبير. محمد عرفه الدسوقي، دار الفكر، بيروت

(ر)

٧١. الرضاع باللبن المجفف وبنك اللبن. المفتي عطية صقر، فتاوى الأزهر، وزارة الأوقاف المصرية

(ز)

۷۲. زاد المعاد في هدي خير العباد. ابن قيم الجوزية. محمد بن أبي بكر. مؤسسة الرسالة. بيروت

۷۳. زر کا تحقیقی مطالعہ، ڈاکٹر عصمت اللہ، ادارۃ المعارف کراچی

(س)

۷۴. سنن ابن ماجة. ابن ماجة. أبو عبد الله محمد بن يزيد القزويني. مكتبة أبي المعاطي

۷۵. سنن أبي داود. أبو داود سليمان بن الأشعث السجستاني. دار الكتاب العربي. بيروت

۷۶. سنن الدارقطني. أبو الحسن الدارقطني. علي بن عمر البغدادي. دار المعرفة بيروت

۷۷. السنن الكبرى. أبو بكر أحمد بن الحسين بن علي البيهقي. مجلس دائرة المعارف النظامية الكائنة في الهند

۷۸. سنن النسائي بشرح السيوطي وحاشية السندي. أحمد بن شعيب أبو عبد الرحمن النسائي. مكتب المطبوعات الإسلامية. حلب

(ش)

۷۹. الشرح الكبير للدردير. أبو البركات أحمد بن محمد العدوي. دار الكتاب العربي. بيروت

۸۰. شرح المجلة. الأتاسي. محمد خالد. مكتبه رشيديه. كوئته

۸۱. شرح مختصر خليل. الخرشي على مختصر سيدي خليل. دار الفكر للطباعة. بيروت

۸۲. الشروط المقترنه بالعقد وأثرها فيه في الفقه الإسلامي. محمد عثمان شبير. جامعة قطر

۸۳. شعب الإيمان. أبو بكر أحمد بن الحسين البيهقي. دار الكتب العلمية. بيروت

(ص)

۸۴. صحيح البخاري. محمد بن إسماعيل البخاري. دار الكتب العلمية

۸۵. صحيح مسلم. مسلم بن الحجاج. دار الكتب العلمية

(ع)

۸۶. عدالتی فیصلے، مفتی محمد تقی عثمانی، ادارہ اسلامیات

۸۷. العناية شرح الهداية. محمد بن محمد البابرتي. دار الكتب العلمية

(غ)

۸۸. غرر کی صورتیں، ڈاکٹر اعجاز احمد صمدانی، مکتبہ معارف القرآن کراچی

۸۹. الغرر وأثره في العقود. الشيخ صديق محمد الأمين الضرير. دار الجيل. بيروت

۹۰. غمز عيون البصائر. السيد احمد بن محمد الحنفي الحموي. دار الكتب العلمية. بيروت

(ف)

۹۱. فتاوى الأزهر. دار الإفتاء المصرية. دار اليسر. المصر

۹۲. فتاوى اللجنة الدائمة. جمع وترتيب : أحمد بن عبد الرزاق الدويش. دار المؤيد

۹۳. الفتاوى الهندية. لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي. دار الفكر. بيروت

۹۴. فتاوى دار الإفتاء المصرية. دار الإفتاء المصرية. وزارة الأوقاف المصرية

۹۵. فتاوى قاضيخان. الحسن بن منصور قاضي خان. دار النوادر

۹۶. فتاویٰ عثمانی، مفتی محمد تقی عثمانی، مکتبہ معارف القرآن کراچی

۹۷. فتح الباري شرح صحيح البخاري. ابن حجر العسقلاني. أحمد بن علي أبو الفضل. دار المعرفة. بيروت

۹۸. فتح القدير شرح الهداية. المحقق ابن الهمام الحنفي. دار الفكر

۹۹. الفقه الإسلامي وأدلته. أ.د. وهبة الزحيلي. دار الفكر. دمشق

۱۰۰. الفقه الإسلامي ومدارسه. مصطفى أحمد الزرقاء. دارالقلم. دمشق

۱۰۱. فقه البيوع. المفتى محمد تقى عثماني. مكتبه معارف القرآن

۱۰۲. فقه المعاملات المالية والمصرفية المعاصرة. دكتور نزيه حماد. دارالقلم. دمشق

۱۰۳. فقه المعاملات. مجموعة من المؤلفين. دار الكتب العلمية

۱۰۴. الفقه الميسر. لجنة العلماء. مدار الوطن للنشر

۱۰۵. الفقه على المذاهب الأربعة. عبد الرحمن الجزيري. دار ابن حزم

۱۰۶. فيض الباري شرح صحيح البخاري. محمد أنور شاه الكشميري. دار الكتب العلمية

(ق)

١٠٧. قاموس فرنسي. عربي. إنجليزي. المكتبة الشاملة

١٠٨. قرارات وتوصيات مجمع الفقه الإسلامي التابع لمنظمة المؤتمر الإسلامي. لمملكة العربية السعودية

١٠٩. قضايا فقهية معاصرة في المال والاقتصاد. دكتور نزيه حماد. دار القلم. دمشق

١١٠. قواعد الفقه. محمد عميم الإحسان المجددي البركتي. الصدف ببلشرز كراتشي

(ك)

١١١. الكافي في فقه أهل المدينة. أبو عمر يوسف بن عبد الله. مكتبة الرياض الحديثة. الرياض

١١٢. كشاف اصطلاحات الفنون والعلوم. محمد بن علي ابن القاضي التهانوي. مكتبة لبنان ناشرون. بيروت

١١٣. كشاف القناع عن متن الإقناع. منصور بن يونس بن إدريس البهوتي. دار الفكر. بيروت

١١٤. كشف الأسرار عن أصول فخر الإسلام البزدوي. عبد العزيز بن أحمد. علاء الدين البخاري. دار الكتب العلمية. بيروت

(ل)

١١٥. اللباب في شرح الكتاب. الميداني . عبد الغني الغنيمي الدمشقي. دار الكتاب العربي

١١٦. لسان العرب. محمد بن مكرم بن منظور الأفريقي المصري. دار صادر. بيروت

(م)

١١٧. المالية الدولية. دريد آل شبيب. دار اليازوري العلمية

١١٨. المبسوط. شمس الأئمة السرخسي . محمد بن أحمد بن أبي سهل. دار المعرفة. بيروت

١١٩. مجلة الأحكام العدلية. لجنة مكونة من عدة علماء وفقهاء في الخلافة العثمانية. نور محمد. كارخانه تجارتِ كتب. آرام باغ. كراتشي

١٢٠. مجلة الاقتصاد الإسلامي العالمية. العدد:٦٣. اغسطس. ٢٠١٧. جامعة كاي

١٢١. مجلة مجمع الفقه الإسلامي. منظمة المؤتمر الإسلامي بجدة.

١٢٢. مجمع الأنهر. شيخي زاده، عبد الرحمن بن محمد الكليبولي. دار الكتب العلمية. بيروت
١٢٣. مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، نور الدين علي بن أبي بكر الهيثمي، دار الكتب العلمية
١٢٤. المجموع شرح المهذب، أبو زكريا، يحيى بن شرف النووي، دار الكتب العلمية، بيروت
١٢٥. المحلى، ابن حزم الأندلسي الظاهري، أبو محمد علي بن أحمد، دار الفكر
١٢٦. المحيط البرهاني، محمود بن أحمد، برهان الدين مازه، دار إحياء التراث العربي
١٢٧. مختصر القدوري، أحمد بن محمد أبو الحسين القدوري، دار الكتب العلمية
١٢٨. المدخل الفقهي العام، الشيخ مصطفى الزرقاء، دار القلم، دمشق
١٢٩. المدخل إلى فقه المعاملات المالية، دكتور شبير احمد، دار النفائس، أردن
١٣٠. المدونة الكبرى، مالك بن أنس، دار الكتب العلمية، بيروت
١٣١. المذكرات الايضاحية للقانون المدني الاردني، قاضي، عمار محمد القضاة، دار الثقافة للنشر والتوزيع، أردن
١٣٢. مرشد الحيران إلى معرفة أحوال الإنسان، محمد قدري باشا، المطبعة الكبرى الأميرية ببولاق
١٣٣. المستصفى في علم الأصول، محمد بن محمد الغزالي، دار الكتب العلمية
١٣٤. مسند ابي يعلى، أحمد بن علي، أبو يعلى الموصلي التميمي، دار المأمون للتراث، دمشق
١٣٥. مشروع لقانون إسلامي للبيوع والديون، الشيخ مفتى محمد تقى عثمانى، مكتبه معارف القرآن
١٣٦. مشكاة المصابيح، التبريزي، محمد بن عبد الله الخطيب العمري، المكتب الإسلامي، بيروت
١٣٧. المصباح المنير في غريب الشرح الكبير للرافعي، أحمد بن محمد بن علي المقري الفيومي، المكتبة العلمية، بيروت
١٣٨. معارف القرآن، مفتی محمد شفیع، ادارة المعارف کراچی
١٣٩. المعاملات المالية المعاصرة، دكتور شبير احمد، دار النفائس، أردن
١٤٠. المعاملات المالية المعاصرة في الفكر الاقتصادي الإسلامي، ياسر بن طه، مكتبة النور
١٤١. المعاملات الماية المعاصرة في ضوء الاسلام، سعد الدين محمد الكبي، المكتب الإسلامي، بيروت
١٤٢. المعايير الشرعية، لجنة العلماء، مجمع الفقه الإسلامي، جدة

١٤٣. المعجم الأوسط، أبو القاسم سليمان بن أحمد الطبراني، دار الحرمين، القاهرة
١٤٤. المعجم الكبير، أبو القاسم سليمان بن أحمد الطبراني، دار الحرمين، القاهرة
١٤٥. معجم لغة الفقهاء، محمد رواس قلعه جي، حامد صادق قنيبي، دار النفائس
١٤٦. معجم مقاييس اللغة، أبو الحسين أحمد بن فارس، دار الفكر
١٤٧. معين الحكام فيما يتردد بين الخصمين من الأحكام، علاء الدين علي الطرابلسي، دار القلم، دمشق
١٤٨. مغني المحتاج، محمد الخطيب الشربيني، دار الفكر، بيروت
١٤٩. المغني، عبد الله بن أحمد بن قدامة المقدسي، دار الفكر، بيروت
١٥٠. المفردات، الاصفهاني، أبو القاسم الحسين بن محمد، دار المعرفة، لبنان
١٥١. مقدمات في المال والمكية والعقد، علي محي الدين القره داغي، دارالبشائر الإسلامية
١٥٢. مقدمة في الصيرفة الإسلامية، نايف بن نهار، مؤسسة وعي للدراسات والأبحاث، قطر
١٥٣. المنتقى شرح المؤطا، الباجي، أبو الوليد سليمان بن خلف المالكي، دار الكتب العلمية، بيروت
١٥٤. المنثور في القواعد، الزركشي، محمد بن بهادر بن عبد الله، وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية، الكويت
١٥٥. المهذب، إبراهيم بن علي بن يوسف الشيرازي، دار الفكر، بيروت
١٥٦. مواهب الجليل لشرح مختصر الخليل، أبو عبد الله محمد بن محمد الطرابلسي، دار عالم الكتب
١٥٧. موسوعة الطبية الفقهية، دكتور أحمد محمد كنعان، دار النفائس
١٥٨. الموسوعة العربية العالمية، لجنة العلماء، دائرة المعارف العالمية
١٥٩. الموسوعة الفقهية الكوينية، لجنة العلماء، وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية

(ن)

١٦٠. النهاية في غريب الأثر، أبو السعادات المبارك بن محمد الجزري، المكتبة العلمية، بيروت
١٦١. نهاية المحتاج إلى شرح المنهاج، شمس الدين محمد بن أحمد، الرملي، دار الفكر للطباعة
١٦٢. نيل الأوطار من أحاديث سيد الأخيار ، الشوكاني، محمد بن علي بن محمد، إدارة الطباعة المنيرية

۱۲۳. نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے، اسلامی فقہ اکیڈمی، انڈیا

(و)

۱۲۴. الوسيط في المذهب، محمد بن محمد الغزالي أبو حامد، دارالسلام، قاہرة

(ھ)

۱۲۵. الهداية في شرح بداية المبتدي، علي بن أبي بكر المرغيناني، دار احياء التراث العربي

انگریزی ڈکشنریز

1. Cambridge Advanced Learner's Dictionary - 3rd Edition
2. Longman Dictionary of contemporary English
3. Oxford Advanced Learner's Dictionary - 8th Edition.
4. Principles of insurance LOMA

ویب سائٹس

1. http://kenanaonline.com/users/ahmedkordy/posts/241465
2. http://kenanaonline.com/users/ahmedkordy/posts/241465
3. http://taakbs.blogspot.com/2013/06/milk-bank.html
4. http://www.aljazeera.net/health/2002/4/4-1-1.htm
5. http://www.alukah.net/sharia/
6. http://www.qoranona.com
7. http://www.shefa-online.net/news/displayArticle.asp?aid=380&x=
8. https://ar.wik pedia.org/wiki
9. https://en.wikipedia.org/wiki/Franchising
10. https://legal-dictionary.thefreedictionary.com/bill+of+exchange
11. https://www.aliftaa.jo/Research.aspx?ResearchId=102#.X9Wud9gzblV

12. https://www.aliftaa.jo/Research.aspx?ResearchId=102#.X9XHBtgzbIU

13. https://www.investopedia.com/terms/b/billofexchange.asp

14. https://www.investopedia.com/terms/b/billofexchange.asp

15. https://www.investopedia.com/terms/b/bond.asp

16. https://www.investopedia.com/terms/b/bond.asp

17. https://www.investopedia.com/terms/f/franchise.asp

18. https://www.investopedia.com/terms/i/islamicbanking.asp

19. https://www.marketing91.com

20. https://www.marketing91.com/types-of-bill-of-exchange/

21. https://www.ncbi.nlm.nih.gov/pubmed/27336107

22. kenanaonline.com

23. Wikipedia.org

24. www.equiti.com

25. www.imtithal.com

26. www.investopedia.com

27. www.slideshare.com

28. www.westerncape.gov.za/.../health/donorbank

نیا اور نظر ثانی شدہ ایڈیشن

قواعد فقہیہ کی مبادیات

اور "مجلة الأحكام العدلية" کے (۹۹) قواعد کی تحقیق و تطبیق

فقہی قواعد کا تحقیقی مطالعہ

• تعارف و مبادی • تاصیل و تحقیق • تفریعات و مستثنیات

مفتی شاد محمد شاد
فاضل ومتخصص جامعہ دارالعلوم کراچی

دار الصدیق لنشر البحوث الإسلامية والعلمية
بام خیل، صوابی